
OCTOBER 2011
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
www.Paksociety.com
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com
www.Paksociety.com



کہنی سُننی — مسدید — 14

کرن کرن روشنی — ادارہ — 15

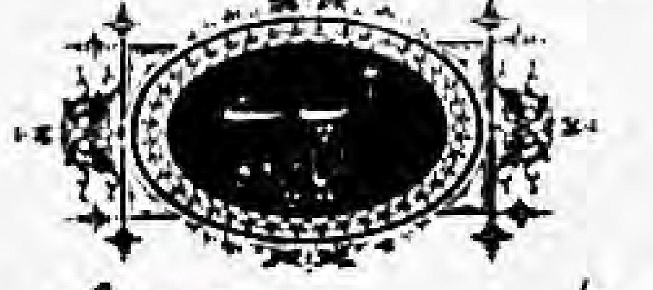
ہمارے نام — نادرہ خاتون — 271

ڈوب رہی ہے — ام ثمامہ — 22



بہار آنے تک — فاخرہ جبیں — 68

نگاہِ آئینہ ساز — شازیہ ہمایوں — 156



اندر کیلا ہے — انشاء جی — 20



سفال گر — بشریٰ سعید — 154

وہ میرا ہے — نمرہ احمد — 226



میری ڈائری سے — امت الصبور — 267



اک کربِ مسلسل — سعدیٰ حمید — 55

سمجھوتے کی چادر — نفیسہ بیگم — 102

بھید — سمیرا حمید — 216

کاملیت پسند — مصباح خادم — 254



ردا اصفہانی — شاہین رشید — 24



ساجد شاہ — شاہین رشید — 30



غزل — عرفان صدیقی — 262

نظم — منظر ایوبی — 262

غزل — شبانہ یوسف — 261

غزل — ثروت ظفر — 261



چراغِ آخرِ شب — رفعت ناہید — 36

میرے خواب لوٹا دو — نگہت عبداللہ — 110



زنگارنگ سلسلہ — شگفتہ جاہ — 263

خبریں وبریں — تبصیر نشاط — 284

روشن حرف — سیما ممتاز عباسی — 279



آپ کی بیاض سے — خالدہ جیلانی — 269



آپ کا باورچی خانہ — شیریں عظیمی — 280

موسم کے پکوان — خالدہ جیلانی — 282



نفسیاتی ازدواجی الجھنیں — عدنان — 287



بیوٹی بکس کے مشورے — امت الصبور — 289



اکتوبر 2011

جلد 39 شمارہ 6

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

مدیرہ

کہی ان کہی

خواتین ڈائجسٹ کا اکتوبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

ابھی پچھلی تباہی کے نشان مٹے نہ تھے کہ سندھ کا ایک بڑا حصہ پھر زیر آب آگیا۔ پانی جو زندگی ہے۔ بارش جس کے لیے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ یہ آب رحمت ہماری ناقص منصوبہ بندی کی بدولت تباہی و بربادی کی ان گنت داستانیں رقم کرکے سمندر کی نذر ہو جائے گا۔

بہرحال یہ اہل سیاست کا کام ہے، وہ جانیں۔ ہمیں اپنے حصے کا دیا جلانا ہے۔ دیگر مسائل و ضروریات کا تو ذکر ہی کیا۔ ایک بڑی تعداد تک ابھی پانی اور خوراک بھی نہیں پہنچ پائی ہے۔

کسی انسان کی جان بچانا سب سے بڑی نیکی ہے جس نے کسی ایک انسان کی جان بچائی، اس نے پوری انسانیت کو بچالیا۔ آپ کی تھوڑی سی توجہ سے کسی کو زندگی مل سکتی ہے۔

محمود بابر فیصل (ذوالقرنین)

محمود بابر فیصل جیسی خوبصورت شخصیت آج ہمارے درمیان نہیں۔ سالوں گزرنے کے باوجود دل اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔ ان کی زندہ دلی، دل نوازی، ان کی شگفتہ باتیں جو غیروں کو اپنا بنا لیتی تھیں۔ جس محفل میں ہوتے، جان محفل ہوتے۔ اپنے پرائے سب ہی ان کی محبتوں کے اسیر تھے۔

وہ حساس دل اور تخلیقی ذہن کے مالک تھے۔ ان کی شگفتہ تحریروں میں زندگی مسکراتی تھی تو ان کے افسانے زندگی کی تلخ حقیقتوں کے عکاس تھے۔

ان کے لیے سب سے بڑا تحفہ ہماری دعائیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

عید نمبر۔ عید سروے،

ہماری خوش نصیبی ہے کہ اچھی مصنفین کے ساتھ ساتھ ہمیں بہت ذہین قارئین کا تعاون بھی حاصل ہے۔ اسی لیے ہماری کوشش ہوتی ہے کہ مختلف سلسلوں کے ذریعے قارئین کی صلاحیتیں سامنے لائی جائیں۔ نومبر کا شمارہ عید نمبر ہوگا جس میں عید کے حوالے سے دیگر تحریروں کے ساتھ ساتھ قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔

اس بار آپ کی سلیقہ مندی کا امتحان ہے۔ سوال یہ ہے۔

1. عید کے موقع پر اگر آپ کو کچھ دوستوں، عزیزوں کی دعوت کرنے کو کہا جائے تو آپ کیا مینو ترتیب دیں گی میٹھا اور گوشت کی کیا ڈشز بنائیں گی؟ ایسی کون سی چیز شامل کریں گی کہ مہمان آپ کی ہنر مندی اور سلیقہ کی داد دیتے ہوئے خوش خوش رخصت ہوں؟

اس سوال کا جواب اس طرح بھجوائیں کہ بائیس نومبر تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

قارئین کو شازیہ عطا یاد ہوں گی۔ انہوں نے چند تحریریں لکھیں پھر شازیہ ہمایوں بن کر دیس چھوڑ گئیں۔ امریکہ میں لکھنے لکھانے کا سلسلہ بھی قائم نہ رہا۔ اب ایک طویل مدت بعد شازیہ نے ایک مکمل ناول لکھا ہے۔ سادہ سے انداز میں لکھا یہ ناول فکر کے کئی زاویے سامنے لاتا ہے۔ ہمیں یقین ہے آپ کو پسند آئے گا۔

- بہار آنے تک ۔ فاخرہ جبیں کا مکمل ناول،
- نمرہ احمد اور بشریٰ سعید کے ناولٹ،
- سعدیہ حمید چودھری، نفیسہ بیگم، سمیرا حمید اور مصباح خادم کے افسانے،
- رفعت ناہید سجاد اور نگہت عبداللہ کے ناول،
- ٹی وی فنکار ساجد شاہ سے ملاقات،
- رودا رضا اصفہانی سے باتیں،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

جانوروں کی زکوٰۃ

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اونٹوں، بکریوں یا گایوں کا جو مالک ان کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا (اس کے یہ جانور) قیامت کے دن انتہائی بڑے اور موٹے ہو کر آئیں گے، وہ اسے سینگوں سے ماریں گے اور پاؤں سے روندیں گے، جب آخری جانور گزر چکیں گے تو پہلے گزر جانے والے دوبارہ آجائیں گے۔ (اسے یہی عذاب ہوتا رہے گا) حتیٰ کہ (سب) لوگوں کا فیصلہ ہو جائے گا۔"

فوائد و مسائل: ○ زکوٰۃ نہ دینا بہت بڑا گناہ ہے۔ ○ جانوروں میں بھی زکوٰۃ فرض ہے جس کی تفصیل اگلے ابواب میں آرہی ہے۔ ○ کبیرہ گناہوں کے مرتکب افراد کو میدان حشر میں بھی گناہوں کی سزا ملے گی۔ ○ بعض صورتوں میں ممکن ہے کہ محشر کی یہ سزا ہی اس کے لیے کافی ہو جائے اور جہنم کی سزا ٹل جائے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "(اسے یہ عذاب ہوتا رہے گا) اس دن جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے حتیٰ کہ لوگوں کا فیصلہ ہو جائے گا، پھر اسے جنت یا جہنم کا راستہ دکھا دیا جائے گا۔"

قیامت کے دن

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"وہ اونٹ جن کا حق (زکوٰۃ) ادا نہیں کیا گیا، (قیامت کے دن) آئیں گے، اپنے مالک کو سموں سے روندیں گے اور سینگوں سے ماریں گے۔ اور خزانہ گنجا سانپ بن کر آجائے گا۔ وہ قیامت کو جب اپنے مالک سے ملے گا تو مالک اس سے دو دفعہ بھاگے گا، پھر وہ (سانپ) سامنے سے آئے گا تو مالک (پھر) بھاگے گا (اور) کہے گا تو کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے؟ وہ کہے گا میں تیرا خزانہ ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔ وہ اس سے بچنے کے لیے اس کی طرف ہاتھ کرے گا

توہ اس (ہاتھ) کو اپنے منہ میں لے لے گا۔"

فوائد و مسائل : ○ خزانے سے مراد سونا چاندی وغیرہ ہے جس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی گئی۔

○ انسان دنیا میں روپے پیسے کا لالچ کرتا ہے۔ اس کو حاصل کرنے میں حلال حرام کی پروا نہیں کرتا اور لالچ کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں دیتا۔ اس قسم کا مال قیامت کو عذاب کا باعث ہوگا کہ انسان اس سے جان چھڑانا چاہے گا لیکن وہ نہیں چھوڑے گا۔

○ انسان ہاتھ سے مال لیتا ہے لیکن اسی ہاتھ سے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرنا چاہتا' اس لیے ہاتھ کو عذاب ہوگا کہ اس کا خزانہ سانپ بن کر اس کا ہاتھ کاٹ کھائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین۔

جس مال کی زکوٰۃ ادا کردی

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام حضرت خالد بن اسلم رحمتہ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ باہر گیا۔ انہیں ایک بدو ملا' اس نے کہا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ترجمہ : "جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ....." (اس آیت کا کیا مفہوم ہے)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے کہا۔

جس نے اسے جمع کیا اور اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی اس کے لیے تباہی ہے۔ یہ حکم زکوٰۃ کا حکم نازل ہونے سے پہلے تھا جب زکوٰۃ کا حکم نازل ہوگیا تو اللہ نے اسے مالوں کی پاکیزگی کا ذریعہ بنادیا۔ پھر متوجہ ہو کر فرمایا۔

"مجھے پروا نہیں کہ میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو جس کی تعداد (اور مقدار) کا مجھے علم ہو اور اس کی زکوٰۃ ادا کروں اور اس سے اللہ کی فرماں برداری والے کام انجام دوں۔"

فوائد و مسائل : ○ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا دین کے اہم مسائل میں سے ہے۔ یہ حکم زکوٰۃ فرض ہونے سے پہلے بھی تھا' اب بھی ہے لیکن پہلے اس کی کم از کم مقدار کا تعین نہیں کیا گیا تھا' اس کے بعد یہ مقدار بھی متعین کردی گئی۔

○ فرض زکوٰۃ اور دیگر واجب اخراجات کے علاوہ نیکی کی راہ میں خرچ کرنا نفلی عبادت ہے۔

○ زکوٰۃ ادا کرنے سے باقی مال پاک ہوجاتا ہے ورنہ سارا مال ناپاک ہوتا ہے۔

○ جائز طریقے سے دولت مند ہونا اللہ کی طرف سے احسان اور نعمت ہے جس کا شکر ادا کرنے کے لیے ضرورت مند افراد کی مدد کرتے رہنا چاہیے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تو نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کردی تو اپنے فرض سے سبک دوش ہوگیا۔"

چاندی اور سونے کی زکوٰۃ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں نے تمہیں گھوڑوں اور غلاموں کا صدقہ معاف کردیا ہے لیکن (نقدی میں سے) چالیسواں حصہ ادا کرو' یعنی ہر چالیس درہم میں سے ایک درہم۔"

حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر بیس دینار یا (اس سے کچھ) زیادہ' میں سے آدھا دینار اور چالیس دینار میں سے ایک دینار وصول فرماتے تھے۔

فوائد و مسائل : ○ جو گھوڑے کام کاج کے لیے ہوں اور جو غلام خدمت کے لیے ہوں' ان کی زکوٰۃ دینا فرض نہیں لیکن اگر کوئی شخص گھوڑوں یا غلاموں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا ہو تو اسے دوسرے مال تجارت کی طرح ان کی قیمت کا اندازہ کرکے ان کی زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے' اس کے بارے میں متعدد روایات موجود ہیں لیکن ان کی سندوں میں کلام ہے' تاہم کہا جاسکتا ہے کہ یہ احادیث باہم مل کر قابل استدلال ہوسکتی ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ نے بھی تاجروں سے مال تجارت پر زکوٰۃ وصول کرنے کے احکامات جاری فرمائے تھے۔ امام بیہقی رحمتہ اللہ نے مال تجارت پر زکوٰۃ کے وجوب کو ترجیح دیتے ہوئے فرمایا ہے وھذا قول عامتہ اھل العلم "اکثر علماء کا یہی قول ہے۔" ○ درہم چاندی کا سکہ تھا جس کا وزن موجودہ حساب سے 2.975 گرام اور بعض کے نزدیک 3.0[illegible] گرام ہے۔ کم از کم دو سو درہم چاندی ہو تو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ ارشاد نبوی ہے "پانچ اوقیہ سے کم میں زکوٰۃ نہیں۔" اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ اکثر علماء نے دو سو درہم کی مقدار ساڑھے باون تولے بیان کی ہے۔

سونے کا نصاب بیس دینار ہے' جس کی مقدار ساڑھے سات تولے ہوتی ہے۔ جب کہ موجودہ دور کے حساب سے اس کا وزن 85 گرام بنتا ہے۔

سونے اور چاندی میں زکوٰۃ کی مقدار چالیسواں حصہ ہے' مثلاً" اگر کسی کے پاس دس تولے سونا ہو تو اسے چوتھائی تولہ (تین ماشے یعنی 2.916 گرام) سونے کے برابر زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہوگی۔

نقد رقم کا نصاب سونے کے برابر ہے کیونکہ موجودہ نظام کے مطابق کرنسی نوٹ سونے کے قائم مقام قرار دیے جاتے ہیں' اس لیے بین الاقوامی تجارت میں ممالک ایک دوسرے سے سونا وصول اور ادا کرتے ہیں' تاہم علماء کی اکثریت نے نقد رقم کی زکوٰۃ کے لیے چاندی کے نصاب کو [illegible] کم از کم ساڑھے باون تولے چاندی کی رقم [illegible] رقم فالتو پڑی ہو اور اس پر سال گزر جائے تو [illegible] اعشاریہ فی صد کے حساب سے زکوٰۃ [illegible] ایک یہ ہے کہ اس نصاب [illegible] اس طرح اہل [illegible] زکوٰۃ نکلے گی۔

[illegible] کو (سال کے دوران میں) مال ملے

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' وہ فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے۔

"کسی مال میں زکوٰۃ نہیں حتیٰ کہ اس پر سال گزر جائے۔"

فوائد و مسائل : ○ سونے چاندی وغیرہ میں نصاب کا مالک ہونے کے ایک سال بعد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ ○ زرعی پیداوار جب باغ یا کھیت سے اٹھالی جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے' اس میں سال گزرنا شرط نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اس کے کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو۔" [illegible] اس کے پاس پہلے کچھ مال موجود ہو لیکن وہ نصاب سے کم ہو' پھر اسے کچھ اور مال مل جائے اس کی وجہ سے نصاب مکمل ہوجائے تو سال کی ابتدا نصاب مکمل ہونے سے ہوگی۔ اگر اس کے ایک سال بعد اس کے پاس نصاب موجود ہے تو زکوٰۃ ادا کرے گا۔

کن مالوں میں زکوٰۃ واجب ہے

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمان سنا۔

"پانچ وسق کھجوروں سے کم میں زکوٰۃ نہیں' پانچ اوقیہ (چاندی) سے کم میں زکوٰۃ نہیں اور پانچ سے کم اونٹوں میں بھی نہیں۔"

بھی نہیں۔"

فوائد و مسائل : ○ کھجوریں جب خشک کرکے ذخیرہ کرنے کے قابل ہوجائیں' اس وقت اگر ان کا وزن پانچ وسق کے برابر ہو تو ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ ایک وسق ساٹھ صاع کے برابر ہوتا ہے اور صاع ایک پیمانہ ہے جس کا وزن تقریباً" ڈھائی کلو بنتا ہے۔ اس حساب سے پانچ وسق کا وزن تقریباً" 20 من بنتا ہے' جس میں سے ایک من زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ ○ پانچ اوقیہ دو سو درہم کے برابر ہے یعنی چاندی کا نصاب دو سو درہم تقریباً" ساڑھے باون تولے ہے۔ ○ اگر کسی کے پاس پانچ سے کم اونٹ ہوں تو ان میں زکوٰۃ فرض نہیں۔ پانچ اونٹ ہوں تو ایک بکری زکوٰۃ کے طور پر ادا کی جائے گی۔ اونٹوں کی زکوٰۃ کی مزید تفصیل باب 9 میں آئے گی۔

زکوٰۃ کا وقت آنے سے پہلے (پیشگی) ادا کردینا

حضرت علی بن ابوطالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے واجب ہونے سے پہلے جلدی کرتے ہوئے زکوٰۃ ادا کرنے کی اجازت مانگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت دے دی۔

فائدہ : پیشگی ادائیگی کا مطلب یہ ہے کہ سال پورا ہونے سے پہلے زکوٰۃ ادا کردی جائے۔ وقت آنے پر حساب کرکے کمی بیشی پوری کرلی جائے۔ یہ جائز ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک یہ روایت حسن ہے۔

جب کوئی زکوٰۃ ادا کرے تو اسے کیا کہا جائے؟

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

روایت ہے' انہوں نے فرمایا "جب کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے مال کا صدقہ (زکوٰۃ) لے کر حاضر ہوتا تو نبی کریمؐ اس کو دعا دیتے۔ میں اپنے مال کی زکوٰۃ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے اللہ! ابو اوفیٰ کے خاندان پر رحمت نازل فرما۔"

فوائد و مسائل : ○ سونے چاندی اور نقدی کی زکوٰۃ صاحب نصاب کو خود حاضر ہو کر ادا کرنی چاہیے۔ غلے اور مویشیوں کی زکوٰۃ اسلامی حکومت کا مقرر کردہ افسر صاحب نصاب کے پاس پہنچ کر وصول کرے۔ ○ اسلامی معاشرے میں عوام اور حکومت کے مابین محبت اور احترام کا تعلق ہوتا ہے۔ زکوٰۃ وصول کرنے والے کو چاہیے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والے کا شکریہ ادا کرے اور اسے دعا دے۔ ○ "آل" کے لفظ میں وہ شخص خود بھی داخل ہوتا ہے جس کی آل کا ذکر کیا جاتا ہے' اس کے علاوہ اس کی اولاد اور وہ افراد جو اس کے زیرِ دست ہیں اور وہ ان کا سردار سمجھا جاتا ہے' وہ بھی "آل" میں شامل ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات "آل" سے متبعین اور پیروکار بھی مراد لیے جاتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ترجمہ :

"اور جس دن قیامت قائم ہوگی (ہم کہیں گے) فرعون کی آل کو شدید ترین عذاب میں داخل کر دو (المومن)۔" اس آیت میں آل سے اولاد مراد نہیں کیونکہ فرعون لاولد تھا۔ اور اس کی بیوی (حضرت آسیہ علیہ السلام) مسلمان تھیں۔

زکوٰۃ وصول کرنے والے ملازمین کے مسائل

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"زکوٰۃ کے معاملے میں زیادتی کرنے والا زکوٰۃ روک لینے والے کی طرح ہے۔"

فوائد و مسائل : ○ زکوٰۃ کے معاملے میں زیادتی کرنے والے سے مراد زکوٰۃ وصول کرنے والا وہ اہل کار ہے جو شرعی طور پر مقررہ مقدار سے زیادہ زکوٰۃ طلب کرتا ہے' یا درمیانے درجے کے جانور وصول کرنے کے بجائے بہترین جانور طلب کرتا ہے۔ ○ ایسا اہل کار اسی طرح گناہ گار ہے جس طرح وہ شخص گناہ گار ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہو اور وہ ادائیگی سے انکار کر دے' یعنی یہ کبیرہ گناہ ہے۔ ○ اس شخص کو زکوٰۃ نہ دینے والے سے اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کہ اس کی زیادتی کی وجہ سے لوگوں میں زکوٰۃ نہ دینے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور وہ حیلے بہانوں سے زکوٰۃ روک لیتے ہیں۔ ○ زکوٰۃ کے معاملے میں زیادتی کرنے والے سے مراد وہ شخص بھی ہو سکتا ہے جو زکوٰۃ یا صدقات غیر مستحق افراد کو دیتا ہے' لیکن وہ شخص اس صورت میں خطاکار سمجھا جائے گا جب اسے معلوم ہو کہ جس شخص کو زکوٰۃ دی جا رہی ہے' وہ حقیقت میں اس کا مستحق نہیں۔

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے تھے۔

"حق کے ساتھ زکوٰۃ وصول کرنے والا' اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والے کی طرح ہے حتیٰ کہ گھر واپس آ جائے۔"

فوائد و مسائل : ○ حق کے ساتھ زکوٰۃ وصول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اتنی مقدار وصول کرے جتنے شرعاً کسی پر واجب ہیں۔ نہ زیادہ طلب کر کے زکوٰۃ دینے والوں پر ظلم کرے اور نہ کم وصول کر کے مستحقین کی حق تلفی کا باعث بنے۔ ○ اسلامی سلطنت میں ایمانداری سے سرکاری ملازمت کے فرائض انجام دینا' اسلام اور اسلامی سلطنت کی خدمت ہے۔ ○ مجاہد اسلامی سلطنت کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے تگ و دو کرتا ہے اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے۔ اسی طرح مالی معاملات کے فرائض انجام دینے والا بھی سلطنت کی معاشی سرحدوں کی حفاظت کر کے اسے مضبوط بناتا ہے جس کی وجہ سے دشمن حملہ کرنے کی جرات نہیں کرتا' اس لحاظ سے اس کے فرائض بھی کچھ کم اہم نہیں۔ ○ اپنے فرائض دیانت داری سے انجام دینا بڑے ثواب کا کام ہے۔

خیانت

حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زکوٰۃ کے مسئلہ پر ان کی بات چیت ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ "کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زکوٰۃ میں خیانت کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرماتے نہیں سنا۔

"جو کوئی اس میں سے ایک اونٹ یا ایک بکری کی خیانت کرے گا' قیامت کے دن اسے اپنے اوپر لادے ہوئے حاضر ہو گا؟"

حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ "ہاں۔" (سنی ہے۔)

فوائد و مسائل : ○ اجتماعی معاملات میں خیانت بہت بڑا جرم ہے۔ جن افراد کے ہاتھ میں مسجد' مدرسہ یا صوبے اور ملک کے مالی معاملات ہوں' انہیں اس ذمے داری کا احساس رکھنا چاہیے۔ ○ زکوٰۃ کی خیانت سے مراد یہ بھی ممکن ہے کہ صاحب مال اپنا پورا مال ظاہر نہ کرے' اس طرح واجب مقدار سے کم زکوٰۃ دے۔ اس طرح چرائی ہوئی ایک بکری یا ایک اونٹ بھی قیامت کے دن سخت عذاب کا باعث ہو گا۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے والا پورا مال بیت المال میں جمع نہ کرائے' یا اسے جائز مصرف کے علاوہ اپنی کسی ضرورت کے لیے خرچ کرے تو اسے بھی اس جرم کی سخت سزا ملے گی۔

حضرت ابراہیم بن عطاء اپنے والد عطاء بن ابو میمونہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زکوٰۃ وصول کرنے پر مقرر کیا گیا۔ جب وہ (اپنے فرائض انجام دینے کے بعد) واپس (مدینہ) آئے تو انہیں کہا گیا۔

"مال کہاں ہے؟"

انہوں نے فرمایا۔ "کیا آپ نے مجھے مال لانے کے لیے بھیجا تھا؟ ہم نے وہیں سے وصول کیا جہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وصول کیا کرتے تھے' اور وہیں دے دیا جہاں (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں) دیا کرتے تھے۔"

فوائد و مسائل : ○ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشہور صحابی ہیں' جو غزوہ خیبر کے سال اسلام لائے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں بصرہ بھیج دیا تھا تاکہ لوگوں کو دین کی تعلیم دیں۔ ○ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ بات چیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوئی' وہ انہی کے حکم سے بصرہ گئے تھے۔ ○ زکوٰۃ کے زیادہ مستحق اس علاقے کے غریب لوگ ہیں' جہاں سے زکوٰۃ وصول کی گئی۔ ○ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اور سنت پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ ○ حضرت عمران رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ خدمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں بھی انجام دی تھی۔ ○ حضرت عمران رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ خدمت زمانہ نبویؐ سے زمانہ فاروقی تک مسلسل انجام دی' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص صحیح طور پر فرائض انجام دے رہا ہو تو بلاوجہ اس کا تبادلہ نہیں کرنا چاہیے' البتہ کوئی معقول وجہ موجود ہو تو تبادلہ کرنے میں حرج بھی نہیں۔

فائدہ : معافی اللہ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ترجمہ :

"پیغمبر اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے۔ وہ تو وحی ہے جو (ان پر) نازل کی جاتی ہے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم بحیثیت حاکم کے جاری فرماتے تھے۔

کن مالوں میں زکوٰۃ واجب ہے؟

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں (گورنر بنا کر) یمن روانہ کیا اور ان سے فرمایا۔

"غلے میں سے غلہ وصول کرنا' بکریوں سے بکری' اونٹوں میں سے اونٹ' اور گایوں میں سے گائے۔"

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پانچ چیزوں کی زکوٰۃ کا حکم جاری فرمایا ہے۔ گندم' جو' کھجور' منقیٰ اور مکئی۔



اندر کیا ہے؟ کچھ نہیں

ابنِ انشا جی

نیویارک کی خبر ہے کہ وہاں ایک کتاب چھپی اور مہینے بھر میں اس کی پچیس ہزار جلدیں فروخت ہو گئیں۔ ایک سو ساٹھ صفحے کی اس کتاب کی قیمت تین ڈالر ہے۔

یعنی تیس روپے' مشتاقوں کا ہجوم ایسا ہے کہ پبلشر اس کے دوسرے ایڈیشن کی فکر کر رہے ہیں۔

اور اس کتاب کے اندر کیا ہے' کچھ نہیں' سادہ اوراق میں' تحریر نہیں کوئی' تصویر نہیں کوئی۔

☼ ☼ ☼

ہمارے لیے اس خبر میں کوئی نئی بات نہیں' ہم نے کئی کتابیں پڑھی ہیں جن میں کچھ نہیں ہوتا' آخر میں کچھ ہاتھ نہیں آتا اور ایسی تو بہت ہیں کہ تین چوتھائی سے زیادہ خالی ہوتی ہیں' کسی میں پلاٹ نہیں ہوتا' کسی میں کردار نگاری نہیں ہوتی' کسی میں آغاز نہیں ہوتا' کسی میں انجام نہیں ہوتا' شاعری کی کتاب ہو تو اکثر وزن نہیں ہوتا۔

اور وزن ہو تو اس میں معنی نہیں ہوتے اور اگر وزن اور معنی دونوں ہوں تو شاعری نہیں ہوتی۔ قصے' کہانیوں اور شاعری کی تخصیص نہیں اور بہت سے مضامین کی کتابیں ہم نے اندر سے خالی دیکھی ہیں۔ ان کا مطالعہ استاد ذوق کے قصیدے کے اس شعر کی مثال ہے۔

رات بھر ٹھونگا کیا ' انجم کے دانے چرخ پیر
صبح دم دیکھا تو واں اصلا شکم میں کچھ نہ تھا

☼ ☼ ☼

اتنا البتہ ہے کہ ہماری ان کتابوں کے ورق سادہ نہیں ہوتے۔ نیویارک والی اس کتاب میں ورق سادہ چھوڑ دیے گئے ہیں اور شاید یہی اس کی مقبولیت کی وجہ ہے۔ یوں تو تحریر کی کبھی کوئی قیمت نہیں رہی۔ آپ سادے کاغذ کا ریم بازار میں جا کر بیچیے' پھر چھپے ہوئے اخبار کا ریم لے جائیے اور فرق دیکھ لیجیے' خواہ اس میں ہمارا کالم ہی کیوں نہ چھپا ہو' جس میں بے شمار قیمتی بلکہ انمول اور زریں اقوال اور بے بہا اشعار ہوتے ہیں' ڈیڑھ دو روپے سیر سے زیادہ قیمت نہ پائے گا۔ سادگی کی قدر کا یہ حال ہے کہ پرانے شاعر سادہ رویوں پہ مرا کرتے تھے' جس کے چہرے پر کوئی تحریر ہو' خط وغیرہ' اس کی قدر گر جاتی تھی۔ محبوبوں تک کو اپنے مصحف رخ ہدیہ کرنے پڑتے تھے' دام دے کر خریدتا کوئی نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

کتاب کو اندر سے سادہ رکھنے میں کئی خوبیاں ہیں۔ پبلشر کا تو یہ ہے کہ کتابت بچتی ہے' طباعت یعنی چھپائی کی سیاہی بچتی ہے اور مصنف یعنی مضمون تک بچتا ہے' اچھی خاصی کتاب محض پبلشر اور جلد ساز کے تعاون سے تیار ہو جاتی ہے' معاشرے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے گمراہ نہیں ہوتے' بے راہ روی نہیں پھیلتی' اس میں سرمایہ داری کی حمایت نہیں ہوتی' سامراج کی وکالت نہیں ہوتی' عریانی نہیں ہوتی' ابہام نہیں ہوتا' جہالت نہیں ہوتی' چرب زبانی نہیں ہوتی' تعصب نہیں ہوتا' غلط بیانی نہیں ہوتی' کچھ بھی تو نہیں ہوتا' پھر ایسی کتاب یا کتابیں پڑھنے والے کی نظر خراب نہیں ہوتی' اسے عینک نہیں خریدنی پڑتی' اس سے کوئی ادھار نہیں مانگتا' ایک سو ساٹھ صفحے کی کتاب تیس روپے میں اتنی خوبیوں کے ساتھ قطعی مہنگی نہیں' کم از کم ہمیں مہنگی معلوم نہیں

ہوتی۔

☼ ☼ ☼

بین الاقوامی بھائی چارے کے فروغ میں بھی یہ کتابیں بہت کام آ سکتی ہیں' ان کو دنیا میں ہر کوئی پڑھ سکتا ہے' ہر جگہ مقبول ہوں گی' اس سے خواندگی اور ناخواندگی کا مسئلہ بھی خوش اسلوبی سے حل ہو جائے گا' کیونکہ کتابوں کو ناخواندہ لوگ نہیں پڑھ سکتے' ان سے محظوظ نہیں ہو سکتے' خواندہ لوگوں کی حد تک بھی یہ دقت ہے کہ جو انگریزی پڑھا ہے' وہ عربی کتاب نہیں پڑھ سکتا اور عربی خواں کے لیے جاپانی زبان میں چھپی ہوئی کتاب بے معنی ہے' آنکھیں جھپکتا رہ جائے گا۔

اگر یونیسکو جو خود بھی تکلیف اٹھاتی ہے' ہمیں بھی تکلیف دیتی ہے' اس قسم کی کتابوں کو رواج دے تو ہماری پبلشنگ کی صنعت بڑی ترقی کر سکتی ہے اور قارئین کا معیار بھی بلند ہو جائے گا' وہ چھپی ہوئی گھٹیا کتابیں نہ پڑھیں گے' تو ضرور بلند ہو جائے گا۔

☼ ☼ ☼

ہمارے ملک میں بھی اس قسم کی کتابوں کا رواج ہونا چاہیے' اس کے انگریزی یا امریکی زبان سے ترجمہ کرنے میں بھی کچھ دقت نہیں' کیونکہ اس کے اندر کچھ ہے نہیں ترجمہ کرنے کو' اس کی پروف ریڈنگ بھی آسان ہے کیونکہ اس کے اندر کوئی تحریر نہیں' جس کے ہجے غلط ہو سکیں' اس کو سمجھنے کے لیے کوئی خلاصہ بھی نہیں چاہیے' کوئی استاد بھی درکار نہیں' کوئی مضمون ہو تو خلاصہ ہو' خلاصہ کا خلاصہ کیا معنی؟

☼ ☼ ☼

جن لوگوں کو مطالعے کی عادت نہیں' ان میں مطالعے کو فروغ دینے کے لیے بھی یہ نسخہ اچھا ہے' لوگ مطالعے سے نہیں بھاگتے' صرف تحریر سے بھاگتے ہیں' سفید کورے کاغذ سے کوئی نہیں بھاگتا' ویسے تو یہ بات کوئی کتاب سے خاص نہیں' پرانی مثل ہے' تھوتھا چنا باجے گھنا' جتنا کوئی برتن خالی ہو گا' اتنی ہی اس میں سے اچھی آواز آئے گی۔ آپ کے آس پاس جتنے مقبول عام آدمی ہیں' لوگ جن کے آگے پیچھے پھرتے ہیں' کبھی ان کے اندر جھانک کے دیکھیے' خالی ہوں گے' بالکل خالی۔ پس اگر ایک خالی کتاب کی اتنی قدر ہو رہی ہے کہ مہینے بھر میں دوسرا ایڈیشن نکل رہا ہے' جبکہ ادب عالیہ کی کتاب کے ایک ہزار نسخے نکلنے میں پانچ سال لگ جاتے ہیں تو کچھ تعجب نہ ہونا چاہیے' نظیر اکبر آبادی نے جو بات کورے برتن کے لیے لکھی ہے' کورے کاغذ کے لیے بھی کہہ سکتے ہیں۔

تازگی ذہن کی تری تن کی
واہ کیا بات کورے کاغذ کی

☼ ☼ ☼

دور کیوں جائیے' یہ ہمارا کالم ہی ہے' کیا اخبار خریدنے والے سب ہی لوگوں نے پڑھا ہو گا' آپ بھی مارے باندھے ان سطور تک پہنچے ہوں گے' حالانکہ دیکھیے ہم اس میں کیا کیا مضمون کھینچ کر لائے' کیا کیا نکتے پیدا کیے ہیں' اگر اس کی جگہ خالی چھوڑ دی جاتی تو سب پڑھتے' یعنی سب کی نظر سے گزرتی' آئندہ ہم اپنی کتابیں بھی سادہ ہی بازار میں لایا کریں گے' ان کے اندر کچھ چھاپ کر ان کو خراب نہیں کیا کریں گے' لوگ چاہیں ان میں حکمت کے نسخے لکھیں' پسندیدہ اشعار لکھیں' فلمی گانے لکھیں' محبوبوں کے نام اور ٹیلی فون نمبر لکھیں یا کچھ بھی نہ لکھیں' کبھی بچے کی ناک پونچھنی ہو تو اس میں سے ورق پھاڑ سکتے ہیں' ہم اس میں ایسا کاغذ لگائیں گے جو اس مقصد کے لیے موزوں ہو' رومال کا کام دے سکے' قیمت بھی تیس روپے سے کم رکھیں گے کیونکہ ہمارا ملک مقابلتاً غریب ہے۔

☼



ڈوب رہی ہے زندگی

اُمِ ثمامہ

کہتے ہیں پانی کی اپنی کوئی شکل نہیں ہوتی اسے جس سانچے میں ڈھالا جائے وہ ڈھل جاتا ہے۔ کبھی یہ صحرا میں زندگی کے پھول بانٹتا ہے اور کبھی اپنی تیزی اور سفاکی سے دربدری، بھوک، دکھ اور موت کے تیر کو ہنستی مسکراتی زندگی کی شہ رگ میں پیوست کر دیتا ہے۔

پانی سفاکی پر آجائے تو کچھ نہیں دیکھتا اور اس دفعہ پانی نے واقعی کچھ نہیں دیکھا، نہ سفید بال اور جھریوں سے بھرے بزرگ چہرے، نہ اجرک کاندھوں پر ڈالے سر پر سندھی ٹوپی سجائے سندھ دھرتی کے کڑیل جوان، نہ اوڑھنیوں میں خود کو چھپاتی سندھ دھرتی کی الہڑ مٹیاریں، نہ سونے چاندی سی لہلہاتی فصلیں..... یہ آزمائش ہے یا پھر ہمارے نامہ اعمال کا نتیجہ، پھر حکومتی لاپروائی بے حسی یا کچھ اور..... یہ میں نے جو لکھا ہے حقیقت اس سے بھی کہیں زیادہ ہولناک اور دردناک ہے۔

پانی میں ڈوبتی، سسکتی، اندھیرے کے ڈر کو اوڑھے ہوئے لب سڑک گزرتی زندگی اس قدر المناک ہے کہ شاید پڑھنے والے اس کی تاب نہ لا سکیں۔ لیکن اس حقیقت کا سامنا کرنا ہی ہوگا جس سے آج کل سندھ کے 80 فیصد عوام گزر رہے ہیں۔ آج اگر ہم دوسروں کے دکھ کو اپنے دل پر بوجھ نہ سمجھیں گے تو کل کوئی ہمارے آنسو پونچھنے والا بھی نہیں ہوگا.....

"دھی رانی! یہ مانی ٹکر لے آئی ہوں بڑی مشکل سے تیرے لیے لائی ہوں۔" رحیماں ننھی ماروی کی منتیں کر رہی تھی۔

"اماں! میں مانی نہیں کھاؤں گی۔ میں تم سے بات نہیں کروں گی تم نے بوڈ (سیلاب) میں میری پیاری گڈی کو کیوں نہیں بچایا، وہ پانی کے زور میں بہہ گئی۔ اماں! تم کو پتا تھا ناں کہ چار دن بعد اللہ وسائی کے گڈے سے میری گڈی کی شادی تھی۔"

اب وہ ماروی کو کیا جواب دیتی کہ بوڈ (سیلاب) میں کتنی ماؤں کی جیتی جاگتی گڑیاں اور گڈے بہہ گئے۔

ایسے مناظر اگر آپ ضلع میرپور خاص، بدین، سانگھڑ، عمرکوٹ کی طرف سفر کریں تو جا بجا سڑکوں پر بنی ان خیمہ بستیوں میں نظر آئیں گے جہاں لوگ جانوروں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ جو کبھی باعزت طریقے سے اپنے گھروں میں رہتے تھے، انہوں نے یہ کبھی سوچا تھا کہ انہیں مانگ کر کھانا پڑے گا.....؟ ان کی باپردہ عورتیں ننگے سر کھلے آسمان تلے پڑی ہوں گی۔ ان کے بچے امداد لے کر آنے والی گاڑیوں کے نیچے آ کر کچلے جائیں گے۔ وقت کب کس کو کیا دکھائے، یہ کاتب تقدیر کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ یہ منہ زور سفاک پانی غریبوں کی بستیاں اجاڑنے کے بعد امیروں کے بیڈ رومز اور ڈرائنگ رومز تک بھی تو رسائی حاصل کر سکتا ہے مگر ہم یہ سب سوچتے ہی نہیں ہیں۔

ہر بار کی طرح وہی حکومتی اداروں کی لاپروائی، وہی ہیلی کاپٹروں سے فضائی معائنے، امداد کے تھیلے پکڑاتے ہوئے کھنچتی تصویریں، وہی غریب عوام کا ڈوبتا مال و اسباب، وہی کمیوں کی دربدری اور وہی نیوز چینل کی ہاہاکار اور پھر اک گہری خاموشی.....

اگر ہم حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیں تو ہمیں یہ ادراک ہوگا کہ یہ سارا ستم بارشوں کا نہیں اس میں [illegible] کی کرم فرمائیاں بھی ہیں۔ وڈیروں کی [illegible] روکے جانے والا پانی انہوں [illegible] امیروں کی زرعی اراضی [illegible].....

ہمارا شہر بھی سندھ [illegible] متاثر ہوا ہے۔ جس دن ہم وہاں سے [illegible] خالی ہو چکا تھا اور جھڈو کا زمینی رابطہ فقط ایک ٹوٹی ہوئی سڑک کا ٹکڑا تھا جس پر تیز بہاؤ کے ساتھ کئی فٹ پانی رواں دواں تھا۔

ہم کشتیوں میں سوار ہو کر ٹنڈو باگو پہنچے۔ وہاں میرے بھائی جان اور بھانجا گاڑی لے کر ہمیں لینے آئے ہوئے تھے۔ سات گھنٹے کا سفر کر کے ہم رات ایک بجے میرپور خاص پہنچے حالانکہ جھڈو سے میرپور خاص کا راستہ فقط ڈیڑھ گھنٹے کا ہے۔ اس تمام عرصے میں میری بہنوں، بھائیوں اور امی کی حالت کافی خراب رہی اور وہ ہمارے خیریت سے پہنچنے کے لیے دعائیں کرتے رہے۔

رستے میں ہم نے ایسے ایسے لوگوں کی عورتوں کو ٹریکٹر ٹرالی میں سفر کرتے دیکھا، جنھوں نے کبھی کاروں سے نیچے پیر نہیں رکھا تھا۔

میرے شوہر ابھی تک وہیں ہیں کہ شہر کے خالی ہوتے ہی لوٹ مار ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے ہر گھر کا ایک فرد رکھوالی کے لیے وہیں رک گیا۔ اس عارضی جدائی کی اذیت اور پریشانی کو لفظوں میں بیان کرنا، میرے قلم کے بس کی بات نہیں ہے۔

جھڈو اور دیگر چھوٹے شہروں میں سترہ دن سے لائٹ نہیں ہے۔ ٹیلی فونک سسٹم نہیں ہے اور واحد سڑک بھی ٹوٹ چکی ہے۔ ہم کن مشکلات سے پانی کے اس منہ زور دریا کو عبور کر کے آئے اور رستے میں پانی کی من مانی اور غریب عوام کی بے بسی کے جو جو مناظر دیکھے، وہ لکھنے بیٹھوں تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ میری بہت ساری شاعری اور کچھ کہانیاں سیلاب کے پانی میں ڈوب کر مٹ گئیں مگر یہ نقصان لوگوں کے مالی اور جانی نقصان سے کہیں کم ہے۔

متاثرہ علاقوں میں پاک آرمی اور جماعت الدعوۃ کے رضاکار کام کر رہے ہیں اور لٹے پٹے لوگوں سے دعائیں وصول کر رہے ہیں۔

میری قارئین سے گزارش ہے کہ وہ جہاں کہیں ہیں اپنی بساط کے مطابق ان لوگوں کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کریں، پانی جن کا سب کچھ بہا کر لے گیا ہے۔ ہم کب تک ٹی وی پر رپورٹ دیکھ کر افسوس بھرے جملے بولتے رہیں گے، کب تک کمیٹیاں بناتے رہیں گے اور چندے جمع کرتے رہیں گے۔

ہر فرد اپنی اپنی بساط کے مطابق عملاً "اپنا حصہ" ڈالے تو حالات کچھ حد تک سدھر جائیں گے اگر ہم اپنی کاوش سے ننھے ننھے دیے جلائیں تو اندھیرا ضرور ختم ہوگا اور پانی میں ڈوبے لوگوں کی زندگی میں امید کا روشن سویرا ضرور نمودار ہوگا۔

اس مشکل گھڑی میں خدائے بزرگ و برتر سے دعا کیجیے اور خدارا پھٹی ہوئی چادروں اور رلیوں سے بنے خیموں پر کھڑے ہو کر اپنی سیاست نہ چمکائیے کہ یہ خوف خدا کا وقت ہے۔ یہ اجتماعی دعا کا وقت ہے!!!

☆

باتیں رِدا اصفہانی سے

شاہین رشید



1 اصلی نام؟
"مریم رضا اصفہانی۔"

2 پیار کا نام؟
"امی مانو بولتی ہیں کوئی ردو بولتا ہے۔ کافی نام ہیں پیار کے۔"

3 تاریخ پیدائش/ شہر/ ستارہ؟
"26 ستمبر 1992ء کراچی/ Libra (میزان)"

4 تعلیمی قابلیت؟
"بی کام (تھرڈ ایر)۔"

5 بہن بھائی/ آپ کا نمبر؟
"دو بھائی اور میں/ ایک بھائی بڑا ہے 'ایک چھوٹا۔"

6 شادی کب کرنی ہے؟
"ابھی دور دور تک کوئی ارادہ نہیں۔"

7 شوبز میں آمد؟
"گھر والوں کی مرضی سے آئی ہوں۔ امی ابو دونوں اس فیلڈ سے ہیں۔"

8 پہلا پروگرام؟
"ڈرامہ سیریل روگ۔"

9 پہلی کمائی اور کہاں خرچ کی؟
"ایک دن کا ڈھائی ہزار "روگ" میں ملا تھا اور کپڑے بنوائے تھے۔"

10 صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟
"کہ دوبارہ سو جاؤں اور کوئی اٹھائے نہیں۔"

11 اپنے چہرے کے نقش و نگار میں کیا پسند ہے؟
"آنکھیں۔"

12 گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟
"گھر کے ہر کونے میں سکون ملتا ہے۔"

13 شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟
"صبر والی ہوں۔ انتظار کر لیتی ہوں۔"

14 غصے کی تیز ہیں یا؟
"میں بہت امن پسند ہوں۔ البتہ میرے کچھ اصول ہیں اس کی کوئی خلاف ورزی کرے تو مجھے غصہ آتا ہے۔"

15 اپنے مسائل کس سے شیئر کرتی ہیں؟
"امی سے کیونکہ میری کوئی بہن نہیں ہے تو وہ ہی میری ماں بھی ہیں اور بہن بھی ہیں۔"

16 کوئی گہری نیند سے اٹھا دے؟
"اف..... بہت غصہ آتا ہے۔ خواہ سامنے امی ہی کیوں نہ ہوں۔"

17 پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا بات نوٹ کرتی ہیں؟
"بات کرنے کا اسٹائل اور باڈی لینگویج۔"

18 آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
"کہ میں آئینہ دیکھ کر اپنا وقت ضائع کر رہی ہوں۔"

19 کیا آپ اپنی مرضی سے زندگی گزار رہی ہیں؟
"الحمدللہ سو فیصد اپنی مرضی سے زندگی گزار رہی ہوں۔"

20 اپنے آپ کو کب بے بس محسوس کرتی ہیں؟
"جب کوئی میری بات نہ سنے تو۔"

21 زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟
"رشتے داروں کے لیے اور دوستوں سے ملنے کے لیے۔"

22 کوئی کردار جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟
"نفسیاتی مریضہ کا۔"

23 آپ کے لیے کون جان قربان کر سکتا ہے؟
"ارے اتنے سارے ہیں۔ کس کس کا نام لوں۔"

24 اگر دعا سے کوئی مل سکتا تو کس کو مانگتیں؟
"ایک ڈاکٹر صاحب ہیں عذرا اصفہانی 'انہیں مانگتی۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔"

25 جب آپ پہلی مرتبہ نیا قلم استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی ہیں؟
"اپنا نام۔"

26 کوئی غلطی جس کو سوچ کر شرمندگی یا ندامت محسوس کرتی ہیں؟
"جب اپنے گھر والوں سے بدتمیزی کرتی ہوں۔"

27 کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟
"ہاں کئی مرتبہ 'پہلا کام ہی یہی ہوتا ہے۔ پھر سب مناتے ہیں کھانا کھا لو دودھ پی لو۔"

28 کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟
"صرف اپنی امی کے ہاتھ کا 'ان سے اچھا کھانا پوری دنیا میں کوئی نہیں بنا سکتا۔"

29 پسندیدہ کھانا/ ناشتہ؟
"امی کے ہاتھ کی بریانی/ ناشتے میں پنیر والے سینڈوچ اور اگر بخار ہو تو چائے پاپا۔"

30 موڈ کب خراب ہوتا ہے؟
"کبھی بھی خراب ہو سکتا ہے۔ کسی بھی وجہ سے۔"

31 کس بات سے ڈرتی ہیں؟
"قبر کے عذاب سے۔"

32 پسندیدہ چینل؟
"اے آر وائی ڈیجیٹل 'میرے زیادہ تر ڈرامے اس چینل سے آتے ہیں۔"

33 بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے۔ لڑکے یا لڑکیاں؟
"دونوں میں سے کوئی بھی نہیں۔"

34 کیا دعا سے قسمت بدل سکتی ہے؟
"بالکل جی..... ہر چیز بدل سکتی ہے۔"

35 اپنی شخصیت میں کیا تبدیلی لانا چاہتی ہیں؟
"ٹھہراؤ لانا چاہتی ہوں۔"

36 قسمت پہ کتنا یقین ہے؟
"بہت زیادہ..... بلکہ سو فیصد۔"

37 لوگ آپ کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟

"اچھا ہی سوچتے ہوں گے۔ کیونکہ جب میں کسی کے ساتھ برا نہیں ہوں تو کوئی میرے ساتھ کیوں برا ہوگا۔"

38 کبھی چھٹی حس ایکٹو ہوئی؟

"بہت، مجھے خواب بہت آتے ہیں اور پہلے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔"

39 گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟

"ٹھنڈا پانی مل جائے اور میرا چھوٹا بھائی میرا بہت خیال کرتا ہے۔"

40 موت سے ڈر لگتا ہے؟

"موت سے ڈر نہیں لگتا وہ برحق ہے۔ بس ایمان پر آئے، یہ دعا کرتی ہوں۔"

41 کون سی تقریبات میں جانا پسند نہیں؟

"شوبز کی پارٹیز میں جانا پسند نہیں۔"

42 سائنس کی بہترین ایجاد؟

"موبائل فون۔"

43 جھوٹ کب بولتی ہیں؟

"کوشش کرتی ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں۔"

44 کن کے سامنے جھوٹ بولنا مشکل ہے؟

"اپنے والدین کے آگے۔ کیونکہ وہ مجھ پر بہت بھروسہ کرتے ہیں۔"

45 تہوار جو شوق سے مناتی ہیں؟

"سارے تہوار شوق سے مناتی ہوں۔ تیار ہو کر سیلیبریٹ کرنے کا بہت شوق ہے۔"

46 شوبز کی سب سے بڑی برائی؟

"ابھی تک تو سب کچھ اچھا ہی نظر آ رہا ہے۔"

47 چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟

"سو کر بہت دیر سے اٹھتی ہوں پھر امی سے ناشتہ مانگتی ہوں اور پھر کہیں باہر امی کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔"

48 شہرت کیسی لگ رہی ہے؟

"بہت اچھی لگ رہی ہے اور اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔"

49 زندگی کب بری لگتی ہے؟

"جب اپنے آپ سے کچھ سوچ کر رونے لگتی ہوں۔ مگر پھر دوسروں سے ڈسکس کرتی ہوں تو ٹھیک ہو جاتی ہوں۔"

50 کوئی سوال جو برا لگتا ہے؟

"اگر شوبز کا کوئی بندہ کہے کہ شوبز میں کیسے آئیں۔"

51 کوئی لڑکا [illegible] کھورے تو؟

"تو میں بھی گھور کے دیکھتی ہوں۔"

52 سارا دن میں پسندیدہ وقت؟

"شام پانچ بجے..... یہ وقت بچپن سے اچھا لگتا ہے۔ صبح پانچ بجے کے بعد کی روشنی اور شام کا وقت بہت اچھا لگتا ہے۔"

53 کب چیخنے چلانے کو دل چاہتا ہے؟

"اگر مجھے شک بھی ہو جائے کہ کوئی مجھ پر شک کر رہا ہے تو۔"

54 کس لمحے نے زندگی بدل دی؟

"بہت سارے لمحات ہیں۔ لیکن شاید عام سے خاص ہونے نے۔"

55 نصیحت جو بری لگتی ہے؟

"اگلے گھر جا کر کیا کرو گی۔ جوتے پڑیں گے۔"

56 غصہ کب آتا ہے / ردعمل کیا ہوتا ہے؟

"غصہ تب آتا ہے جب کوئی غلط بات کرے / پہلے نرمی سے بات کرتی ہوں مگر سامنے والا جھوٹ بولے تو پھر سنا دیتی ہوں۔"

57 فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟

"جتنے ہاتھ میں آجائیں۔"

58 کن باتوں پہ کنٹرول نہیں ہے؟

"اپنے رونے پر اور اپنے ہنسنے پر۔"

59 کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟

"نہیں، بار بار ہوتی ہے۔ پھر ختم بھی ہو جاتی ہے جب آپ کا موڈ ہو، محبت ہو جاتی ہے۔"

60 کبھی مانگ کر تحفہ لیا؟

"مجھے تحفے دینا اچھا لگتا ہے اور وہ تحفہ ہی کیا جو مانگ کر لیا جائے۔"

61 کیا اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟

"جی ہاں..... فوراً۔"

62 اپنا موبائل نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکی ہیں؟

"پانچ، چھ مرتبہ تبدیل کر چکی ہوں۔ بس موڈ کی وجہ سے۔"

63 لوکل سفر کس پہ کرتی ہیں۔ بس میں، رکشے میں یا اپنی کار میں؟

"مجھے رکشا بہت پسند ہے۔"

64 کوئی انوکھی خواہش؟

"انوکھی تو نہیں ہے۔ بس خواہش ہے کہ ایک چیریٹی اسپتال بنواؤں اپنی زندگی میں۔"

65 گھر والوں کی کس بات پہ موڈ آف ہو جاتا ہے؟

"اگر کوئی ایک بات کو بار بار بولے تو۔"

66 کن چیزوں پر بہت خرچ کرتی ہیں؟

"اللہ کی راہ پر..... اپنے چھوٹے بھائی پر اور اگر کسی نے کوئی فرمائش کر دی تو اس پر۔"

67 فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کر کن چیزوں کا جائزہ لیتی ہو؟

"ان خواتین کا جو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بھیک مانگ رہی ہوتی ہیں۔"

68 کس چیز کے بغیر نہیں رہ سکتیں؟

"پرفیومز کے بغیر۔"

69 کس شخصیت کے بغیر نہیں رہ سکتیں؟

"اپنی والدہ کے بغیر۔"

70 کس شخصیت سے خوفزدہ رہتی ہیں؟

"کسی سے نہیں، صرف اللہ سے ڈرتی ہوں۔"

71 اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟

"بری عادتیں بہت ساری ہیں..... اچھی سوچنی پڑیں گی ویسے رحم دل ہوں۔"

72 دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو ترو تازہ محسوس کرتی ہیں؟

"رات کو۔ جب شوٹ سے واپس گھر آتی ہوں تو میری بیٹری چارج ہو جاتی ہے۔"

73 آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو؟

"تو بہت غصہ آتا ہے۔"

74 کوئی پسندیدہ شخصیت جن کے ساتھ دنیا گھومنا چاہتی ہیں؟

"اپنی امی کے ساتھ..... ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

75 کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟

"کسی کے لیے نہیں، اپنے پاکستان سے بہت پیار ہے اور ہمیشہ رہے گا۔"

76 بستر پہ لیٹتے ہی سو جاتی ہیں یا کروٹیں بدلتی ہیں؟

"لیٹتے ہی سو جاتی ہوں۔"

77 انسان کا بہترین روپ؟

"جس کی نیچر اچھی ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔"

78 کھانے کے لیے بہترین جگہ چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل

"چٹائی۔"

79 کون سے الفاظ زیادہ استعمال کرتی ہیں؟

"جو منہ میں آجائے..... کوئی خاص نہیں۔"

80 مرد کب برے لگتے ہیں؟

"جب فری ہونے لگتے ہیں۔"

81 لڑکے کب برے لگتے ہیں؟

"ذرا کم ہی برے لگتے ہیں۔ ویسے جب وہ حد پار کرتے ہیں تب۔"

82 پیسہ کس شکل میں جمع کرتی ہیں؟

"نہیں کر سکتی..... یہ بڑا مسئلہ ہے۔"

83 اگر مذہب میں ایک قتل کی اجازت ہوتی تو؟

"گوہر..... جو کہ میری خالہ کے شوہر تھے، جن کی وجہ سے میری خالہ کا انتقال ہوا۔"

84 بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہو؟

"مزے کی بات یہ کہ بیڈ کے ساتھ سائیڈ ٹیبل ہے ہی نہیں۔" (قہقہہ)

85 آپ کی ایک عادت جو گھر والوں کو پسند نہیں؟

"مشورہ نہیں لیتی۔ حالانکہ مجھے لینا چاہیے۔"

86 اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟

"جو دل چاہتا ہے خرید لیتی ہوں اور جو پسند ہو وہی قیمتی ہو جاتی ہے۔"

87 کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟

"ہینڈ بیگ اور موبائل۔"

اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟

"اسی میں اللہ کی مرضی تھی۔"



ساجد شاہ سے ملاقات

شاہین رشید

ساجد شاہ ڈراموں کی فیلڈ کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔ بے شمار ڈراموں میں کام کر چکے ہیں اور ہر سیریل میں ان کا کردار بہت مختلف ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ زیادہ تر منفی کردار کرتے ہیں لیکن تب بھی یہ اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ کردار پہلے ڈرامے سے میچ نہ کرتے ہوں۔ ساجد شاہ کو آج کل آپ ہر دوسرے ڈرامے میں دیکھ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انٹرویو کے لیے یہ مشکل سے ٹائم دے پائے۔

"ہیلو۔۔۔ کیسے ہیں۔۔۔ بہت مصروف ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں جی۔۔۔ بہت مصروف ہوں اور اس وقت بھی شوٹ پر ہوں۔ کچھ دیر میں شوٹ شروع ہو جائے گی۔ تب تک آپ بات کر لیں۔"

"اوکے۔۔۔ آج کل کون کون سے ڈرامے آن ایر ہیں؟"

"کافی سارے ہیں "ٹوٹے ہوئے پر' میری صبح کا ستارہ' خوشبو کا گھر" اور کئی نئے ڈرامے شروع ہونے والے ہیں۔ کافی سارے انڈر پروڈکشن ہیں۔۔۔ ایک لمبی فہرست ہے بتانے لگا تو پھر آپ کچھ اور نہیں پوچھ پائیں گی اور ٹائم ختم ہو جائے گا۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ نہیں پوچھتے۔ جب آن ایر آئیں گے تو دیکھ لیں گے۔ ویسے پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے؟"

(قہقہہ) "بس اللہ کا خاص کرم ہے۔۔۔ اس کی مہربانی ہے جس نے عزت دی ہوئی ہے۔"

"آپ کے رول سب میں نیگیٹو ہی ہوں گے؟"

"نہیں۔ اب ایسا نہیں ہے۔۔۔ ایک وقت تھا کہ میں نیگیٹو رول ہی کرتا تھا مگر اب ایسا نہیں ہے۔۔۔ اب دونوں قسم کے رول کر رہا ہوں۔ "ٹوٹے ہوئے پر" میں میرا پوزیٹو رول ہے اور کچھ آنے والے ڈراموں میں بھی پوزیٹو رول ہیں۔"

"آپ کی اپنی پسند کیا ہے۔۔۔ نیگیٹو یا پوزیٹو؟"

"مجھے تو کام کرنا ہے۔۔۔ بس رول اچھا ہو' خواہ نیگیٹو ہو یا پوزیٹو ہو' پر ہو پاور فل۔۔۔ عام ہلکا پھلکا رول اب نہیں لیتا۔"

"لوگوں کا کیا رسپانس ہے۔۔۔ کس میں زیادہ پسند کرتے ہیں؟"

"جو مجھے پسند کرتے ہیں' وہ مجھے ہر رول میں پسند کرتے ہیں اور میری تعریف کرتے ہیں۔۔۔ اسی لیے میں دونوں رولز کرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔"

"آج کل بے شمار ڈرامے بن رہے ہیں۔ ان کے معیار کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟"

"اگرچہ سب ڈرامے معیاری نہیں ہوتے لیکن آج کل کچھ ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بہت اچھا کام کر رہے ہیں اور ان کے ڈرامے بہت پسند کیے جا رہے ہیں۔ معیار اچھا ہے۔ مقبول ہو رہے ہیں۔۔۔ پھر ہمیں جو فیڈ بیک ملتا ہے' اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ لوگ ڈراموں کو کتنا پسند کرتے ہیں۔"

"ماضی کے ڈرامے بھی آپ نے دیکھے ہوں گے اور حال میں تو آپ خود ہیں۔ کچھ کہیں گے آپ؟۔۔۔ کیا فرق آیا ہے؟"

"ہر دور ایک جیسا نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر دور میں ایک جیسی چیزیں پسند کی جاتی ہیں۔ گزرے دور کے ڈرامے بہت اچھے تھے اور وہ ڈرامے اس دور کے تقاضوں کو پورا کرتے تھے۔ آج کے دور کے ڈرامے آج کے دور کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ انسان کا مزاج اور سوچ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ یکسانیت کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ اگر آج کے ڈرامے معیاری نہ ہوتے تو نہ اتنے زیادہ ڈرامے بن رہے ہوتے اور نہ ہی لوگ ان کو دیکھ رہے ہوتے۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔۔۔ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی بہت ضروری ہے۔ آپ اس فیلڈ میں کس کشش کے تحت آئے؟"

"سچی بات بتاؤں کہ میں تو اس فیلڈ میں شوقیہ آیا تھا۔ لیکن جب اللہ نے کامیابی دینا شروع کی تو پھر اس فیلڈ کو ذریعہ معاش بنا لیا۔"

"تو پہلے کیا ذریعہ معاش تھا اور کیا یہ فیلڈ انسان کی تمام ضروریات کو پورا کر دیتی ہے؟"

"پہلے میں جاب کرتا تھا۔ ایک پرائیویٹ کمپنی میں جنرل منیجر تھا مگر جب اس فیلڈ میں کام زیادہ ملنے لگا تو میں نے جاب کو خدا حافظ کہہ دیا اور جہاں تک اس فیلڈ سے ضروریات پوری کرنے کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ اچھی آمدنی ہوتی ہے تب ہی تو میں نے جاب چھوڑی اور اب تو ماشاء اللہ بہت چینلز آ گئے ہیں اور کام بھی کافی بڑھ گیا ہے۔"

"نہ صرف کام بلکہ معاوضہ بھی۔"

"جی ہاں' آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔۔۔ اب اسے ذریعہ معاش بنایا جا سکتا ہے' بلکہ اب تو یہ باقاعدہ ایک پروفیشن بن گیا ہے۔"

"آپ نے ایک مرتبہ اپنے انٹرویو میں کہا تھا کہ مستقبل میں آپ کا ارادہ ڈائریکشن کی طرف آنے کا ہے تو یہ کب تک ہوگا؟"

"ارادہ تو ہے اب دیکھیں کب تک۔ ڈائریکشن اتنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے بہت وقت اور تجربہ چاہیے ہوتا ہے۔ اور میرے پاس تو آج کل کام ماشاء اللہ اتنا زیادہ ہے کہ فی الحال تو صرف سوچ ہی سکتا ہوں کہ آؤں اس فیلڈ میں بھی۔"

"گزشتہ دنوں آپ کے بیٹے کو "روگ" میں اور "پل صراط" میں دیکھا۔ ماشاء اللہ دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہو گیا ہے۔ اسے اس فیلڈ میں آپ نے ہی متعارف کرایا ہوگا؟"

"جی ہاں۔۔۔ ماشاء اللہ بڑا ہو گیا ہے اور وہ تو اس فیلڈ میں بچپن سے ہے۔ آج کل وہ بھی کئی ڈراموں میں مصروف ہے اور جہاں تک تعارف کرانے کی بات ہے تو وہ بھی اس فیلڈ میں اتفاقیہ آیا ہے۔"

"اچھا؟۔۔۔ وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ میں ایک دن ڈرامے کی ریکارڈنگ کے لیے پی ٹی وی گیا۔ میرا بیٹا جو کہ اس وقت کافی چھوٹا تھا میرے ساتھ تھا۔ وہاں اقبال انصاری اور بشریٰ انصاری سے ملاقات ہوئی۔ ویسے بھی میرے ان سے اچھے تعلقات تھے تو عید کے ایک پلے کے لیے انہوں نے میرے بیٹے کو سائن کر لیا۔ بس پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور آج تک چل رہا ہے۔"

"بہن بھائیوں کو بھی لگاؤ ہے کیا۔۔۔ یا کوئی اس فیلڈ میں ہے؟"

"نہیں جی۔۔۔ بس میں اور میرا بیٹا ہی اس فیلڈ میں ہیں اور میں کون سا پلاننگ کے ساتھ آیا تھا۔ شوقیہ آیا اور بس میرا بھی سلسلہ چل نکلا۔"

"مطلب یہ کہ ٹیلنٹ کہیں بھی ہو اپنی جگہ بنا لیتا

ہے ..... کچھ اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتائیں؟"

"میں 30 جنوری کو سندھ میں پیدا ہوا۔ میرے والد نے میرا نام محمد علی شاہ رکھا اور والدہ کو ساجد نام پسند تھا۔ وہ ساجد کے نام سے ہی مجھے پکارتی تھیں ان کی وجہ سے سب مجھے ساجد کہنے لگے اور یوں میرا نام ساجد شاہ ہو گیا' پھر اسی نام سے اسکول کالج میں داخلہ لیا اسی نام سے شناختی کارڈ بنا۔ والد کنسٹرکشن کمپنی میں میڈیکل آفیسر تھے جبکہ والدہ ہاؤس وائف۔ میرے آباؤ اجداد کا تعلق افغانستان سے ہے۔ وہ مائیگریٹ کر کے پاکستان آگئے اور صوبہ سرحد کے شہر پشاور اور ایبٹ آباد میں قیام پذیر ہوئے۔ 1980ء میں ہم سب کراچی آگئے' ہم آٹھ بہن بھائی ہیں۔ میں بڑا ہوں۔ میری پانچ بہنیں اور ہم تین بھائی ہیں اور ماشاء اللہ سب اپنی اپنی فیلڈ میں مطمئن اور اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ میں نے گریجویشن کیا ہے میں پانچ سال تک اپنے والدین کی اکلوتی اولاد رہا تھا۔"

"اچھا..... پھر جب اللہ نے آپ کو بہنوں بھائیوں سے نوازا تو آپ کی ویلیو کم ہوئی یا زیادہ؟"

"میری ویلیو میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہی ہوا ..... والدین نے سب بچوں کو بہت پیار اور توجہ سے پالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب صراط مستقیم پر ہی چلے کوئی بگڑا نہیں۔"

"آپ نے محسوس کی سب کی مداخلت؟"

"نہیں..... مجھے تو اچھا لگا کیونکہ میرا اکیلا پن دور ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں سے بہت پیار ہے۔ ہم سب فرینڈز کی طرح رہتے ہیں۔"

"آپ پریکٹیکل لائف میں کب آئے؟"

"بہت کم عمری میں میں پریکٹیکل لائف میں آگیا تھا وجہ یہ تھی کہ میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا تھا اور ظاہر ہے کہ میں گھر کا بڑا تھا سو مجھ پر ساری ذمہ داری آپڑی تھی' چونکہ والد صاحب کنسٹرکشن کمپنی میں میڈیکل آفیسر تھے تو مجھے بھی کمپنی میں جاب مل گئی۔ مجھے کمپنی کا حساب کتاب دیکھنا ہوتا تھا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ جیسے جیسے میری تعلیم میں اضافہ ہوتا گیا' میری ترقی بھی ہوتی گئی۔ اللہ کا مجھ پر بڑا کرم رہا۔ پھر شوبز سے بھی کمانے لگا تو پھر سے اچھے دن آگئے۔"

"جس عمر میں آپ نے جاب کی اس عمر میں تو نوجوان خوب عیش کرتے ہیں اور بے فکری کی زندگی گزارتے ہیں۔ آپ کو محسوس تو ہوتا ہو گا؟"

"ہاں کیوں نہیں..... لیکن اس سے زیادہ مجھے اپنے گھر کی ذمہ داریوں کا احساس تھا کہ میرے والد جنہوں نے ہمارے لیے اتنا کچھ کیا' آج اگر ان کا سایہ ہمارے سر پر نہیں ہے تو بڑے بیٹے کی حیثیت سے مجھے اپنی ذمہ داریاں نبھانی تھیں اور ایسا نہیں ہے کہ میں نے اپنی نوجوانی کا دور بہت برا گزارا' اللہ کا شکر ہے کہ میں نے بھی بہت اچھا وقت گزارا۔"

"وقت اور حالات موڈ پر برا اثر ڈالتے ہیں۔ آپ پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟"

"نہیں ایسا نہیں ہوا۔ عموماً" ایسے حالات میں مزاج پر برا اثر پڑتا ہے مگر میں اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے صبر بہت دیا ہے بہت حوصلہ دیا ہے اور ہر حالات میں ایڈجسٹ ہونے کی صلاحیت بھی دی ہے۔ نہ میں بچپن میں غصے کا تیز تھا نہ نوجوانی میں اور نہ ہی اب ہوں بس میرے مزاج کی یہ خاصیت ہے کہ میں جس کام کو کرنے کا سوچ لیتا ہوں اسے کر کے چھوڑتا ہوں ..... اور میرے خیال میں یہ ایک اچھی عادت ہے۔ اس سے کم سے کم کوئی کام ادھورا نہیں رہتا۔"

"دوستوں کا حلقہ وسیع رہا یا بس..... چند دوست اور پھر گھر؟"

"بس ٹھیک رہا۔ نہ بہت وسیع نہ بہت کم ..... اور میں سمجھتا ہوں کہ نوجوانی میں اچھے دوستوں کا ملنا بہت بڑی نعمت ہوتا ہے کیونکہ یہ وہ دور ہوتا ہے جب نوجوان دوسروں کی عادتوں کو بہت زیادہ فالو کرتا ہے۔ اگر دوست پان سگریٹ کی عادت میں مبتلا ہوتے تو وہ بھی ان عادتوں کو اپناتا ہے۔ اللہ کا بڑا کرم رہا مجھ پر کہ

میں پان سگریٹ کی عادت میں مبتلا نہیں ہوا اور بڑی صاف ستھری زندگی گزاری۔"

"پھر کردار نگاری میں تو مشکل ہوتی ہوگی؟"

"اول تو ایسے کردار ہی نہیں ملے کہ جن میں کوئی بہت زیادہ سگریٹ نوشی کرنا پڑے یا کسی بری عادت میں مبتلا دکھایا گیا ہو۔ ہلکا پھلکا رول ہو تو پھر کوئی مشکل نہیں ہوتی۔"

"انسان میں فنکارانہ صلاحیتیں تو بچپن سے ہی ہوتی ہیں۔ جس کا اظہار وہ کہیں نہ کہیں کرتا رہتا ہے۔ پھر بعد میں کہیں اس کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ آپ کو کب احساس ہوا کہ آپ کچھ کرسکتے ہیں؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ انسان کے اندر کا ٹیلنٹ اظہار مانگتا ہے اور اظہار کرنے کے لیے پھر اللہ تعالیٰ راستے بھی ہموار کردیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اور میرے لیے راستے بھی خدا تعالیٰ نے خود ہی ہموار کیے۔

انسان کی اصل درس گاہ تو اس کا اسکول ہی ہوتا ہے اور ہمارے دور کے اسکولوں میں تو غیر نصابی سرگرمیوں پر بہت زور دیا جاتا تھا میں اسکول اور کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بہت جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا کرتا تھا۔ یہاں پر میرے ٹیلنٹ کو تھوڑی قدر مل جایا کرتی تھی۔ مجھے احساس تو تھا کہ مجھ میں کچھ کرنے کی صلاحیت ہے مگر میرے پاس کوئی پلیٹ فارم نہیں تھا۔۔۔۔ بس پھر جب ٹی وی پہ کام کرنے کا موقع ملا تو ایسا لگا کہ میں اپنے آپ کو بہت جلد منوالوں گا اور ایسا ہی ہوا۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ مجھ پر ترقی کے راستے کھولتا چلا گیا۔"

"خرچ کے معاملے میں کیسے ہیں۔۔۔۔ فضول خرچ یا۔۔۔۔؟"

"درمیانہ ہوں۔۔۔۔ بہت زیادہ فضول خرچی کو برا سمجھتا ہوں اور اپنے بیٹے کو بھی یہی سمجھاتا ہوں۔ آج کے دور میں ہوں یا کسی بھی دور میں، پیسہ کمانا بہت مشکل ہے۔ کیا فائدہ کہ اس کو فضولیات میں خرچ کر دیا جائے۔"

"پھر بھی کن چیزوں پر زیادہ خرچ کرتے ہیں؟"

"ضروریات زندگی کے علاوہ اگر میں کسی چیز پر خرچ کرتا ہوں تو وہ کتابیں ہیں۔ مجھے زمانہ طالب علمی سے ہی مطالعے کا شوق رہا ہے اور میں جب چھوٹا تھا یعنی طالب علم تھا تو جو جیب خرچ مجھے ملا کرتا تھا، انہیں جمع کرتا رہتا تھا اور جب ایک معقول رقم اکٹھی ہو جاتی تھی تو پھر ان سے اپنی پسندیدہ کتابیں یا میگزین لے لیا کرتا تھا اور یہ شوق ابھی تک برقرار ہے۔"

"قسمت پہ یقین رکھتے ہیں؟"

"بالکل جی۔۔۔۔ جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے، وہی ملتا ہے۔ انسان صرف کوشش کرتا ہے۔ اس لحاظ سے میں اللہ کی ذات پر مکمل بھروسا کرتا ہوں اور بہت زیادہ مذہبی انسان ہوں۔"

"قسمت پر یقین رکھتے ہیں تو پھر کوئی پلاننگ نہیں کرتے؟"

"ایسا نہیں ہے۔۔۔۔ مجھے نہیں پتا کہ میرے نصیب میں کیا لکھا ہے۔ میں پلاننگ ضرور کرتا ہوں مگر رزلٹ اللہ تعالیٰ پہ چھوڑ دیتا ہے۔ کیونکہ جو اللہ تعالیٰ بہتر سمجھتا ہے وہی کرتا ہے۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"

"آج کل تو فارغ وقت ملتا ہی نہیں ہے۔ پھر بھی اگر مل جائے تو جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں مطالعے کا شوقین ہوں تو مطالعہ ہی کرتا ہوں اور بڑی باقاعدگی سے جاگنگ کرتا ہوں۔ کیونکہ اس فیلڈ میں رہنے کے لیے انسان کا فٹ ہونا بہت ضروری ہے۔"

"زندگی کے بارے میں کیا کہیں گے؟"

"زندگی بہت حسین چیز ہے۔۔۔۔ لیکن انسان سے کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں اور اچھا انسان وہی ہوتا ہے جو اپنی غلطیوں سے سیکھ کر اپنی زندگی کو خوشگوار بنائے۔ میں اپنی لائف سے بہت خوش ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے ساجد شاہ سے اجازت چاہی۔

رفعت ناہید سجاد

چراغِ آخرِ شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں' ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد' ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادی اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر' عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں' اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بےحسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پر اعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی یونی ورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کر کے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی



علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے، وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔ عبیرہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن وہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اسرار کے ساتھ بہ وجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے، جہاں ان دونوں کی والدہ آپائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کردیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کرنا صرف اسپانسرل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے، جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کر کے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے، اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان، شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے، جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھا دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۲۴ چوبیسویں قسط

توقع کے بالکل برعکس فاروق نے سر اٹھایا گویا جواب دہی کی ذمہ داری از خود اس پر آگئی تھی۔

"غصہ تو وہی پرانا ہے بابا! البتہ اس میں ان کا کردار نیا ہے، اس لیے ہراساں ہو رہی ہیں۔"

بابا کی پیشانی از سر نو شکن آلود ہوئی۔ "کتنا اچھا ہوتا اگر تم اپنی ان جملے بازیوں کو تھوڑی دیر کے لیے بھول جاتے۔"

جیسے مشین کا بٹن بند کیا جاتا ہے، وہ ایک موڈ سے سوئچ ہو کر فوراً" دوسرے میں داخل ہو گیا۔

"شاید ایام جاہلیت سے ابھی تک ٹھیک سے نکل نہیں پائے ہم، نسلوں تک دشمنیاں نبھانے کا رواج باقی ہے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ ایجنسیاں ابھی تک ان کے پیچھے تھیں۔ کبھی اس بہانے کبھی اس بہانے۔"

"اور اب کیا بہانا ہے؟" انہوں نے بے تابی سے پوچھا تھا۔

"نعیم ملک صاحب کو بیک وقت "را" اور سی آئی اے کی حمایت حاصل رہی ہے، شاید اس طرح سر عباس کے گرد دائرہ تنگ کرنے میں وہ کامیاب رہ سکتے ہیں۔"

ایک وقت میں جب ایک فون کال پر ڈھیر ہونے والا ڈکٹیٹر اپنے لوگوں کو تاش کے پتوں کی طرح بانٹ رہا تھا۔ پروفیسر عباس ان کو مطلوب نہیں تھے۔ ورنہ وہ پہنچا دیے جاتے۔ ہاں البتہ وہ اس لسٹ میں تھے جن کو تنبیہہ کی جاتی ہے اور اس تنبیہہ کا رنگ یہ ہوتا ہے کہ بندے بن جاؤ ورنہ۔۔۔ اس ورنہ کے بعد جو خالی۔۔۔ ہیں، ان میں کچھ بھی ہو سکتا ہے فی الحال ان نکتوں پر نعیم ملک کھڑا ہے۔ وہ ان کا ایک ادنیٰ پتلا ہے۔ ان کے کام نہ آیا تو کسی ٹرک کے نیچے آکر کچلا جائے گا، ایک دن نالی میں اس کی لاش سڑ رہی ہوگی اور اس کی جگہ کوئی اور لے لے گا۔ لہٰذا اس کو اپنی

۔۔۔ کے لیے دم ہلانی پڑ رہی ہے۔ پروفیسر صاحب اگر کتاب لکھنے یا لیکچر دینے سے رک جاتے تو شاید نعیم ملک بے روزگار ہو جاتا۔ ابھی تو ان پر جو الزام لگ رہے ہیں وہ کافی گھٹیا ہیں۔"

"مثلاً"؟"

"مثلاً" زیور چوری، کسی کی منکوحہ کو حبس دم میں رکھنا، ہراساں کرنا، وغیرہ وغیرہ۔ اب یہ الزامات بھی غیر اہم بن کے رہ گئے ہیں۔ جب تک کوئی بڑا تیر نہ مارا جائے۔"

"کیا تمہارے ابا پریشان ہیں؟" انہوں نے عبیر کی طرف غور سے دیکھا۔

"وہ تو بالکل پریشان نہیں ہیں۔ صرف ہم سب پریشان ہیں۔"

اس نے چپکے سے فاروق کی طرف دیکھا۔ وہ کس قدر تفصیل سے ہر معاملے سے آگاہ تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ اس معاملے میں پوری طرح جذب تھا، خواہ مخواہ اپنا طوطا بیچ میں لے آیا لیکن سب سے حیرت کی بات یہ ہے کہ کوئی شخص بیک وقت پروفیسر صاحب اور سارا حق کا ایک جیسا دلدادہ کیسے ہو سکتا ہے۔

اور اتنا سوچ سمجھ کر لفظ منتخب کرنے والا شخص سارا حق کے سامنے ایسا اوچھا بیان کیوں دیتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ سب ہوتا ہے تو اسے دکھ کیوں ہوتا ہے۔ سوالات کا ایک ڈھیر سامنے دھرا ہے اور کریم بی کہتی ہیں، سوال کم کرو۔ اب ان میں سے کون سے چن لیے جائیں اور کسے چھوڑ دیا جائے، وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں چلتی ہوں سر۔" جیسے اس چھت کے نیچے ہونے والی گفتگو اس سے متعلق ہی نہ ہو۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ کر رکی۔ لمحے بھر کو ٹھہری اور جب پلٹی تو مسکراہٹ اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ تھکی ہاری، مضمحل ہی سہی۔

"اللہ آپ کو جلدی اچھا کرے سر۔"

"آمین۔" سر نے سنجیدگی سے کہا۔ "ایک بات بتاتی جاؤ۔ تمہاری مجھ سے تو ناراضی نہیں ہے نا!"

"نہیں سر!" وہ خجل سی ہو گئی۔ "کسی سے بھی نہیں ہے۔"

"میں تو اپنی بات کر رہا ہوں بیٹا! کسی کی بات کسی سے کرنا۔"

غیر متوقع طور پر عبیر کی نظر جھجکی، بکھری اور یوں ہی پھسلتی لاتعلق سے بنے اس شخص پر رکی جو ٹانگ پر ٹانگ رکھے اپنے چمکتے بوٹ کی طرف متوجہ تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں شرارت کی جو ہلکی سی کوند تھی، وہ اس کو بالکل اچھی نہیں لگی۔



رکشہ غیر معمولی شور مچا رہا تھا۔ اس نے بیٹھتے ہی اس کی زبوں حالی پر بھی غور کر لیا تھا لیکن اب تو وہ بیٹھ چکی تھی یا شاید ہماری سڑکوں پر یوں ہی ہنگامے کی سی فضا چھائی رہتی ہے۔ کھڑکھڑاتے رکشہ، دیوانہ وار ہارن بجاتی گاڑیاں، لمبے لمبے اسپیڈ دیتے موٹر سائیکل پتا نہیں کیسا ہیجان ہے اپنے اندر۔ جو اتنا شور مچا کر نکالتے ہیں۔ ابھی سارا حق یہاں سے گزرتیں تو اپنی کار کے شیشے نیچے کر کے اس Noise Pollution (شور کی آلودگی) پر سخت خفا ہو چکی ہوتیں۔

اسے کوفت سی ہوئی۔ پھر بے موقع اور بے جگہ اس نے کسی کو یاد کیا تھا۔ اور ایک خیال سے اس طرح دوسرا خیال کڑی ملاتا جڑتا جاتا ہے۔ اس کو اس زنجیر سے خوف محسوس ہوا۔ اگلی کڑی پر جانے سے پہلے رکشہ نے ایک زوردار دھچکا کھایا تھا۔ جیسے بڑی تائی اودی اودی جامنوں پر نمک چھڑک کر ان کو ایک ڈبے میں بند کر کے خوب ہلاتی تھیں۔ جامنوں کو کھانے سے پہلے ان پر اس قدر تشدد کیوں کیا جاتا ہے، کوئی انسانی حقوق والا ہی بتا سکتا ہے۔

ان مسلسل دھچکوں سے وجود تو کیا ذہن بھی متوازن رکھنا دشوار تھا۔ دل ایک بات بھی تو ایک جگہ ٹک کر سکون سے سوچ نہیں جا رہی تھی۔ وہ پریشان تھی اور اپنے کو ندا کی طرف جا رہی تھی۔

اس بلاک میں یہ مختصر لیکن پرسکون سا گھر روئے زمین پر نہ بنا ہوتا تو زندگی کس قدر تلخ ہو جاتی۔ وہ اتری تو شام کا مرجھایا ہوا سورج بس ڈوبنے کو تھا۔ شفق کی سرخی کو اندھیرا نگل لے گا اور اس تاریکی کو ایک روشن صبح سمیٹ لے گی۔ وہ صبح کبھی تو آئے گی۔ صبح ضرور آئے گی۔ برس کا فیتہ کندھے پر ڈال کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"آپائی! صبح سے سوائے ایک کڑوالی چائے کی پیالی کے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔"

"یہ تم فقیروں کی طرح ہمیشہ دو دن کی بھوکی کیوں ہوتی ہو۔ تمہارا آفس کا میس اجڑ گیا ہے؟" آپائی کھلکھلا کر ہنسیں' بالوں کی پتلی سی چوٹی لپیٹ کر گدی پر جمائی۔

"میں نے بیسن گھول رکھا ہے۔ دعا کر رہی تھی کوئی آجائے تو پکوڑے بنالوں۔"

حمیرا نے اپنے لیپ ٹاپ کا Lid گرایا USB نکالی۔ "اتنی اچھی پریزنٹیشن تیار کی ہے۔ دکھاؤں؟"

"نہیں۔" اس نے بے مروتی سے کہا۔

"آپائی کے بیسن کی طرح دوسرا حسن اتفاق کہ سر فیصل آج ہی تمہارا پوچھ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے۔ ہم نے اچھے لوگوں کے ساتھ کبھی اچھی نہیں کی۔ پھر سب کا ذکر چلا کیونکہ میں اور سر دونوں ہی فرصت سے تھے۔ اس لیے ہم نے تفصیل سے "چھین لے حافظہ میرا" کیا۔ وہ بتا رہے تھے کہ کسی کانفرنس کے سلسلے میں انہیں اٹک جانا پڑا اور اتفاقات میں سے یہ بھی ایک کہ ان کے موبائل کا بیلنس ختم ہو گیا' کسی دوکان سے وہ ایزی لوڈ لینے گئے ان کا سامنا قیصر سے ہو گیا۔ قیصر نے انہیں پہچاننے سے قطعی انکار کر دیا۔ وہ بڑی واجبی سی دوکان چلا رہا تھا۔ مگر خوش حال بھی لگتا تھا۔ اس نے کہا۔ "ازراہ کرم آپ بھی مجھے مت پہچانئے' مجھے اپنی دوکان کو آگ نہیں لگوانی اعجاز بے روزگار ہے' جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے۔ کہیں کوئی کام نہیں مل رہا۔ اس کی بہن بھی بیوہ ہو کر ان کے گھر آگئی ہے۔ اس کے بھی بچے ہیں۔ وہ کہتا ہے' وہ درجہ چہارم کی نوکری کو بھی تیار ہے مگر ٹریجڈی یہ ہے وہ بھی ایم این اے اپنے حلقے میں خود پوسٹ کرتے ہیں۔ لہٰذا سر فیصل اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ڈگری نہ لینے والا آسودہ ہے اور ڈگری یافتہ کو کوئی چپڑاسی بھی نہیں رکھتا۔ تو آؤ آج اپنی اپنی ڈگریوں کو آگ دکھا دیں۔"

اب حمیرا باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔ عبیر کو خوف محسوس ہوا۔ مذاق ہی میں سہی اس نے صبح سے کچھ نہ کھانے کا اعلان کیوں کیا تھا۔

حمیرا واپس آئی تو اس کے ایک ہاتھ میں گرم پکوڑوں کی پلیٹ اور دوسرے میں اس کا مگ تھا۔ پاؤں اٹھا کر کرسی پر سکون سے بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ہاں چلو اب بتاؤ' کیا کہنے آئی تھیں؟"

عبیر بوکھلا سی گئی۔ "کہنے آئی تھی۔ یہ کس نے کہا۔"

"باس سے ناراضی ہوئی یا اس کے بیٹے سے گلہ ہے؟" حمیرا نے اس کے سوال کو قطعی گھاس نہ ڈالی تھی۔

"سنو عبیر! نہ میں نے کوئی طوطا پالا ہے نہ وہ فال نکالتا ہے بس میں تمہیں جانتی ہوں۔ کسی کے کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بتاؤ اب۔" وہ کچھ دیر کو چپ رہی۔

"میری سارا حق سے ملاقات ہوئی تھی۔ تمہارا نام تو وہ بھول گئیں۔ مجھ سے پوچھ رہی تھیں...... میں جس کے حوالے سے انہیں ملی تھی' اس کا نام انہیں یاد نہیں اور میرا نام انہیں نہیں بھولا۔ حالانکہ میں ان کی بھی عقیدت مند نہیں رہی۔"

"کوئی بات نہیں ہم حافظے اپنی مرضی کے رکھتے ہیں اور یہ کون سی ایسی بات ہے' جس سے تمہارے چہرے کی ہوائیاں اڑ جائیں۔ ہاں ایک بات یاد رکھنا' سارا حق جو کچھ کہتی ہیں' وہ عموماً "سو فیصد سچ نہیں ہوتا۔"

"ہاں مجھے بھی لگا۔ وہ تمہارا نام بھولی نہیں ایسے ہی سائیں بن رہی تھیں۔"

"یہ بھی اور اس کے علاوہ بھی بہت سے آدھے سچ ہیں۔ ہر کانوں سے سنی اور آنکھوں سے دیکھی بات حقیقت ہو۔ ضروری نہیں۔ تم نے بھی ابھی آدھا سچ بتایا ہے۔ باقی کا آدھا' چائے کے گھونٹ کے ساتھ نگل گئی ہو۔ خیر ابھی بھی کوئی جلدی نہیں۔ فرصت ہو تو بتا دینا۔"

"چلو گی؟ دادی اماں یاد کر رہی تھیں؟" اس نے جیسے اگلے گھونٹ میں بقیہ کا سچ بھی حلق سے اتار لیا۔

"ہاں چلو۔" وہ سہولت سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپائی آپ ایف چلیں گی؟"

"نہیں۔" انہوں نے اندر سے جواب دیا۔ "رضا اب پہنچتا ہی ہو گا۔ مز کا پیالہ تیار رکھا ہے' نائلہ کے لیے لیتی جانا۔"

"ہیلو مائی ڈیئر جان آف آرک۔" وہ گیلری سے گزرتی لمحے بھر کے لیے ٹھٹک کر رکی۔ سلونے چہرے پر دمکتی اور سوچتی سی آنکھیں۔ وہ کسی اندرونی بے ساختہ خوشی سے جھلملا رہی تھیں لیکن چہرے پر ٹھہرا ٹھہرا سا ایک بلا کا مستقل سکوت' یہ چہرہ جو بہت سے چہروں کے درمیان سے جھانک رہا تھا۔ ہمیشہ اس کے قدم روک لیتا تھا۔

"تمہاری زندگی میں بھی کوئی محرومی تھی جون؟"

☼ ☼ ☼

"دوپہر ڈھلنی شروع ہوئی تھی کہ رات کے کاموں نے تیاری پکڑ لی۔ لکڑیوں کی جل کر خاکستر ہوئی راکھ سے لالٹین کی چمنیاں مانجھی جانے لگیں۔ یہ ہر روز کا کام تھا۔ بتی سے دھواں دیتی روشنی' چمنی کے اطراف میں جمع ہو کر لالٹین کو جیسے سیلے بخار میں مبتلا کر دیتی تھی۔ اس دھندلائے شیشے سے جو روشنی منعکس ہوتی' وہ ماند ماند اور بجھی بجھی ہوتی۔ لیکن اس ملگجی دھندلی روشنی میں وہ عبداللہ فاروقی کا رسالہ "خاتون" انہماک سے پڑھا کرتی تھی۔ اسی روشنی میں اس کی اماں تکیہ غلاف کاڑھتی تھیں۔

دن کے خاتمے اور رات کے آغاز کو اسی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ دیوں میں تازہ تیل بھر کر طاقچوں میں سجاتے طاقچے' جو گھر کے ہر کونے میں اسی نیت سے بنائے گئے تھے۔ رات بھر جلنے والی بتیاں تیل پی پی کر اور جل کر بھسم ہو جاتیں۔ اماں اپنی بقچی سے مٹھی بھر کپاس نوچ کر نکالتیں' سلیقے سے بنولے الگ کر کے دونوں ہتھیلیوں کے درمیان روئی کی مہین تہہ سے چراغ کی بتیاں بٹنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ ہر بتی مختلف نمونے کی تیار ہوتیں' حالانکہ اسے صبح تک جل کر خاک ہی ہو جانا تھا۔

"لے لو آپا!" وہ بہت سارے نمونے بٹ کر ماں وفا کو تھما دیتی اندھیرا اترنے سے پہلے اجالوں کا سارا سامان تیار ہو جاتا۔ ململ کی کھڑاؤں اور سفید چست پاجامے میں جس کی چنٹیں سوکھی ٹانگوں پر لکڑی کی طرح مڑھی ہوئی تھیں..... ٹاخ ٹاخ چلتی ماں وفا' چراغوں کو سنبھالتی اور دیا سلائی سے آگ دکھاتی' برآمدوں' دالانوں کو اجالتی اپنے باورچی خانے کی طرف چلی جاتیں۔ صحن کی آخری حد پر لکڑی کے کھمبوں کے سہارے کھڑا باورچی خانہ' جس پر بھوسے کی چھت ایک شہتیر کے سہارے اٹکی تھی۔ اپنے حصے کی لالٹین' شہتیر سے ذرا باہر نکلے' لکڑی کے کٹکے پر لٹکا کر رات کے کھانے میں مصروف رہتیں۔ ہر روز کی طرح گزرا دن جگمگاتے سورج سے دھندلی پیلی روشنیوں

میں منتقل ہونا شروع ہو جاتا۔

اس گھر کی شام کس قدر اداس کردینے والی ہوتی ہے۔ دن بھر کی چہل پہل، قلقاریوں اور کھلکھلاتی ہنسی سے گونجتے آنگن میں جیسے ایک دم ویرانہ اتر آتا۔ عطن نے برآمدوں سے صحن میں کھلنے والی محراب تلے کھڑے دور کچی مٹی والے طویل صحن کے پار ماں وفا کو لکڑیوں کی آگ دہکاتے دیکھا۔ پھونکنی میں اپنا سانس بھرتی وہ دھونکنی کی طرح ہانپ جاتی تھیں۔ گاڑھا کثیف دھواں جسے ہر پھونک کے بعد اپنی آنکھ سے دور کرنے کی کوشش کرتیں لیکن وہ پھر رخ بدل کر اور ناک تاک کر ماں وفا کی آنکھوں کو دھواں دار کیے رکھتا۔

روشنی دائروں میں تقسیم تھی۔ ہر دو دائروں کے درمیان تاریکی کا ڈیرا تھا۔ برآمدے کی محرابوں سے ماں وفا کے باورچی خانے تک دو روشنیوں کے درمیان کی گھور تاریکی مگر ہوائیں کہ ماں وفا کی لکڑیوں نے چیخ چیخ کر آگ پکڑ ہی لی تھی۔

"کم بخت گیلی لکڑیاں!" انہوں نے نیلی کنی والے ململ کے دوپٹے سے آنکھوں کے گوشے رگڑتے ہوئے کہا۔

ابھی ماشکی، مشک بھر کے صحن میں چھڑکاؤ کرکے گیا تھا۔ چمڑے کی مشک کسی لاڈلے بچے کی طرح گود میں لٹکائے گھر میں داخل ہوتا۔ گھڑونچی کے سوراخوں میں اٹکے قطار در قطار گھڑے اور تنگ منہ والی صراحیاں بھرتا جاتا۔ حتیٰ کہ اس کی پھولی پھولی مشک، پھونک نکلے غبارے کی طرح پچک کر رہ جاتی۔ بچا کھچا پانی اپنی مشک کندھے تک بلند کر کے ان کی شکل نئی نکور کردیتا۔ نازک چھال والے مٹی کے گھڑے جن کے پیٹ پر رنگ برنگے ابھرواں نقوش سجے تھے، جھلملا اٹھتے۔ آخری مشک وہ دیوار کے ساتھ کیاری میں آگے گل عباس کے دہکتے، آگ کے رنگ والے پھولوں پر انڈیل کر باہر چلا جاتا۔ دیر تک مٹی کی سوندھی سوندھی باس فضا میں بسی رہتی۔ پھر اس پر لکڑیوں سے اٹھتے دھوئیں، چراغوں کے سلگتے تیل کی خوشبو حاوی ہو جاتی۔

ماں وفا اپنے حجرے سے باہر آئیں۔ دوپٹے کا پلو گھسیٹ کر اپنی پیشانی پر کھینچا۔ ملازمین سے وہ ایسا ہی پردہ کیا کرتی تھیں۔ جس کو وہ خود کا نا پردہ کہتی تھیں۔ گھونگھٹ کی اوٹ سے انہوں نے آواز لگائی۔

"ٹال کی طرف جاؤ تو اس موئے سے کہنا، ناس پٹے پانی میں بھیگی لکڑیاں، پیسے لینے کو شیر، آنکھیں جاتی رہیں۔"

"یہ بھی کہا تھا ماں وفا۔" گیلے کیچڑ سے بھرے فرش پر ننگے پاؤں چلتا ہوا وہ رکا۔ اس کی مشک سے ابھی تک پانی قطرہ قطرہ رس کر اس کے پیر بھگو رہا تھا۔

"بدتمیز آدمی ہے، کہتا ہے گیلی ہے تو کیا ہوا، چولہے میں جلے گی تو سوکھ جائے گی۔"

ماں وفا کو ٹال والے کی حاضر جوابی کچھ دل کو لگی نہیں، وہ بڑبڑاتی واپس آکر ماش کی دال مسل کر کا ہی چھلکے الگ کرتے غصہ دکھانے لگیں۔

"ان ہی اعمالوں سے تو مسلمانوں پر یہ وقت آگیا، ان جیسے لوگوں نے ہمارے بادشاہوں کو فرنگی کا غلام کر کے رکھ دیا۔"

نا محسوس ہوا سے بتی کی لو ٹمٹماتی تو تاریکی میں دم بخود کھڑے آم اور جامنوں کے گھنے درختوں پر غیر مرئی سی شکلیں بننے لگتیں۔ چراغ کے نزدیک سے گزرنے والوں کے سائے سامنے والی دیوار سے صحن تک ایک ہیبت ناک شکل بناتے تھے۔ "چھن" کی آواز ماں وفا کے چھپر سے گونجی، دال بگھار کر انہوں نے ہانڈی پر فوراً "روغنی ڈھکن ڈھک دیا۔ گھر کے گھی اور پیاز کی کراری سی خوشبو نے باقی سب خوشبوؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں ماں وفا کے چہرے پر نارنجی روشنیاں وقفے وقفے سے جھلک مارتیں، پسینہ پسینہ روٹی کی تھپ تھپ جاری تھی۔

"دستر خوان بچھا دو ری لونڈیو! ابھی بادا، چچا مسجد سے آتے ہوں گے۔ دیر ہوئی تو غصے ہوں گے۔" چچی اپنے چھ

[illegible] کے سوتی غرارے کو لہراتی چراغ کے پاس سے گزریں۔ صحن میں ماں وفا کی کہانیوں والے جن کا سایہ [illegible] آیا۔

وہ جن جو سات بھائیوں کی اکلوتی بہن کو اٹھا کر لے جاتا تھا۔ دادی اماں نے تخت پر جھکا سر اٹھایا۔ تیزی سے تسبیح کے دانے گھماتے انہوں نے چراغ کی لو اونچی کی، ذرا دیر ہو جاتی تو بتی تیل میں ڈوب گئی تھی، طیش بھری نظروں سے انہوں نے بہو کی طرف دیکھا۔

"اے لو اب غصہ کرکے مجرم بھی ٹھہرے۔ آخر کو مرد ذات ہے۔ رشید میاں! کھانا شروع کرنے سے پہلے مسجد کی روٹی دے آنا۔"

بان کی دو چارپائیاں جوڑ کر دستر خوان بچھایا جانے لگا۔

"ابھی لگا جاتا ہے اماں! آتو جائیں۔ آپ ہی تو کہتی ہیں، کھانے والا رزق کا انتظار کرتا ہے، رزق کو کھانے والے کا انتظار نہیں کرایا جاتا۔"

بڑی بھابی سڑ پڑ کرتی ادھر سے ادھر گزرتے دادی اماں کو ٹھنڈا کرنے لگیں۔

"عطن ذرا پچھلے کمرے سے اچار تو نکال لانا۔" کتنی دیر سے کاہلی سے ستون سے ٹیک لگائے زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھی عطن اندھیرے اور روشنیوں کا کھیل دیکھتی آلکسی سے اٹھی یوں اکیلے بیٹھ کے سب کو دیکھتے رہنے کا اپنا ہی مزا ہے۔ جیسے آپ واحد تماش بین ہیں اور سامنے نوٹنکی جاری ہے۔ وہ کاہلی سے اٹھی۔ [illegible] منظر کے سامنے پردہ آگیا تھا۔ اسے اندر سے اچار لانا تھا۔

[illegible] سارے گھر سے عشق تھا۔ سوا دو کمروں کے، ایک پچھلا کمرہ جس میں اینٹوں پر لکڑی کے تختے بچھا کر باورچی خانے سے متعلق تمام اشیا دھری تھیں۔ نمک مرچ کے ڈبے، ہر قسم کی ہانڈیاں، دیگچیاں، ڈول، جالی والا [illegible] کا ٹوکرا اور ٹوکرے میں ٹھونس ٹھونس کر بھرے کوٹ کی پلیٹیں اور گلاس، اچار کی برنیاں اور مرتبان اور ان کے درمیان سے جھانکتے دو دو ہاتھ موٹے دانت نکوستے چوہے۔ اس کا نام پچھلا کمرہ نہ جانے کیوں تھا حالانکہ [illegible] سامنے ہی تھا۔ پیچھے تو اصل میں وہ دوسرا کمرہ تھا جس سے اسے خوف آتا تھا۔ جس میں ایک کنواں تھا۔ اس [illegible] والے کمرے کی پشت پر غسل خانہ تھا۔ جہاں تانبے کی قلعی شدہ جھلملاتی بالٹیاں اور ڈول سونے کی طرح [illegible] کرتے تھے۔ کھلی کٹوریوں میں سرسوں کی کھلی اور بیسن گھلا رکھا رہتا تھا جس کو نہانا ہوتا، وہ پہلے کنویں کی [illegible] چلا کر ڈول بھرتا اور بھرا ڈول بالٹی میں انڈیل کر نہانے کے لیے غسل خانے میں لیے جاتا۔

وہ جب بھی چرخی گھما کر ڈول نیچے گراتی تو ایک نظر کنویں کی تہہ میں ضرور جھانکتی، لمحے بھر کے لیے اس کا سر [illegible] جاتا، اتنی گہرائی میں جھانکنے سے اس کے پاؤں زمین سے اکھڑتے اور اسے لگتا وہ اپنے عکس سے ملنے کسی دن [illegible] کی تہہ میں چلی جائے گی۔ یہ خوف بھی عجیب چیز ہے۔ جس سے آپ ڈرتے ہیں اسی کی طرف لپکتے ہیں۔ جوں [illegible] ڈول پانی کی سطح سے ٹکراتا اس کا عکس دائرہ در دائرہ پھیلتی لہروں میں معدوم ہو جاتا۔ جیسے اس کا سارا وجود کرچی [illegible] ہو گیا ہو۔

ہاتھ میں پکڑا چراغ اس نے ایک تختے پر احتیاط سے رکھا۔ ذرا سی لاپروائی اس دیے کو اوندھا سکتی تھی۔ پھر ان [illegible] اندھیری بھول بھلیوں سے باہر نکلنا ناممکن ہو جاتا۔ گہرے مرتبان میں ڈوئی ڈال کر شیشے کا پیالہ اس نے احتیاط سے بھرا ایک ہاتھ میں چراغ، دوسرے میں شفاف کٹوری لیے باہر نکلی تو دستر خوان چن دیا گیا تھا۔ ذکیہ [illegible] کی طرح جھلملاتے لوٹے کی ٹونٹی سے گھر کے مردوں کے ہاتھ دھلا رہی تھی۔ زیب النساء تولیہ ہاتھ میں [illegible] منتظر تھی۔ جو ہاتھ دھو چکتا، تولیہ اس کے آگے کر دیتی۔

"اخاہ!" اسی اندھیرے کونے سے حمید بھائی نے برآمد ہو کر اس کے پوز کو ستائش سے دیکھا۔

"اس وقت تو فلورنس نائٹ اینگل لگ رہی ہو۔ ایک ہاتھ میں چراغ ہے دوسرے میں دوا۔"

"مجھے نہیں معلوم' آپ کس کا نام لے رہے ہیں۔" عطن نے نیم بیزاری سے کہا۔ اس کا دوپٹہ ڈھلک کر پیروں میں الجھ رہا تھا لیکن اس کے ہاتھ خالی نہیں تھے کہ آنچل اپنے شانوں پر درست کر سکتی۔

"ہر روز آپ ایک نیا نام کہیں سے سن آتے ہیں۔"

"ہاں مگر ہر نیا نام عارضی ہوتا ہے۔ تمہارا پکا والا نام بس ایک ہی ہے "جون آف آرک۔"

تائی اماں نے روٹی کی قلفی کھول کر اپنے شوہر اور دیوروں کے سامنے کرتے ایک شک بھری نظر اس لڑکی پر ڈالی جس کا چہرہ ہلکی سرخی سے جھلملا رہا تھا۔ پتا نہیں چراغ کی لو کی پھڑپھڑاہٹ تھی یا ان کے بیٹے نے کچھ ایسا کہا تھا کہ قوس قزح جیسے رنگ اس کے چہرے پر ڈول گئے تھے۔ اب یہ یاد نہیں عطن ان کو ہمیشہ ناپسند تھی یا جب سے ان کے بیٹے کی نظروں میں کچھ نیا چھلکا تھا' وہ اس کو ناپسند کرنے لگی تھیں۔

تیز طرار چالاک لڑکی! ان کی پیشانی شکن آلود ہوئی۔ بڑبڑاتے ہوئے وہ اس کے قریب گئیں۔

"چچا' تایا سب صحن میں جمع ہیں' دوپٹہ تو ٹھیک کرو۔" ان کے لہجے کی سختی "جون آف آرک" کو چبھی۔

"ایک ہاتھ میں کٹوری ہے' دوسرے میں چراغ' تیسرا ہاتھ میرے پاس ہے نہیں تائی اماں!"

"بدتمیز' گستاخ' زبان دراز!"

گو ایک لفظ بھی ان کی زبان نے ادا نہیں کیا مگر ان کے ماتھے کی ہر شکن سے وہ نظریات ٹپک رہے تھے جو ان کے عطن کے بارے میں اس وقت سے تھے جب ان کا بیٹا بڑی جنگ سے پلٹا تھا۔ جنگ سے زندہ پلٹ آنے والے فوجی اعلیٰ رتبوں پر نہ ہونے کے باوجود ماؤں کو افسر لگتے تھے۔ ان کا رہن سہن بھی تبدیل ہو جاتا تھا۔ ہاتھوں سے چمچ اور چمچ سے پھر کانٹے تک' پھر تولیے سے نیپکن تک کا سفر' پھر ضرورت پڑنے پر روانی سے انگریزی بولتے ..... اور افسر کون ہوتے ہیں۔

یوں تو نکمے' نکھٹو پڑے پڑے پلنگ توڑنے والے اور لیٹے لیٹے حکم چلانے والے بھی افسر ہی لگتے تھے اور یہ تو ان کا بیٹا تھا جو محاذ سے پلٹا تھا اور اس وقت پلٹا جب واپسی کی آس دم توڑنے لگی تھی۔

"اگر ہم نے جنگ میں شرکت نہ کی تو ہم پر جرمن مسلط ہو جائیں گے۔" جاتے وقت اس نے اپنے سفر کو جیسے لازمی قرار دیتے کہا تھا۔

"میاں ہمیں کیا..." غالب بیزاری سے کہتے۔ "اس کی فکر کریں تو انگریز کریں۔ غلاموں کو کیا' آقا انگریز ہو یا جرمن۔"

"لیکن ہٹلر بہت ظالم ہے۔"

"اور انگریز مہربان؟"

"عارف!" والد صاحب نے ذرا بلند آواز سے پکارا۔

"اتنی گرمی میں چولہے پر بیٹھے ہو' کھانا کیوں نہیں کھاتے؟" وہ بان کی پیڑھی پر بیٹھا بیٹھا ان کے برابر کھڑا ہو گیا۔

"ابا جان! ابھی ماں وفا ستاروں کا کھیل دکھائیں گی۔"

"جاؤ کھانا کھاؤ بیٹا! ماں وفا نے توا الٹا' اس کی گنبد جیسی سیاہ گہرائی پر جلتے چولہے سے لکڑی نکالی جس کے کنارے انگارہ بنے ہوئے تھے۔ ڈھاک سے انہوں نے لکڑی توے پر ماری۔ سیاہ کالے آسمان جیسا توا جھلمل ستاروں سے بھر گیا۔

عارف خوشی سے اس وقت تک تالیاں بجاتا رہا۔ جب تک کہکشاں جلتی بجھتی رہی۔

انہوں نے پھر توا چولہے کے کنگروں پر ٹکا دیا۔ لکڑی دوبارہ چولہے میں رکھی اور پھر پھونکنی کا کھیل شروع ہو گیا ۔۔۔ خوش خوش پلٹا تھا۔ اس لیے ان کو اپنی اضافی محنت زیادہ کھلی نہیں۔ ماں وفا کے پاس بچوں کو لبھانے کے اور بہت گر تھے۔ وہ آٹا گوندھنے بیٹھتیں تو بچے اکٹھے کر لیتیں۔

"آجاؤ شہزادو! پھر آٹا گیلا ہو گیا تو ماں وفا کو نام نہ دینا۔" بچے دوڑتے آتے اور ان کے گرداگرد چوکڑی مار کر بیٹھ جاتے۔ روز کا ڈرامہ شروع ہوتا۔ آٹے کے بڑے سے لگن میں خشک آٹے کا پہاڑ بنتا۔ اس میں مٹھی سے گڑھا کر کے اتنی جگہ نکالی جاتی کہ کنویں کی شکل اختیار کر لے۔ ڈول سے پانی چھلکا کر وہ اس کنویں کو کناروں تک لبریز کر دیتیں۔ تھوڑا سا آٹا پانی کی سطح پر چھڑکا جاتا کہ پانی چھپ جائے۔ نظر آتا تو خشک پہاڑ' کنارے کنارے اندھے مسافر کی طرح مسافت طے کرتی ان کی دو انگلیاں۔

"بچ کر حافظ جی! کھائی ہے۔" کبھی کبھی وہ اپنا سفر اتنا طویل کر دیتیں کہ بچے آخری منظر کے لیے سانس روکے دم بخود حافظ جی کے صحیح سلامت پار ہو جانے کی دعا کرتے لیکن اس کہانی کا واحد جملہ بول کر وہ حافظ جی کو کھائی میں غرق کر دیتیں۔ لگن میں ہر طرف پانی پانی ہو جاتا۔

کھیل ختم ہوا اور آٹا گوندھنا شروع۔ بچے اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس ہوتے اور عطن دور بیٹھی خوف سے سوچتی' کیسی خوفناک کہانی ہے۔ بے چارے حافظ جی۔ کسی نے ان کو کنویں سے نکالا بھی یا ابھی تک وہ پانی کی تہہ میں گل سڑ رہے ہیں' اسی لیے جب وہ گندھے آٹے کی دو دموں والی چڑیاں بنا کر بچوں میں تقسیم کرتیں تو اس کو بچپن میں بھی اس کھیل میں بے رغبتی محسوس ہوتی۔

"عطن آپا نے کھا لیا؟" عارف نے چاروں طرف دیکھا۔ مردوں اور بچوں کے کھا چکنے کے بعد اب عورتوں اور لڑکیوں کی باری تھی۔ ڈوبتی نبضوں والی لالٹین کی پھرکی گھما کر بتی ذرا بلند کی گئی۔ کھانے والیوں کے چہرے روشن ہو گئے۔

"اماں!" عارف نے اپنی امی کے کاندھے سے لٹک کر پوچھا "ہم کیوں پہلے کھاتے ہیں' آپ کیوں بعد میں کھاتی ہیں؟"

"اس لیے..." اماں نے متانت سے کہا۔ "ایک وقت میں ایک روٹی پکتی ہے۔ ماں وفا سب کو ایک ساتھ کیسے کھلا سکتی ہیں۔"

"پھر یہ کیوں نہیں ہوتا کہ ایک دن آپ اور عطن آپا وغیرہ کھائیں اور ایک دن ابا' تایا۔"

"ارے واہ!" حمید بھائی مسکرائے۔ "یہ تو انقلابی پیدا ہو رہا ہے بھابی! ضرور جون آف آرک کی تربیت کا نتیجہ ہو گا۔ ذرا عباس کو ان خاتون سے بچا کر رکھیے۔"

جون آف آرک نے صحن میں قطار سے بچھے پلنگوں کے پائنتی کھیس ڈالتے اور کڑھے ہوئے اجلے تکیے سرہانے رکھتے ایک نظر حمید بھائی کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھا۔ پتا نہیں ان کو کیا شوق ہے۔ مجھے دوسروں کی نظروں میں گرانے کا۔"

حمید بھائی اپنے والد اور بھائیوں کی طرف نکل گئے جو ایک دائرے میں موڑھے ڈالے سونے کے انتظار میں بستروں کی تیاری دیکھ رہے تھے۔

"فرنگی میاں! کیا کہتے ہو۔ انگریز سچ مچ چلا جائے گا۔" چچا انگریز کی فوج میں شامل ہونے پر اس کی جنگ کو ہلکے خوش گوار لہجے میں چھیڑتے رہتے تھے۔

"جانے کی تو اس نے ٹھان ہی لی ہے۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے' یہ نہیں پتا۔"

"ہونا کیا میاں!" بھائی نے بے زاری سے کہا "جیسے پہلے رہتے تھے پھر اتفاق' پیار محبت سے رہنے لگیں گے۔

یہ تو انگریز سکھا کر گیا ہے۔ دونوں قوموں کو لڑاؤ اور ٹھاٹھ سے حکومت کرو۔"
"لیکن پچھلے تیس چالیس سالوں میں یہ پیار محبت کہیں دکھائی تو نہیں دیتا۔"
"تیس چالیس سال عمر نہیں اور چلے ہیں تیس چالیس سال کی باتیں کرنے' سب فرنگی ڈھونگ ہے۔ ایک دفعہ نکل جائے پھر سب پہلے جیسا نہ ہو جائے تو کہنا۔"
"پھر مغل حکمرانی کرنے لگیں گے؟ یا آپ ایک آقا سے دوسرے آقا کی غلامی میں چلے جائیں گے۔"
"حالات بہت نازک ہیں بھائی جی!" انہوں نے عباس کو اپنے گھٹنے سے اتارتے بڑے بھائی کی طرف مؤدب انداز میں دیکھا۔ "کہیں کہیں سے فسادات کی خبریں آ رہی ہیں۔ اگر یہ آگ پھیل گئی تو..."
"کیوں پھیلے گی۔ یہ تو دو چار سر پھروں کے دماغ کی خرابی ہے۔ پہلے بھی تو رہتے تھے اکٹھے۔ اب کیوں نہیں رہ سکتے۔ چلو رشید میاں! بتاؤ' پاکستان بن گیا تو تم کیا کرو گے؟"
"میں فوراً" یہاں سے کوچ کر جاؤں گا۔ اور اس مٹی پر سجدہ کروں گا۔"
آوازوں میں تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک چار دیواری کے اندر ایک لالٹین کے گرد بیٹھے لوگوں میں اتفاق رائے نہیں تھا۔
دادا میاں نے مصلے پر بیٹھے تشویش سے سر اٹھایا۔ یہ کیسی جنگ تھی جو گھروں میں در آئی تھی۔ اس میں بڑے چھوٹے کا لحاظ بھی ختم ہو گیا تھا۔ انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ چھڑی کی لٹھ کے سہارے اٹھے اور صحن میں اپنے بچھے پلنگ پر تھکے تھکے سے چلے گئے۔ ٹوپی اتار کر اپنے سرہانے رکھتے اور سونے سے قبل کے وظائف تسبیح ختم کرنے لگے۔
[illegible] دادی اماں نے [illegible] کو مخاطب کیے بنا کہا۔ کوئی اٹھا اور روشنیوں کو پھونکوں سے بجھانے لگا۔ پل بھر میں [illegible] تاریکی میں ڈوب گیا۔ دیوار کے ساتھ لگے درخت شدید حبس کے سبب ساکت کھڑے تھے۔ ہر [illegible] درخت پر ایک جن تھا اور ہر جن کا نام ماموں اللہ بخش تھا۔ ماموں اللہ بخش کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ وہ محض ایک شرارتی بچے تھے۔ لوگوں کی چیزیں چھپا دیتے اور جب لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک ہار جاتے اور چڑ کر کہتے "ماموں غرارے کی گوٹ کتری تھی' صبح سے ڈھونڈ کر بے زار ہوئی' میری گوٹ واپس کرو۔" اور یہ کمال اتفاق ہوتا کہ جب وہ دل کی پیاس کے آگ جیسے سرخ رنگ کی گوٹ کے ٹکڑے گنتی تو وہ پورے ہوتے۔
ماں وفا نے عطن کو بتایا تھا کہ "جن ان کی نانی کے زمانے میں بھی تھے اور عطن کی نواسی تک زندہ رہیں گے۔ ان کی عمریں ہماری عمروں سے لمبی ہوتی ہیں۔" جھلمل کرتے ٹمٹماتے روشن تاروں کی ہلکی سی جھپک میں کبھی اسے درختوں کی چوٹیوں پر کسی کا سایہ سا ڈولتا محسوس ہوتا لیکن وہ بزدل نہیں تھی اس لیے چادر میں دبک جانے کے بجائے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی لیکن اس نے کبھی کسی جن کو سالم کا سالم نہیں دیکھا۔ جس کی اس کو حسرت ہی رہی۔
بچے اپنے پلنگ سے چھلانگیں مار کر ماں وفا کے پلنگ پر کودے۔ "کہانی ماں وفا" عباس نے بڑے بچوں کی نقل میں دہرایا۔ "کہانی ماں وفا" پتا نہیں کیوں وہ اس اشتیاق سے کہانی سنتا تھا حالانکہ اس کو کسی قصے کے سر پیر کی سمجھ نہیں تھی۔
"ماں صدقے!" انہوں نے کھاٹ پر سرک کر بچوں کے لیے جگہ بناتے ہوئے کہا۔ "کون سی والی؟"
"سات بھائیوں والی۔" عطن نے چارپائی سے ذرا سا سر بلند کر کے عباس کی طرف دیکھا۔ کہانی میں اور عباس میں صرف ایک ہی چیز مشترک تھی۔ وہ بھی سات بھائیوں میں ___ سب سے چھوٹا والا تھا۔ صحن میں یہاں سے

وہاں تک لوگ اپنے اپنے پلنگوں پر سونے کے قریب ہوتے' ماں وفا کی ٹھہری ہوئی خوبصورت آواز' تاریکی میں آخری پلنگ تک جاتی۔ ایک سوز اور درد سے وہ منظوم نوحہ سناتی تھیں۔

''بو بوری بو بوری کھول کواڑ
تیرے ساتوں بھائی کھڑے دوار''
اندر سے بہن کی آواز آتی
'' بھائی رے بھائی کیسے کھولوں میں کواڑ
ہاتھ بھی جوڑے پیر بھی جوڑے' جوڑے سر کے بال
چھاتی اوپر سل دھری کوئی انکس بیٹھا پاس''

ماں وفا کی آواز میں بچھڑی اور قیدی بہن کا درد سمٹ کر آنسو کی شکل اختیار کر لیتا۔ خاموشی اور تاریکی میں ان کی درد بھری آواز دلوں کو بوجھل کر دیتی۔

قید ہوئے اور غلام ہوئے بغیر اس کہانی کا درد دل کو چھو نہیں سکتا' عطن اس بچھڑی بہن کا تصور کرنے لگی' جس کو معلوم نہیں جن کس دلچسپی کے تحت اٹھا کر لے گئے تھے' نہ وہ ان کی قسم کی مخلوق تھی اور لے جا کر کیوں رسیوں سے یا زنجیروں سے جکڑ کر قید کر دیا تھا۔ ہاتھ پیر حتی کہ سر کے بال بھی جکڑ دیے گئے تھے اور وہ جنبش نہ کرے' اس کے سینے پر غالباً'' وہ سل رکھی تھی' جو قیمہ پیسنے کے لیے بمشکل ہلائی جاتی تھی اور جو انکس بھی پاس بیٹھا ہے وہ شاید گونگا بہرہ بھی ہے' کیونکہ اندر رہا ہرا سے بہن بھائیوں کا منظوم مکالمہ سنائی نہیں دے رہا۔

''کیسی بے بسی ہے'' عطن نے درد سے سوچا' اس بے بسی کا نوحہ تو پڑھا جاتا ہے' لیکن کوئی آواز نہیں اٹھاتا۔ آواز اٹھانا شدید ترین معیوب بات سمجھی جاتی ہے۔ خاص طور پر عورت کی آواز' یہاں تک کہ مردانے سے کوئی خاندان کا مرد سوتا اٹھ کر پیاس بجھانے کے لیے اندر آجاتا تو ماں وفا جیسی بزرگ خاتون کہانی روک کر اس وقت تک انتظار کرتیں کہ وہ کٹورا بھر واپس نہ چلا جائے۔

اس کے ذہن میں بغاوت کا یہ خناس کس نے بھر دیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا' عموماً'' اس کی ضد تسلیم کر لی جاتی تھی۔ باوجود اس کے کہ ضدی لڑکیاں ایک طعنہ ہوا کرتی تھیں۔ جو محض کسی کا گھر اجاڑنے کے لیے بیاہی جاتیں اور معلوم نہیں کتنی نسلوں سے عورت کے لیے تعلیم ایک گالی بن کر رہ گئی تھی۔ اردو پڑھنا سیکھیں' قرآن کی شُدبُد حاصل کریں' بہشتی زیور کا مطالعہ بھی عام تھا' دھوبی اور دودھ والے کا حساب اگر آجائے تو سبحان اللہ' ورنہ یہ عام طور پر اعلا تعلیم کے زمرے میں آتا تھا۔

بظاہر تو عطن کا گھرانہ ان خوش قسمت لوگوں میں آتا تھا' جنہوں نے اسے ایک نیم سرکاری مدرسے میں پڑھنے کی اجازت دی۔ دسویں جماعت تک ان کو تانگہ لینے آتا تھا۔ جس پر پردے کی چادر تنی ہوتی۔ تانگہ چونکہ بھرے بازار سے گزرتا تھا' اس لیے ان کی تعلیم کے لیے شاگرد پیشہ سے ایک بزرگ خاتون اس کے ہمراہ جاتی اور سارا دن اسکول کے صدر دروازے کے باہر گھنے آم کے درخت کے نیچے بیٹھی اونگھتی یا شوخ کپڑے کی گوٹ والی پنکھی جھلتی رہتی۔ تانگے کے گرد اس قدر کس کر چادریں تانی جاتیں کہ ہوا کا گزر بھی ناممکن تھا۔ کتنی مدت اسے پتا بھی نہیں چلا کہ یہ بگھی کہاں چلی جاتی ہے۔ صرف گھوڑے کی ٹاپوں اور ہچکولوں سے اس کو اندازہ ہوتا کہ بگھی۔ اس وقت اینٹوں والی پکی سڑک سے گزر رہی ہے یا کچے میں بھاگی جا رہی ہے' چونکہ اس کی فطرت میں بغاوت کا بیج تھا اور حمید بھائی کے بقول اس کو گھٹی اصلی والی جون آف آرک نے دی تھی۔ لہٰذا وہ آزادی کے حصول کے راستے تلاش کر ہی لیتی تھی۔ پینسل کی نوک سے اس نے اس مضبوط لٹھے میں سوراخ کر لیا تھا اور پینسل گھما گھما کر اس قابل بنا لیا تھا کہ اس کی آنکھ کا ایک ڈھیلا اس میں فٹ ہو کر باہر کے بھاگتے منظر کی ایک جھلک دیکھ سکے۔

''...ضا الوالی! اگر گھر میں کسی کو بتایا تو میں آپ کا گلا دبا دوں گی۔''

انہی باتوں... رضا نو لی بی ذرا سمجھنے کی کوشش کرتیں۔ ''کیا بتایا اور کس کو بتایا اور ان تنے ہوئے پردوں کے اندر آخر ایسا کیا ہو رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے ذہن کو زیادہ تکلیف دینے کی عادی نہیں تھیں' اس لیے پھر انتا غفیل ہو جاتیں اور اب تو اس کو اس شاہ جہانی روزن کی بھی حاجت نہیں رہی تھی۔ اسے اندر ہی پتا چل جاتا' اس وقت مرلی کھوڑا' کانچ کے کھلونوں کی دکان کے پاس سے گزر رہا ہے۔ جو ہاتھ سے چھوٹتے ہی چورا چورا ہو جاتے ہیں۔ ملائی والی برف کی دکان ہے' اس کے گھڑے پر سرخ بنارسی کپڑے کی جھالر لٹک رہی ہے۔ یہ مٹھائی کی دکان ہے جس پر رام دیال حلوائی کا کڑھایا چڑھا ہے جو بڑی شستہ اردو بولتے گاہکوں کو کتھئی رنگ کی پھولی پھولی گلاب جامنیں کیلے کے پتوں میں لپیٹ کر بیچتا ہے۔

''کار الاتقہ سے یاد فرمایئے مہربان۔'' کبھی کان سے فارسی کے ادھورے شعر ٹکراتے۔ اردو زبان فارسی اور ہندی سے اتھڑی ہوئی تھی' ان کی زبان نہیں تھی' لیکن سب بولتے تھے۔

ذرا فاصلے سے جو ایک شور سنائی دے رہا ہے۔ مسلم لیگ کا مختصر سا جلوس ہے اور پاکستان کا مطالبہ کر رہا ہے' جو زیادہ شور رہا ہے وہ جلوس کانگریس کا ہے۔ وہ خود کچھ نہیں مانگ رہا۔ صرف اس مطالبے کو رد کر رہا ہے۔ جب تانگہ مسلم لیگ کے جلوس کے پاس سے گزرتا تو لال دین کوچوان کے گھوڑوں کی ٹاپیں سرخوشی سے مست و بے ترتیب پڑتی تھیں' لیکن جب کانگریس کے جلوس سے گزرتا' لال دین کچھ بڑبڑاتے' ان کی بڑبڑاہٹ سمجھ میں نہیں آتی تھی' لیکن غصے کا اظہار وہ گھوڑے کے بم پر اپنی چھڑی ٹھونک کر کرتے۔

اس کو یہ شور و غوغا اور اس کا مطلب کبھی سمجھ میں نہیں آسکا۔ اگر مسلمان کسی علیحدہ وطن کا مطالبہ کر رہے ہیں تو اس میں ہندو برادری کا کیا نقصان ہے۔ آزادی تو دونوں قومیں مانگ رہی ہیں۔ وہ اپنی آزادی کو برحق اور دوسری قوم کی آزادی کو ناجائز کیسے قرار دے سکتے ہیں؟

حمید بھائی نے اس کو بتایا تھا' سیکڑوں سال کی غلامی کے بعد ہندو جاتی زندگی میں پہلی بار آزاد ہونے جا رہی تھی۔ اس نے کبھی آزادی کی جدوجہد کی ہی نہیں۔ بدھا آئے' پھر اشوک آیا اور پھر مسلمان آگئے۔ اس کے بعد انگریز' معمولی سی پس و پیش کے بعد وہ اپنے حکمران تبدیل کرتے آئے تھے۔ بعض جگہ یہ معمولی ہچکچاہٹ بھی دیکھنے میں نہیں آئی اور وہ برسوں کی محرومی کا بدلہ مسلمانوں کو غلام بنا کر لینا چاہتے ہیں۔ ہندو کہتے ہیں ہمارا ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوگا' حالانکہ یہ ہمیشہ سے ٹکڑے ٹکڑے تھا اور ان کا کبھی تھا بھی نہیں۔ وہ تو ہمیشہ سے محکوم تھے اور ہاں خبردار اپنے بڑے بھیا کو مت بتانا۔ وہ پکے کانگریسی ہیں مجھے تمہیں کھا جائیں گے۔''

حمید بھائی جو درس دیتے اس میں اسکول کی استانیوں کی جھلک نظر آتی۔ وہ بھی جذب اور شدت سے آواز بلند کرلیتے اور اس شدت کا عالم یہ تھا کہ وہ گھروں میں بھی تقسیم ہو گئے تھے۔ مسلمانوں میں دو دھڑے تھے۔ ان میں اختلاف رائے تھا۔ پاکستان بننا چاہیے' پاکستان نہیں بننا چاہیے۔ ایک قوم دو نظریے' ہندوؤں کا نظریہ ایک ہی تھا اور وہ سب اس پر متفق تھے کہ پاکستان نہیں بننا چاہیے' اس میں کوئی اختلاف رائے نہیں تھا۔

بقول بڑے بھائی' حمید بھائی عطیہ کو پٹیاں پڑھاتے رہتے۔

''اگر ہندوؤں سے پوچھا جائے' تمہیں انتخاب کی آزادی ہے کیا چاہیے؟ فرض کیا' تمہیں کچھ ایسا ملتا ہے' جس میں تمہارا بڑا فائدہ ہے' لیکن مسلمانوں کا کوئی نقصان نہیں' دوسری طرف تمہیں ایسا کچھ دیا جائے' جس میں تمہارے حق میں کچھ بھی نہیں نکلتا' لیکن مسلمانوں کا سراسر نقصان ہوتا ہو تو تم کیا چنو گے۔ تو وہ بغیر سوچے دوسرا انتخاب کرتے ہیں۔ تم نے سنا ہوگا نا' بنگال کی تقسیم کے وقت ہندوؤں نے کیسا فیل مچایا تھا۔''

وہ چپ چاپ تاریخ کے یہ سبق سنتی رہتی لیکن یہ سمجھنے سے قاصر تھی' وہ مہربان سے اا۔ بی' جو شام کے وقت

ہماری چارپائیاں باہر نکالتے ہیں اور وہ مہاشے جو ہمارے پودوں کو پانی دیتے ہیں اور ان کے بھائی بند، ہمیں کوئی نقصان کیسے پہنچا سکتے ہیں؟

پانچ سال سے وہ اس راستے سے گزر رہی تھی اور ان پانچ سالوں میں حالات کہاں سے کہاں جا پہنچے تھے۔ اس نے جماعت ششم میں جب اس ہائی اسکول میں داخلہ لیا جو کسی انجمن کی ماتحتی میں چل رہا تھا جہاں اسمبلی میں "وہ شمع اجالا جس نے کیا یا اسلام کے فرزند و توحید کے پروانو' آئینہ فطرت میں اسلام کو پہچانو" پڑھا جاتا تھا' نا سمجھی سے سمجھ داری کی طرف اس کا سفر اتنا تھا کہ اب اسے ان لفظوں کے مفہوم سمجھ میں آ گئے تھے۔ آئینہ فطرت کو چار سال تک "آئی نئے فطرت" پڑھتے۔ حالانکہ اس بوسیدہ سے اسلامیہ گرلز اسکول کو نئی فطرت سے کوئی علاقہ تھا بھی نہیں۔ دسویں جماعت اس نے سیکنڈ ڈویژن میں ورنیکلر پاس کی۔ اور خاندان بھر میں اس کی قابلیت کے ڈنکے پٹ گئے۔ خاندان کے کچھ لڑکے بھی تھرڈ ڈویژن سے آگے نہیں جا سکے تھے۔ یہ 1947ء تھا اور اس کی عمر اٹھارہ سال ہو چکی تھی۔ عام طور پر ہو جانے والی شادیوں کی عمر سے کچھ آگے..... لیکن چونکہ وہ تعلیم یافتہ تھی' اس لیے اس کو گنجائش دی جا سکتی تھی۔ اس کی ہم عمر ساتھی اب بھی کپڑے کی گڑیا سے کھیلتی تھیں' لیکن اس کو گڑیا سے قطعی رغبت نہیں تھی۔

بچپن سے اس کے خیالات عجیب و غریب تھے۔ بھائی میاں کندھے پر بٹھا کر اسے نوٹنکی دکھا لائے' اسے یہ بھی نہیں پتا چلا' گلابی ساڑھی باندھے' ماتھے پر تلک لگائے دراصل لڑکی نہیں ایک لڑکا تھا۔ بھائی میاں نے وعدہ لیا تھا کہ وہ گھر جا کر کسی کو نہیں بتائے گی کہ اس نے نوٹنکی دیکھی ہے۔ وعدہ تو اس نے پورا کیا' لیکن گھر پہنچتے ہی اس نے دھڑلے سے اعلان کر کے سب کو دم بخود کر دیا کہ وہ بڑی ہو کر نوٹنکی میں ناچا کرے گی۔

"نوٹنکی کہاں دیکھی تم نے؟" سوال ایسے تھا جیسے نوٹنکی میں ناچنا اتنا معیوب نہیں' جتنا دیکھنا۔

لوگوں نے شک سے بھائی میاں کی طرف دیکھا۔ نئی نسل کو بے راہ رو کرنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ بھائی میاں کو بہت ارمان تھا ان کی لڑکیاں بھی گھر کے لڑکوں کی طرح علی گڑھ جا کر پڑھیں۔ لیکن اتنی شدت سے قاعدے توڑنے کی وہ جسارت نہ کر سکے۔ اس کا رنج ان کو ایک مدت رہا۔ عباس ابھی چھوٹے تھے۔ لیکن امکانات تھے کہ علاقے کے کسی مشن اسکول میں داخل کر دیے جائیں گے' لیکن فی الحال ان کی اور بقیہ بھتیجوں کی ذمہ داری عطن پر آ گئی تھی۔ وہ روشنائی والی دوات اور سرکنڈے کے قلم لے کر پھوپھو کے پلنگ پر اچک آتے۔

ماں وفا کے بعد عباس سب سے دلارا عطن بی کا تھا۔ مسہری سے لٹکے اس کے پاؤں پر وہ جھولے کی طرح آ بیٹھتا' عطن ٹانگیں ہلا کر پینگ پر جھوٹے دیتی رہتی۔

"بڑھیا ری بڑھیا! اپنے بھانڈے ہٹا لے' عباس کی بارات آئی' اڑ ڑ ڑ دھم۔"

رشید بھیا لکڑی کی آرام کرسی پر جو دراصل نواڑ سے بنی تھی' گود میں رکھے کاغذوں کے ڈھیر پر کچھ لکھتے لکھتے سر اٹھا کر بڑی دلچسپی سے یہ کھیل دیکھتے' اپنی بہن سے کیے وعدے کی وہ پاس داری نہیں کر سکے' جس سے وہ نظریں کتراتے تھے۔ ابھی تک ان کے گھر سے کوئی خاتون علی گڑھ نہیں گئی تھیں۔ بزرگوں کو آمادہ کرنا آسان نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا انگریز مسلمانوں کو تعلیم کے بہانے اپنا مذہب ان کی رگوں میں اتار رہا تھا۔ بہرکیف یہاں پڑھائی ختم نہیں ہوگی۔ انجمن کے کسی زنانہ کالج سے سہی' ان کی قابل بہن بی اے ضرور کر لے گی۔ مگر اس کی دونوں حسرتیں پوری ہونے سے رہ گئیں۔ نوٹنکی میں رقص کی اجازت ملی' نہ علی گڑھ جانے کی۔

ان دنوں عطن پر کہانیاں لکھنے کا جنون سوار ہو گیا۔ کیسی ہونی چاہیے کہانی' بادشاہ ملکہ' جن پری' یا کوئی بھٹکی ہوئی روح' ویران محلوں میں سائے کی طرح سرسراتی' لیکن جب وہ کہانی لکھ کر رشید بھیا کے حضور پیش ہوئی' وہ

اپنی اس پرنسے اونگھ رہے تھے۔ کہانی پڑھ کر انہوں نے نہایت ملائمت اور نرمی سے کہا۔

"نہایت بوسیدہ کہانی ہے عطن بی بی! آج سے آپ تہذیب نسواں اور عصمت پڑھنا بند کیجئے یا گھر کی بزرگ خواتین کو دے دیجئے۔ میری کتابوں والی الماری کھولیے' جب تک آپ کے کالج کے داخلے کا قضیہ حل نہیں ہوتا' الماری کی کتابیں ختم کیجئے۔"

حمید بھائی دیرہ دھون سے آئے تو اس کو پژمردہ پایا۔

"کیا ہوا بی بی' یہ آپ پر مردنی کیوں طاری ہے؟ خوش ہو جائیے پاکستان بننے والا ہے۔"

وہ خوش ہو گئی "واقعی' لیکن بھیا! ہمیں خوف آتا ہے ہر آرزو پوری ہو' ممکن تو نہیں۔ دنیا بہت سی چیزوں کے آگے بے بس ہے۔ بڑے بھیا کی خواہش تھی ہم علی گڑھ جا کر بی اے کرتے' ہماری بھی کتنی خواہش تھی۔"

"کیا ہوتا بی اے کر کے؟"

"خواہشیں پوری ہو جائیں تو کیا ہوتا ہے۔" وہ جھنجلا گئی۔

"دیکھو بی بی! تمہیں تو دھنک رنگ چنری کا بھی بہت شوق تھا' میں سفر مارتا کہاں جے پور پہنچا' تمہارے لیے چنری خریدی' میں نے تو کبھی تمہیں وہ بھی پہنے نہیں دیکھا۔"

"آپ بھی زمانے سے جدا ہیں۔" وہ مزید چڑ گئی۔ "دھنک رنگ دوپٹہ اور بی اے ایک برابر ہو سکتے ہیں؟"

بچے اسے گھسیٹ کر لے گئے۔

"حمید بھائی تصویریں بنائیں۔" وہ چراغ کے سامنے بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے جانوروں کی شبیہہ عکس کی شکل میں صحن کی دیوار پر بنانے لگے۔ یہ بچوں کا پسندیدہ کھیل تھا۔ دو کھڑے کانوں والا گھوڑا' جگالی کرتا اونٹ' اڑتی ہوئی چیل' تیزی سے کان پھڑپھڑاتا خرگوش' سایوں اور روشنیوں کا امتزاج' ڈولتے سایوں میں بنتی اور مٹتی تصویریں۔

"چلو کرایہ دو' میں نے تم سب کو بائیسکوپ دکھایا ہے۔" حمید نے عدم دلچسپی سے کھیل بند کر دیا۔

"کتنے افسوس کی بات ہے۔" اس نے دکھ سے سوچا' "ہم کسی کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں بھی پوری نہیں کر سکتے۔"

"حمید بھائی! کتنا ہمارا دل چاہتا ہے' ہم بھی اپنی تصویر بنواتے۔"

وہ پھر چھم سے ایک نئی خواہش کے ساتھ اس کے سر پر سوار تھی۔

"اس کان پھڑپھڑاتے خرگوش کی طرح؟"

"نہیں۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔ "وہ جو کیمرا ہوتا ہے' اصلی تصویریں بناتا ہے۔ میری ایک ہم جماعت نے اپنی ایک تصویر دکھائی دی تھی۔ پھولوں کی کیاری میں بیٹھ کر..... اس کے چاروں طرف سفید گلاب تھے' وہ بتا رہی تھی پھولوں کا رنگ تو گلابی تھا' مگر تصویر میں سفید نظر آتے ہیں۔ جیسے انسانوں کا عکس دیوار پر پڑتا ہے تو سب سیاہ لگتا

"ہاں واقعی!" یہ ننھی منی خواہش پوری کرنا تو کوئی نہر کھودنا نہیں تھا۔ وہ اگلی دفعہ آئے تو ان کے ہاتھ میں [illegible] تھا۔ بچوں نے اس سے پہلے کیمرا نہیں دیکھا تھا۔

[illegible] بھیا خفا ہو گئے۔ "جب قیامت کے دن ان تصویروں میں جان ڈالنے کا کہا جائے گا' پھر پتا چلے گا۔"

حمید بھائی فقہ کے اس اہم مسئلے پر متوجہ ہونے کے بجائے گھر والوں کو گھیر گھار کر لانے لگے۔ بڑی بھابھی نے [illegible] ابھی چولہے پر چڑھا رکھی تھی۔ تصویر کھنچوانے سے ان کو چنداں رغبت نہیں تھی۔

"[illegible] بھابھی! چھوڑ دیجیے اپنا چولہا چوکی۔ سب لوگ منہ ہاتھ دھو کر آئیں۔ بال ٹھیک کریں۔ او بھائی منیر!

میرے شاعر! میرے مجنوں' کبھی تو ڈھنگ کے حلیے میں نظر آیا کر' کپڑے ٹرنک میں رکھتا ہے یا گھڑے میں۔"

شاعر' مجنون چونکا۔ "منیر میاں کے بس دو' تین ہی شغل ہیں' شاعری کے نام پر تک بندی کرتے ہیں' کبوتر پال رکھے ہیں' قدم زمین پر' نظریں آسماں پر جمی ہیں۔"

حمید بھائی جیسے کیمرا کرائے پر لائے تھے۔ بڑی جلدی میں تھے۔

"بھابھی! بھابھی!" انہوں نے پھونس کے چھپر کھٹ میں جھانک کر چٹکی بجائی۔

"آ رہی ہوں' کڑھی کو ابال آ گیا تو دن بھر کی محنت پہ سمجھو پانی پھرا۔"

دھوپ میں کرسیاں لا کر بچھا دی گئیں' چوکیاں' پیڑھیاں ہر قسم کا فرنیچر' تصویر کے لیے اکٹھا کیا گیا۔ کانگریسی بھیا تصویر کشی کے خلاف تھے۔ وہ بڑبڑاتے واپس چلے گئے' روکنے پر بھی نہیں رکے۔ حمید بھائی کے ہاتھ میں کیونکہ کیمرا تھا' لہٰذا لوگوں کو ان کے من مانے فیصلوں کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ وہ کالے کپڑے سے منہ باہر نکال کر تحکمانہ قسم کی ہدایت جاری کرتے' مرکز میں دادا ابا ہوں گے' بھائی آپ اس طرف کھڑے ہوں' منیر میاں آپ باندیوں کی طرح سیاہ کبوتر کی آواز میں غٹرغوں کرنا بند کریں' عطن! تم پیچھے آ کے کھڑی ہو۔"

لمحے بھر کے لیے حمید بھائی رکے' عطن ست رنگی دوپٹہ اوڑھے ان کا شکوہ دور کیے دے رہی تھی۔

"لاؤ اسے مجھے دو۔" انہوں نے عباس کو اس کے باپ سے مانگا۔

"آپ کو تنگ کرے گا ابا جی۔"

"تنگ تو تم نے بھی بہتیرا کیا تھا بیٹا۔"

کتنی دیر گزر گئی' تصویر کھنچوانے والے سانس روکے تپتی دھوپ میں سورج کی طرف رخ کیے کیے تھک گئے تو کہیں کالے پردے کے پیچھے سے حمید بھائی کی آواز گونجی۔ "مسکرایئے" اور ایک کلک (click)

کسی نے ان کے حکم کی تعمیل نہیں کی کہ اتنی دیر ایک ہی رخ ساکت کھڑے چہرے بے جان ہو گئے تھے سورج سیدھا آنکھوں میں گھسا چلا آ رہا تھا۔

"تیرہ تصویریں کھینچ سکتی ہیں۔" انہوں نے فخر سے اعلان کیا۔ کچھ اپنے چھوڑے کاموں کی طرف واپس ہوئے۔ کچھ تصویر کھنچوانے کے شوق میں پھر چندھیا دینے والی دھوپ میں آ کھڑے ہوئے۔ ابھی فوٹو گرافی جاری تھی کہ شہر سے پہلے اندوہناک حادثے کی خبر آئی۔ جنت بی بی بوکھلائی اطلاع لائی تھیں۔

"ہندوؤں نے دینو قصائی کو ہلاک کر دیا۔" وہ مسلمانوں کے محلے میں گائے کا گوشت بیچتا تھا۔ پھر ایک اس دن کے بعد ہر نئے دن نئی خبر میں اضافہ ہوتا گیا۔ پانی پت' اٹاوہ' کان پور میں خون بہا۔ بلند شہر سے بھی دکھ بھری اطلاعات آئیں۔ اچانک ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے تھے۔ پاکستان بننے کی خوشی کے ساتھ ساتھ خوف اور اندیشوں نے لپیٹ لیا۔ ہندو تعداد میں زیادہ تھے اور انگریز کے سر چڑھے تھے۔ جگہ جگہ مسلمانوں کی لاشیں ملنے لگیں۔

پھر اس دن جب دسترخوان بچھایا گیا اور بڑے بھیا نے کھانے والوں کو ٹوک کر کہا کہ "ٹھہرو رشید کو آنے دو" تو اماں وفا ڈلیا میں پھولی ہوئی گرم روٹی دسترخوان پر رکھ کر بولیں۔

"برتن تو لگا لو عطن بی بی! مالک آتے ہی ہوں گے۔"

آج کی شام سل پر کوفتوں کا قیمہ پیستے ان کے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ اس نے گرم دیگچی کا ڈھکن اٹھا کر جھانکا' گرم مسالے اور ہرے دھنیے کا بھوک بڑھا دینے والا جھونکا آیا۔ خوش رنگ شوربے میں تیرتے سڈول کوفتے' وہ دفتر سے واپس نہیں آئے تھے۔ اتنی دیر اکثر ان کے معمول میں شامل تھی۔ پھر بھی اماں فکرمندی سے

اماں وفا کے پاس بیٹھتی بولیں۔

"واقعی ٹھہرو! رشید کو تو آنے دو۔" تب باہر سے کسی مسرور میاں نے اطلاع بھجوائی۔ "بڑے صاحب کو پولیس لے گئی ہے۔ انہوں نے کسی انگریز کے سر میں ڈنڈا مار دیا تھا۔"

"ہائیں! اماں ننگے پیر دوڑیں۔" وہ کیوں کسی کو ڈنڈا مارنے لگا' وہ کوئی باؤلا تھوڑی ہے۔" مسرور سینہ پھلا کر بولے۔

"بڑے مالک کہتے تھے۔ یہ ہمارا ہی کھاتے ہیں اور ہم ہی پر غراتے ہیں۔" زندگی کورٹ کچہری کی نذر ہو کے رہ گئی' رشید بھائی کے مقدمے کے لیے وکیل ڈھونڈے جانے لگے۔ انگریز نے اپنے انصاف کا بڑا ڈنکا پیٹ رکھا تھا۔ انگریز ابھی زندہ تھا اور اقدام قتل میں ان کو طویل سزا کا امکان بھی نہیں تھا' لیکن جج کے سامنے بڑے فخر سے انہوں نے اعتراف جرم کیا اور آزادی کی خوشی میں ایک چھوٹی سی تقریر کی جو جج کو زیادہ بھائی نہیں۔

☼ ☼ ☼

گلی میں سودے والوں کی آوازوں سے صبح کا آغاز ہوا۔ پھل والا' کھلونے بیچنے والا' اور اخبار فروش جو خبریں بیچنے کے ساتھ ساتھ بلند آواز میں خبریں پڑھ کر بھی سناتے تھے۔ کان پور میں ہندو مسلم فساد' پنجاب میں مسلمانوں کے خون کی ہولی' سکھوں نے محلے کے محلے نذر آتش کر دیے۔

گھر کے اندر ایک سناٹا در آیا تھا۔ آزادی کی فضا میں جہاں جوش اور ولولہ تھا' وہیں کہیں لوگوں کو خوف نے دم بخود کر دیا تھا۔ اجلی چاندنیاں میلی پڑ گئیں' گاؤ تکیوں کے غلاف جگہ جگہ سے کھسک گئے۔

"اب کیا ہو گا؟" سروتے سے چھالیہ کترنے کی ایک مخصوص ٹک ٹک کے سوا ہر طرف موت کا سناٹا چھایا رہتا۔

"کون کون پاکستان جائے گا اور کون یہیں رہے گا۔"

"کیوں جائیں گے ہم اپنا وطن چھوڑ کر' ہمیں کون نکال سکتا ہے۔" کانگریسی بھیا خفا ہوتے۔

مشرقی پنجاب کی طرف سے ریل گاڑیاں کٹ کٹ کر پاکستان پہنچ رہی تھیں۔ پیدل چلتے قافلوں پر حملے ہوتے' ہندو پڑوسی اور ملازمین تسلی دینے آتے تھے۔ "آپ کو کہیں جانے کی کیا ضرورت' ہمارے ہوتے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے۔"

"بٹ کے رہے گا ہندوستان' لے کے رہیں گے پاکستان۔"

ہری جھنڈیاں اٹھائے گلی سے بچوں کا جلوس گزرتا۔ دوسری طرف سے ہندو بچوں کا جلوس آتا۔ وہ اکھنڈ بھارت کے نعرے لگاتے' ترنگا لہراتے' آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے' گلی کے نکڑ پر دونوں گروہوں میں خون خرابہ بھی ہوتا۔ آہستہ آہستہ گھر خالی ہونا شروع ہو گئے تھے' ہر روز کسی کے پاکستان چلے جانے کی اطلاع آ جاتی۔ حمید بھائی سرکاری ڈیوٹی سے روز جھنجلا کر پوچھتے تھے کہ آخر "وہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں' پاکستان کو کوچ کیوں نہیں کرتے۔" لوگ منتظر آنکھوں سے کانگریسی بھائی کی طرف دیکھتے۔

"کیوں جائیں گے ہم؟" وہ حتمی فیصلہ سنا دیتے۔

"آپ ضرورت کا سامان باندھ رکھیے گا۔" حمید بھائی کی حتمی اور آخری اطلاع آئی۔" رشید بھائی کی اطلاع لے کر اماں ... صبح میں ٹرک لے کر آپ تک پہنچ جاؤں گا۔ منہ اندھیرے نکل لیجئے گا۔ اب غیر ضروری تاخیر نامناسب ہر طرف سے جو خبریں آ رہی ہیں اس کے بعد ایک پل بھی ٹکنا موت کو دعوت دینا ہے۔ جس کو نہیں جانا' وہ

نہ جائے۔"
بھائی نے چیں بہ جبیں ہو کر ٹانگ پہ ٹانگ بدلی۔
"جس کو جانا ہو جائے۔"

احتیاط کے تقاضے میں ٹھیکری پہرے کا رواج عام ہو چلا تھا' نوجوان جتھے باری باری راتوں کو جاگتے۔ پھر جس صبح ٹھیکری پہرہ دینے والوں کی لاشیں گلی کے کونوں میں اوندھی پڑیں ملیں جن میں سے ایک لاش منیر میاں کی بھی جن کے پاؤں زمین میں اور نظریں کبوتروں پر ہوتی تھیں۔ اس روز روانگی والے اتوار میں دو دن باقی تھے اور ان کی حفاظت کا وعدہ کرنے والے اور گھر میں کام کاج کی غرض سے آنے والے ہندو کب سے غائب تھے۔

فضا میں خوف کا سکوت طاری تھا۔ کنویں کی چرخی چلاتے عطن نے سوچا' پچھلے تین دن سے گھڑے نہیں بھرے گئے۔ کام پر نہ ماشکی آتا تھا نہ برکاش چاچا جو چارپائیاں کمروں سے صحن میں نکالتے تھے۔ حفاظت کے خیال سے انہوں نے آنگن چھوڑ کر حبس زدہ کمروں میں سونا شروع کر رکھا تھا اور پتا نہیں کتنے دن سے اندر سے باہر کا اور باہر والوں کا اندر سے رابطہ منقطع تھا۔

یوں ہی اسے شک پڑا آدھی رات کی اس خاموشی میں کمروں کے باہر ان دبی دبی سی سرگوشیوں کا کیا جواز ہے۔
"چھوٹے بھیا!" عطن نے خود سے سرگوشی کی۔ "باہر کوئی ہے" کھڑکی کھول کر اسے باہر جھانکنے کی ہمت نہیں پڑی اور ضرورت بھی نہیں ہوئی۔ وہ سب دیواریں پھاند کر اندر آ گئے تھے۔
"ہاں بیٹا! یہ۔ کلمہ پڑھ لو۔" انہوں نے سکون سے کہا۔

دیواروں سے کود کر اندر آتے لوگوں کے ہاتھ سر سے بلند تھے جن میں بھڑکتی آگ کے علم روشن تھے۔
"لڑکی کدھر ہے؟" اتنی بہت سی روشنیوں سے ہر طرف آگ کی بھڑکتی چمک اور دیواروں پر خرگوش تھے' نہ اڑان بھرتی چیلیں' انہیں لڑکی کی ایک جھلک ہی دکھائی دی۔ کیونکہ اس سے قبل وہ دروازے کے اندر آتے وہ کنویں کی تہہ میں سائے کی طرح ڈولتے اپنے عکس سے ملنے اتر گئی تھی۔

انہوں نے بھڑکتی مشعلوں سے پردوں کو چھوا۔ میلی پڑتی چادروں اور گاؤ تکیوں والے تخت کو آگ دکھائی اور جس کے ہاتھ جو لگا اٹھا کر چلتا بنا۔ صحن کے آخری کونے میں کینوس کی کرسی پر سیاہ صفحوں والی تصویروں کا البم اوس سے بھیگا' آگ سے بے نیاز پڑا تھا۔ شام پڑے وہ اس کرسی پر بیٹھے یوں ہی ان البم کے ورق الٹ رہے تھے۔ وہ خود ان تصویروں میں نہیں تھے کہ تصویر کشی کے خلاف تھے۔ گھر میں بھڑکتی آگ نے اندھیرے میں ڈوبی بستی کو اجال دیا تھا روشنی کی چکا چوند میں انہوں نے دیکھا بستی پر ایک مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ یہ زندوں کا قبرستان تھا۔

رشید کے سب سے چھوٹے خوف زدہ بچے کو سینے سے لگائے انہوں نے ایک نظر پلٹ کر اپنے گھر کی طرف دیکھا۔ اوپر والی منزل سے لکڑی کی بخاری جل کر نیچے گری۔ کنویں کی تہہ میں کون تھا۔ دروازوں' کھڑکیوں کے جھلستے ملبے کے ڈھیر میں کون کون دفن تھا' گنتی کا وقت نہیں تھا اور پہچان سلب ہو کے رہ گئی تھی۔ انہوں نے بچے کھچے لوگوں کی طرف پلٹ کر دیکھا اور ایک بڑے گھر سے مختصر قافلہ لیے پکی اینٹوں کی سڑک پر پاپیادہ ایسے چلے جیسے کوئی خواب میں چلے۔
"پاکستان زندہ باد۔" کانگریسی بھیا نے ایک گہرا دبا دبا سانس آزاد کیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ایک کرب مسلسل

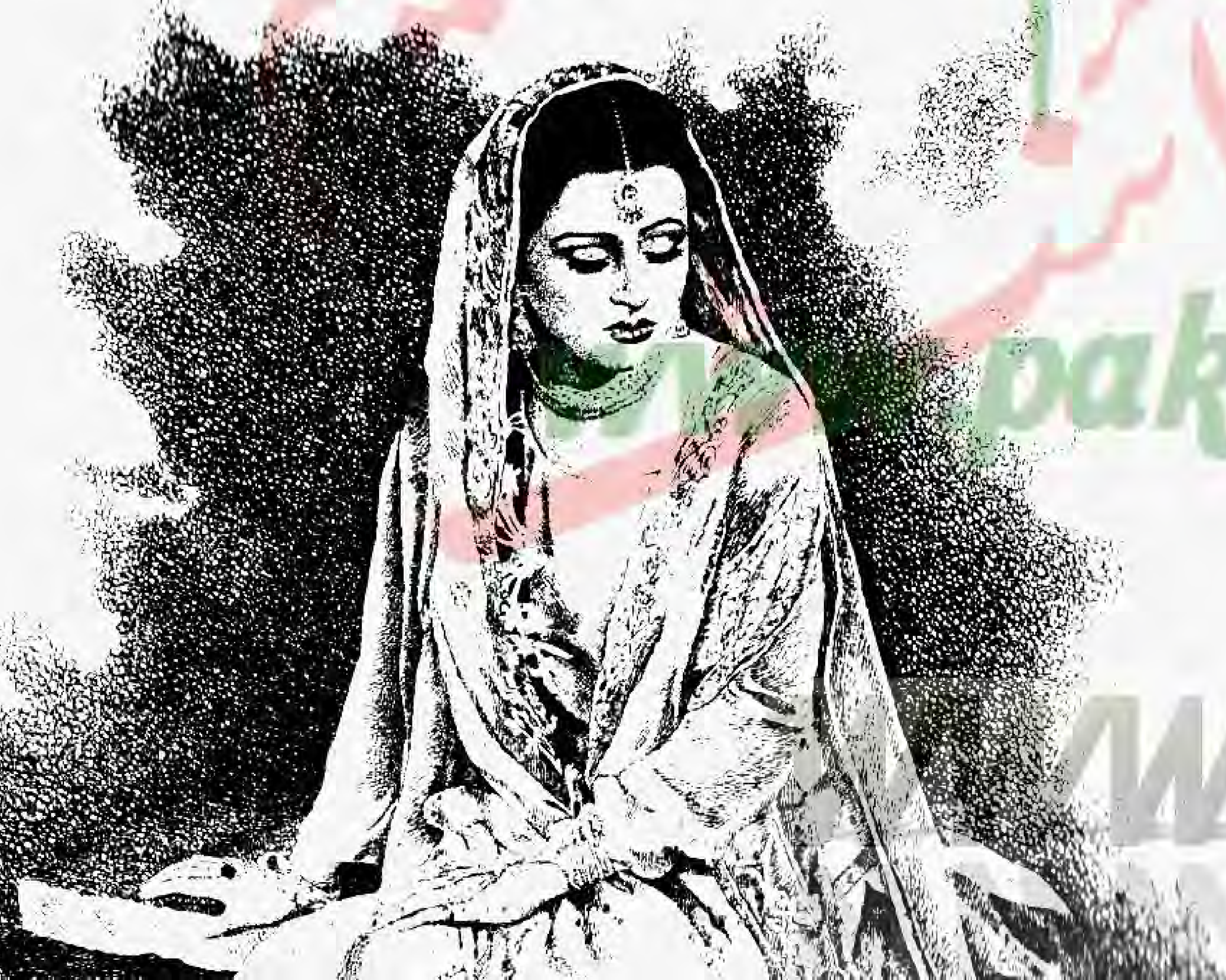
سعدیٰ حمید چوہدری

وہ برائیڈل ڈریس میں بہت خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ سانولا رنگ تمتما رہا تھا جیسے بن مانگی دعا قبول ہو گئی ہو۔ آنکھوں میں عجب سرخی تھی۔ جیسے نکلتے سورج کی دل ربائی اس کی آنکھوں میں اتر آئی ہو۔ اس کی آنکھوں کے جلتے بجھتے دلوں سے اس سے' رسم آشنائی چل نکلی تھی۔ اس کا وجود بول رہا تھا۔ ماحول کی خاموشی میں دیواروں نے بھی وصف گویائی پا لیا تھا۔ ہر چیز بے پناہ شور کر رہی تھی۔ اس کے کنگن' چوڑیاں' ماتھے کی بندیا' دل کی دھڑکن' گلاب کے پھولوں کی خوشبو کا بے پناہ شور تھا۔

یہ کیسی عورت تھی۔ کیا میں نے پہلے کبھی کوئی عورت نہیں دیکھی تھی۔

حماد حسین نے تو عورت کو کھلونے کی مانند رکھا تھا' جانچا تھا اسے' پھر کیا بات تھی کہ وہ بے بس ہو گیا تھا۔ یا پھر بے بس کر دیا گیا تھا۔ اس کے کہے گئے لفظ' اس کے گرد دیوانہ وار رقص کر رہے تھے۔ فیصلہ ہجر گزری شب کے عکس کی طرح اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

سمجھوتا یا محبت یہ دونوں لفظ اس کی لغت میں نہیں تھے۔ مگر وہ سمجھوتا کرنے پہ مجبور تھا اور محبت اس کی رگوں میں اتار دی گئی تھی۔



بے بس کردیا گیا تھا وہ ظاہرا" نہیں باطنی جسمانی نہیں ذہنی طور پر اس کے کہے گئے الفاظ اس کے گرد ایسے محو رقص تھے۔ جیسے کوئی کاغذ کا ٹکڑا آندھی کے تیز بگولے کی زد میں آجائے۔ وہ ایک صحت مند، مکمل شخصیت کا حامل تھا۔ مگر صرف جسمانی طور پہ، اس کے جسم کے ایک حصے میں ہمہ وقت سائیکلون تباہی مچائے رکھتا تھا۔ اس سائیکلون کی نوعیت کیا تھی؟ کوئی سائیکولوجسٹ یا سائیکو انالسٹ، اس بات کی وضاحت نہیں دے سکا تھا کہ اس کے اندر ہمہ وقت موجزن رہنے والے اضطراب کی وجہ کیا ٹھہری تھی بھلا؟

کوئی شدید نوعیت کا احساس گناہ؟

"میں نے کبھی خود کو پارسا آدمی سمجھا ہی نہیں۔ گناہ نہ جانے کتنے کر چکا ہوں کوئی پچھتاوا، کوئی احساس جرم؟ کچھ بھی نہیں۔ میرا شمار ان خوش قسمت لوگوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے جو چاہا وہ مل گیا۔ جلد یا بدیر..... وہ ایک عجیب و غریب اعصاب کا مالک شخص تھا۔

سارہ ملک سے شادی بھی اس کے اضطراب کو کم نہیں کرپائی تھی۔ وہ بہت اچھی اور باصلاحیت لڑکی تھی، پڑھی لکھی سمجھ دار۔۔۔ دونوں کے درمیان ایک قدر مشترک تھی۔ دونوں ہی بینکنگ سے وابستہ تھے۔ ان کے درمیان زبردست قسم کی انڈر اسٹینڈنگ ہونی چاہیے تھی۔ مگر یہ ہی واحد چیز تھی جو ان کے درمیان نہیں تھی۔

حماد حسین سے شادی سارہ ملک کا سب سے بڑا خواب تھا اور جب وہ پورا ہوا تو وہ کئی ہفتے سو نہیں پائی۔ جاگتی آنکھوں کا یہ خواب اس کی نیندیں اڑا لے گیا۔ پھر وہ بے خوابی اس کی زندگی کا سب سے اہم حصہ بن گئی کیونکہ اس نے حماد حسین کو بہت کم سوتے دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں تو مکینیکل سا آدمی ہوں۔ ہر چیز میں حساب کتاب، ہر معاملے میں ڈسپلن اتنے بجے سونا ہے، اتنے بجے اٹھنا ہے۔ میری ہر مصروفیات میرے سیکریٹری کی ڈائری پہ درج ہو گئی ہے اور پھر میں اپنی روٹین میں کوئی تبدیلی کرنا پسند نہیں کرتا۔"

پوچھے گئے سوال پہ اس نے کسی قدر تلخی سے کہا تھا۔

"بداخلاقی میرا رویہ نہیں ہے۔" اس سوال پہ تو وہ بھڑک اٹھا تھا۔

ارمغان انڈسٹریز کے نعمان اسلم سے ہونے والی ایک جھڑپ کے بارے میں ایک بالواسطہ سوال تھا اور اس کے چہرے پہ سرخی اور پسینہ نمودار ہوا تھا۔

"مجھے کوئی پرابلم نہیں ہے۔ دوسروں کو مجھ سے پرابلم ہوتا ہے۔"

"لوگ کہتے ہیں کہ آپ کو اخلاقی تربیت نہیں دی گئی؟"

نوین ارتضیٰ کے سوال پر وہ ایک دم سرد سا ہو گیا تھا۔ سر کرسی کی پشت پر ٹکائے وہ کچھ ثانیے اسے دیکھتا رہا تھا۔ نوین کو لگا کہ اس کی ہتھیلیاں بھیگنے لگی ہیں۔

وہ بزنس ٹائیکون تو تھا مگر اسے بہت سے چیلنجز کا سامنا تھا۔ یہی چیلنجز اور نامعقول رویے اسے بے انتہا جھنجھلاتے تھے۔ اس کی شخصیت کو گرم رخ دیتے ہوئے رویے۔

"ایک یتیم کی کیا اخلاقی تربیت ہو سکتی ہے بھلا؟"

نوین ارتضیٰ کو لگا تھا کہ وہ رو پڑے گا۔

"کون کرسکتا ہے؟ یہ وہ شے ہے، جو پیسے سے نہیں مل سکتی۔" وہ ہنسا تھا۔ مگر آنکھوں میں درشتی کی سطح سے اس کی مسکراہٹ ٹکرا کر فنا ہو گئی۔

"آپ کے والدین؟"

"بچپن میں ہی ساتھ چھوڑ گئے۔" "کیسے؟"

"یاد نہیں مجھے۔" اس نے سوال مکمل نہیں ہونے دیا تھا۔" اور جاننے کی میں نے زحمت نہیں کی۔ طالب علمی کی عمر بورڈنگ میں کٹ گئی۔ میری کوئی مورل ویلیوز (اخلاقی اقدار) نہیں ہیں۔"

وہ گویا کسی اور زمانے میں پہنچ گیا تھا۔

"رہی سہی کسر انکل ابرار نے پوری کردی۔ میرے گارجین۔" اس نے نوین کی وضاحت طلب نظروں

...اب میں کہا تھا۔ "گھر پہ قبضہ کر کے آدھی جائیداد اپنے نام کرلی۔ جو بچی کھچی میرے حصے میں آئی، وہ اپنے بل بوتے پہ میں نے دگنی کرلی۔" اس کے لہجے میں واضح تفاخر تھا۔

"خوش قسمتی کا یہ پہلو تو ہے میرے پاس کہ خاک کو بھی ہاتھ لگاؤں تو سونا بن جاتی ہے۔

بات پتا کیا ہے مس نوین!" وہ گویا کسی منطقی نتیجے پہ پہنچ گیا تھا۔ "مجھے خود بھی کسی سے تعلق یا قرابت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوستوں کو میں نے کبھی آزمایا نہیں۔ والٹ میں پیسے ہوں تو ہر چیز خود بخود آپ کی جھولی میں آن گرتی ہے۔"

وہ یہ کہتے ہوئے مسکرایا تھا اور اس کی تقدیر کا لکھا اس پر مسکرایا تھا۔ بعض اوقات، کہے ہوئے الفاظ مختلف شکلیں اختیار کرکے آنکھوں کے آگے ناچتے پھرتے ہیں۔ کون روک سکتا ہے اس اس رقص جنوں کو اور نہ ہی کوئی سعی جاوداں شکل اختیار کر سکتی ہے پھر۔

"میں نے زندگی کو پیسے کے بل بوتے پر گزارا ہے۔ یہ زندگی رشتوں کے جال سے مبرا ہے۔"

"عورت میری نظر میں؟"

عورت کے بارے میں سوال پر وہ پل بھر کو رکا تھا۔

"محض ایک ضرورت ہے۔" لہجے میں بے پناہ روانی و ملامت تھی۔ "عورت کے ساتھ کوئی خوب صورت رشتہ ہو سکتا ہے، میں نے کبھی نہیں سوچا۔ ان فیکٹ اس کی خوب صورتی پہ میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔"

نوین کا قلم ٹھہرا سا گیا تھا۔

"مجھے تو بس ایک ضرورت ہی لگتی ہے۔"

"محبت؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ "مجھے کبھی ملی ہی نہیں تو کیا بتاؤں اس کے بارے میں۔ یہ تو بس ایک کیمیکل ری ایکشن ہے۔ ایک طرح کا ہارمونیکل افیکٹ۔ ختم تو محبت بھی ختم۔"

اس نے اپنی بات ختم کر کے خود ہی قہقہہ لگایا تھا اکیلے ہی کیونکہ نوین کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ بھی نہیں آئی تھی۔ وہ اس کی شخصیت سے بے حد متاثر تھی۔ ٹی وی پہ نظر آنے والا ایک معتبر چہرہ۔ ٹی وی کے علاوہ اس سے اکثر پارٹیز میں بھی مل چکی تھی۔ مگر براہ راست ملاقات اسی انٹرویو میں ہو رہی تھی۔

وہ دم بخود تھی۔ وہ اسے ریاضی کا ایسا سوال نظر آرہا تھا، جس کے لیے ہر کلیہ، ضرب، تقسیم اور جمع کا ہر عمل بے کار تھا۔ نوین ارتضیٰ نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے اجازت چاہی تھی۔ شوٹنگ کا سیشن پہلے ہی ہو چکا تھا۔ کاغذات فولڈر میں لگاتے ہوئے، ریکارڈر سمیٹتے ہوئے بیگ کندھے پہ ڈالتے ہوئے اس کا دل چاہا تھا کہ وہ نوین ارتضیٰ کو دروازے تک رخصت کرنے آئے۔ مگر وہ بے نیازی سے پیپر ویٹ گھماتا رہا تھا۔ نہ شکریہ، نہ خدا حافظ، نہ ہی کوئی الوداعی نظر۔ نہ ہی کوئی رسمی کلمہ۔ اس نے اس کے کلمات سے بھرے کاغذوں کو تھام رکھا تھا۔ کالے پتھر اور پیلے پھول کا ساتھ لمحہ بھر کا تھا۔

☼ ☼ ☼

کالا پتھر اور پیلے پھول۔

بزنس اپ ڈیٹ کے مرکزی صفحے پہ حماد حسین کا انٹرویو اور تصاویر مرکزی اہمیت کی حامل تھیں۔ "بائے نوین ارتضیٰ" بظاہر عام سی بات تھی۔ مگر اتنی عام بھی نہیں کہ کالا پتھر اپنی جگہ پہ قائم رہتا اور مگر پیلا پھول پتی پتی بکھر گیا تھا۔

کالے پتھر اور پیلے پھول کی کہانی، زبان زد عام نہیں ہوتی۔ یہ لمحہ بھر کو جنم لیتی ہے پھر ستارہ سحر کی مانند افق پہ کہیں بکھر جاتی ہے۔ معصوم قدموں کی مانند راستوں پہ روندی جاتی ہے۔

انڈیا سے آئے ہوئے آکاش مہرہ کے ساتھ آفیشل ڈنر کرتے ہوئے رات کافی بھیگ چکی تھی۔ آکاش کو پی سی میں چھوڑ کر اس نے لانگ ڈرائیو کے ارادے سے گاڑی مرکزی سڑک کی جانب موڑ دی تھی۔ مال روڈ بہت گم صم تھی۔ کوئی اکا دکا گاڑی کے پہیے چرچراتے تو سڑک کے کنارے لگے درختوں میں بھی ہلچل مچ

جاتی۔
"کم آن مین 'ٹیک آ بریک'" گنگناتے ہوئے' وہ بے حد انجوائے کر رہا تھا۔ موبائل کی بپ نے اسے متوجہ کیا تھا "نبیل کالنگ" اسکرین پہ جگمگاتے نام نے اسے بے حد مزہ دیا تھا۔ جان دار مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کا احاطہ کیا تھا۔
"کہاں ہے یار؟" بے تکلفی سے پوچھا گیا۔
"خیریت ہے؟"
"خیریت ہی تو نہیں ہے۔ آج میں نے تیرے لیے ایسا چاند ڈھونڈ نکالا ہے جو تیری شب کو چار چاند لگا دے گا۔" "میں تیرے گھر کے سامنے کھڑا ہوں۔"
"چاند کون ہے؟" حماد حسن نے دلچسپی سے پوچھا۔
"تیرے ویک اینڈ پہ میری طرف سے ایک تحفہ ہے یار من!"
ایک عجیب سی سنسناہٹ نے حماد حسن احاطہ کر لیا تھا۔ چاند کو دیکھنے اور اسے چھونے کی خواہش نے اس کا دامن بے دردی سے کھینچا تھا۔ نہ جانے کیوں حماد حسن کو ہر وہ چیز بے حد متاثر کرتی تھی۔ جو اونچے آسمانوں کا حصہ ہو۔ گھر کی طرف گاڑی موڑتے ہی اسے نبیل کی گاڑی کی جلتی بجھتی ہیڈ لائٹس نظر آئی تھیں۔
"ہائے یار!" نبیل اسے دیکھتے ہی گاڑی سے نیچے اتر آیا تھا۔ کیسا ہے تو؟"
"فائن یار!" اس نے بے تکلفی سے ہاتھ اس کے کندھے پہ رکھ دیا تھا۔
"شی از ہیئر!" نبیل نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا تھا۔
"کم آن۔" وہ گاڑی کے پاس جا کے دھیرے سے بولا تھا۔ وہ کالی چادر میں ملبوس تھی۔ کالی چادر نے اس کے پورے وجود کا احاطہ کر رکھا تھا۔ بہت عام سی' سر سے پاؤں تلک یا حماد حسن کو ہی ایسا لگا تھا۔
"او کے یار! میں چلتا ہوں۔" نبیل ہاتھ ہلا کر گاڑی کی جانب بڑھ گیا تھا۔
وہ ایک دم چونکا تھا۔ ضمیر گیٹ کھول چکا تھا۔ ضمیر بھی قابل ذکر اور نمایاں حیثیت کا حامل کردار تھا۔ اتنے بڑے گھر میں مالی ــــ باورچی اور چوکیدار اور نگران
حماد حسن کی فطرت میں عجب حق ملکیت تھا۔ اپنے گرد و پیش میں تبدیلی کو بمشکل ہی گوارا کرتا تھا۔ بس ضمیر کا وجود ہی گوارا تھا۔ اپنے گرد ہجوم بے کراں کو اکٹھا کرنا اسے ناگوار گزرتا تھا۔
"گو ان سائیڈ۔" وہ ہلکی آواز میں بولا تھا۔ "میں گاڑی اندر کروں گا تم اندر جاؤ۔"
وہ جھنجلا سا گیا تھا۔ نبیل نے یہ چاند نجانے کہاں سے دریافت کیا تھا شاید افریقہ سے۔ جوہانسبرگ سے۔

وہ خود ہی مسکرا دیا تھا۔ حالانکہ اس کا مسکرانے کو قطعی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے بیڈ روم سے آتی میوزک کی ہلکی ہلکی آواز نے اسے بتایا تھا کہ ضمیر نے اسے اس کے بیڈ روم میں بٹھا دیا ہے۔
اس کے آتے ہی ہلکی آواز میں میوزک لگانا' کمرے میں ہیٹر یا اے سی لگانا' کافی یا جوس تیار کرنا یہ سب ضمیر کی روزمرہ کی روٹین تھی' جس سے وہ کبھی نہیں چوکا تھا۔ اسی لیے وہ اتنے برسوں سے حماد حسن کے دل سے نہیں اترا تھا۔
اس کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا تھا۔ اسے وہ بے حد عام سی لگی تھی اور عام چیز تو حماد حسین کی فہرست میں تھی ہی نہیں۔ نجانے نبیل نے مجھ سے مذاق کیا تھا یا وہ واقعی سنجیدہ تھا۔ وہ صوفے پہ سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ صوفے پہ ٹانگیں سمیٹے ہوئے اور گھٹنوں میں سر دیے' وحشت زدہ ہرنی۔ وہ اندازے لگاتا ہوا کمرے میں داخل ہو کر بے مزا ہوا تھا۔
اس نے اس کی موجودگی کا گویا نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔ دراز کھول کے سامنے آنے والے شرٹ اور ٹراؤزر کھینچ کے نکالے۔ ہینگر زمین پھینک دیے۔ باتھ روم کا دروازہ ٹھاہ کی آواز سے بند ہوا۔ صوفے پہ بیٹھے ہوئے جامد وجود میں لحظہ بھر کو ہلچل مچی تھی وہ نجانے کتنی دیر تک گرم پانی کا شاور لیتا رہا تھا۔ ایک گھنٹہ یا اس سے بھی زائد باہر بیٹھے وجود سے بالکل بے خبر مگن

انداز میں بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا وہ باہر نکلا ایک دم
"اوہ مائی گڈنیس!" نامعلوم سی کڑواہٹ نے اس کا احاطہ کیا اسے وہ بالکل بھی اچھی نہیں لگی تھی۔
اس کا دل چاہا کہ نبیل کو فون کر کے کہے کہ اس تحفے کو واپس لے جائے' مگر نبیل کے ناراض ہونے کے خیال سے وہ رک سا گیا تھا۔ اسے مخاطب کیے بغیر' وہ بیڈ پہ بالکل سیدھا لیٹ گیا تھا۔ نجانے گرم شاور کا اثر تھا یا اتنی نیند اس پر غالب آ گئی تھی۔ سوچوں میں الجھے بغیر وہ نیند کی وادیوں میں اتر گیا تھا۔
وہ کسی معصوم بچے کی طرح سو رہا تھا۔ اپنی ہی باہوں میں چہرہ سمیٹے' جیسے آسمان پر تیز چاندنی پھیلی ہو اور بادل کے آوارہ ٹکڑوں نے مل کے کسی معصوم بچے کی صورت اختیار کر لی ہو۔
وہ عام سی لڑکی صوفے پہ بیٹھی اس سوئے ہوئے وجود میں زندگی کی رمق تلاش کر رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے ایک نامعلوم خوف نے اس کا احاطہ کر رکھا تھا۔ ایک دم اس نے اپنے پنجے' اس کی رگوں سے ہٹا دیے تھے۔ وہ بے حد مطمئن ہو کے بیٹھ گئی تھی مگر خوف کی بھی تو نفسیات ہے۔ بظاہر ہٹ بھی جائے منظر عام سے مگر وجود کے گرد ایک ہالہ سا بنائے رکھتا ہے۔
اس نے کروٹ لی تھی۔ اب اس کا چہرہ براہ راست آنکھوں کی زد میں تھا جنہوں نے اسے یوں تھام رکھا تھا گویا کوئی مقدس صحیفہ تھام رکھا ہو۔ یا کوئی آیت اترنے کو مل گئی ہو۔ کمرے کی فضا میں ایک تقدس آمیز خاموشی تھی۔ ایک اپنائیت کی بو تھی جس نے اس کے روم کا احاطہ کر لیا تھا۔ وہ سویا ہوا وجود اسے زندگی کی ایک نئی جہت سے متعارف کروا رہا تھا۔ جو تعلق اس سوئے ہوئے وجود اور جاگتی ہوئی ہستی کے درمیان بنا تھا اسے "کن" کی خوشخبری تھی۔ خالق نے خالی دامن میں قوس قزح کے رنگ بھر دیے تھے۔
"ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے بمشکل ساتھ گھنٹے پہلے ملا تھا' اور بے خبر سو رہا تھا مگر اس کی نیندیں بنجر کر گیا تھا۔ آنکھوں کو اس سے کیا غرض کہ وہ اچھا ہے برا' پرایا ہے یا سگا۔ وہ تو جس چہرے میں کھب جاتی ہیں اسی کی ہو جاتی ہیں۔ پھر دل کو مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ اس عکس کو اپنے نہاں خانوں میں رکھ لے۔
اس نے مردوں کا ہر روپ دیکھا تھا مگر یہ روپ انوکھا سا کیوں تھا۔ کھڑی ستواں ناک اس کے غرور کو دوام دے رہی تھی بند غلافی آنکھیں سپنے دیکھنے سے انکاری تھیں مگر سپنوں کو جگانے کی اور دوسری آنکھوں کو دینے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ شہد رنگ بالوں کا گچھا ماتھے پہ بکھرا ہوا تھا۔
گہری خاموشی کو ہلکی دستک نے توڑا تھا' وہ ایک دم چونکی تھی۔
"مالک کافی!" ضمیر نے کہا تھا۔
"دے دو۔" اس نے کانپتی آواز میں کہا تھا۔
"مالک سو گئے کیا؟" وہ دبے قدموں سے چل کر آیا تھا۔ کافی رکھ کے وہ حماد حسن کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
"ایک کپ!" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔
"مالک کو جگانا مناسب نہیں۔" وہ ٹرے اٹھا کر اسی طرح دبے قدموں سے پلٹ گیا تھا۔
کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے' گرم بھاپ کی اوٹ لے کر' اس کی آنکھوں نے دھند کی چادر اوڑھ لی تھی۔
"ہر پل روندے جانے کا خوف' میری چادر میں بندھ گیا ہے۔ کوئی قدر شناس ـــ؟" وہ کپ کی سنہری لائن سے ہاتھ کی لکیریں سہلا رہی تھی کہ شاید اس عمل سے اس کی تقدیر کوئی نئی سمت اختیار کر لے۔
"شاید یہ مجھے ناپسند کرتا ہے اسی لیے تو۔ یہ زندگی میں نے خود اپنے لیے منتخب کر لی۔" آنکھوں میں نمی نے رستہ بنا لیا تھا۔ وہ کپ رکھ کے اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی' جو بچوں کی طرح بے خبر سو رہا تھا۔ چہرے پہ معصومیت کا چاند طلوع ہوا تھا۔
"میرے خدایا! تو نے اس طرح کے شخص میں معصومیت کیسے بھر دی؟ دراز پلکوں سے مزین آنکھیں۔ اس نے آنکھوں کے غلافی پردوں کو دیکھا تھا اور اس کی آنکھیں کھلنے سے انکاری ہو گئی تھیں۔ وہ

اتنی بے اختیار کیوں ہو گئی تھی جیسے کسی مکڑی کے جالے میں پھنستی جا رہی ہو۔ وحشت اور بے اختیاری کا سفر غیر یقینی حالات میں طے کرنا بہت مشکل ہوا کرتا ہے۔ جبکہ مسافر "ہوس زدہ" قبیلے سے تعلق رکھتا ہو۔ مگر یہ کون تھا؟ جس سے اسے بالکل بھی نفرت نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے خیمۂ دل کے پاس کوئی جگنو ٹھہر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ واقعی مختلف قسم کا آدمی تھا۔ وہ ہوس زدہ لوگوں کے قبیلے سے تعلق ضرور رکھتا تھا' ہوس بھرے راستوں پر سفر کرتا تھا مگر ایک دو قدم چل کر ہی ہمت ہار بیٹھتا تھا۔ اچھے لوگوں کے لیے فطرت نے ان کے اندر سیفٹی والو لگا رکھے ہوتے ہیں۔ گویا قدرت ان کی حفاظت خود کرتی ہے۔ گویا ان کے اچھے پن پہ ساری دنیا کی بنیادیں کھڑی ہوں۔ ان کے بگڑتے ہی گویا سب کچھ دھڑام کر کے گر جائے گا۔

یہ نیند بھی اس کا سیفٹی والو ہی تھا۔ وہ کبھی خود پہ بھی منکشف نہیں ہو پایا تھا تو ایک انجان اور شاید بری لڑکی پہ کیسے منکشف ہو جاتا۔

ہم سے قاتل کے خدوخال پوچھو
ہم نے مقتل میں شب گزاری ہے
تم چاہو تو ہم پلٹ جائیں
سفر اب بھی اختیاری ہے
وصل کو کیسے معتبر سمجھیں
ہجر کا خوف دل پہ طاری ہے

وہ اس کی قد آور تصویر کے سامنے کھڑی تھی۔

دل بھی شہزادہ ہوتا ہے نامعلوم جگہ کا' ہر چیز کو اپنا محکوم سمجھ کر حکم جاری کر دیتا ہے بس۔ مگر جب آنکھ کھلتی ہے تو مچلنے کا عمل رک سا جاتا ہے۔ ایڑیاں رگڑنا بند کر دیتا ہے تو پھر پتا چلتا ہے کہ شہزادہ لٹ چکا ہے۔ زاد سفر کے نام پہ بس اک لٹا ہوا دل ہے یا پھر رائیگاں جانے کا دکھ ہے جو رگوں میں پیوست ہو جاتا ہے۔

یا پھر دل ایک فقیر ہوتا ہے۔ جو کبھی ضد نہیں کرتا' کبھی خواہش کا اظہار نہیں کرتا' بس چپ چاپ مٹی کا حصہ بن جاتا ہے۔ چپ چپاتے ہی زندگی کے ساتھ جڑی گرہ کھل جاتی ہے اور اس کا دل بھی عجیب تھا' کبھی شہزادہ کبھی فقیر.... بے اعتباری اور اعتبار کے پنڈولے کے درمیان جھولتا ہوا دل۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ اس کے عارض و رخسار کی گرمی سے اسی کے پاؤں جل اٹھے تھے۔ وہ اس کے پیروں سے گال ٹکائے بے خبر سو رہی تھی۔ کمرا ہیٹر کی گرمی سے دہک رہا تھا۔

کبھی شروع کی راتوں کا نوخیز چاند دیکھا ہے' جس کی چاندنی بے حد مدھم مگر اثر بہت زود آفریں ہوتا ہے۔

شاید اس کی نظر کا اثر تھا کہ وہ بے چین ہو کے اٹھ گئی تھی۔

"چلو تمہیں چھوڑ دوں۔" اس نے اس لمحے کی قید سے ہاتھ چھڑایا تھا۔ شاید صبح کے چار بج رہے تھے۔

"آپ میری ایک بات سنیں گے؟"

"کیا....؟" وہ جوتے پہنتے پہنتے رک گیا تھا۔

"آپ مجھے خرید لیں۔" کتنی انوکھی فرمائش تھی۔

وہ ایک دم ٹھٹک سا گیا تھا۔ اس کے پورے وجود پہ عمومیت کا ٹیگ لگا ہوا تھا اور وہ "حماد حسن" اسے خرید لے گا' کتنی انوکھی فرمائش تھی نا۔

"پلیز یہ مت کہیے گا کہ آپ کے پاس مجھے خریدنے کے لیے قیمت نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں ٹوٹے ہوئے شیشے کی کرچیاں تھیں۔

جوتے پہن کر موبائل اور بٹوہ نکالنے کی غرض سے وہ دراز کھولنے کو جھکا تھا۔ اس نے اس کی بات کا جواب دینے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

"عام سی لڑکی کی عام سی خواہش۔"

"نوکرانی بنا کر رکھ لیں۔ گھر کے سارے کام کر دیا کروں گی۔"

"ضمیر کرتا ہے میرے سارے کام۔" وہ باہر نکلنے کو تھا۔

"آپ ایک خدا کو مانتے ہیں نا۔ آپ کو اس کا واسطہ۔" وہ لپک کے اس کے سامنے آئی تھی۔ یہ وقت خدا کے وجود پہ بحث کرنے کا نہیں تھا مگر وہ رک گیا تھا۔

ایک بکنے والی عورت کے منہ سے خدا کا ذکر؟

"مجھے لگتا ہے کہ یہ میرے پاس آخری موقع ہے' اس کے بعد فطرت مجھے کوئی اور موقع نہیں دے گی اور آپ کے پاس نیکی.... شاید اتنی بڑی نیکی کرنے کا یہ آخری موقع ہو' پلیز۔"

نین کٹورے پانیوں سے بھرے تھے۔ اس کی معصومیت پارہ پارہ ہونے لگی تھی اور پارے میں ملامت کی ہوا بھر رہی تھی۔

بٹوہ میز پہ رکھنے اور جوتے اتارنے کے عمل کے دوران وہ اسے خریدنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ کیوں' ارادتاً" "بے ارادہ' بے ساختہ پتا نہیں مگر وہ ارادہ کر چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم نے اتنی بڑی رقم ایک لڑکی کی خاطر برباد کر دی؟" نبیل تقریباً چیخ ہی اٹھا تھا۔ "تم حواسوں میں ہو اپنے۔" وہ میرا چہرہ دیکھتے ہوئے مجھ سے تصدیق چاہ رہا تھا۔

"نہیں۔" میں جیرالڈ کی فیکس پڑھ رہا تھا۔ نبیل کو اچھی طرح پتا تھا کہ میرا موڈ آف ہے مگر اس کی حیرت اس کے اندر چیخیں مار رہی تھی۔

"تم نے ہی تو کہا تھا کہ وہ چاند ہے اور میری شب کو چار چاند لگا دے گی۔"

"صرف ایک شب کے لیے اور.... اتنی بڑی قیمت؟" وہ ششدر تھا۔

"میرے لیے اتنی بڑی نہیں ہے۔" اندر سکون کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ تین دن ہو گئے تھے۔ اس کو چھونے کی' اس کے لمس کی خواہش میرے اندر نہیں جاگی تھی۔ کیا وہ عورت نہیں تھی یا وہ واقعی اتنی پاکیزہ مقدس تھی.... پاکیزہ اور مقدس؟ کیا کوئی بکنے والی عورت مقدس ہو سکتی ہے؟ یا پھر قدرت اس کی حفاظت کیوں کر رہی تھی؟

"میں نے کچھ نہیں کیا اس کے لیے' اس کے خدا نے کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب مجھے نہیں پتا۔" میری خالی ہلتی ہوئی کرسی نے نبیل کو بتا دیا تھا کہ میں اس موضوع پہ مزید بات نہیں کرنا چاہتا۔

"یار! اس ٹائپ کی لڑکی اور خدا سے تعلق.... اور تم اس بات پہ اتنا یقین کیسے کر سکتے ہو جب کہ تم نے خود کبھی جمعہ کی نماز بھی نہیں پڑھی۔"

لفٹ کا دروازہ تقریباً بند ہونے کو تھا اور وہ اندر گھس آیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ میں جواب نہیں دوں گا' پھر بھی نجانے کیا کیا بولتا رہا' جب کہ میں کان لپیٹ چکا تھا۔

"سوشل ورکنگ کا نیا شوق تمہیں لے ڈوبے گا' دیکھنا تم۔"

آخری جملہ میرے کانوں سے ٹکرایا تھا اور میں نے بے حد بے مزا ہوتے گاڑی کا شیشہ چڑھا لیا تھا۔

بعض اوقات' زندگی اتنی بڑی کروٹ لے لیتی ہے کہ آپ نئی جہتوں کا شمار کرتے ہوئے بے پناہ تھکن کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ لبرٹی کے سامنے سے گزرتے ہوئے بوتیکس میں سے جھانکتے ہوئے ملبوسات نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا تھا۔

نجانے کیا سوچ کر میں نے اس کے لیے اتنے کپڑے خرید ڈالے تھے۔

"صاحب!" شاپرز تھامتے ہوئے وہ بے حد ہراساں ہو رہی تھی (یا مجھے ہی لگ رہی تھی) "اتنے قیمتی کپڑے میں نے کبھی نہیں پہنے' آپ نے کیوں اتنی زحمت کی؟"

"میں نے کبھی عام یا ہلکی چیز خریدی ہی نہیں۔" میں نے شدید جھنجلاہٹ میں جواب دیا تھا۔ مگر وہ جھنجلاہٹ بھرا جملہ عام نہیں تھا۔ میں نے دروازہ شدید غصے میں بند کیا تھا۔ نجانے کس بات پہ غصہ تھا۔

مارکیٹنگ کے سلسلے میں ہونے والی میٹنگ اور غنی برادرز کا ٹینڈر نہ ملنے پہ مجھے کچھ ٹینشن سی تھی۔

میں تھکا ہارا سا گھر میں داخل ہوا تھا۔ بعض اوقات زندگی کے بارے میں ہر نظریہ ' ہر فلسفہ غلط ثابت ہونے لگتا ہے۔ ہر حرف الٹا ہو جاتا ہے۔ جیسے آئینے کے سامنے رکھ دیا گیا ہو۔ اس دن دھوپ بھی عجب بدرنگ سی تھی۔ گرد نے سورج کا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ عجب سا دن تھا گویا کچھ عجیب سا ہونے جا رہا ہے۔

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی ایک مزے دار سی خوشبو نے اشتہا کو بڑھا دیا تھا۔ ضمیر کھانا ضرور بناتا تھا مگر اشتہا انگیز نہیں ہوتا تھا۔ وہ کچن میں تھی۔ "کیا ہو رہا ہے۔" میں دروازے ہی میں ٹک گیا تھا۔ اس نے تازہ جوس میری طرف بڑھایا۔

"مجھے آپ سے بات کرنا تھی۔" وہ متذبذب سی تھی۔

"کیا؟" میں رک گیا۔

"وہ آپ ضمیر کو میرے بارے میں۔۔۔" وہ اٹک گئی تھی۔

"وہ آپ کے بارے میں بہت پوزیسیو ہے۔" وہ رک گئی تھی۔

"مجھے لگتا ہے 'وہ مجھے ناپسند کرتا ہے۔ آپ کا کوئی کام کروں تو اسے ناگوار گزرتا ہے۔ آپ اسے۔۔۔"

"میں سمجھا دوں گا اسے۔" میں نے اس کی بات مکمل نہیں ہونے دی تھی اور پلٹ گیا تھا۔ اس کی موجودگی کا میں خود تعین نہیں کر پا رہا تھا۔ ضمیر تو میرا نگران تھا۔ بچپن سے۔ میرے ہاتھ فیصلے کے ریشم میں پھنس گئے تھے گویا۔

☼ ☼ ☼

وہ کچن میں ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھی سبزیاں بنا رہی تھی۔ بالوں کی لٹیں بکھری سی گئی تھیں۔

"ضمیر کہاں ہے؟"

"وہ ذرا باہر تک گیا ہے۔" وہ گھبرا کے کھڑی ہو گئی تھی۔ چھری اپنی نوک سمیت اس کے پاؤں پہ گری تھی۔ اس کے چہرے پہ تو اذیت کے کوئی آثار نہیں مگر آنکھوں میں ہلکی سی سرخی اتر آئی تھی۔ جب آپ کے پاس کوئی اور نہ ہو تو نظر آنے والی واحد چیز آپ کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ میں نے نگاہ خاص پہ خود کو تسلی دی تھی۔

"سنو! دودھ گرم کر کے لانا۔" میں کمرے کی طرف پلٹ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بوتل کے جن کی طرح دودھ گرم کر کے لے آئی تھی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر محض سر ہی اٹھا پایا تھا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہوں بس ہلکی سی حرارت محسوس ہو رہی ہے۔"

"دودھ پی لیجیے۔" وہ مجھے گلاس پکڑا کر ذرا فاصلے پہ جا کے کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے گلاس پکڑنے کی کوشش کی تھی مگر وہ ہاتھ سے پھسل گیا تھا۔ نیم گرم دودھ میرے اوپر گر گیا تھا۔

"مائی گڈنیس ضمیر!" میں دھاڑا تھا۔ وہ افتاں و خیزاں تولیہ اٹھا کے لائی اور بوکھلاہٹ آمیز انداز میں ' میری شرٹ صاف کرنے لگی۔ اس کی کالی بھنورا سی آنکھیں نم ہو کے جھیل سی لگ رہی تھیں۔ میرے چہرے اور گردن کو صاف کرتے ہوئے اس کا چہرہ میرے بے حد قریب تھا۔ میرا دل چاہا تھا کہ میں اس کے گالوں کی ٹھنڈک محسوس کر کے دیکھوں۔

"مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ آپ کی طبیعت اتنی خراب ہے۔" میرے اندر کرلاتے اضطراب سے بے خبر وہ کہہ رہی تھی۔ اس نے الماری سے شرٹ نکالی۔

"یہ بدل لیں آپ۔"

"تم جاؤ میں بدل لوں گا۔" میں اس سے نظریں چرائے ہوئے تھا۔

"آپ جائیں۔ میں بیڈ شیٹ بدل دیتی ہوں۔" میں بڑی فرصت سے واش روم سے ہو کے آیا تھا۔ وہ بیڈ شیٹ بدل کے دودھ کا گلاس تھامے بیٹھی تھی۔۔۔۔ میں نے ہاتھ بڑھایا۔

"اونہہ! ناٹ اگین۔" وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ سے سہولت کے ساتھ گلاس کو تھامے ہوئے تھی۔

"تم کون ہو؟" یہ سوال نجانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا تھا۔

"میرا مطلب ہے۔" میں اٹک گیا تھا۔ شاید اس کے گال کے گڑھے میں الجھ گیا تھا۔

"میرا نام ملائکہ ہے۔" سب مجھے پیار سے لکی کہا کرتے تھے مگر شاید نام ہی لکی تھا۔ قسمت کے خانے میں تقدیر خالی کاغذ کی طرح کوری تھی۔ میں کسی تاریک راہ کی مسافر نہیں تھی۔ بہت بڑی حویلی تھی ہماری۔ پیلے پتھر والی جس کی دیواروں پہ سورج قیام کرتا تھا اور دھوپ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی۔ اپنے ابو کی اکلوتی بیٹی تھی میں۔"

اس کی آواز اب دھیرے دھیرے دم توڑ رہی تھی۔ اب کمرے میں 'میں نہیں تھا کہیں بھی۔ وہ تھی اور ساتھ میں اس کی تنہائی۔

"میرے ابو بھی اکلوتے تھے۔ ان کی لکی بھی اکلوتی تھی۔ مگر میرے دو چچا تھے سوتیلے۔ میرا سارا بچپن ان کے بازوؤں کے جھولے میں گزرا۔ مگر وہ کہتے ہیں نا بھولا ٹوٹے تو انسان بہت بلندی سے گرتا ہے۔ میرے دادا نے احمد پور شرقیہ والی زرخیز زمین میرے ابا کے نام لگائی تو سارے پیارے رشتے نفرت اور حسد کی آگ میں جھلس گئے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ زمین خاندان سے باہر چلی جائے گی کیونکہ خاندان میں میرا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ پھر وہ مجھ سے دس برس چھوٹے ذوالقرنین کا رشتہ لے کر آ گئے۔

جس کے بڑے ہوتے ہوتے میں بوڑھی ہو جاتی مگر شاید بہتر ہی ہو جاتا۔ کم از کم عزت کے ساتھ اکڑ کے تو جاتی ناں۔ میرے رنگ تو ماند نہ پڑتے۔"

وہ قالین پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھی نہ جانے کس دھیان میں تھی اور میں اس کے دھیان میں تھا۔

"ابو نے برادری والوں کے سامنے ان کی خوب بے عزتی کر کے ' دھکے دے کے نکلوا دیا تھا۔

اس دن وہ مجھے کالج کے ہاسٹل میں لینے آئے تھے۔ آسمان آگ برسا رہا تھا۔

میں اس دن احمد پور کی سڑکوں پہ نہیں بلکہ انجان سڑکوں پہ دوڑنے لگی۔ مجھے ہوش آیا تو محض در و دیوار ہی انجان نہیں تھے ' بلکہ لوگ بھی اجنبی تھے۔ نہ صرف اجنبی بلکہ ظالم ' وحشی اور انسان کے روپ میں جانور۔

کبھی جنگل میں کسی گلہری کے ساتھ 'کوئی خونخوار جانور کھیلتا ہو تو گلہری کے چیخنے کی آواز بھلا کہاں تلک جاتی ہے؟ کون بچانے آتا ہے اسے؟ مجھے بھی کوئی بچانے نہیں آیا اور لکی مر گئی۔"

مجھے احساس ہوا کہ اس کی آنکھیں احمد پور شرقیہ کی پیلی دھوپ سے لبریز تھیں ' بالکل مردہ سی۔ کتنے وجود ایسے ہوتے ہیں جو مردہ اجسام لیے زندگی جیتے ہیں۔ صرف چلتی سانس تو زندگی کی ضمانت نہیں ہوتی۔

"ابا نے مجھے کہاں کہاں ڈھونڈا ہو گا مگر شاید اس غلیظ جگہ پہ تو انہیں توقع ہی نہیں ہو گی۔ یا شاید انہوں نے ابا کو بھی مار ڈالا ہو گا۔ ورنہ وہ مجھے ڈھونڈ ہی نکالتے اور مجھے انہوں نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کی خاطر ' روند ڈالا۔ کتنے بے رحم لوگ تھے۔" کمرے میں گہری خاموشی ہو گئی۔

"عزت اور چار دیواری کے سائبان سے نکلنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔" اس نے بہت سرد آہ بھری تھی۔

"جانے کون سے لمحے کی خطا تھی جو مجھے سیاہ کار بنا گئی۔ آپ تو بہت پڑھے لکھے ہیں 'پتا نہیں اللہ تعالیٰ نے خودکشی کیوں حرام کی ہے؟"

"تاکہ زندگی اور موت کا اختیار خدا کے پاس ہی رہے۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"میرے جیسے لوگ جو صرف موت کی آرزو میں زندگی گزارتے ہیں وہ کیا کریں۔"

"مر کے بھی چین نہ پایا تو؟" میرے سوالیہ انداز سے وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"وہ الرحم الراحمین ہے۔" خدا کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا تھا میں۔

"دودھ نہیں پی رہے آپ۔ آپ کو پتا ہے 'آپ کو بخار ہے۔" اس کے لہجے میں خاصی خفگی تھی۔ خفگی تھی یا حاکمانہ انداز تھا۔ جو مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔

"تم جاؤ' پی لوں گا میں۔" عجب اکھڑپن تھا میرے لہجے میں وہ لحہ بھر کو حق دق ہوئی۔

"کوئی بات بُری لگ گئی آپ کو؟" اس کی نظروں میں عجب بے چینی تھی جو مجھے مضطرب کرنے لگی تھی۔ دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کر میں نے کمبل سر تک تان لیا تھا۔

وہ لائٹ بند کر کے باہر نکل گئی تھی۔ الجھن سی ہونے لگی تھی مجھے اس کے وجود سے۔

"وہ الرحم الراحمین ہے۔"

"میرا نام کلی تھا۔"

مختلف آوازیں گہری نیند میں غرق ہونے تک میرے سر پہ منڈلاتی رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

میرے ماتھے پہ یخ بستہ ہاتھ تھا۔ جو مجھے نیند کی گہری وادیوں سے کھینچ کے لایا تھا۔ گویا تپتے وجود پہ برفانی طوفان تھا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے اب۔ میں آپ کا بخار چیک کر رہی تھی۔" وہ کہہ رہی تھی۔ میری وضاحتی نظریں گویا اس کے چہرے پہ کھب رہی تھیں۔

"تم سے کس نے کہا کہ میرے کمرے میں بغیر اجازت آؤ۔"

"وہ ..... میں ... میرا مطلب ہے آپ کو سوئے ہوئے خاصے گھنٹے ہو گئے تھے ..... میں پریشان ہو رہی تھی۔"

"آؤٹ۔" میں حلق کے بل چلایا تھا۔ یہ میری سختی کی انتہا تھی۔ وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے باہر نکل گئی تھی۔ کیوں کر رہا تھا میں ایسا؟ مجھے لگنے لگا تھا کہ وہ اپنے وجود کا احساس میرے اندر اتار رہی تھی۔

مجھے اپنا وجود' اس کے مقابلے میں بونا سا لگنے لگا تھا۔ کیوں مقدس سی لگتی تھی وہ مجھے کہ احترام کرنے کو دل چاہے؟ کیوں عورت سی نہیں لگتی تھی وہ مجھے؟ یہ بہت سارے "کیوں" میرے اندر ایسا ہالہ بنا رہے تھے کہ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔

لانگ ڈرائیو کے خیال سے میں باہر آیا تھا۔ موسم خاصا خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ میں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ قالین پہ بیٹھی تھی۔ اس کے بیٹھنے کا انداز بہت عجیب سا تھا گویا سب کچھ ہار گئی ہو۔ چہرے پر عجیب دراڑیں تھیں جیسے چٹانوں کے ماتھے پہ ہوتی ہیں۔ اپنی ازلی بے نیازی کے سبب میں اس سے کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ پاس سے گزرتے ہوئے وہ ہفتہ وار میگزین میری نظر میں آیا جو میری تصویر سے مزین تھا۔

اس کی پراسراریت ختم ہونے کے بعد اس کے وجود میں میری دلچسپی یکایک ختم ہو گئی تھی۔ اس کی حیثیت اب ڈرائنگ روم میں سجے ہوئے شوپیس کی سی تھی۔

"کچن کے لیے کچھ سامان چاہیے۔" اس کی سرسراتی آواز میرا حلق تک کڑوا کر گئی تھی۔

"یہ ضمیر کا شعبہ ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔" میرا لہجہ خاصا کھردرا تھا۔ اس کے چہرے کا پھیکا سا رنگ دیکھ کر مجھے کمینی سی خوشی ہوئی تھی (اس نے نہ جانے کیا سوچ کے مجھ سے بات کرنے کا طریقہ ڈھونڈا تھا)

"سنو! اس سنڈے کو تمہارا نکاح کر رہا ہوں میں۔" مجھے لگا کہ وہ کھڑے کھڑے گر جائے گی۔ اس کا رنگ خطرناک حد تک زرد ہو گیا تھا۔

"میرا آفس ورکر ہے۔ بہت خوش رکھے گا تمہیں۔"

اس رات ہوائیں میری کھڑکی سے ٹکرا ٹکرا کر بین کرتی رہی تھیں۔ بارش کی بوندیں برس برس کر مجھے بد دعائیں دے رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"اب یہ مت کہیے گا کہ آپ کے پاس مجھے خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔"

میرے وجود میں کوئی کرچی سی چمکی تھی۔

"آپ ایک احسان کر دیجیے' میرے وجود میں چبھی سوئیاں نکال دیجیے۔"

میں نے نکیا اپنے پھر ... رہا لے ان آوازوں کا ... رہا تھا ..... وہ اس مسجد کی طرح تھی' جو ویرانے میں بن گئی ہو۔

اس نے کبھی مجھے اندر آنے نہیں دیا اور نہ میں کبھی اندر جا پایا تھا۔

مجھے اس کی مضبوطی سے خار آنے لگا تھا اور میرا دل چاہتا تھا کہ اس کے وجود کے ٹکڑے کر دوں اور میں نے ایسا ہی تو کیا تھا۔ فرق یہ تھا کہ ہاتھوں میں تیشہ نہیں تھا بس۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" نبیل تقریباً" چیخ ہی اٹھا تھا۔ "تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟ یہ بھی شکر ہے کہ یہ فریضہ آپ خود سر انجام نہیں دے رہے۔"

میں یکایک ہنس پڑا تھا۔

"ایسا بھی دماغ خراب نہیں ہے میرا۔" اس مرتبہ میرا قہقہہ کھوکھلا سا تھا۔ مجھے اپنے وجود سے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔

جہیز کے نام پہ میں نے طارق کو ایک خطیر رقم تھمائی تھی اور اتنی خوب صورت بیوی تو اس نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہو گی۔ طارق کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے ماتھے پہ شرافت کا ٹیگ لگا تھا۔ سارا قصہ سننے کے بعد (جو میں نے خاصا مختصر کر کے سنایا تھا) اس کا جواب یہ تھا کہ "اس میں اس کا کیا قصور ہے بھلا؟ یہ تو قسمت کی ستم ظریفی ہے۔"

اس لمحے مجھے یقین ہوا تھا کہ وہ اسے بہت خوش رکھے گا۔ میں نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اسے اس کے ماضی کا طعنہ کبھی نہیں دے گا۔ اس وقت بھی مجھے اپنا رویہ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وعدے وعید ایسے لے رہا تھا' جیسے اپنی قیمتی متاع اس کے حوالے کرنے جا رہا تھا۔

"دلہن بن کے بہت پیاری لگ رہی تھی۔ میں اسٹڈی روم میں بیٹھا نہایت اہم فیکس پڑھ رہا تھا۔ لفظ ... دھندلا گئے تھے۔

... میں پھیلا خالی پن بہت محسوس ہونے لگا تھا۔

ماتھے پہ یخ بستہ ہاتھ کی برف' میرے وجود میں' جم گئی تھی اس لمحے۔

تیرے بھی مشورے شامل تھے ترکِ تعلق کی خواہش میں
اے میری وحشت دل اب یہ اضطراب کیا ہے

وہ فیکس مجھ سے پڑھی نہیں گئی تھی۔ کاغذ پہ اس کی آنکھیں آگ آئی تھیں۔ میں نے کاغذ وہیں رکھ دیا۔

اگر میں چاہتا تو امام زماں بن جاتا۔ ایک بے سہارا لڑکی کو سہارا دے کر انسانیت کے عظیم میناروں پہ چڑھ کے بیٹھ جاتا اور میں سمجھ بھی یہی رہا تھا۔ کہ میں نے اس کے ساتھ بہت بڑی نیکی کی ہے۔ اس کو شرافت بھری زندگی کا سائبان دیا ہے۔ جبکہ اس نے کہا تھا۔

"آپ نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ!"

اس لمحے' اس کے ہونٹوں پہ بڑی جان لیوا مسکراہٹ تھی۔ یہ کیسی مسکراہٹ تھی جو اس کی آنکھوں تک نہیں پہنچ پائی۔ وہ ہنستی تھی اور اس کا کاجل روتا تھا اس وقت اس کے اس ایک فقرے نے میری انا اور عظمت کے سارے مینار دھڑ دھڑ گرا دیے تھے۔

وہ جا چکی تھی۔ میں اپنے وجود کی کرچیاں سمیٹے اپنی انا کے بت کی لاش اٹھائے خالی گھر میں پھرتا رہا..... مگر اپنی ازلی بے نیازی کے باوجود میں نے بہت سے راستوں سے اس تک جانے کی کوشش کی تھی۔ مگر ہر بار خود کو ایک بند گلی میں مقید پایا تھا۔ اس لمحے مجھے نبیل سے اپنی گفتگو یاد آئی تھی۔

"نبیل! ایک بات کہوں؟" شام کے پھیلتے سائے میں' اسکوائش کورٹ' میں اس کا ہاتھ پسینہ پونچھتے ہوئے رک گیا تھا۔

"وہ کہتی ہے۔" میں رک گیا تھا۔

"اب بولو بھی یار! کیا ارشاد فرمایا ہے ملکہ عالیہ نے۔ تم کیا چودھویں صدی کی دوشیزاؤں کی طرح شرما رہے ہو؟" وہ اپنی کٹ کے اوپر جھک گیا تھا۔

"وہ کہتی ہے' میں اسے روک لوں' جانے نہ دوں۔" نبیل کے قہقہے نے کورٹ کو ہلا کے رکھ دیا تھا

اور میرے چہرے پہ واقعی چودھویں صدی کی لڑکیوں جیسی سرخی در آئی تھی۔

"تو تو چاروں شانے چت ہو گیا ہے۔ تُو نے برائیڈل ڈریس کا کہہ دیا ہے نا نیلوفر سے۔" اس نے میری پرائیویٹ سیکریٹری کا حوالہ دیا تھا۔

"ہوں۔"

"تو یہی سچ ہے بس۔" وہ کٹ کندھے پہ ڈال کے چلنے لگا تھا۔

"تو ایسی عورت سے شادی کرے گا؟" وہ رکا تھا اور اس کی آواز خاموشی میں ڈھل گئی تھی۔ "کہیں تجھے اس سے محبت تو نہیں ہو گئی؟"

میں انجانے اضطراب میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"کیا ڈیفی نیشن (تعریف) ہے تیرے پاس محبت کی؟"

میں انجانے وسوسوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"بے بس ہو گیا ہے تو اس کے آگے۔" ہم دونوں نیلے آسمان کے نیچے کھڑے تھے۔

"نہیں۔" میں نے مدافعانہ انداز میں سر ہلایا تھا۔

"مگر میں چاہتا ہوں کہ جب وہ مسکرائے تو مسکراہٹ اس کی آنکھوں کی دہلیز تک پہنچے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے دکھوں کی زنجیر کا سلسلہ ٹوٹ جائے۔"

"یہی تو محبت ہے۔" "جب ہم کسی کو دکھ دینے کے خیال سے ڈرنے لگیں اور اس کے گرد سکھ کی چار دیواری تعمیر کرنا چاہتے ہوں۔"

"تم قبول کر لو گے' اسے اس کے ماضی سمیت؟"

وہ ایک دم میری طرف پلٹا تھا۔

"نہیں۔" نبیل نجانے کیوں میرے منہ سے 'نہیں' سننا چاہ رہا تھا۔ اور میرے منہ سے یہی نکلا تھا' وہ مطمئن ہو کے پلٹ گیا تھا۔

"تم کسی اچھی لڑکی سے شادی کر لو۔ وہ مجھے بچوں کی طرح پچکار رہا تھا۔

اور میں بہل گیا تھا..... مگر اس وقت اگر نبیل مجھے انسانیت اور عظمت کے میناروں پہ چڑھنے کا مشورہ دے دیتا تو کیا ہوتا۔ میں کیوں چاہتا تھا کہ میں خود نہ جھکوں اور احسان بھی کر ڈالوں۔

مگر محبت میں تو فیصلوں کے ریشم کبھی نہیں الجھتے۔ "نہیں" تو منہ سے نکلتا ہی نہیں۔ مجھ جیسے انا پرست کو محبت کیسے ہو سکتی تھی۔ بھلا۔ اور اگر محبت نہ تھی تو اسے بھولا کیوں نہیں آج تک۔ وہ میری ہر بے اختیاری میں' میری ذات کے انتشار میں زندہ کیوں ہے

طارق کے استعفے اور پھر کبھی نظر نہ آنے کے عمل نے میری ذات کے اندر ایسی آگ جلا دی تھی۔ جس کے بھانبڑ کے لیے تیل کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ سارہ ملک سے شادی کے بعد بھی وہ میرے لیے ایسا معمہ تھی جسے حل کرنے میں میری ساری زندگی داؤ پہ لگ گئی تھی۔

جب بھی بارش ہوتی ہے میرے اندر اس کو دیکھنے' اس کے عارض کی گرمی کو محسوس کرنے کی خواہش دھاڑیں مار مار کے رونے لگتی ہے۔

کیوں اس کی قیمت چکا کر بھی اس کی اک نظر کی قیمت میں ساری عمر چکا نہیں پایا۔ میری نارسائی کے ہاتھ میں نہ چراغ آیا اور نہ کوئی سلیقہ' جو میری ٹوٹی پھوٹی اور شکستہ انا کو جواب دے سکے۔

"بھلا ایک خریدی عورت" سے شادی ہو سکتی ہے؟"

مجھے یہ سوال نبیل کے بجائے خود سے پوچھنا چاہیے تھا۔

صحرا سے بچنے کے لیے بارش کی قیمت چکانا پڑتی ہے' ہے ناں؟ ٹھیک کہتا ہوں نا میں؟ اسے محبت نہیں آزمائش کہتے ہیں۔

وہ میری آزمائش نہیں تھی مگر میں نے اسے آزمائش بنا لیا تھا' جب میں نے حلال اور حرام کا واضح فرق محسوس نہیں کیا۔ وہ میرے لیے حرام کے لبادے میں حلال کی واضح اور مقرر شدہ حد تھی' جسے میں نے پہچانا نہیں۔"

ہم کیوں نظر آنے والی اشیاء اور کردار کے تعین میں الجھ جاتے ہیں۔

درجات کا اندازہ کیوں نہیں لگا پاتے۔ یہیں غلطی کر جاتے ہیں۔

ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں!

فاخرہ جبیں

بہار آئے تک



صبح کا وقت ہے اور افراتفری کا وہ عالم کہ کسی کو کچھ بجھائی نہیں دے رہا۔

یونیورسٹی والوں کی بس چھوٹی جارہی ہے۔ اسکول والوں کی وین پاں' پاں کررہی ہے۔ تایا ابو دیر کرنے والوں کو گھور رہے ہیں۔ بڑے چچا دیر ہونے پر بڑبڑا رہے ہیں اور چھوٹے چچا بڑے صبر سے منہ ہاتھ دھوئے۔ بلکہ باندھے اپنی باری کے انتظار میں ہیں۔

"بھنڈی چیخ رہی ہے کہ" ناشتے کا ایک وقت ہی کیوں مقرر ہے۔ اور کچھ لوگ رات کو ہی ناشتہ کیوں نہیں کرلیتے۔"

خود اس کا اپنا یہ حال ہے کہ صبح صبح نہادھو' چوٹی بنائے کچن میں جو گھسی تو اب دوپٹہ گول مول ہوکر ایک کونے میں پڑا ہے۔ آستین کہنیوں سے اوپر پہنچ گئی ہے۔ بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی گرم گھی میں ڈبو کر لال کرچکی ہے۔ چائے چھلکنے سے پیر کی انگلیاں سوج چکی ہیں مگر یہ چوٹیں معمول کی ہیں۔ لہٰذا وہ برق رفتاری سے سب کچھ بھلائے پراٹھے بیل رہی ہے۔ سلائس جلارہی ہے۔ انڈے اور برتن توڑ رہی ہے۔ ہاتھ جوڑ رہی ہے۔ بھابھی کے سامنے۔

ایسے میں شاہ زین کی آمد کا اعلان جس کسی نے بھی

مکمل ناول



سنا' بے اختیار ہو کر اپنا سر تھام لیا۔ کسی کسی نے البتہ دیوار اور در بھی تھام لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دیکھو بھلا۔ یہ مدیحہ کو کیا سوجھی۔؟ گھر بھرا ہوا ہے لڑکیوں سے۔ اور وہ بھیج رہی ہے جوان جہان لڑکے کو رہنے کے لیے۔" تائی اماں سے ایسی ناسمجھی کی امید تو نہ تھی۔ خدا جانے کس رو میں یہ بات کہہ گئیں۔

بڑی' چھوٹی چچی نے گڑبڑا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور اس سے پہلے کہ تائی اماں کی یہ بات گھر کے خرانٹ بوڑھوں تک پہنچتی اور وہ گھر کے بجائے کسی ہوٹل میں شاہ زین کے قیام و طعام کا بندوبست فرماتے بڑی' چھوٹی چچی نے تائی اماں کو دونوں طرف سے دبوچا اور ان کے ہائیں ہائیں' ارے۔ ارے کی پروا کیے بغیر انہیں پچھلے صحن میں لا چھوڑا جہاں گنگو دھوبی گھر کے پینتیس افراد کے میلے کپڑے دھونے کے لیے واشنگ مشین' ڈرائیر مشین اور واٹر پمپ ایک ساتھ چلائے بلا کا مصروف تھا۔

"بڑی بھابھی! یہ کیا غضب۔۔۔؟ ذرا سوچیں۔" بڑی چچی کے لب تیز تیز ہل رہے تھے۔ یقیناً" کچھ بول بھی رہی ہوں گی مگر تائی اماں کے پلے کچھ پڑتا تب ناں۔ انہوں نے جھنجلا کر گنگو دھوبی کو دفعان کرنے کا اشارہ کیا۔

وہ بیچارا چھورا چھو۔۔۔ چھوا چھو۔۔۔ تو اس دور میں کرنے سے رہا۔ مشینوں کی گھرر گھرر۔۔۔ زوں۔۔۔ شوں ۔۔۔ اور بھاری کپڑوں پہ ڈنڈے کی دھائیں دھائیں البتہ ضرور مخل ہو رہی تھی۔

چھوٹی چچی نے جھٹ اپنے گلابی کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر لال نوٹ نکالا اور لے جا کر گنگو کے ہاتھ پہ دھرا۔

"یہ لو میاں جاؤ! گھڑی بھر کے لیے جان چھوڑو۔ کوئی چائے' پان' قلفی' شربت کھا پی لو جا کر۔"

گنگو کو اور کیا چاہیے تھا۔۔۔؟ پیسے دبوچے۔۔۔ کورنش بجا تا۔۔۔ یہ جا' وہ جا۔۔۔ اتنے میں بڑی چچی بات شروع کر چکی تھیں۔

"چار ماموؤں کا اکلوتا بھانجا۔۔۔ اور چار بھائیوں کی اکلوتی بہن مدیحہ! ذرا جو آپ کی باتوں کی بھنک بھی اسے پڑ گئی تو ذرا سوچیے' کتنا دل دکھے گا۔۔۔ بے چارے کا۔۔۔ وہ پڑھا لکھا' سلجھا ہوا شاہ زین۔ کوئی ہماری لڑکیوں کو بھگانے' بہکانے تھوڑی آرہا ہے جیسے باقی سب بہن بھائی مل کر رہ رہے ہیں۔ چار دن وہ بھی آکر رہ لے۔"

بڑی چچی ذرا پردے میں رہ کر بات کر رہی تھیں۔ چھوٹی چچی کو یہ بات کچھ خاص نہ بھائی تھی۔

بڑی تائی گھر کے کرتا دھرتاؤں میں سے ایک تھیں۔۔۔ بھلا ان سے کیونکر چھپایا جا سکتا تھا۔ انہوں نے صاف صاف بات کرنے کی ٹھانی۔

"بڑی بھابھی! میں تو سیدھی اور صاف بات کہوں گی۔ مدیحہ کئی بار ذکر کر چکی ہے کہ شاہ زین کے لیے خاندان سے ہی لڑکی پسند کرے گی۔ ہو سکتا ہے وہ دانستہ اسے یہاں بھجوا رہی ہو۔ آپ تو خیر سے بری الذمہ ہیں۔ ہمیں دیکھیے راتوں کو نیند نہیں آتی۔"

انہوں نے پوری کوشش کی آنکھیں پھیلا کر بے خوابی دکھانے کی حالانکہ نوجوان نسل گواہ تھی کہ بستر پر جاتے ہی ہیبت ناک خراٹے لینے والی یہ ہی محترمہ تھیں۔

"دو صائمہ بھابھی کی۔۔۔ تین میری۔۔۔ لڑکیاں کیا۔۔۔ بھاری سلیں دھری ہیں سینے پہ۔۔۔ اب اپنے ہی اپنوں کا نہ سوچیں تو۔۔۔ میں تو کہتی ہوں۔۔۔ بھائی صاحب سے کہہ کر کمرہ ذرا اچھا سا سیٹ کروا دیں۔۔۔ دو چار دنوں کی تو بات نہیں۔۔۔ ابھی جگہ خریدے گا۔ پھر مکان بنے گا۔۔۔ مدیحہ کے شفٹ ہونے تک آخر وہ یہیں رہے گا ناں۔۔۔؟ اور ماشاء اللہ سے ہماری بچیاں' نیک' سلیقہ مند' بااخلاق' باکردار۔ ہو سکتا ہے۔ یہیں کہیں میل' جوڑ لکھا ہو اس کا۔"

"یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔۔۔ میں بھی سٹھیا گئی۔۔۔ بھلا یہ بات کیونکر نہ سوچی۔ اچھا تم لوگ ذرا دوپہر کا ہانڈی' چولہا دیکھ لو۔۔۔ میں کچھ سوچتی ہوں اس بارے میں۔"

انہوں نے تخت پر ٹانگیں پھیلائیں اور ململ کا دوپٹہ منہ پہ پھیلا کر اونگھنے لگیں۔ ان کا اونگھنا بھی کمال کا ہوتا تھا۔۔۔ اسی اونگھ میں وہ غور و فکر کرتیں۔۔۔ معاملات سلجھاتیں۔ مسائل حل کرتی تھیں۔

"ماؤں کو بیٹیوں کی کتنی فکر ہوتی ہے۔" ان کی بڑی ہوئی پلکوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ خود وہ ایک اکلوتے بیٹے کی ماں تھیں۔ گھر بھر میں سب سے بڑا بیٹا شیراز حسن۔۔۔ اعلا تعلیم یافتہ۔۔۔ خوبصورت۔۔۔ اونچا لمبا ۔۔۔ ادھر تعلیم سے فارغ ہوا۔ ادھر پسند سے منگنی بھی کروالی۔۔۔ پہلا ہنگامہ تھا گھر کا۔ کیا ہی اودھم مچا تھا۔۔۔ لڑکے' لڑکیوں نے خوب ہی مزے کیے۔ گانے گائے' ڈھول پیٹے۔۔۔

خوشی کے نقاروں نے اس سانحے کی سسکیوں کی بازگشت ان کے کانوں تک پہنچنے ہی نہ دی جس نے شیراز حسن کو ایک ٹانگ کی معذوری و محرومی دی تھی۔ ۔ محبت آزمائش بن گئی۔۔۔ اور ہر آزمائش پر پورا نہیں اترا جا سکتا ان کی محبت داغ جدائی دے کر زخموں سے کھرنڈ بھی نوچ کر لے گئی۔۔۔ اور وہ آہ کیے بغیر اپنے کمرے کا ایک لازمی سا جزو بن کر رہ گئے۔۔۔ اب نہ ان کا کمرہ انہیں چھوڑتا تھا' نہ وہ کمرے کو۔

مجبوری لاچاری کے ان دنوں میں ٹی وی اور کمپیوٹر کا زیادہ ساتھ رہا۔ علم پہلے سے تھا' عقل اور شعور کو جلا ملی تو اخبارات سے وابستہ ہو گئے۔

تمام لڑکوں کی سیاسی محفل ان ہی کے کمرے میں جما پاتی تھی۔۔۔ جن دنوں لڑکے اپنے امتحانات سے فارغ ہوتے ان کے کمرے میں خوب ہی رونق رہتی۔ چائے' تبصرے' گرما گرمی' کھیل' تماشے' راز بھری باتیں۔۔۔ وہ گھر کے ہر فرد کے دوست تھے۔۔۔

"اور اگر میں کہوں۔ میرے بیٹے کے لیے۔ خوشی کی کوئی کرن۔۔۔ امید کا کوئی جگنو۔۔۔ کوئی آسرا' کوئی سہارا دے دو تو شاید صائمہ اور عفت یہ بھاری سلیں اپنے سینے سے ہٹانا کبھی پسند نہ کریں۔" تائی اماں نے کروٹ بدلی۔

جامن کے درخت پر طوطوں نے خوب ہی شور مچا رکھا تھا۔۔۔ اور اس سے پرے شہتوت کے درختوں پر چڑیوں کی چڑ چوں۔۔۔۔

"بیٹیاں بھی تو چڑیوں کی مانند ہوتی ہیں۔۔۔ چہکتی لہکتی۔۔۔ پھر سے اڑ جانے والی۔۔۔"

پانچوں بچیوں کے چہرے ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔۔۔

صائمہ کی بڑی بیٹی ارم تھی۔ ڈاکٹری کے آخری سال میں۔۔۔ دبلا پتلا جسم۔۔۔ لمبی چوٹی' سیاہ آنکھیں اور دودھ شہد سے بنی رنگت۔۔۔ خوش اخلاق اور مہربان ڈاکٹر' فرماں بردار حد سے زیادہ۔

اس سے چھوٹی افشین تھی۔ گھونگھریالے بال ہمیشہ کندھوں پر گرائے رکھتی۔۔۔ اسے بس کاغذ' رنگوں اور تصویروں سے پیار تھا۔۔۔ آرٹ گیلریز میں اکثر آنا

جانا رہتا تھا بی ایس سی سے آگے پڑھ کر نہ دیا۔ دوسروں کے معاملات میں دخل نہ دیتی اور اپنے معاملات میں دخل دینے نہ دیتی تھی۔۔۔ رنگ، روپ میں کسی سے بھی کم نہ تھی۔

عفت کی تین بیٹیاں تھیں۔۔ ضویا، اریبہ، فرح۔

فرح فیشن کی دلدادہ تھی۔ فربہ جسم۔۔ سپید رنگت، بھرے بھرے ہونٹ۔ آنکھیں ذرا چھوٹی تھیں مگر کاجل میں ڈوبی رہنے سے بڑی بڑی لگتی تھیں۔ گھر میں سب سے زیادہ کپڑے، خرچے اور نخرے اسی کے ہوتے تھے۔

اریبہ کم گو سی لڑکی تھی۔ مزاج سنجیدہ اور کسی حد تک تند تھا۔ اس لیے اسے کم ہی چھیڑا جاتا۔۔ شکل وصورت میں وہ بھی اچھی تھی۔ پلکیں لانبی لانبی اور خوبصورت تھیں۔ ایک ادا سے اٹھتی تھیں۔ سارا حسن قدرتی تھا۔ وہ خود کوئی تردد نہ کرتی تھی۔

ضویا ایم اے کے آخری سال میں تھی۔ چلبلی طبیعت، شرارتی، لڑکیوں سے کم، لڑکوں اور بچوں سے زیادہ بنتی تھی اس کی۔۔ بے فکری، خوش حالی اور تازگی اس کی طبیعت کا خاصا تھا۔۔ سارا دن ٹی وی سے جڑی رہتی۔ بہت کام ہوتا تو یہ کہ میاں مٹھو کو بسکٹ، ٹافیاں کھلا دیں۔ کلیاں توڑ کر چائے کی میز پہ سجادیں اور کبھی کچھ نہ سوجھا تو ربڑ کی گیند لے کر ٹپ۔۔ ٹپ سارے صحن میں گھوما کرتی۔ انچاس، پچاس۔ اکاون۔ سامنے آنے والوں کو چیخیں مار کر ہٹا دیتی۔

خود گھومتی گھامتی۔ کبھی کسی کرسی سے ٹکراتی، کبھی برآمدے کے ستونوں سے۔۔ تو کبھی گملوں پر براجمان ہوتی۔۔ ایک بار زور کا ٹپہ لگا اور گیند اڑتی ہوئی تایا ابا کی چائے میں۔۔ تب گھر بھر سے ڈانٹ پڑی۔ گیند بلال بھائی کے قبضے میں چلی گئی۔ چند دن خوب ہی سکون رہا۔ پھر ایک روز جنون بڑھا۔۔ تو سنگھاڑا جو صبح و شام گھر کی صفائی کے لیے آتا تھا۔ چپکے سے اسے گیند تھما گیا۔ تب سے شام دوبارہ ٹپ ٹپ کی آواز سے آباد ہو گئی تھی۔

تائی اماں اونگھتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔ وہ ان کی بھی لاڈلی تھی۔

گنگو شاید واپس آگیا تھا۔ گھرر۔۔ گھرر۔۔ زوں شوں کی آوازیں سوچوں میں خلل پیدا کر رہی تھیں۔ انہوں نے ناگواری سے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔۔ پھر یاد آیا۔۔ پرس ان کی خواب گاہ کے تکیے تلے ہوتا ہے۔

لمبی سانس لے کر انہوں نے مندی مندی آنکھیں کھولیں۔ اور پھر یک لخت ہی چونک اٹھیں۔ ان پانچ چہروں کے پیچھے سے ایک اور چہرے نے اپنی جھلک دکھلائی تھی۔ عظمی نایاب عرف ادما۔

انہیں حیرت ہوئی۔ چھوٹی، بڑی چچی کے ساتھ ساتھ انہوں نے خود بھی اسے یاد نہ رکھا تھا۔۔ کیوں۔؟ شاید ادما اس لسٹ میں کہیں تھی ہی نہیں۔ سب سے اوپر۔۔ نہ سب سے نیچے۔

☼ ☼ ☼

"ارے میں کب کہتی ہوں کہ کوئی شہزادہ، کوئی چندے آفتاب، ماہتاب ڈھونڈ کر لاؤ۔ ہمیں تو کوئی انسان کا بچہ چاہیے بس۔۔ گھربار ہو، اچھا کماتا ہو اور ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ ساس، نندیں، دیور کسی پر اعتراض نہیں۔ میری بچی کو عادت ہے بھرے گھر میں رہنے کی۔۔۔ بچپن سے دوسروں کو پکاتی، کھلاتی آئی ہے۔ ایم اے پاس ہے۔ سولہویں درجے کی ملازمت کر رہی ہے۔ شکل وصورت میں کسی سے بڑھ کر نہیں تو کم بھی نہیں۔"

"امی کتنی ذہین ہیں۔ ایسی رٹی رٹائی تقریر۔ رشتے والی خالہ بدل گئیں مگر اس تعارفی بیان میں کوئی ادل بدل نہیں۔" اسے خوامخواہ ہی ہنسی آگئی۔

اور اس رشتے کے پیچھے اس نے خود کو کتنا بدل ڈالا تھا۔

بالوں کے بڑھنے کی رفتار کوئی خاص نہیں تھی۔ لہٰذا لاغر سی چوٹی بنانے کے بجائے انہیں کندھوں تک خوبصورتی سے ترشوالیا تھا۔ پچھلے مہینے امی نے عینک کی جگہ لینس لگوادیے تھے۔ لوجی۔ ایک اور مصیبت ۔۔۔ لینس لگائے کون۔؟ اتارے کون۔۔؟ صبح صبح کسی کو

...شکل ہوتی۔۔ کسی کو کپڑوں کی۔۔ اور وہ لینس ...میں دوڑی پھرتی۔۔ ادھر لگاتی۔۔ ادھر پھڑک ...بھی الٹا لگ جاتا۔۔ لڑکیوں کے ہاتھ تو سمجھو ...لگ گیا۔ بس نہیں لگا تو کوئی معقول رشتہ ہی ...ہاتھ نہ لگا۔ چنانچہ ہر مہینے پارلر یہ حاضری ...کر دی گئی تاکہ مختلف کریموں سے سانولا رنگ تو ...دبا ہی رہے۔ وہ پوری طرح اپنے آپ کو فٹ ...کی کوشش کرتی۔

...عام لڑکیوں کی طرح اس بات کو نہ اپنے لیے مسئلہ ...بناتی نہ دوسروں کے لیے۔ رشتہ نہ ملنا اس کے لیے ...نہیں، امی کے لیے مسئلہ تھا اور وہ خود ایسی باتوں پر ...پریشان نہیں ہوتی تھی۔ خصوصاً "شادی، بیاہ کا معاملہ ...اس کا ایمان تھا، دیر، سویر سب اللہ کی طرف سے ...ہوتی ہے۔ رشتے بھی آسمانوں پر ہی طے پاتے ہیں۔ پھر ...ان باتوں پہ خواہ مخواہ کی ٹینشن کیوں۔؟ ہاں امی کے ...اطمینان کے لیے آنے والے رشتوں میں خوب ہی ...دلچسپی لیتی۔۔ خود لڑکے کا بائیو ڈیٹا سننے بیٹھ جاتی۔۔ ایک ...دفعہ صرف اس لیے رشتہ واپس کر دیا کہ لڑکے کا نام ..."دین محمد" تھا۔" بس تب تو امی جو اس سے خفا ہوئیں تو انہیں منانے کے لیے اسے انجو ماں کا سہارا لینا پڑا تھا۔

"دین محمد" البتہ راتوں کو خوابوں میں آ آ کر اسے ڈراتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے کہا۔ شاہ زین آرہا ہے۔"

"کہاں ہے۔۔؟" تایا ابا نے سر اٹھا کر اطراف میں دیکھا۔

"میں نے یہ کب کہا کہ ابھی چلا آرہا ہے۔ آجائے گا کچھ دنوں تک۔۔" تائی امی قدرے برا مان کر کہا۔

"کافی دنوں سے سن رہا ہوں۔ یہ کوئی نئی اطلاع نہیں۔"

"جی ہاں۔ پرانی اطلاع ہے مگر بستر ہو گا ذرا اس پر غور فرمالیں۔"

"کس پر۔۔؟" ان کی تمام تر توجہ ٹی وی اسکرین پر تھی۔

"شاہ زین کی آمد پر۔"

"اس میں غور فرمانے والی کوئی بات ہے ؟"

"جی نہیں۔ غور فرمانے والی بات صرف بشریٰ انصاری میں ہے۔" تائی اماں چیخ کر بولیں تو وہ سٹپٹائے۔

"ایک تو یہ عورت۔۔" انہوں نے پہلو بدل کر بے چارگی سے ٹی وی اسکرین پہ چمکتی صائمہ چودھری کو دیکھا۔

"ڈولی کی آئے گی بارات" ایسا ڈرامہ نہ تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر بیگم کی بور ترین باتوں پر توجہ دیتے۔

"مسئلہ کیا ہے؟"

"شاہ زین کو ٹھہرانا کہاں ہے؟"

"اس دو کنال کے گھر میں اس کے ٹھہرنے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔" انہیں غصہ آیا۔

"دو کنال کے گھر میں 35 افراد بھی رہتے ہیں۔" تائی اماں نے جتایا۔

"اوپر کا کوئی کمرا صاف کروالو۔" آسان سا حل تھا۔

"اوئی۔ مارنا ہے اسے ؟"

"کیوں۔۔ اوپر کوئی پھانسی گھاٹ ہے کیا۔۔؟"

"لاحول ولا۔۔ کیسی بات کر رہے ہیں آپ۔ میرا مطلب تھا، وہ ٹھنڈے علاقے سے آئے گا۔ اوپر تو غضب کی گرمی۔ اس پر لوڈشیڈنگ۔ بچہ بے چارہ تو پگھل جائے گا۔"

"تو بچے نے یہاں کرنے کیا آنا ہے۔؟ اسے نہیں معلوم یہاں کے حالات۔ اور ٹھیک ہے اس نے رہنا ہے تو برداشت کرے۔ گرمی بھی اور لوڈشیڈنگ بھی۔"

صائمہ چودھری کا رنگ چڑھ رہا تھا۔

تائی اماں چپ چاپ باقی کی بات منہ میں لیے اٹھ گئیں۔۔۔ اور سیدھی بڑے چچا کے بلال کے پاس جا پہنچیں۔

وہ ٹراؤزر اور بنیان پہنے بیڈ پہ پھیلا ہوا تھا۔ دونوں

بیٹے باپ کے سینے پر چڑھے اودھم مچا رہے تھے۔ رابعہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے چہرے پر مساج کر رہی تھی۔

"ارے تائی اماں! آپ۔ آیئے ناں۔۔۔" بلال جھٹ مودب ہو بیٹھا۔

تائی اماں بیٹھیں اور نئے سرے سے شروع ہو گئیں۔ بلال چپ چاپ سنتا رہا۔

پہلے تایا ابا کی شکایتیں۔ پھر اصل مسئلہ۔

"یہ تمہارے تایا، چچا انتہا درجے کے کنجوس۔۔۔ ایک روپیہ تک نہ خرچیں گے۔ لیکن وہ اکلوتا، ماں کا لاڈلا۔۔۔ میں چاہتی ہوں، مدیحہ کو کوئی شکایت نہ ہو۔"

"بس اتنی سی بات تائی اماں! آپ مجھے حکم کر کے بلا لیا کریں۔ یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔" بلال سر جھٹک کر مسکرایا۔

اگلے روز دوسری منزل کے سب سے تاریک کمرے کو صاف کیا گیا۔ نیا کارپٹ، نیا بیڈ، پردے، کشن، الماریاں، وال کلاک، منی پلانٹس۔ اے سی۔

"اوہ میرے خدا۔۔۔! بلال بچے۔۔۔ تم نے اتنا خرچ کر ڈالا۔۔۔"

"ارے یہ بتائیں، میری تائی اماں خوش ہیں کہ نہیں۔" وہ انہیں بانہوں میں لیے ان کا منہ چوم رہا تھا۔

"جیتے رہو میرے بچے۔!" تائی اماں کی آنکھیں بھر آئیں۔

☼ ☼ ☼

رات سے ہلکے ہلکے جھکڑ چل رہے تھے۔ صبح صادق ہوئی تو موسم اور زیادہ خوشگوار۔ کالے کالے بادل۔ پر شور ہوا۔ فضا میں قلابازیاں لگاتے پکھیرو۔ لڑکیوں کے تو دل بے قابو ہونے لگے۔

"عائشہ چچی! ناشتے میں پورے۔ پورے صرف پورے۔" پائیں باغ میں نعرے بازی ہو رہی تھی۔

باورچی خانے میں آٹا گوندھنے کے لیے پر تولتی بھنڈی نے آٹے سے بھری پرات یوں ہی ڈرم میں الٹ دی۔

"اب عائشہ چچی جانیں اور ان کا کام۔" وہ بگٹٹ باغ کی طرف بھاگی کہ کہیں موسم کی رنگینیوں سے محروم نہ رہ جائے۔

وہاں رنگین آنچل لہرائے جا رہے تھے۔ لکن میٹی۔ بول میری مچھلی کتنا پانی۔۔۔ مائی میری مشک کا پانی پی لو۔ تینوں بھابھیاں بھی ننھی منی بنی لڑکیوں کے ساتھ۔ ہی۔۔۔ ہی۔۔۔ ہا میں مصروف۔۔۔ رنگین آنچل فضا میں لہرائے جا رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحبہ جامن کے درخت پر تھیں۔ کسی کے گال پہ نشان پڑ رہا تھا۔ کسی کی ناک جامنی ہو گئی۔ نشانہ تو بہت ہی بہترین تھا۔

افشین اپنی دودھیا پالتو بلی کو زبردستی سبز گھاس پہ بٹھائے اس کے مختلف پوز لے رہی تھی۔ ادما بلال بھائی کے کندھے سے لٹک رہی تھی۔

"اتنے اچھے موسم کا اس چار دیواری میں کیا مزہ۔ کہیں باہر چلیں۔" بعض معاملات میں صرف بلال بھائی کا ہی سکہ چلتا تھا۔ طلال کے پاس گاڑی نہ تھی۔ اور نہ ہی بزرگوں کی اجازت کے بغیر گاڑی استعمال کی جا سکتی تھی۔ چھوٹے چچا کا ٹیپو ابھی چھوٹا تھا اور شادی شدہ فاران بھائی اتنے سڑیل مزاج کہ ادما مر کر بھی ان سے فرمائش نہ کرتی۔۔۔ لے دے کر بلال بھائی ہی بچتے۔

"جاؤ پہلے مرسلین سے اجازت لے کر آؤ۔"

مرسلین ادما سے چھوٹا تھا مگر اسے بگ باس بننے کا شوق تھا۔ بلال بھائی جان بوجھ کر اسے چھیڑ رہے تھے۔

"تو کہہ دیجیے کہ لے جانا نہیں چاہ رہے۔" خضریٰ نے دور سے ہانک لگائی۔

تبھی سنگھاڑے نے آکر اطلاع کی۔

شیراز حسن ادما کو بلا رہے تھے۔

"تیار رہیے۔ میں بس ابھی آ رہی ہوں۔" وہ بھاگم بھاگ شیراز کے کمرے تک آئی۔ وہ بہت سی کتابوں میں الجھے نظر آ رہے تھے۔

"ادما! لائبریری تک جانا ہو گا۔" انہوں نے فوراً اس کے آنے کا نوٹس لیا تھا۔ گھڑی بھر میں ہی ایک

ت اس کے سامنے تھی۔ مختلف عنوانات سے پر۔ سامنے اتنے بذکور تھیں۔

اس نے زیر لب دہرایا۔

"رومی کو ساتھ لے لو۔ وہ ابھی گھر پہ ہی ہو گا۔"

نے چھوٹے چچا کے منجھلے بیٹے کا نام لیا۔

"کوشش کرنا۔ ذرا جلدی آ سکو۔" وہ پوری آنکھیں کھولے اس پہ نظریں جمائے کہہ رہے تھے۔

کمرے میں موسم کا احوال انہیں کیا معلوم۔؟

ادما بھی جھٹ پٹ وہ کاغذ اور اپنی مخصوص ڈائری لے باہر نکل آئی۔

"میں تمہیں زحمت سے بچا رہی ہوں۔ لیکن اگر موسم زیادہ خراب ہوا تو بس صرف ایک مس کال۔"

وہ آتے آتے رومی کو بتا آئی۔

لائبریری دور کہاں تھی۔ بس پندرہ منٹ کی چہل قدمی اور وہ بھی اتنے آفت موسم میں۔ وہ نہر کنارے بے تحاشا نارنجی رنگ والے پھولوں کے ساتھ ساتھ چلتی لائبریری تک پہنچ گئی تھی۔ اندر حبس تھا۔ لیکن وہ مستعد ہو چکی تھی۔ کتابوں کا ایک ڈھیر نکال کر وہ ایک مخصوص میز پر جا پہنچی۔ مطلوبہ نکات جمع کرتے کرتے اسے تقریباً ڈھائی گھنٹے لگ چکے تھے۔ لیکن وہ خوش تھی۔ شیراز حسن اس کا کام دیکھ کر یقیناً اسے شاباش ہی دیتے۔ یہ اس کا معمول تھا۔ سیاست، ثقافت، ادب اس کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ کالج کے زمانے میں وہ ان موضوعات پر بلا تکان بولا کرتی تھی۔ شیراز حسن اس کے اس شوق سے بخوبی واقف تھے اور بھرپور فائدہ بھی اٹھاتے تھے۔

وہ باہر نکلنے سے کتراتے تھے لہٰذا اسی کو پیغام بھجواتے اور وہ نہایت عرق ریزی سے ان کا من چاہا کام ان تک پہنچا دیتی۔

اب بھی وہ نہایت شاداں و فرحاں لائبریری سے نکلی۔ ہلکی پھلکی رِم جھِم رِم جھِم کے ساتھ مگر یہ بادلوں کی بارش تھی۔ منہ زور۔ باغی دھواں دھار۔ وہ لائبریری کا سیاہ آہنی گیٹ عبور کر چکی تھی۔ پیدل کے لیے سوچا۔ واپس ہو لے۔ تب ہی سفید کرولا قریب آ کھڑی ہوئی۔

"جلدی کرو۔ جلدی۔"

"ہائیں۔۔۔ ہائیں۔" بارش کی تیز بوچھاڑ میں کسی نے بازو سے گھسیٹ کر گاڑی میں بھی ڈال لیا۔

"یہ تم سب کے سب کہاں؟" ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں مسلیں پھر دلچسپی سے ان سب کو دیکھا۔

"ارسلان، شزا اور فاطمہ۔" انجوامی کے تینوں بچے۔

"شیراز بھائی نے فون کیا تھا۔ فوراً لائبریری پہنچو۔ ہم نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ کیوں۔۔۔؟ بس پہنچ گئے لائبریری۔ اور "کیوں؟" تو سامنے ہی کھڑی نظر آ گئیں۔"

فاطمہ اس کی درگت بنی دیکھ کر خوامخواہ ہی دانت نکالے جا رہی تھی۔

اگلے پانچ منٹ میں وہ گھر کے گیٹ پہ تھے۔

یہاں ایک اور حیرانی۔

دونوں گاڑیاں لدی پھندی چلنے کو تیار۔۔۔ کہاں؟

"مدیحہ پھپھو کا فون۔۔۔ شاہ زین۔۔۔ ایئرپورٹ۔۔۔"

دھائیں دھائیں برستی بارش میں قریب سے گزرتی گاڑی میں سے کچھ اسی قسم کی آوازیں آئی تھیں۔۔۔ ٹیپو بے چارہ گاڑی کا شیشہ کھولے آدھے سے زیادہ باہر لٹک رہا تھا۔

"تم لوگ جا سکتی ہو تو پھر ہم کیوں نہیں؟" فرح اور ضویا گیٹ پہ کھڑی بحث رہی تھیں۔ ان تینوں کو گاڑی میں بیٹھے دیکھا تو دونوں طرف سے دھاوا بول دیا۔

"ارے۔۔۔ رے۔۔۔ ہم تو۔۔۔" ادما چلائی مگر ارسلان بھی آج موڈ میں تھا۔ گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔

☼ ☼ ☼

واپسی کا دو گھنٹے کا سفر از حد بور ثابت ہوا تھا۔ لاہور جانا اور پھر مہمان کے بغیر واپس آنا۔ سارا سفر ہی بے کار۔۔۔ جاتے ہوئے جو کھانا پینا، ہلا گلا ہوا۔ ایئرپورٹ پہ جا کر ماند پڑ گیا۔

لڑکیاں سمٹ سمٹا کر گاڑی میں ہی بیٹھی رہیں۔

لڑکوں نے ایرپورٹ کا کونا کونا چھان مارا۔ وہ حضرت شاہ زین۔ اونچے لانبے گھبرو جوان۔ فیس بک پر ہزار بار کے دیکھے ہوئے۔ اب یہاں خدا جانے کون سا ماسک پہن کر آئے۔ کہ کسی سے پہچانے نہ گئے۔ لڑکوں سے تو خوب ہی دوستی تھی۔ گپ شپ۔ مشورے مشاورت۔ سانجھی دوستیاں۔

مایوس ہو کر گھر کے فون کھڑکائے گئے۔ جو اول تو ریسیو نہ ہوئے اور ہوئے تو حکم ملا کہ۔

"واپس چلے آؤ۔"

"ہائیں۔ ایسے کیسے۔ بنا مہمان؟" وہ حیران تھے مگر واپس ہو لیے۔ سارا راستہ اونگھتے، سوچتے، کوستے ہوئے گزرا۔

گھر میں داخل ہوئے تو بھنڈی انہیں دیکھ کے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھی۔ ساتھ دینے کے لیے خضریٰ شانہ بشانہ۔

"شاہ زین بھائی سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ مدیحہ پھپھو نے چوری چوری یہاں فون کر دیا۔ شاہ زین بھائی کو کیا خبر۔۔؟ جہاز سے اترے۔۔ ٹیکسی کی اور سیدھے یہاں۔۔ بارش ختم۔ ہوا ختم۔۔ اور سورج سوا نیزے پر۔۔ وہ تو جی۔۔ گرمی اور حبس سے گوڈے گوڈے گھبرا گئے۔" گوڈے گوڈے بھنڈی کا تکیہ کلام تھا جو کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ فٹ ہو سکتا تھا۔

"پہلے تو کالونی میں گھوم پھر کے گھر ڈھونڈا۔۔ چکر کھا کھو کے آخر یہاں پہنچے تو آگے سے گنگو ٹکر گیا۔ گنگو بے چارہ کانوں سے بہرہ۔ وہ بولیں۔۔ یہ سنے نہ۔۔ وہ پوچھیں تو یہ ہنس دے۔ تنگ آ کر خود ہی مال اسباب اٹھا کر اندر گھس گئے۔ ارم باجی سامنے سے آ رہی تھیں۔ پر ان کو کہاں دکھائی دیں۔ وہاں تو پسینہ گوڈے گوڈے بہہ کر آنکھوں میں گھس رہا تھا۔ خود تو آگے گزر گئے۔ گملا پیچھے لڑھکا دیا۔ اب پتا نہیں لڑھکایا تھا یا لڑھک گیا۔ مگر اپنی ڈاکٹرنی صاحبہ پیر کے انگوٹھے پہ ہلدی، تیل لگا کر پٹی باندھ رہی ہیں۔" وہ دانت نکالتی داستان سناتی رہی۔

لڑکے تو کب کے شاہ زین کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ لڑکیاں بھی ایک ایک کر کے اٹھ گئیں۔ کچھ نے جا کر ارم کی مزاج پرسی کی۔ کچھ سونے کے لیے لڑھک گئیں۔ ادما شیراز حسن کے کمرے سے ہو کر اپنے پورشن میں آ گئی تھی۔ سارے دن کی تھکان کے بعد وہ اب کچھ آرام کرنا چاہتی تھی۔



"نہ۔۔ شاہ زین بھائی! آپ کو آخر سوجھی کیا؟ ہم تو کئی دنوں سے بنیروں پہ بتیاں بال رہے تھے کہ شاہ زین آ رہا ہے۔ آ رہا ہے۔ اور آپ آئے بھی تو یوں۔ اور بیچاری ارم آپی کا کیا قصور۔۔۔؟ ابھی تک ہلدی۔۔ تیل۔۔" یہ خضریٰ تھی۔ ادما اور مرسلین سے چھوٹی دوپہر کے ان دیکھے سانحے کو تخیل کے پردے پہ دیکھ دیکھ کر ہنستی جا رہی تھی۔

شاہ زین بے چارہ شرمندہ سا بیٹھا تھا۔

سب ڈائننگ ہال میں جمع تھے۔ کھانا کھایا جا چکا تھا۔ ایک گھنٹہ تو پورا تایا ابو نے لگایا سب کو متعارف کرانے میں۔۔ اور اس کے بعد سے نوجوان پارٹی اسے گھیرے بیٹھی تھی۔ شاہ زین غالباً "سترہ" اٹھارہ سال بعد آیا تھا۔ اور فی الحال ذرا چپ چاپ بیٹھا ان کے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔

سب لوگ عجب رنگوں کے تھے اور ہر رنگ اپنی جگہ منفرد۔ نکھرا ہوا۔ شوخ۔ بات سے بات نکالتے تھے۔ فقرہ ابھی کہنے والے کے منہ میں ہوتا اور باقیوں کی ہنسی اسٹارٹ۔ بہت سی بے تکی باتوں کے درمیان بلال بھائی اچانک بڑی سنجیدگی سے کہتے۔

"میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔"

ساری قوم اپنی بولتی بند کر کے ان کی طرف متوجہ ہو جاتی۔

"کریم والے بسکٹ میں کریم ہوتی ہے لیکن ٹائیگر بسکٹ میں 'ٹائیگر' نہیں ہوتا۔" ہاہاہا۔

کبھی جھاڑو دیتے سنگھاڑا کو اچک کر لے آتے۔ وہ بھی شوقین مزاج۔ گہری سیاہ رنگت میں سفید دانت لشکارے مارتے تھے۔ شاید اسی لیے سنگھاڑا کہہ

[illegible] اپنا تھا۔

وہ [illegible] پہ ہاتھ رکھ کر لمبی تان لگاتا۔

[illegible] رحمت دا دریا الٰہی!
[illegible] ہر دم وگدا تیرا
[illegible] اک قطرہ بخشے مینوں
[illegible] تے لم بن جاندا میرا

[illegible] میاں محمد بخش کلام باہو، ہیر وارث شاہ۔ چل سو چل۔۔۔۔

[illegible] ہوا کے پھول ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے۔۔ بے آواز۔ [illegible] ہیلی مہکنے لگتی۔۔ وہ سب دم بخود بیٹھے رہتے۔ [illegible] سنگھاڑے کی جوان آواز شام سمے کا دکھ روتی۔ [illegible] کہیں احساس زیاں جگاتی کہیں انجانا دکھ بھر دیتی۔ [illegible] جوان دل تازہ محبتوں کی یاسیت سے رسنے لگتے۔ ہر [illegible] اپنے رنگ پہ آ جاتا۔

ایسے میں شاہ زین حسن ٹکر ٹکر ان کھوئے ہوئے [illegible] انسانوں کو دیکھتا رہتا۔

☼ ☼ ☼

"چھوٹی چچی پوچھ رہی ہیں۔ چائے کمرے میں پئیں [illegible] یا ہال میں۔"

"[illegible] نہیں یار۔۔! ابھی کچھ سونے کا موڈ ہے۔ چائے [illegible] دیر کے بعد۔" شاہ زین سنگھاڑے کو ٹال کر بیڈ [illegible] آیا۔

"بڑی چچی نے کہا ہے۔ چائے دم پہ رکھی ہے۔ [illegible] ابھی بھجوا دیں یا۔۔؟"

[illegible] جھانک رہا تھا۔

"[illegible] پلیز۔ ابھی تھوڑی دیر بعد۔۔ میں کچھ ریسٹ چاہ [illegible] رہا۔"

شاہ زین نے قدرے ندامت سے دوبارہ انکار [illegible] وہ آج صبح سے مختلف ہاؤسنگ کالونیوں کا جائزہ [illegible] بعد کچھ دیر قبل ہی گھر لوٹا تھا۔

[illegible] تھوڑی بعد دروازے پر ایک بار پھر کھٹر پٹر ہوئی۔

"[illegible] کچھ دیر بعد۔۔" اس نے نعرہ لگایا اور تکیہ

"اچھا۔ اچھا۔"

"ہائیں۔" اس نے تکیے کے نیچے سے جھانکا۔

تائی اماں بے چاری دبے پاؤں واپس لوٹ رہی تھیں۔ وہ ایک جست لگا کر ان تک پہنچا۔

"آیئے۔۔ آیئے۔ سوری۔ معذرت۔۔ میں سمجھا۔" اس نے انہیں کندھے سے تھاما اپنے پاس لا بٹھایا۔

"تم شاید آرام کر رہے تھے۔؟" بڑا میٹھا لہجہ تھا۔

"نہیں جی۔ میری کیا مجال۔؟ مم۔ میرا مطلب ہے، آپ نے آنے کی تکلیف کیوں کی ممانی جان! مجھے بلوا لیا ہوتا۔"

"جیتے رہو۔ جیتے رہو۔ میں تو بس تم سے کچھ باتیں۔" اور پھر باتیں شروع۔ وہ بھی تائی اماں کی۔

شاہ زین جمائیاں روکنے کی کوشش میں ہلکان۔۔ آنکھوں میں نیند کی سرخی لیے۔ وہ ان کی باتیں سن رہا تھا اور سنے جا رہا تھا۔

سب باتوں کی ایک ہی بات۔

"مغربی لڑکیوں کی خرابیاں اور ان سے دوستی کے نقصانات۔"

معلوم نہیں اتنے نکات کہاں سے جمع کیے تھے انہوں نے۔۔ ہاں بھئی۔ بیٹا لکھاری، صحافی۔ تو اماں پر بھی کچھ تو اثر ہونا ہی تھا ناں۔

"شاہ بیٹا! کہیں تم نے تو وہاں کی لڑکی سے۔۔ کوئی چکر وکر تو نہیں چلا رکھا۔ میرا مطلب ہے۔ یہ دوستیاں وغیرہ۔"

"جی؟ لڑکیوں سے دوستی۔۔" وہ کہتے کہتے ایک دم رکا۔

تائی اماں کی آنکھوں میں سو خدشے، وہم، خوف سرسرا رہے تھے۔ شاہ زین کو فوری طور پر اپنے جواب میں ترمیم کرنا پڑی۔ اقرار کی صورت میں تو بخیے ادھڑنے کا ڈر تھا۔

"نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں۔ لڑکیوں سے دوستی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں ایک پاکستانی گھرانے کا چشم و چراغ۔۔ میں اور ایسی حرکت۔ توبہ۔۔ توبہ۔۔۔" اس

نے نفی میں سرہلایا۔ پھر احساس ہوا کہ ضرورت سے زیادہ بول دیا ہے۔ سر کو دو چار بار جھٹکا۔ اف خدایا۔

"یہ فضا کا اثر ہے یا ماحول کا۔ نیند کے سامنے ایسی بے بسی کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ شاید یہاں کی خوراک۔

تائی اماں نے بھی غالباً" اس کی کیفیت محسوس کرلی تھی۔ سو اسے آرام کرنے کا کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

پھر جاتے جاتے پلٹیں۔

"میں نے کہا اگر چائے۔"

"ضرور۔۔۔ کیوں نہیں۔ چائے بھجوادیں۔ اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

اور کچھ ہی دیر بعد۔ ڈھیر سارے لوازمات کے ساتھ چائے پیتے ہوئے اس نے بہت سوچا مگر یاد نہ آسکا کہ وہ کس ریاست کا نواب تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ بڑی سی میز تھی  اور انواع واقسام کے کھانوں سے پر۔

رات کے کھانے کا وقت تھا۔

ٹیپو کی آنکھیں حیرت کے مارے کھل گئیں اور رومی کا منہ۔

"یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟" رومی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے سے پوچھا۔

"کچھ پڑھ کے پھونک رہے ہیں کھانے پر۔ سب کے ہاتھ کیوں بندھے ہوئے ہیں۔؟" ٹیپو نے سرگوشی کی۔

"شاہ بھیا کا انتظار ہے۔ آدھ گھنٹہ قبل پیغام آیا تھا۔" آرہا ہوں۔"

اب معلوم نہیں۔ کہیں بھول بھلیوں میں کھو گئے۔ یا چھکڑے پہ بیٹھ کر آرہے ہیں۔"

"اوہ۔" رومی نے کھانے کی میز پر نظر دوڑائی۔

"ہم لوگ شروع کرتے ہیں ناں۔ وہ بھی۔"

"ناں۔۔ ناں" تینوں خواتین یک لخت ہی چلائیں۔ ٹیپو بے چارے کے ہاتھ سے چمچ چھوٹ کر دور جاگرا۔

"مہمانوں کے بغیر کھانا کھانے کا رواج کب سے شروع ہوگیا ہمارے ہاں! انتظار کرو۔ جیسے سب لوگ کررہے ہیں۔"

ٹیپو نے جھاڑ کھائی اور پھر اپنا سا منہ لے کر بیٹھ رہا۔ کیونکہ وہاں سب ہی اپنا اپنا منہ لے کر بیٹھے تھے۔

ادھر شاہ زین صاحب گہری نیند سے بیدار ہو کر نہائے، دھوئے، بال بنائے۔ سیڑھیوں سے نیچے اترے تو جدھر کچھ آوازیں آئیں، ادھر کو ہو لیے۔ ابھی یہاں آئے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہ ہوئے تھے۔ نہ ہی سارا گھر گھومے پھرے تھے۔ پھر سب ہی پورشن ایک سے۔ ہاں چھوٹا سا کوریڈور عبور کرکے بائیں جانب مڑے تو ماحول میں کچھ اجنبیت سی محسوس ہوئی۔

یہاں رات کی رانی اور چمپا کے ساتھ ساتھ مولسری کی خوشبو فضا میں حاوی تھی۔ ایک کمرے کی جالی دار کھڑکی سے روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ وہ اسی کمرے میں جاگھسے۔ یہاں بھی ماحول مختلف۔ کہاں تو کھانے کے لیے پیغام پہ پیغام آرہے تھے اور کہاں کھانے کا نام ونشان بھی نہیں۔ جنگ وجدل اور چیخم دھاڑ البتہ وہی تھی جو اس گھر کے ہر اس مقام پر دکھائی دیتی تھی جہاں دو یا دو سے زیادہ افراد پائے جاتے تھے۔

"میرا جینا محال، سونا دشوار، حال بے حال ہوچکا ہے۔ ایک الماری پہ چھپکلی چپکی ہوئی ہے۔ دوسری پہ مکڑی لٹک رہی ہے۔ دراز پہ پچھو رینگ رہا ہے۔ میرے اللہ! اس کمرے میں کسی انسان کے رہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔" وہ لڑکی سخت خفا انداز میں بول رہی تھی۔ جبکہ دوسری گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکائے کھی کھی کیے جارہی تھی۔

"اس سے زیادہ گھٹیا اور بے ہودہ شوق شاید ہی کوئی ہوگا۔ کل دراز سے ڈسپرین ڈھونڈتے ہوئے وہ کم بخت لال بیگ میرے ہاتھ سے ہی چپک کر رہ گیا۔ امی آپ فوراً" سے پیشتر میرے لیے کسی دوسرے کمرے

ت کردیں۔ ورنہ میں اس کو اٹھا کر آگ میں ڈال دوں گی۔"

"اوہ تو یہ معاملہ ہے۔" شاہ زین نے اب سمجھا تھا۔ ماحول گرم کیوں ہے۔ امی بے چاری نے دونوں ہاتھوں میں تھاما ہوا سر اٹھایا۔ تو شاہ زین نے عائشہ چچی کو پہچانا۔

دروازے پہ ہلکی سی دستک دے کر وہ کمرے میں داخل ہوا۔

تینوں نقوش نے اجنبی دستک پر چونک کر دیکھا۔

چچی کے چہرے پہ ہلکی سی ندامت ابھری۔

"کب سے فضول بکے جارہی تھی۔ خدا جانے کیا کچھ سنا ہوگا اس نے۔"

ماں کی آنکھوں میں ہلکی سی تنبیہہ ابھری۔ بٹی نے غیر محسوس انداز میں کندھے اچکا کر اپنی بے پروائی ظاہر کی اور پھر اسے اندر آنے کی دعوت دینے لگی۔

"سوری۔ یہاں شاید کوئی اور معاملہ چل رہا ہے۔ یا پھر میں ہی غلط وقت پر آیا ہوں۔"

"ارے نہیں بیٹا! کوئی معاملہ نہیں۔ بس ان دونوں بہنوں کے آپس کے جھگڑے۔ آؤ۔ بیٹھو۔" عائشہ چچی نے فوراً" اس کے لیے جگہ کشادہ کی۔

"کیا لوگے بیٹا۔ چائے۔ ٹھنڈا۔ یا کھانا لگوادوں؟"

وہ کچھ تذبذب کے عالم میں تھا۔ مگر بہر حال بیٹھ گیا۔

"کہاں تو بھنڈی نے کھانے کے لیے دروازہ بجا بجا کر توڑ دیا۔ اور اب پوچھا جارہا ہے کہ۔ اور باقی اہل خانہ۔۔؟

عائشہ چچی ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے میں مصروف ہوگئیں۔

وہ الجھا سلجھا جواب دیتا رہا۔

اسے تو یہ ہی معلوم تھا کہ کھانے کے وقت تمام اہل خانہ موجود ہوتے ہیں۔ یہ اور بات کہ اجتماعی کھانا کھانے کی نوبت ابھی تک کم ہی آئی تھی۔

ذرا سی دیر میں تلی ہوئی مچھلی، کباب اور ابلے چاول اس کے سامنے تھے۔ تھوڑی دیر میں تازہ تڑکا لگی دال اور گرم گرم چپاتیاں بھی۔۔۔ خضریٰ کھانا لاکر اب اس کے پاس بیٹھی کتر کتر باتیں کیے جارہی تھی۔ اور یہ کوئی اضافی خوبی نہ تھی۔ سارا خاندان ہی باتونی تھا، یہ شاہ زین کو آتے ہی معلوم ہوگیا تھا۔

"آپ تو بہت جنٹل مین بنتے ہیں۔ مم میرا مطلب ہیں" بہت ہی بیبے بچے ہیں بیبے کا مطلب سمجھتے ہیں آپ۔۔ آں۔ اوما ذرا بیبے کی انگریزی تو بتانا۔" وہ بیچ میں ہی پکارتی پھر دوبارہ گفتگو کا سلسلہ جوڑتی۔

"آپ ذرا اپنے گھربار کے چکروں سے نکل آیئے۔ پھر آپ سے جٹ پٹی سنیں گے۔"

"خضریٰ! اٹھو اور چائے بنا کرلاؤ۔" عائشہ چچی نے اسے اٹھادیا۔ تو شاہ زین نے پہلی بار ڈھنگ سے کھانے کی طرف توجہ دی۔

کھانے کے بعد چائے۔ اسی دوران مرسلین کی آمد ہوئی۔ وہ ایم بی اے کے آخری سال میں تھا۔

سنجیدہ مزاج نوجوان۔ گفتگو بھی خاصی سلجھی ہوئی۔ چائے کے دوران خاصی اچھی گپ شپ رہی دونوں کی۔ بعد ازاں وہ اجازت لے کر باہر نکل گیا۔ کھانے کے بعد چہل قدمی کی عادت تھی اس کو۔



اگلا روز خاصی گرما گرمی لیے ہوئے تھا۔ چھوٹی، بڑی چچی کے بڑے بڑے منہ پھول، سوج کر اور بھی بڑے ہوچکے تھے۔

"یہ زیادتی ہے بڑی بھابھی! ہم لوگ بیس، بیس کھانے بنائے منتظر۔ سارے بچے بھوکے انتظار کرتے رہے اور وہ محترمہ اسے گھٹنے سے لگائے دال، چاول کھلاتی رہیں۔

تائی اماں نے خاموشی سے ان کا شکوہ سنا تھا۔

عائشہ بڑی سادگی سے اپنی صفائی پیش کرگئی تھیں اور تائی اماں رہیں سدا کی منصف۔ انہیں کہیں سے بھی عائشہ چچی قصوروار نظر نہ آئیں۔ سو انہوں نے بات وہیں پہ ٹھپ کردی۔ لیکن بگڑے ہوئے موڈ سنور نہ سکے۔

اتفاقاً" اس روز شاہ زین گھر پہ تھا۔
چہروں کے بگڑے ہوئے زاویے۔ روکھا پھیکا' سرد ماحول۔
"یہ کیا ہو گیا ان لوگوں کو...؟" شاہ زین سر کھجاتا۔ بددلی سے ممانیوں کو دیکھتا رہا۔ بھید تو تب کھلا... جب بھنڈی اس کے دھلے ہوئے کپڑے لے کر کمرے تک آئی۔
"رات آپ نے اچھا نہیں کیا۔ سارا ٹبر گوڈے گوڈے بھوکا بیٹھا رہا اور آپ مزے سے مچھلی کباب کھا یہ جا وہ جا۔"
شاہ زین یک لخت ہی چوکس ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اور پھر کرید کرید کر بھنڈی سے پوچھتا اور گرہیں کھولتا رہا۔
"عائشہ چچی کا پورشن الگ تھلگ کیوں؟ کھانے میں اس گھرانے کی شمولیت کیوں نہیں؟ اور کھانا "ادھر" سے کھا لینے پر اتنی ناراضی کیوں؟"
بھنڈی نے ہزاروں قسمیں دے کر اپنا نام صیغہ راز میں رکھتے ہوئے بتایا۔
"وحید چاچو باقی بھائیوں کے سوتیلے بھائی ہیں۔ اس پر مستزاد' شادی بھی زور زبردستی اپنی پسند سے کروائی عائشہ چچی سے۔ گھر والوں کا سلوک وحید چاچو سے کبھی بھی اچھا نہ رہا۔ لہٰذا وہ آج سے کئی برس قبل دل برداشتہ ہو کر دبئی چلے گئے۔ بیوی' بچوں کو بلانے کے لیے راضی نہیں ہوئے' خود البتہ کبھی کبھار چکر لگا لیتے ہیں۔ بچے تو آپس میں شیر و شکر ہیں۔ اور بڑے بھی بظاہر تو ٹھیک ہیں لیکن سوتیلے پن کی گرہیں کبھی نہیں کھلتیں۔" یہ آخری نادر خیالات بھنڈی کے اپنے تھے جن کا اظہار کیے بغیر وہ نہیں رہ سکتی تھی۔
شاہ زین کو البتہ حیرت تھی کہ اس کی ماں نے کبھی بھی اپنی خاندانی پس منظر کو اس سے ڈسکس نہیں کیا تھا۔ شاید آج تک ان دونوں ماں بیٹوں کو اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

کل ہی ارم نے سب لڑکیوں کے وزن کیے تھے اور کل ہی ہانک کروا کے لیے بھی لے گئی۔ تائی اماں چلاتی رہ گئیں۔
"بھابیوں میں سے کسی کو ساتھ لے لو... ارے اکیلی جاؤ گی کیا...؟ تمہارے تایا' چچا۔" اتنے میں منہ زور لڑکیاں کھٹ کھٹ کرتی گیٹ سے باہر۔
"تمہاری ماؤں کے ذہن نہیں بدلے جا سکتے۔ لڑکیاں آٹھ دس بھی ہوں تو اکیلی۔" وہ بڑے مزے سے گپیں ہانکتی ساری کالونی کے چکر لگاتی رہیں۔ تازہ ہوا نے سب ہی کے مزاجوں پر خاصا خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ بات بے بات ہنستی قہقہے لگاتی واپس آ کر تائی اماں کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔
"دیکھ لیجیے۔ سب کی سب صحیح سلامت واپس۔ اپنا محلہ' اپنے لوگ پھر کاہے کا ڈر۔"
ان کا روز کا معمول بن گیا۔ تایا' چچا' بلال' فاران بھائی اس وقت تک گھر پہ نہیں آتے تھے۔ لہٰذا اس معمول میں کوئی مخل نہ ہوا۔
الٹا بڑی چچی نے بھی حمایت کی۔ "اچھا ہے گھڑی بھر کے لیے تازہ ہوا میں گھوم پھر آئیں۔ اسکول کالجز کے بعد سارا دن گھر میں بند ہی تو رہتی ہیں۔"
لیکن پھر اس معمول کو کسی اور نے بھی نوٹ کر لیا تھا۔
شب بارات کی آمد آمد تھی۔ اور چھوٹے موٹے پٹاخے رات کو ادھر ادھر چھوٹتے ہی رہتے تھے۔ وہ اپنی باتوں میں مگن تیز تیز قدم اٹھاتی معمول کے راستوں پر رواں دواں تھیں۔ جب ایک موڑ مڑتے ہی یکا یک پانچ سات پٹاخے عین ان کے قدموں میں آ کر چھوٹے۔ ان سب کی تیز چیخوں نے کالونی کے در و دیوار کو ایک پل کے لیے ہلا کر رکھ دیا تھا۔
کوئی آنکھوں پہ ہاتھ رکھے چیخ رہی تھی۔ کوئی کانوں پہ۔ ضوبا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اور خضریٰ نے با آواز بلند رونا شروع کر دیا تھا۔
وہ تین لڑکے تھے۔ جو اس شرارت یا بدتمیزی کے بعد سامنے قطار میں بنی کوٹھیوں میں سے کسی ایک کے اندر گھس گئے تھے اور اب "غالباً" یہ تماشا دیکھ کر محظوظ

[illegible] تھے۔
"[illegible]" اوما کے حواس ایسی کسی بھی صورت حال میں ذرا جلدی بحال ہو جاتے تھے اس نے کسی کو [illegible] پکڑا۔ کسی کو بازو سے کھینچا۔ کسی کا پلو دبوچا اور [illegible] قبل کہ آس پاس کے گھروں سے لوگ باہر [illegible] وہ ان سب کو لے کر برابر کی پتلی سی گلی میں گھس [illegible] تھی۔
"[illegible] تم اپنا باجا تو بند کرو۔ گھر والوں کو ذرا سی بھنک پڑ [illegible] اس بات کی تو وہ بے عزتی ہوگی کہ یاد ہی کرو گی۔ اب چپ چاپ کر کے نکلو ادھر سے تاکہ کسی کو کانوں کان خبر [illegible]۔"
بات تو سچ تھی۔ وہ دم سادھے چلیں تو گھر کے گیٹ [illegible] جا کر دم لیا۔
نیچے رکنے میں خطرہ تھا۔ وہ دبے پاؤں سیڑھیاں [illegible] کر اوپر چلی آئیں ذرا دیر میں ہی چھت پہ ایک [illegible] میں بیٹھی تھیں سر تھامے۔
"شکر کرو کہ آج بھنڈی ساتھ نہیں تھی۔ ورنہ وہ [illegible] ابھی تک بج رہا ہوتا۔" تائی اماں نے کسی خاص [illegible] کی تیاری کے لیے اسے گھر پر ہی روک لیا تھا۔
[illegible] ناک اور آنکھوں میں ابھی تک دھواں گھسا ہوا۔
"میرے پیروں پر جلن ہو رہی ہے۔ لگتا ہے جل [illegible] ہیں۔ ارم! کہیں نشان ہی نہ بن جائیں۔" فرح [illegible] فکر مند تھی۔
"شاہ زین کا کمرہ خالی ہے۔ وہاں چل کر دیکھ لیتے [illegible]۔" ارم دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی۔
"ناحق بے چاریوں کو ساتھ لے کر خوار کرتی [illegible]"
شاہ زین معمول کے مطابق اس وقت باہر گیا ہوا تھا اس لیے وہ سب آزادی سے اس کے بیڈ پر ڈیرا [illegible] گئیں۔... کسی نے صوفہ سنبھال لیا۔
[illegible] اس وقت سب سے معقول دکھائی دے رہی [illegible] نیچے بھجوا دیا گیا۔
[illegible] اماں کو کہہ دینا کہ ہم سب شیراز بھائی کے [illegible] ہیں۔" بہانہ بتا کر روانہ کر دیا گیا۔
یہاں روشنی میں سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ رنگ اڑے ہوئے۔ چہرے زرد۔ ہونٹ خشک۔ آنکھوں میں خوف کچھ کچھ غصہ۔
اوما کے لبوں سے ہنسی ایک فوارے کی صورت میں چھوٹی تھی۔ اور پھر یکے بعد دیگرے سب کے قہقہے نکل گئے۔
"اوئی امی جی۔" خضریٰ کی نقل اتاری گئی۔
"ہائے میں مر گئی۔ ہائے میں مر گئی کہہ کر ڈانس کون کر رہا تھا۔" فرح کو چھیڑا گیا۔
"اف خدایا! لگتا ہے ایک پٹاخہ افشین کے بالوں میں چھوٹا تھا۔" اس کے گھونگھریالے بال بے تحاشا بکھرے پڑے تھے۔
"اتنے دنوں کی واک نے بھی کوئی اثر نہیں ڈالا۔ موٹیوں کو کھینچ کھینچ کر کے میرے نازک بازو جواب ہی دے گئے۔ اف خدایا! میں کتنی ذہین واقع ہوئی ہوں۔ اگر بروقت تم لوگوں کو وہاں سے نکال کر نہ لے آتی تو ابھی تک ہم وہاں لوگوں کے نرغے میں پھنسے ہوتے۔ اور اس کے بعد تایا' چچاؤں کی پیشیاں بھگت رہے ہوتے۔"
"یہ سب کیوں ہوا؟"
"کیسے ہوا؟"
"کس نے کیا؟"
"کس کی اجازت سے ہوا...؟" اوما ناک پر عینک جمائے۔ بالکل تایا ابو ہی لگ رہی تھی۔
"ہاں تو پھر بتائیں ناں۔ کیا' کیوں' کب اور کیسے...؟ کوئی اس کے عین سامنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا تھا۔
"اوئی ماں' آپ کہاں سے نکل آئے؟"
اوما نے گڑبڑا کر سکھیوں کو دیکھا۔
"شاہ صاحب! میرا مطلب ہے شاہ زین بھیا! آپ تو اس وقت...؟"
"باہر نہیں ہوتا۔ آج شہزادیاں محل میں وقت سے بہت پہلے پہنچ گئیں۔ اور ظاہر ہے کہ خیریت نہیں رہی... چہروں سے تو یہ ہی لگ رہا ہے اور باقی باتیں بھی

اتفاق سے ٹیرس پر ٹہلتے ہوئے سن چکا ہوں۔ جو رہ گیا۔ وہ آپ بتائیے۔" اب بھاگنے کی گنجائش کہاں تھی۔ اوما نے مختصر بتادیا۔

"اب آپ کسی اور سے نہ کہہ دیجیے گا۔ مرد حضرات سارے کے سارے تائی پچیوں پہ چڑھ دوڑیں گے کہ ہمیں گھر سے نکلنے ہی کیوں دیا؟"

"ٹھیک ہے نہیں کہوں گا۔ لیکن جانے سے پہلے ..... بیڈ شیٹ جھاڑ کر درست کردیجیے گا۔ صوفے کے کشن ترتیب سے اور کارپٹ پر ڈسٹنگ بھی اصل میں ڈسٹ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔" وہ نہایت اطمینان سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

"ہائیں۔" لڑکیوں کو قدرے حیرت ہوئی۔ پھر جھک جھک کر پہلو بدل بدل کر دیکھا جانے کن کن راستوں سے واپسی ہوئی تھی۔ سب کے پیر دھول مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔

"یہ بھی بڑی چیز ہیں۔ رفتہ رفتہ کھلیں گے۔" فرح نے پرسوچ نظروں سے شاہ زین کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی تصویر کو دیکھ کر کہا تھا۔

اگلی شام کا وہ لمحہ ان سب لڑکیوں کو حیران کردینے والا تھا۔ جب شاہ زیب اور طلال ان کے سامنے کھڑے کہہ رہے تھے۔

"واک کرنے کون کون جارہا ہے؟"

چند لمحے آنکھوں ہی آنکھوں میں مشاورت کے بعد اوما سب سے پہلے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ پھر یکے بعد دیگرے۔ باقی سب۔

طلال نے جاتے جاتے مرسلین کو آواز لگائی۔ مرسلین نکلا تو رومی اور ٹیپو بھی ساتھ ہولیے تھے۔

☼ ☼ ☼

شاہ زین نے بنا بنایا گھر خرید لیا تھا۔ وہ سب کے سب مل کر گھر دیکھنے کے لیے گئے۔ "حاوی" کی ڈیزائننگ نے سارے شہر میں دھوم مچا رکھی تھی۔ اور یہ گھر بھی ان ہی کا ڈیزائن کیا گیا تھا۔ قدیم و جدید کا امتزاج۔ وسیع و عریض لان کے داہنی جانب ایک حوض تھا۔

"شاہ زین بھائی! فوراً" سے پیشتر مالی کو بلوائیے۔ آم، انار اور لیموں کے درخت ہونے چاہئیں بلکہ انار کا درخت اس طرح ہو کہ اس کی شاخیں بڑھ کر حوض کے پانی میں اپنا عکس دکھائیں۔ اور جب میں یہاں آیا کروں گی ناں تو حوض کنارے بیٹھ کر "اداس نسلیں" اور "آنگن" پڑھا کروں گی۔" اوما اپنی رائے کے اظہار اور مفت مشورے دینے میں کبھی کنجوسی نہیں کرتی تھی۔

"حوض میں سفید بطخیں ہونی چاہئیں۔ یہ مطالبہ بھی پیش کردو۔" فرح نے ہلکا سا طنز کیا۔

"وہ کمی تو تمہارے آنے سے پوری ہوجایا کرے گی۔" اوما کے بجائے ضویا نے جواب دیا۔

"اور یہاں پر ایک بک شیلف ہونا چاہیے۔ اور ادھر گلاس وال کے بائیں جانب اسٹیریو پڑا ہو۔ تاکہ برستی ہوئی بارش میں یہاں بیٹھ کر جگجیت، نور جہاں اور نصرت فتح علی خان کی غزلیں سنی جاسکیں۔"

اوما کے لہجے میں جو بات سب سے پہلے محسوس کی جاسکتی تھی، وہ اس کا کھرا پن تھا۔ کسی بھی کھوٹ، بناوٹ سے عاری، صاف ستھرا لب و لہجہ۔ جس سے کسی بھی "جذبے" کو اخذ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

شاہ زین بے حد دلچسپی اور شوق سے اسے سن رہا تھا۔

اور ایسے ہی جذبے اور لگن میں چوبی زینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"اگر یہ میرا گھر ہوتا۔ تو میں یہاں۔"

تو شاہ زین نے فرح اور اریبہ کے ساتھ افشین کے چہروں کے بگڑے زاویوں کو بخوبی محسوس کیا تھا۔

"دلی کو چھچھڑوں کے خواب۔" کسی نے ہلکی سرگوشی کی۔ اور پھر بلند قہقہہ۔

اوما نے قدرے چونک کر ان سب کو دیکھا۔ اس کا دھیان بٹانے کی لاشعوری کوشش کے طور پر شاہ زین نے اسے زینے سے اوپر جانے کی پیشکش کی لیکن وہ اوما تھی۔ ان ہی لوگوں میں پیدا ہوئی۔ ان ہی میں پل کر

جوان ہوئی تھی۔ وہ بنا سنے بتا سکتی تھی کہ کیا کہا گیا۔ اور کس مفہوم میں کہا گیا۔؟

شاہ زین نے اس کے چہرے کا رنگ ایک پل کے لیے بدلتا محسوس کیا مگر دوسرے لمحے وہ بالکل نارمل ہوچکی تھی۔

"میں صرف اپنا بیڈ روم ڈیکوریٹ کررہا ہوں۔ باقی سب کام والدہ محترمہ خود آکر کریں گی۔ میری اور ان کی چوائس بہت ڈفرنٹ ہے۔" شاہ زین کہہ رہا تھا۔

"ان کا انتظار کیوں۔ آپ اوما سے ہیلپ لے لیں۔ یہ بہترین ہوم ڈیکوریٹر ثابت ہوگی۔" کہنے والی نے جانے کس انداز سے کہا تھا لیکن اوما نے نہایت خوش دلی سے جواب دیا تھا۔

"ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔"

☼ ☼ ☼

شعبان المعظم کا آخری عشرہ شروع ہونے کی دیر تھی کہ تائی اماں سستی و بیماری کے سارے چولے اتار، رمضان المبارک کی تیاریوں کے لیے ہٹی کٹی ہو بیٹھیں۔ بند پیٹی کھلوائی گئی جو سال کے سال بس رمضان المبارک میں ہی کھلتی تھی۔ فنائل کی خوشبو میں ڈوبے تکیے، چادریں، کشن نکالے گئے۔ سفید چادریں ایک بار پھر نیم گرم پانی میں ڈبو ڈبو کر نکالی گئیں۔

ہال کمرہ جہاں سارے زمانے کے لڑکے، لڑکیاں بچے اپنا اپنا اودھم مچائے رکھتے تھے خالی کرالیا گیا۔ جھاڑے نے خوب ہی رگڑ رگڑ کر فرش دھویا۔ فنائل میں بھگو بھگو کر پوچے مارے۔ الماریاں صاف کی گئیں۔ یہاں قرآن پاک، سپارے، تسبیحیں، جائے نماز کھجور کی گٹھلیوں سے بھرے پیالے، عطر، اگر بتیاں رکھ دی گئیں۔ دیوار سے دیوار تک صاف ستھرا دبیز قالین بچھایا گیا۔ چادریں، تکیے، کشن عین وقت پر رکھے جانے تھے۔ لیجیے یہ کمرہ عبادت کے لیے تیار۔ اب مہینہ بھر گھر کی عورتیں یہیں نماز باجماعت ادا کریں گی یہیں اوتیح ہوں گی۔ ماہ رمضان میں بچوں کو ادھر ادھر گیند لگانے، کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ تائی اماں یا چچی انہیں اپنی نگرانی میں بٹھا لیتیں اور وہ نہایت شوق سے کھجور کی گٹھلیاں لے کر ذکر واذکار میں مصروف رہتے۔

باورچی خانے کا انتظام عائشہ چچی کے سپرد تھا۔ وہ سودا سلف لانے کے لیے ایک ایک کو پکڑتیں۔ اس بار شاہ زین نے انہیں فکر مند دیکھا تو مزے سے انہیں گاڑی میں بٹھا کر یہ جا، وہ جا۔ لڑکوں کا خیال تھا کہ جب موصوف ادھ موئے ہو کر لوٹیں گے تو ان کی خوب ہی درگت بنائی جائے گی۔ مگر خلاف توقع شاہ زین خاصا ہشاش بشاش واپس آیا تھا۔ اس کے لیے یہ تیاریاں نئی مگر بہت دلچسپ ثابت ہو رہی تھیں۔

اوما نے دو دن سے اپنی شکل نہ دکھائی تھی۔ سحری اور افطاری کی ابتدائی تیاریاں لڑکیوں کے ذمے تھیں اور لڑکیوں میں سے اوما کو باورچی خانے سے اس قدر لگاؤ تھا کہ باقیوں کی بس چھٹی۔

"دہی بڑوں کے لیے ماش اور مونگ کی دال پسوا کر رکھ لی ہے۔ کباب تیار ہو کر فریزر میں پہنچ گئے۔ میکرونیز اور چکن رول کا مصالحہ تیار۔ املی کی چٹنی بن گئی۔ کیچپ بازار سے آگیا۔ اب اگر کسی اور چیز کے لیے کسی کو تکلیف ہو تو وہ خود ہاتھ پیر ہلا سکتا ہے۔" پہلے روزے سے دو دن قبل نماز مغرب کے فوراً" بعد اعلان کرتے ہوئے وہ دھپ سے فرح کے بیڈ پہ جاگری تھی۔

"ہائیں۔ آپ کے ہاتھ پاؤں ابھی سے جواب دے گئے کیا؟" حیرت بھری آواز پر وہ سٹپٹا کر اٹھی۔

شاہ زین مناسب جگہ نہ ملنے پر کونے کے اسٹول پر اٹکا ہوا تھا۔ ٹانگیں البتہ طلال کی گود میں تھیں۔

"ارے آپ بھی یہیں پائے جاتے ہیں ....." اس نے غیر محسوس انداز میں دوپٹہ کھینچ کر پھیلایا جو آتے کے ساتھ ہی بیڈ پر اچھال دیا تھا۔

"جی ہاں! خوش قسمتی سے یہاں چھوٹے، بڑے سب ہی پائے، پائے جاتے ہیں۔" طلال نے فقرہ بنایا ... شاہ زین کا قہقہہ۔

"اور آپ کی اس بات کا کیا مطلب ہوا بھلا؟" وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

"ڈیڑھ' دو سو کباب کا قیمہ پیس کر اور پھر کباب بنا کر دکھائیے تو مانیں۔ اتنی ڈھیر ساری تو سبزیاں ہی کاٹی ہیں۔ بند گوبھی سمیت۔"

"یار طلال! یہ پاکستانی لڑکیاں کتنی نازک ہوتی ہیں۔" نہایت ترحم آمیز لہجے میں کہا گیا تھا۔

جواب کسی اور طرف سے آیا تھا۔

"بس جی کیا کریں۔ پاکستانی جو ہوئے۔ ہماری قومی و نسلی خصوصیت ہے۔۔۔ نازک مزاجی اور آرام طلبی۔۔۔ ہم بیس بائیس برس انگریز کے ملک میں گزار کر بھی پاکستانی ہی رہتے ہیں۔ لوٹ کر آئیں تو یہ خصوصیات کہیں نہ کہیں سے عود کر آتی ہیں پھر ہم جوتے سنگھاڑے سے رگڑواتے ہیں۔ رومال' جرابیں گنگو کے سر پہ دے مارتے ہیں۔ ناشتہ بارہ بجے اپنے موڈ کے مطابق بنواتے ہیں۔ دوپہر کے کھانے اور شام کی چائے کے لیے چچی' تائیوں کی دوڑیں لگواتے ہیں اور رات گئے تک گھر بھر کو کھانے کی میز پہ انتظار کرواتے ہیں۔ اور پھر کوئی سچی بات کہے تو برداشت بھی نہیں کر سکتے اور نیلے پیلے' لال ہونے لگتے ہیں۔ کیونکہ ہم پاکستانی ہیں اور پاکستانی تو ہوتے ہی نازک مزاج ہیں۔"

شاہ زین کو تو خدا جانے سانس بھی آ رہی تھی کہ نہیں۔ وہ خود البتہ کہہ کر ہنستی ہوئی کمرے کا دروازہ پار کر گئی۔

کمرے میں بیٹھے نفوس نے بڑی دیر بعد اپنی رکی ہوئی سانس خارج کی۔ حواس و قیاس بحال کیے پھر پلٹ کر شاہ زین کو دیکھا۔

"ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ وہ تو بس یونہی۔" شاہ زین کو لب بھینچے اپنی جگہ سے اٹھتے دیکھ کر لڑکیاں اپنی جگہ بوکھلائیں۔

طلال اور ٹیپو منہ چھپائے ہنسی روک رہے تھے۔۔۔ شاہ زین دھپ دھپ زمین پہ پاؤں مارتے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"کتنی بدتمیز ہے یہ اوما۔۔۔" فرح کا دل اس قدر دکھا کہ بس رونے والی ہی ہو گئی۔ کسی بھی خوبصورت اور ڈیشنگ بندے کی اس قدر بے عزتی کم از کم اس کی برداشت سے باہر تھی۔ خصوصاً" اس وقت جب وہ بندہ کنوارہ ہو اور رشتے کی تلاش میں بھی ہو۔

"حد کر دی بھئی۔ یہ کوئی طریقہ ہے بات کرنے کا۔" یہ اریبہ تھی۔

"زیادہ ہی بددماغ اور بد مزاج ہے یہ لڑکی۔" ایک اور رائے۔

"وہ مہمان ہے اس گھر میں۔ اسے اتنی اجازت کس نے دی ہے کہ۔"

اور بس۔ بات کمرے سے نکل کر برآمدے تک۔۔۔ برآمدے سے باورچی خانے۔۔۔ اور یہاں سے کھڑکی پھلانگ کر سیدھی عائشہ چچی تک۔

پھر جو اوما کی مزاج پرسی ہوئی۔ وہ پہلے تو ہکا بکا رہ گئی۔ پھر ہکلائی' منمنائی اور آخر میں غصے میں آ گئی۔

"یہ ایک انتہائی معمولی سی بات ہے اور اسے اتنا بڑھاوا دینے کی قطعاً" ضرورت نہیں۔" مگر اس وقت تو امی کے اندر تائی' چچیوں کی روح سمائی ہوئی تھی۔ جو تڑپ رہی تھی۔ پھڑک رہی تھی۔ اور پھڑکتی بھی کیوں نہ؟

محترم شاہ زین حسن نے سنگھاڑے کو اپنے جوتے پالش کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ چچی کے ہاتھ سے ٹرے لے کر باورچی خانے میں جا کر کھانا تناول کیا گیا تھا۔۔۔ رات کو کھانے کی میز پر سب سے پہلے موجود۔۔۔ اور وہ بھی ایسے کہ منہ بنا ہوا۔۔۔ سنجیدگی کی چادر اوڑھے۔۔۔ ہر بات کا نپا تلا جواب۔۔۔ زودرنج لڑکیوں کے دل تو رنجیدہ تھے۔ مائیں بھی اس کا موڈ بحال کرنے میں ہلکان ہوتی رہیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ اوما کچھ دنوں سے نظر نہیں آ رہی۔" شیراز حسن نے اچانک ہی سر اٹھا کر رومی سے پوچھا۔ ان کا ٹیبل لیمپ رات جلتے جلتے اچانک ہی بند ہو گیا تھا۔ رومی اسی کے آپریشن میں مصروف تھا۔

"اوما آپی اور گھر والوں کے درمیان کچھ ناراضی چل رہی ہے آج کل۔"

"کیوں۔۔۔؟" وہ ذرا سا چونکے۔

جواباً" رومی نے ساری کتھا کہہ سنائی۔ وہ بھی نہایت دلچسپ پیرائے میں۔

"شاہ بھیا نے اپنی دانست میں صرف چھیڑا تھا۔ یہ نہیں دیکھا کہ کس کو چھیڑا ہے؟ انہوں نے کچھ کہا' اوما آپی نے جواباً" بہت کچھ کہا۔۔۔ لیکن کہہ کر جانا کہاں تھا۔ سارا گھر ہاتھ دھوئے بغیر ہی ان کے پیچھے پڑ گیا۔ عائشہ چچی نے ناک میں دم کر رکھا ہے کہ جا کر شاہ سے معافی مانگو۔ اب یہ ہو تو ہو کیسے؟ اوما آپی اور معافی تلافی۔ سورج تو ابھی مشرق سے ہی نکلتا ہے ناں بھیا۔"

رومی ہنس رہا تھا۔

شیراز حسن سنجیدہ تھے۔

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ اگر وہ غلطی پر ہو تو بہت جلدی تسلیم کر لیتی ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی دانست میں ٹھیک ہے تو پھر واقعی اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔"

"بات تو مذاق میں ہی ہوئی تھی۔ پھر نہ جانے کیوں اتنا بڑا ایشو بنا لیا گیا۔"

رومی بار بار سوئچ آن' آف کر کے لیمپ چیک کر رہا تھا۔

"ایشو اس لیے بنا رومی! کہ یہ باتیں عظمی نایاب نے کہی ہیں۔ کسی اور نے کہی ہوتیں تو صرف مذاق ہی لگتیں۔ مان لو کہ ہم آج بھی وحید چاچو کی اولاد کو اس گھر میں دوسرے درجے کا فرد سمجھتے ہیں۔ اور یہ تینوں بچے نہایت خودداری اور آہنی ارادوں سے اپنی دو نسلوں کی غلطی بھگت رہے ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" رومی ان کے قریب آ بیٹھا۔

"دیکھو' پہلی غلطی دادا صاحب نے کی تھی۔ گاؤں کی انتہائی سادہ مزاج عورت کو ایک نہایت بااثر اور اعلیٰ گھرانے کی عورت کے مقابل لائے اور پھر تاعمر چاچو کے حقوق غصب ہونے کا تماشا دیکھتے رہے۔ دوسرا غلط قدم وحید چاچو کا تھا جنہوں نے اپنی ماں کی سگی بھانجی کو زندگی کا ساتھی تو بنایا لیکن انہیں خاندان میں مناسب مقام دلوانے میں ناکام رہے۔ الٹا سارے مسئلوں سے جان چھڑانے کو کوسوں دور جا بیٹھے۔ اور میں جانتا ہوں رومی! اس سارے عرصے کے اچھے اور برے وقت کا عظمی نے کس حوصلہ مندی اور جرات سے سامنا کیا ہے۔ وہ سب کے ساتھ ہنستی بولتی' کھیلتی ہے لیکن اس کی آنکھوں میں کبھی سوچ اور فکر کی تحریر پڑھنا۔ وہ تمہیں اپنی عمر سے کئی گنا بڑی نظر آئے گی۔ میرے کمرے کی کھڑکی اس کے آنگن میں کھلتی ہے۔ میں نے عائشہ چچی کو سوتے اور اسے رات' رات بھر جاگ کر ٹہلتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کا ضبط' اس کا ظرف باکمال ہے۔ کہنے والے کو پلٹ کر جواب نہیں دیتی۔ جذب کر لیتی ہے۔ اور ایسے لوگ بہت عظیم ہوتے ہیں۔"

"آپ اتنا زیادہ جانتے ہیں اوما آپی کو۔۔۔؟" رومی کو از حد حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں۔ یہ لڑکی مجھے بہت عزیز ہے۔ میرے ساتھ جو حادثہ ہوا۔ اس کے بعد مجھے بہلانے کی سب سے زیادہ کوششیں اوما نے کیں۔ اور میں نے اس کی عزت نفس کے مینار بلند کرنے کے لیے اپنے ہر دکھ کی سانجھ اس سے کی۔ میں اپنے کام کے معاملے میں اوما پر بہت زیادہ بھروسا کرتا ہوں۔ کیونکہ اس کی ذہانت چولہے' چوکی سے کہیں بڑھ کر ہے۔

وہ سوتیلے پن اور باپ کے بزدلانہ رویے کی شکار نہ ہوئی ہوتی تو اس کی قابلیت اسے کہیں بہت اوپر لے جا سکتی تھی۔

"شیراز بھائی! اس گھر کے بڑے آپ کا کہا مانتے ہیں۔ پھر آپ نے ان کے لیے کوئی کوشش۔"

"نہیں کر سکا۔ کیونکہ میں خود لاعلم تھا۔ چہروں کو پڑھنے کے ہنر سے ناواقف۔ مجھ پر جو حادثہ گزرا۔ اس نے مجھ پر بہت سے راز فاش کیے جن میں سے ایک راز عظمی نایاب تھی۔ اور اس وقت کوشش کا زمانہ بیت گیا تھا۔"

شیراز حسن کے لہجے میں تاسف ہی تاسف تھا۔

رومی بنا کچھ کہے چپ چاپ ان کا چہرہ تکتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی مدیحہ پھپھو کی آمد کی اطلاع بھی مل گئی۔

"بس عید تک رکوں گی۔ اسی دوران شاہ زین کی شادی اور پھر واپسی۔ نثار صاحب ابھی وائنڈ اپ کے لیے راضی نہیں ہو رہے۔ کم سے کم بھی چھ' آٹھ ماہ ہمیں لگ جائیں گے' تب تک شاہ زین پاکستان میں اچھی طرح سے سیٹ ہو جائے گا۔"

اور اس تمام گفتگو کے جس حصے نے توجہ جکڑی۔ وہ تھی شاہ زین کی شادی۔ دبا دبا سا جوش ایک بار پھر انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

فرح کا سلم ہونے کا بخار اک بار پھر زور پکڑ گیا۔ روزہ رکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ سارا دن چوری چھپے پھل' سلائس' قہوہ لیتی رہتی۔ بڑی چچی عید کے بہانے ارم اور افشین کو پارلر کا چکر لگوا لائیں۔ اریبہ نے اپنی پلکوں کی جاذبیت بڑھانے کے لیے کیسٹر آئل کا متواتر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔

بھنڈی بغور ان کے چہروں کو دیکھتی پھر خضریٰ اور ضوبیا کے سر ہو جاتی۔

"وہ سب تو گوڈے گوڈے لشکارے' چمکارے مار رہی ہیں۔ اور آپ دونوں اس سڑی ہوئی حبس زدہ شام میں لان کی مٹی گھٹا پھانک رہی ہیں۔ نہ آپ کی پھپھو نے نہیں آنا۔"

"بھنڈی یار! تنگ نہ کر۔" ضوبیا چڑ کر اسے وہاں سے ہٹا دیتی۔ وہ اپنے اسٹیج ڈرامے کی ریہرسل میں کسی کی مداخلت برداشت نہ کرتی تھیں۔

عائشہ چچی باقی سب لڑکیوں کو نظر بھر کر دیکھتیں اور پھر اوما کے چہرے پر نگاہ ٹکا دیتیں۔

"میری بیٹی کسی سے کم تو نہیں۔" ماتا نچھاور ہو جاتی۔

"ستارے کی چمک دمک کتنی ہی ہو۔ سورج کے سامنے دکھائی نہیں دیتا۔"

حقیقت سے نظریں چرانا کہاں ممکن تھا۔ وہ اور کچھ نہ کر پاتیں۔ تو نماز' تسبیح کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتیں۔

"یا اللہ! میری بیٹی کے بھاگ نصیب اچھے لکھ دے۔ سب سے خوبصورت قسمت' اس نے بہت کچھ کھویا۔ اپنے شوق' خواہشات۔ اب اسے مالا مال کر دے۔ وہی دے جو اس کے حق میں نیک اور بہتر ہو۔"

وہ افطاری کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی' ادھر سے ادھر جاتی اوما کو دیکھے جاتیں۔ تایا ابا کا حکم تھا کہ سحری و افطاری اکٹھے کی جائے' سب محمود و ایاز ایک ہی صف میں۔ محمود و ایاز دستیاب نہ تھے لہٰذا بھنڈی اور سنگھاڑا خوب قریب قریب ہو کر بیٹھتے ایک ہی صف میں۔ چنانچہ تائی اماں نے مردوں اور خواتین کی افطاری کے لیے الگ الگ جگہیں متعین فرما دیں۔ جس کا باقیوں کا تو خدا جانے مگر فرح کو خاصا قلق ہوا۔

پہلے دو روزوں کی افطاری میں اچھا خاصا شاہ زین کے مقابل بیٹھتی رہی تھی۔ آنکھوں کی پیاس بجھائی نہ بجھتی تھی۔

"یا اللہ! کس قدر خوبصورت ہے شاہ زین!"

☼ ☼ ☼

پھپھو کی آمد کے بعد تو گویا تائی' چچیاں اپنی اپنی ذمہ داری سے ہی بری الزمہ ہو گئیں۔ باتیں' عبادت' پھر باتیں اور پھر عبادت... بس یہ دو ہی کام تھے۔

عید کے لیے کپڑوں کی خریداری بھابھیوں کے سپرد تھی۔ اور بھابھیوں کے بغیر لڑکیاں بازار جانے کا سوچ بھی نہ سکتی تھیں۔ رابعہ اور بخت بھابھی ہر روز ایک پارٹی کو ساتھ لے کر نکل جاتیں۔ فاران بھائی کی بیگم نائمہ کی گود میں دو ماہ کا صائم تھا لہٰذا وہ گھر میں بچوں کی نگرانی کرتیں۔

ان ہی دنوں انجومامی نے ایک شام افطاری کی دعوت دے ڈالی۔

لڑکیوں کی تو چیخیں ہی نکل گئیں۔

... مدت بعد کوئی اچھی دعوت آئی تھی۔ بیرونی ... تو بس تائی' چچی ہی بھگتا آتی تھیں کہ لڑکیوں کو ... کی اجازت نہ تھی۔ لے دے کر یہ دو ہی گھرانے ... ایسی خوشی کی جھلک دکھلاتے تھے۔ ایک انجو ماموں کی دعوت کبھی کبھار لیکن نہایت اعلا پائے کی ہوتی تھی۔ وہ کانونٹ سے پڑھی تھیں اس زمانے میں' ... کانونٹ کے طلبہ و طالبات اپنی شستہ انگریزی اور اکڑی ہوئی گردن کی وجہ سے کسی بھی تعلیمی ادارے میں دور سے پہچانے جا سکتے تھے۔ پرائیویٹ کالجز اور اسکولز کا ان دنوں ایسا رواج نہ تھا۔ میٹرک کے بعد ہر ادارے کے طالب علم گورنمنٹ کالج میں ہی پائے جاتے تھے۔ اور یہاں کانونٹ زدہ طبقے کا طوطی بڑھ چڑھ کر بولتا تھا۔ اور انجومامی کا طوطی ابھی تک بولتا تھا۔

الف تا ے انگریزی۔

اور اس انگریزی کے متاثرین میں تائی چچیوں کے ساتھ ساتھ بھنڈی بھی شامل تھی۔

"جب دیکھو۔ گوڈے گوڈے انگریجی۔"

چھوٹی چچی تو انہیں دیکھتے ہی کسی نہ کسی کام میں مشغول ہو جاتیں۔

"اب کون بیٹھ کر اس کے ساتھ دماغ کھپائے۔ ... بھی پوچھو تو جواب آئے گا۔

"اللہ کا شکر" منہ بھی نہیں تھکتا ان کا۔"

انجومامی کے تین ہی بچے تھے۔ شہزاد' ارسلان اور ...

ارسلان جیالوجی میں ایم فل کر رہا تھا۔ صرف ... انجومامی کے کہنے پر۔ وگرنہ یار دوست تو کب ... ملازمت سے وابستہ ہو چکے تھے۔

... کہا کرتا تھا۔

"... ماں پاگل ہے۔"

"... پی۔ ایچ۔ ڈی سے پہلے تمہیں چھوڑوں گی نائیں ..."

... کی اردو حد درجہ کمزور تھی۔ اسے آج تک ... معلوم نہ ہو سکا تھا کہ ناک' اخبار اور میز ہوتا ہے یا ہوتی ہے۔ ارسلان نے اسے چیلنج کیا ہوا تھا۔

"قسم سے فاطی! ایک بار اردو میں پاس ہو کر دکھا دے۔ پورا ایک ہزار تیرا۔"

اور فاطی جی جان سے یہ چیلنج قبول کرنے پر تیار۔

تینوں بہن بھائی نہایت سادہ' مخلص' بے ریا تھے۔ ان کے گھر جانے میں لطف ہی کچھ اور تھا۔

دوسری دعوتیں عائشہ چچی کے گھر ہوا کرتی تھیں۔ وہ پکانے اور کھلانے کی بے حد شوقین تھیں۔ اکثر و بیشتر ہی کھانے پینے کا اہتمام کرتی نظر آتی تھیں۔ کبھی حلوہ پوری پہ دعوت ہو جاتی۔ کبھی پاپڑی چاٹ اور دہی بھلوں کی محفل ہوتی اور کبھی کبھار بس آلو بھرے سموسے اور چائے ہی ان کے لطف کا سامان بنتی تھی۔

ایسے موقعوں پر خوب ہی ہنسی مذاق اور لطیفے بنتے۔

آج بھی خوشی کا وہی عالم تھا۔ انجومامی کی طرف دعوت۔ کسی پکنک سے کم نہ تھی۔ دعوت پہ جانے کو سب ہی تیار تھے۔ روزہ دار بھی اور روزہ خور بھی۔

لڑکیاں الماریاں کھولے بند سوٹوں کو ہوا لگوا رہی تھیں۔ کوئی آئی بروز بنانے بیٹھ گئی' کسی نے منہ پر ماسک مل لیا۔ کوئی میچنگ جوتی کی تلاش میں نکل گئی۔ کسی نے ہم رنگ ٹاپس کے لیے منت سماجت شروع کر دی۔

سہ پہر کو بلال بھائی کی گاڑی تائی چچیوں کو لے کر انجومامی کی طرف روانہ ہوئی تو عظمیٰ نایاب عرف اوما ابھی تک لینز ہاتھ میں لیے پھر رہی تھی۔

"دائیں طرف کے سب لوگ پیچھے پیچھے ہٹ جائیں۔" انگلی کے پوروں پر لینز لیے وہ دہائی دے رہی تھی۔ تیسرے کمرے میں کہیں جا کر ارم دکھائی دی۔

"اوہ خدایا۔ شکر ہے۔ پوری دنیا دکھائی دینے لگی۔" اس نے بڑی بڑی آنکھیں پٹپٹائیں۔ احتیاطاً" عینک بھی پرس میں رکھ لی تھی۔

گاڑی میں ٹھنس کر بیٹھتے ہوئے بھی وہ ساتھ بیٹھی افشین کو مسلسل کہنیاں مارتی رہی۔

"اپنے بال سمیٹو۔ میرے لینز۔"

"آہستہ ہنسو۔ میرے لینز۔"
"ارے کھڑکی تو بند کردو یار! تیز ہوا میں لینز اڑ گیا تو اماں سے بس جوتے ہی پڑیں گے۔"
"اف خدایا۔ کہاں سے آگیا۔ بے ہودہ لینز۔ اوہ! نکال اپنی عینک۔ تم تو پہلے ہی پہچانی نہیں جا رہیں۔ وہاں دعوت پر تو لوگ تمہارے چہرے پہ آنکھیں ہی ڈھونڈتے رہ جائیں گے۔" طلال چڑ گیا تھا۔

وہ جواب دیے بغیر نخرہ دکھاتی۔ اٹھلاتی آگے بڑھ گئی۔

سب کی سب ٹھیک ٹھاک ہو کر آئیں۔
لان کے دیدہ زیب رنگوں والے آنچل۔ لمبی قمیض۔ کلیوں والے کرتے۔ فراک ہم رنگ چپلیں۔ خوشبوؤں میں بسے کنوارے نوخیز وجود۔
انجو مامی کا لان اس شام تتلیوں سے بھر گیا تھا۔
"کتنی خوش ہیں بچیاں۔ کبھی کبھار ان کے باہر نکلنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔"
مدیحہ پھپھو کی نظریں ان کے شاداب کھلتے چہروں سے ہٹتی نہ تھی۔
"اللہ ان ہی میں سے کسی کو میرے بیٹے کا نصیب بنا دے۔" انہوں نے دل سے خواہش کی تھی۔
"آج کسی کو جانے کی اجازت نہیں ملے گی رات بھر۔" شنزا خوش تھی اور خوب شور مچاتی ان سب کو اپنے کمرے تک لے جا رہی تھی۔ جہاں اس نے عید کے کپڑوں کے لیے نت نئے ڈیزائن اپنے کمرے کی دیواروں اور دروازے پر چسپاں کر رکھے تھے اور اب کئی گھنٹوں تک وہی ڈسکس ہونا تھے۔
اوما حسب عادت باورچی خانے میں آ گئی تھی۔
انجو مامی سیاہ ساڑھی میں تمام انتظامات کے آخری مراحل کا جائزہ لے رہی تھیں۔
"مامی کوئی کام؟" اس نے حسب عادت ڈھکن اٹھا اٹھا کر ساری چیزوں کا جائزہ لیا۔
خانساماں کی مدد سے ساری ڈشز انجو مامی نے خود تیار کی تھیں۔ صرف کوفتوں کا پتیلا صبح عظمیٰ نے مرسلین کے ہاتھ بھجوایا تھا کہ ماموں ریاض کو کوفتے بس اسی کے ہاتھوں کے پسند تھے۔
"عظمیٰ ڈیر! تم سب چیزوں کو ایک بار چکھ ضرور لینا۔"
وہ سرہلاتی سلاد کی طرف متوجہ ہو گئی۔
روزہ افطار ہونے میں کچھ ہی وقت تھا۔ وہ تین طرح کے سلاد اور افطاری کے لیے کھجوروں میں بالائی بھر کر فارغ ہوئی تو بیرے سرسبز لان میں ٹیبل لگا رہے تھے۔

"اوما۔ اوپر۔ اوپر۔ ہم سب یہیں ہیں۔ آجاؤ۔" و[ہ] لاؤنج میں داخل ہی ہوئی تھی جب کہ طرح طرح کی آوازیں گونج رہیں۔
افشین' فرح اور فاطمہ کھڑکی میں جھکی ہاتھ ہلا ہلا کر اسے متوجہ کر رہی تھیں۔ کہیں پھر کسی امی کے ہاتھ لگ جاتی تو اسے جان چھڑانا مشکل ہو جاتی اور ایسی محفلوں میں بھلا اوما کے چٹکلوں کے بغیر مزا کہاں۔
"آ رہی ہے اوما بھی۔" فرح نے آواز بلند کی۔ اور اگلے ہی پل۔ ایک زوردار چیخ۔
"کیا ہوا؟" لڑکیاں سرعت سے کھڑکی پر جھکیں۔
اور اس کے بعد پلک کی گنہگار آنکھوں نے جو منظ[ر] دیکھا۔
اس میں عظمیٰ نایاب عرف اوما کا دبلا پتلا' نازک اور خوش قسمتی سے سجا سنورا' خوشبوؤں سے لبریز وجود شاہ زین کے مضبوط' وزشی' کسے ہوئے بازوؤں میں سمایا ہوا تھا۔
"ہائے۔"
"نہیں۔"
ابھی چند ثانیے پیشتر تو اوما سب سے بلند سیڑھی پ[ر] تھی اور شاہ زین محض جینز اور بنیان میں ملبوس۔ د[و] قدم نچلی سیڑھی پہ۔۔۔ پھر۔۔۔ یہ اب۔
اف پلکیں جھپک جھپک کر دوبارہ اس منظر کی تردید چاہی مگر کہاں۔
اسٹار پلس کا ڈرامہ ہوتا تو اوما و شاہ زین کے ساتھ ساتھ بحیثیت ناظرین دس' پندرہ منٹ کے اس رومان[ی] پرور حادثے سے لطف اندوز ہو لیتے مگر یہاں تو عظمیٰ

[تو ا]ب [ع]رف اوما تھی۔
[ش]اید ہی بجلی کی رفتار ہو گی جس طرح تڑپ کر اس کے [ح]صار سے آزاد ہوئی تھی اور بجلی کی تڑپ کے ساتھ [لیکن] گرج تو ہوتی ہی ہے۔ سو وہ گرجی بھی اور برسی بھی [ش]اہ زین معصوم تو ارے' ارے ہی کرتا رہ گیا۔
آج سے پہلے تو کسی نے اس قدر وضاحت سے [اس]ے مشرقی و مغربی روایات کے درمیان فرق نہیں [سم]جھایا تھا۔ نہ ہی اخلاقیات' اقدار' روایات' شرم و حیا [اور ک]لچر۔
"ہائیں! یعنی کہ۔۔۔" وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ان [س]ب چیزوں کا یہاں کیا تذکرہ۔
وہ تو صبح سے یہیں قیام پذیر تھا اور اب نہانے کے بعد شنزا سے اپنی شرٹ لینے آیا تھا۔ جو اب سے چار گھنٹے قبل استری کرنے کی غرض سے دی گئی تھی۔
اب اس سے دو قدم اوپر جاتی عزیز' اوما اگر پاؤں [ر]پٹ جانے کے سبب سیدھی اس کی بانہوں میں [آ]سمائی تھی تو اس میں اقدار و روایات اور مشرق کہاں [س]ے آ گئے؟ اور اگر اوما ڈیر کو سیڑھیوں پر فٹ بال کی [ط]رح اچھلنے' لڑھکنے سے بچانے کے لیے انہوں نے نادانستہ اس پر اپنی گرفت مضبوط کرلی تھی' جو حواس [ب]حال ہوتے ہی کمزور بھی پڑ گئی پھر اس میں اخلاقیات اور شرم و حیا؟
وہ اس کے سر پہ چڑھے ہیڑ دھپڑ کچھ بولے جا رہی [تھ]ی۔

پھر جب خفت مٹائے نہ مٹی تو وہیں سیڑھیوں پہ [بیٹھ ک]ر چھکوں پھکوں رونا شروع کر دیا۔
شنزا نے بھاگ کر شرٹ اسے تھمائی اور کمرے کی [ط]رف دھکیلا۔
[ت]ب وہ سمجھا۔ محترمہ اس بات پر خفا ہو رہی تھیں [ک]ہ صرف بنیان پہن کر باہر آنے کی جسارت کیوں کی؟
شاہ زین نے شرٹ جھٹک کر گویا اپنا غصہ اتارا اور [بڑبڑ]اتا ہوا ارسلان کے کمرے میں جا گھسا۔
انجو مامی کو کسی نے خبر کی تھی۔ وہ ساڑھی سنبھالتی [چلی آ]ئیں۔
"اومائے گاڈ' اوما! یہ کیا بیٹا۔ بڑی بات۔"
وہ اسے بازوؤں کے گھیرے میں لیے پچکارتی' سہلاتی' واش روم تک لے آئیں۔
روزہ افطار ہونے میں کچھ ہی منٹ تھے۔ اس نے خود کو سنبھالا دے کر انجو مامی کو واپس بھیجا اور خود واش بیسن پر پانی کے چھپاکے مارنے لگی۔ خوب رگڑ رگڑ کر منہ دھویا۔
رونے کے سب اثرات ختم کرنے کی کوشش کی۔ پھر چہرہ اٹھا کر آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ سب کچھ دھندلا دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔
اس نے زور زور سے پلکیں جھپکیں۔ پھر معلوم ہوا رونے کے دوران جو آنکھیں رگڑیں تو لینز دغا دے گیا تھا۔ اس نے خفگی سے دوسرا لینز بھی اتار کر واش بیسن میں دے مارا۔ اور عینک لگا کر نیچے اتر آئی جہاں سائرن ہونے کے ساتھ ہی سب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔ وہ بھی لپک کر ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو گئی۔ کھانے کے بعد محفل نعت لان میں ہوئی۔
کھلے لان میں جب ہوا سرسرا رہی تھی اور سفید بادل ٹکڑیوں کی شکل میں چاند سے لکن میٹی کھیل رہے تھے۔ خوشبودار فضا میں مرسلین کی پرسوز آواز میں انہوں نے کتنی نعتیں اور دعائیں سن ڈالیں۔
مرسلین کے کتابی چہرے پر سنجیدگی اس کی عمر سے کچھ زیادہ چھلکتی تھی اور اس کی آنکھیں بہت گہری اور خوبصورت تھیں اور ان آنکھوں میں ایسا مقناطیس جڑا تھا کہ مقابل کو دیکھتا اور وہ ایک پل میں اپنا سب کچھ ہار جاتا تھا۔

مدینے میں صبا جانا تو اتنا کام کر دینا
رسول اللہؐ کو میری غریبی کی خبر دینا

تایا ابا دونوں ہاتھوں میں چہرہ دیے ہولے ہولے سسک رہے تھے۔
"انسان بہت کم مایہ ہے۔ گناہوں کی پوٹ۔۔۔ لیکن کتنے فخر سے دندناتا پھرتا ہے۔"
کسی نے ہولے سے سرگوشی کی تھی۔
ایسی پرنور محفل تھی کہ اکثریت کے دل خدا کی

کبریائی کے سامنے جھکے ہوئے عاجزی سے فریاد کررہے تھے۔

یہ کہہ دینا ہزاروں عیب رکھتا ہوں ہنر دینا مرسلین کی آواز جیسے سب کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھی اور اسی پرنور بندھن میں بندھی ضویا نے گویا پہلی بار مرسلین کو دیکھا تھا۔

وہ حیران تھی۔ اور پریشان بھی۔

یہ وہی مرسلین ہے جسے اس نے ہمیشہ اپنے آس پاس بولتے، کھیلتے، ہنستے، دیکھا تھا۔ رنگین دھاگوں سے کڑھا سفید دوپٹہ سر پہ اوڑھے... دونوں گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکائے وہ گم صم بیٹھی تھی۔ جب قریب بیٹھی خضریٰ نے اسے ٹہوکا دیا۔

"اٹھنے کا ارادہ نہیں کیا؟"

محفل ختم ہوچکی تھی۔ سب لوگ اٹھ چکے تھے۔ ضویا چونکی پھر نہ صرف وہ اٹھی بلکہ خضریٰ کا ہاتھ تھام کر دوڑتی ہوئی سب سے پہلے گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔

"خضریٰ! میرا دل دیکھو۔" اس نے خضریٰ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پہ رکھا۔

"کتنی زور سے دھڑک رہا ہے۔ یوں جیسے ابھی باہر آجائے گا۔"

"مجھے تو کچھ نہیں محسوس ہورہا؟" خضریٰ نے ناک چڑھائی۔

"بدتمیز! اچھا سنو۔ عائشہ چچی نے کہیں مرسلین کا رشتہ وشتہ تو نہیں دیکھ رکھا۔"

ہائے! کم عمری بڑی بے صبری۔ وہ اتھل پتھل سانسوں میں پوچھ رہی تھی۔

"کیا مطلب؟" خضریٰ ہونق سی ہوگئی۔

"دیکھو۔ میں تمہاری دوست ہوں ناں پلیز... مجھے اپنی بھابھی بنالینا۔"

"آہ... ہاہ..." خضریٰ کا منہ آپوں آپ کھل گیا تھا۔

"کیا کہا تم نے..." اپنی سانس بحال کرنے میں خضریٰ کو خاصا وقت لگا۔

ضویا دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھی تھی۔

خضریٰ نے سے جھنجوڑا تو معلوم ہوا، آنسو زارو قطار بہہ رہے ہیں۔

"ارے!" خضریٰ کو اس کی حالت دیکھ کر ہنسی آئی پھر تو وہ ہنستی ہی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"توبہ... توبہ ہماری لڑکیوں کو تو ایسے کام نہ آئے۔" چھوٹی چچی خوامخواہ ہی کلس رہی تھیں۔

"کن کاموں کی بات کررہی ہیں۔ ماشاء اللہ ہر ہنر، ہر کام سے واقف ہیں ہماری بچیاں۔" بڑی چچی نے قدرے ناگواری سے کہا۔

"اُفوہ! آپ کو تو لگتا ہے کچھ خبر ہی نہیں۔" وہ کھسک کر بڑی چچی کے قریب ہوئیں اور کل کی افطاری میں ادما اور شاہ زین کے "حادثے" کو مرچ مسالہ لگا کر بتایا۔

"آئے ہائے۔ یہ کب کی بات ہے، ہمیں کانوں کان خبر نہ ہوئی۔"

"لیجیے۔ اب یہ کوئی ایسی بات تو نہ تھی جو ٹی وی، ریڈیو سے خبریں نشر ہوتیں۔ ادما پاؤں پھسل کر گرنے کو تھی۔ شاہ بھیا نے بچالیا گرنے سے بات ختم۔ آپ لوگ تو خوامخواہ ہی بات کو افسانہ، ڈرامہ بنارہی ہیں لیکن خیر آپ کا بھی کیا قصور؟ اسٹار پلس سے ہمیں یہ ہی کچھ تو سیکھنے کو ملا ہے۔" یہ ضویا تھی، آنکھیں بند کرکے اوندھی لیٹی ٹانگیں جھلا رہی تھی۔

"جانے دو لڑکی! یہ سب "طریقے" ہوتے ہیں لڑکوں کو پھانسنے کے۔ تمہیں بھلا کیا خبر۔ رات افطاری سے آکر بستروں پہ پڑیں اور دھت ہورہیں۔ اور وہ ادما ٹفن بھر بھر لائی تھی انجو کی طرف سے۔ یہ بڑی سی ٹرے سجائی اور سیدھی جا گھسی شیراز کے کمرے میں۔ پھر رات گئے تک ٹر ٹر کی آوازیں۔ جانے کون کون سی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔" بڑی چچی نے قدرے نیچی آواز میں دل کے بھڑاس نکالی تو ضویا قدرے چڑ سی گئی۔

"کمال ہے۔ اس گھر میں اول تو ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی رہتی ہے۔ پھر اگر کوئی دوسروں کا خیال کرے تو وہ

آپ لوفر آوارہ لگنے لگتا ہے۔ ادما کے سوا کسی اور کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ شیراز بھائی نے عین وقت پر آنے کا سامگر عادت سے مجبور ہوکر آئے نہیں اور گھر میں تھا کون؟ جو ان کے لیے افطاری بناتا... تائی اماں مارے مروت کے چپ رہیں۔ ادما نے خود انجو ماسی سے کہہ کر شیراز بھائی کے لیے کھانا نکلوایا اور پھر رات گئے وہ ٹر ٹر کرنے کے لیے اکیلی وہاں نہیں تھی۔ خود بلال بھیا، ارسلان، شاہ زین اور رابعہ بھابھی بھی وہیں موجود تھیں۔"

"نہ تمہیں کیوں اتنی تکلیف ہورہی ہے۔ آگئی اٹھ کے کہیں سے وکیل صفائی۔ چلو ہٹو یہاں سے۔ یہ دوسروں سے ہمدردی کرتی رہ جائیں گی اور وہ اپنے داؤ پیچ لڑا کر لے اڑیں گی لڑکے کو۔"

"گھر بھرا ہوا ہے لڑکوں سے... اتنے داؤ پیچ آتے تو پہلے ہی لڑا لیتیں۔ خوامخواہ عائشہ چچی کے سینے پہ مونگ دل رہی ہیں اب تک۔ اور لے بھی اڑیں تو ہمیں کیا غم۔ بڑے بڑے لوگ پھرتے ہیں آس پاس۔ بس نظر آنے کی بات ہے۔"

"چل ہٹ کم بخت! کیا بڑھ بڑھ کر بولے جارہی ہے۔" پیٹھ پہ زور کی دھپ پڑی تو وہ اچھل کر بیڈ سے ہی نیچے اتر گئی۔

"میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔ آپ تو بس یونہی۔" وہ ...تی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

بڑی چچی نے کچھ پرخیال نگاہوں سے دروازے کے ہلتے ہوئے پردے کو دیکھا۔

"یہ کیا کہہ گئی بھابھی! کون پھرتا ہے آس پاس؟ ...ں کی بات کرگئی ہے؟"

"...نکھاڑے کی بات کررہی ہوگی۔ ایک وہی عاشق ہوا اس پر۔ دس گیندوں کو آگ میں جھونکا۔ اگلے دن ...بخت مارا نئی گیند بغل میں دبا کر لے آتا ہے۔ ...تا ہے مجھے ضویا بی بی کا شوق بڑا اچھا لگتا ہے۔ میرے ...کہ بیٹی ہوئی تو اس کا نام ضویا ہی رکھوں گا۔ لو بتاؤ بھلا۔ ...ی نہ شادی۔ بچوں کی باتیں کرلو۔" چھوٹی چچی جلی ...ہی تھیں۔

"آپ بہتر سمجھتی ہیں لیکن مجھے تو ضویا کچھ بدلی بدلی سے لگ رہی ہے آج۔"

"ہاں۔ کل ہی بال سیٹ کروا کے آئی ہے۔ اپنی عمر سے کئی حصے چھوٹے لگ رہی ہے۔"

☼ ☼ ☼

عصر کے بعد کا وقت تھا۔

مدیحہ نماز پڑھ کر تسبیح کے دانے گھماتی راہداریوں میں بھٹکتی پھر رہی تھیں۔ جس کمرے کا دروازہ کھولتیں۔ یا اے سی کی زوں زوں۔ یا انسانی خراٹے۔

"توبہ... پاکستانی قوم۔ کس قدر سوتی ہے۔"

"چلتے چلتے باورچی خانے تک پہنچیں۔ انواع و اقسام خوشبوئیں۔ دیگچوں، پتیلیوں کی کھٹر پٹر۔

"توبہ... پاکستانی قوم... کس قدر کھاتی ہے۔"

خیال تھا، ملازم افطاری کی تیاری کررہے ہوں گے۔ سر ڈال کر اندر جھانکا بڑے بڑے پتیلے، کڑاہی، چمچے، کفگیر۔ اور ان سب کے درمیان۔ ادما، بھنڈی۔ عائشہ چچی اور رابعہ بھابھی۔

کچن خاصا کشادہ تھا۔ انہیں بھی کھڑے ہونے بلکہ بیٹھنے کو جگہ مل ہی گئی۔ بیٹھ کر غور فرمایا۔

دہی بڑے۔ فروٹ چاٹ، چکن رول، اور کھانے کے لیے بریانی، کسٹرڈ، چکن قورمہ، سبزیوں کی بھجیا۔

عائشہ چچی کرسی گھسیٹ کر ان کے پاس میز پہ آ بیٹھیں اور کھجوروں میں بالائی بھرنے لگیں۔

"باقی سب گھر والے کیوں گھوڑے، گدھے بیچ کر سو رہے ہیں۔ اتنے لوگوں کی افطاری، کھانا۔ چلو بھنڈی! باقی لڑکیوں کو آواز دو جاکر۔"

"رمضان کے مہینے میں ہی کچھ کام بڑھ جاتا ہے۔ ورنہ باقی دنوں میں تو سب اپنا اپنا ہی کھاتے پکاتے ہیں۔" عائشہ نے گھبرا کر وضاحت کی۔

"لیجیے پھپھو! ذرا جلدی سے چیک کریں۔ فروٹ چاٹ میں ذرا سی مٹھاس کم یا زیادہ ہو تو فاران بھائی کا موڈ فوراً ہی خراب ہوجاتا ہے۔"

"وہ نفاست سے بال باندھے ایپرن لگائے مگن

تھی۔ خود روزے سے تھی جبکہ مدیحہ ناسازی طبع کے سبب آج روزہ نہ رکھ سکی تھیں۔

"کس کے ہاتھوں کا کرشمہ ہے یہ۔"

"عظمیٰ نایاب المعروف اومادی گریٹ۔" اس نے چمچہ لہرایا اور کڑاہی کے نیچے آگ جلائی۔

"واہ بھئی۔ یہ ہے سگھڑاپا۔ روزے کے ساتھ بھی کمال کی چاٹ بنائی ہے۔ میں تو کہتی ہوں عائشہ! اوما کے ہاتھ میں ذائقہ تم سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔ شاہ زین بھی کہہ رہا تھا۔" وہ جانے کیا کہنے جا رہی تھیں۔

"اف۔۔" بہت تیزی سے وہی بڑوں کے لیے پیاز کاٹتے ہوئے چھری سے ہلکا سا کٹ انگوٹھے کی پور پہ لگ گیا تھا۔

معمول کی بات ہے۔" اس نے خود کو باور کرایا۔

"کہ عائشہ چچی کے گھر جو مچھلی کھائی' اس کا ذائقہ ابھی تک نہیں بھولتا۔"

رول ہلکے براؤن ہو چکے تھے۔ اوما نے پلیٹ میں نکال کر ان کے سامنے رکھے۔ رابعہ بھابھی کا منا اٹھ گیا تو وہ قورمے کا دیگچہ بھی اس کے حوالے کر گئیں۔ بھنڈی تو شاید وہاں باندھ کر بٹھائی گئی تھی۔

"اماں! یہ کاٹیں ذرا جلدی سے۔" اس نے درجن بھر لیموں اٹھا کر ماں کے سامنے رکھے۔ قورمے کے دیگچے میں چمچہ ہلایا اور پھر رول کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"کس قدر پھرتیلی ہے یہ لڑکی۔" پھپھو نے نہایت توجہ سے اس کا نازک سراپا دیکھا۔

"تمہارے انکل ایسی چٹ پٹی چیزوں کے بے حد شوقین ہیں اور شاہ زین تو۔"

املی کی چٹنی کا جار اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا۔

"اوہو۔" اس نے بروقت سنبھالا۔

"بہت ہی پیٹو ہے۔ دونوں باپ بیٹا اکثر ہی مختلف ڈشز ٹرائی کرتے رہتے ہیں۔ اوما بچے! رول بھی بہت مزے کے ہیں۔"

"کیا مزے کے ہیں؟" زندگی سے بھرپور آواز باورچی خانے کے دروازے پہ گونجی اور اوما کے ہاتھ میں پکڑا رول چھپاک سے گرم گرم گھی میں جا گرا۔

"آہ۔۔۔" ایک تیز کراہ کے ساتھ وہ چولہے سے دور ہٹی۔

"ارے کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں بس۔۔" اس نے ہاتھ جھٹک کر تکلیف دور کرنے کی کوشش کی۔

وہ تینوں پل بھر میں اس تک پہنچے تھے۔

پھپھو نے اس کے ہاتھ سے چمچہ لے لیا۔ شاہ زین فریج میں سے کوئی کریم نکال لایا۔ امی نے فوراً" کرسی کھینچ کر اس کی طرف بڑھائی۔

"شاہ زین بیٹے! ٹھیک سے لگانا۔ کوئی زخم زدہ نہ جائے۔ ورنہ داغ پڑ جائے گا۔" پھپھو نے ہدایت کی اور۔

وہ موصوف کرسی کھینچ کر عین اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ کلائی جکڑلی گئی تھی۔ اوما "مم" مم ہی کرتی رہ گئی۔

شاہ زین بڑی سہولت سے ہاتھ پہ پڑے سرخ سرخ نشانوں پر لیپ کرنے لگا۔

"اچھا خاصا تو جل گیا۔ لوگ کہتے ہیں ان کی ذہانت چولہے' چوکی سے بڑھ کر ہے' یہاں آکر دیکھ لے۔ ایک افطاری بنانے میں ہی یہ حال ہو گیا۔"

زبان ننھیال والوں پہ گئی تھی۔

" پتا نہیں کون لوگ کہتے تھے۔" اوما نے ناگواری سے اپنا ہاتھ کھینچا مگر گرفت پہلے سے مضبوط ہو گئی۔

وہ تو ایک پل میں ساری کی ساری ٹھنڈی پڑ گئی۔

پھپھو کا سر کڑاہی میں تھا تو امی قورمے کے دیگچے میں گھسی ہوئی تھیں۔ کوئی بات اوما کے ہونٹوں پر آتے آتے دم توڑ گئی تھی۔

بڑی پریشان نگاہوں سے اسے دیکھا۔

بھوری آنکھیں ایک ٹک اسے گھور رہی تھیں۔

ان بھوری آنکھوں میں کیا تھا؟ وہ ان آنکھوں میں اتر کر دل کی دہلیز پہ جا کھڑی ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ بھید کا سرا پاتی۔ ان آنکھوں کا تاثر یک لخت ہی بدل گیا تھا۔ اور اسی تیزی سے اوما کو لوٹنا پڑا تھا۔ ایک بار پھر ہاتھ کھینچا مگر پانچ انگلیوں کے سرخ نشان کلائی میں گڑ گئے تھے۔ ہونٹوں پہ بڑی دل آویز مسکراہٹ۔

اما کے ہونٹوں کو بھی یک لخت ویسی ہی مسکراہٹ نے چھوا اور اگلے ہی پل وہ دوسرے ہاتھ کے ناخن اس کے ہاتھ کی پشت پر گاڑ چکی تھی۔

"اوہ۔" کلائی ایک پل میں آزاد ہو گئی تھی۔ وہ طنزیہ انداز میں اسے دیکھتی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور یک لخت ہی ٹھہر گئی۔

باورچی خانے کے دروازے پہ فرح کھڑی تھی۔ حیران' پریشان' بے یقین۔



رات بھر بادل کھل کر برسے تھے۔

آنگن میں بچھے پلنگ چھوڑ کر وہ لوگ کمروں میں منتقل ہو گئے تھے۔ موسم اچھا خاصا خنک ہو گیا۔ بجلی نے وفا کی تھی پنکھا بھی ہلکی رفتار سے چلتا رہا۔

امی اور خضریٰ کب کی سو چکیں۔

مرسلین کا کمرا البتہ روشن تھا۔

"یا تو پڑھنے میں مگن ہو گیا ہو گا یا یونہی بتی بجھائے بغیر تکیے میں سر دیے کر سو گیا ہو گا۔" اوما نے دریچے سے باہر جھانکتے ہوئے اپنے تھکے ذہن سے سوچا۔

نیند آج کی رات اس کی آنکھوں میں اتری ہی کہاں تھی۔ جب تک بارش کی پہلی بوند زمین پر نہیں گری۔ وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح سارے گھر میں گھومتی رہی تھی۔ کبھی اس کمرے۔ تو کبھی اس کمرے۔ کبھی تھک کر برآمدے کی سیڑھیوں پہ ٹک گئی۔ کبھی کھڑکی میں جھک کر اندھیرے میں ڈوبے درختوں' پودوں کو کھوجنے لگی۔

امی نے اس کی بے آرامی محسوس کرتے ہوئے ٹوک بھی دیا۔

"سو کیوں نہیں رہیں۔ ابھی کچھ دیر میں سحری بنانے کا وقت ہو جائے گا۔ لیٹ جاؤ گھڑی بھر کے لیے۔"

اور وہ لیٹ بھی گئی۔ آنکھیں بھی موند لیں۔ اور ان بند آنکھوں کے پیچھے جو تھا وہی تو ٹکنے نہ دیتا تھا۔

وہ بے اختیار کلائی مسلتی ہوئی اٹھ بیٹھی تھی۔

پانچ مضبوط بھاری انگلیوں کے نشان ابھی بھی ثبت تھے۔ دکھائی نہ دیتے تھے' محسوس ہوتے تھے۔ وہ ان پر ہاتھ پھیرتی تھی۔ انہیں چھو کر دیکھتی تھی۔ ان پوروں کی حرارت ابھی تک اس کی نبضوں میں اترتی اور اس کے پورے وجود کو دل بن کر دھڑکاتی تھی۔

اور یہ ہی وہ نہیں چاہتی تھی۔ کہ قصد اور عہد کچھ اور تھا۔

حالانکہ ابھی تو کچھ بھی سامنے نہ تھا۔

نہ امید' نہ گمان' نہ اظہار۔

مگر اس کا وجدان سگنل دے رہا تھا۔ کوئی بتی بار بار جلتی تھی' بجھتی تھی' اور بجھ کر پھر جل اٹھتی تھی۔

اور اسی جلنے' بجھنے میں ایک چہرہ ابھرتا تو دوسرا ڈوب جاتا تھا۔

دوسرا ابھرتا تو پہلا دکھائی نہ دیتا تھا۔ اور وہ خود فیصلے کی نوک پہ کھڑی ہلکان ہو رہی تھی۔

دریچے سے آتی' بارش کی خنک ہوا نے اسے ٹھٹھرا کر رکھ دیا تو وہ اپنے پاؤں گھسیٹتی۔ بستر پہ آگری۔ سرتاپا چادر اوڑھتے ہوئے اس نے تکیہ درست کیا اور ذہن کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ہو سکتا ہے سب میرا وہم ہو۔ ویسا کچھ بھی نہ ہو' جیسا میں نے سمجھا۔"

"ہو سکتا ہے۔ ایسی کسی بھی گھڑی میں قدرت خود میری رہنما ہو۔"

"ہو سکتا ہے ایسی کوئی نوبت ہی نہ آئے۔ سب فیصلے اوپر ہی اوپر طے ہو جائیں۔"

کروٹیں بدل بدل کر جسم دکھنے لگا۔ تب کہیں جا کر نیند کا ہلکا سا خمار اس کے دماغ پر چھایا۔ اسی خمار میں اس نے امی اور خضریٰ کو باتیں کرتے' اٹھتے' دروازہ کھلتے' بند ہوتے محسوس کیا۔ اسی خمار میں کسی نے اسے جگانے کی کوشش بھی کی' اسی دھند کی اوٹ میں اس نے موذن کو اذان دیتے سنا اور پھر دھند نے دبیز ہو کر اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کمرے کی کھڑکی غالباً" رات کھلی رہ گئی تھی۔

باغ میں بھیگے درختوں کی گھنی شاخوں میں چھپے تو توں، چڑیوں نے خوب ہی شور مچا رکھا تھا۔ قریب ہی کہیں بچوں کی چہکاریں بھی۔

اس نے کسلمندی سے آنکھیں کھولیں۔

کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا گیا تھا لیکن روشن دانوں اور کھڑکی سے آنے والی روشنی سے کمرا بھر گیا تھا۔ باہر آنگن میں پانی کے بہاؤ اور جھاڑو کی شڑاپ شڑاپ کی آوازیں۔ غالباً" سنگھاڑا صفائی کے لیے آچکا تھا۔

"ہائیں۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھی۔

پاؤں میں چپل اڑس کر عجلت میں دروازہ کھولا۔

چٹا سفید دن۔ خوب کھلا کھلا سا۔ مخلوق ساری کی ساری مگن۔

مرسلین بوگن ویلیا کی ڈھلکی ہوئی ڈالیاں درست کر رہا تھا۔ خضریٰ اور امی کہیں دکھائی نہ دے رہی تھیں۔

اس نے لمبا سانس لے کر دل ہی دل میں روزے کی نیت کی اور پچھلے برآمدے میں جھانکا۔ خضریٰ کبوتروں کی کابک کھولے انہیں دانہ ڈالنے میں محو تھی۔ بچے اس کے گرد جمع تھے، گردن گھما کر دوسری جانب دیکھا اور پھر گھڑی بھر کے لیے ساکت ہو گئی۔

برآمدے کی سیڑھیوں پر مدیحہ پھپھو، امی کے کندھے سے کندھا جوڑے بیٹھی تھیں۔ سگنل دیتی بتی پوری قوت سے روشن ہو گئی تھی۔

وہ بھاگ کر باورچی خانے میں داخل ہوئی۔ یہاں یہ کھڑکی عین ان کے عقب میں کھلتی تھی۔ بہت آہستگی سے دونوں پٹ وا کر کے جھانکا۔

"ابھی صرف آپ کا عندیہ لینا چاہتی ہوں۔ باقاعدہ پیغام جیسے آپ چاہیں۔ بڑے بھیا تو ہیں ہی۔ وحید سے بھی بات کرنا ہوئی تو کر لیں گے۔ لیکن جب تک آپ فیصلہ مجھے نہ سنا دیں۔ بات باہر مت نکالیے گا۔ سمجھ رہی ہیں ناں؟"

وہ غالباً" دوسرے دروازے کھلے رکھنا چاہتی تھیں۔ امی کے گھٹنے پر دباؤ ڈال کر جلدی فیصلے کی تاکید کرتی ہوئی وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور عائشہ یوں ساکت اپنی جگہ پر بیٹھی تھیں جیسے سر پر پرند آ بیٹھے ہوں اور ذرا سی جنبش سی ان کی اڑان کا ڈر ہو۔

"امی!" اس کے ذرا سا ہلانے پر وہ بری طرح چونکیں۔

"اوما! میں تو سوچ بھی نہ سکتی تھی۔" وہ ناقابل یقین لہجے میں بول رہی تھیں۔

"امی پلیز! ابھی کوئی فیصلہ مت کیجئے گا۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر اپنا اضطراب کم کرنے کی کوشش کی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب ___" اسے دقت ہو رہی تھی۔ وہ اپنا مافی الضمیر ماں تک کس طرح پہنچائے۔

"امی! کیا اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا تھوڑا سا اختیار حاصل ہے مجھے۔"

وہ بنا کچھ بولے چپ چاپ اسے دیکھے گئیں۔ وہ کچھ الٹا سیدھا بولنے جا رہی ہے۔ اس کا کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا انہیں۔

"امی! میں شاہ زین سے نہیں، شیراز حسن سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

کہاں تو بوا جوتیاں گھسا گھسا کر تھک گئیں اور کسی کلرک تک کا رشتہ نہ ملا اور کہاں ایک خوبصورت، ذہین و فطین، معاشی طور پر مستحکم و مضبوط لڑکے کا رشتہ گھر چل کر آ گیا اور لڑکا بھی اپنے ہی خاندان کا ___ نہ چھان پھٹک کی ضرورت، نہ کوئی ڈر، خدشہ نہ وہم، اور اب مہارانی کا مزاج ہی نہیں ملتا۔ ایک سے ایک لڑکی چھوڑ کر مدیحہ میری دہلیز تک آئی۔ خدا نے میری دعاؤں کو قبولیت بخشی اور اب اسے یاد آیا کہ شاہ زین نہیں شیراز۔ پہلے کیا گونگے کا گڑ کھائے بیٹھی تھی۔"

"کیا اپنے منہ سے کہتی؟" وہ منمنائی۔

"تو اب کیا کسی اور منہ سے کہلوایا ہے۔ اب بھی تو وہی پھوٹیں۔"

"پہلے کون سا یہاں شادی بیاہ کے چکر چل رہے تھے۔ میرا خیال تھا شاید تائی اماں ...،"

"نہ۔ ان میں سے کسی نے کچھ کہا۔ شیراز نے یا بڑی بھابھی نے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر۔؟ جب انہیں خیال نہیں آیا تو کیا میں جا کر پیش کروں؟"

عائشہ خوب ہی تپی بیٹھی تھیں۔

"وہ بہت بامروت ہیں۔ ہو سکتا ہے جھجکتے ہوں۔ اور ویسے یہ سب باتیں آپ لوگوں کے سوچنے کی ہیں۔ مجھ پر خوامخواہ خفا ہو رہی ہیں آپ۔" وہ بھی قدرے ناراض سی بیٹھی تھی۔

"شاہ زین باہر سے آیا ہے۔ سب کے سب اس پر نظر لگا کر بیٹھ گئے۔ گھر میں پڑے ہوئے فرشتہ صفت شیراز کسی کو نظر نہیں آتے۔ صرف اس لیے کہ وہ مجبور اور معذور ہیں۔ لیکن انہوں نے اس مجبوری کو اپنی کمزوری اور معذوری کو اپنی محتاجی تو نہیں بنایا ناں؟ بس کچھ عرصہ کے لیے لوگوں سے کٹ گئے ہیں۔ لیکن یہ دور بھی گزر جائے گا اگر انہیں کوئی مخلص ساتھ مل گیا تو۔ لیکن ہم لوگوں کو ان کی صرف محرومی دکھتی ہے۔ ان کا بھلا سا دل، ان کا روشن دماغ، ان کی قابلیت، صلاحیت کچھ بھی نظر نہیں آتی۔"

عائشہ تو لب بھینچے گویا اسی کی تقریر سننے بیٹھی تھیں۔

"اور ہاں۔ بات آپ کے لبوں سے ادا ہو تو خیال رکھیے گا۔ آپ کا سر جھکا ہوا نہ ہو۔ میں یہ قدم کسی عشق و محبت یا وقتی اور سستے جذبات کی خاطر نہیں صرف اور صرف شیراز حسن کے لیے اٹھا رہی ہوں کہ مجھے ان کی بہت "پروا" ہے۔ شیراز حسن کی جگہ کوئی اور ہوتا میں تب بھی یہ ہی فیصلہ کرتی۔"

"ہاں ہاں۔ بھول میں تو بنو! تم مت رہو۔ لڑکی کی ماں اپنی طرف سے اپنی بیٹی کا بر پیش کرے تو پھر بس ایک ہی بات سوچی جاتی ہے، اور لوگوں کے ذہنوں پہ پہرے نہ تم لگا سکتی ہو نہ میں۔"

وہ بہت مرجھائے انداز میں کہتے ہوئے اس کے سامنے سے اٹھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

رمضان کا آخری عشرہ شروع ہو گیا تھا۔ مدیحہ پھپھو اور شاہ زین اپنے گھر منتقل ہو گئے تھے۔

"کوشش کروں گی ان دنوں میں گھر کے کچھ خاص حصے مکمل طور پر سیٹ کر لوں۔ عید کے روز گرینڈ پارٹی میرے گھر ہو گی۔" اس روز انجو ماموں اور ریاض ماموں بھی اپنے بچوں سمیت آئے ہوئے تھے، جب مدیحہ پھپھو نے اپنے گھر شفٹ ہونے کی بات کی۔

پھر اگلے دو دن تک سننے میں آیا کہ انجو ماموں اور مدیحہ پھپھو آج کل بازار میں ہر جگہ اکٹھی دکھائی دے رہی ہیں۔

اس روز افطاری کے بعد وہ سب بلال بھائی کی لائی ہوئی آئس کریم پر چھینا جھپٹی کر رہے تھے جب اچانک ہی شاہ زین چلا آیا۔ بڑا بے نیاز سا بن کر سامنے بیٹھ رہا۔ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

ادما بھی ڈھیٹ بنی آئس کریم کھانے میں جتی رہی لیکن نظر کا کیا تھا۔ کبھی نہ کبھی بھٹک ہی جاتی لیکن جب بھی دیکھا، دل نے اپنی دھڑکن گنوائی۔

"ضمیر مطمئن ہو جائے گا پر دل ہار جاؤ گی عظمی نایاب!" اداسی قطرہ قطرہ اسے بھگونے لگی تو وہ یونہی کسی کام کے بہانے محفل سے اٹھ آئی۔

شاہ زین نے پر خیال نظروں سے اس کا تعاقب کیا۔

"محترمہ کے انداز کچھ شکست خوردہ سے لگ رہے ہیں۔ نہ شوخی نہ شرارت۔ نہ کوئی چھیڑ خانی۔" وہ کچھ الجھا۔

نظروں کا زاویہ بدلا تو افشین کو بالکل اپنے سامنے پایا۔

کچھ لمحے خالی خالی نظروں سے اسے گھورتی رہی۔

"اگر آپ اپنی مونچھوں کا اسٹائل تھوڑا بدل لیں تو بالکل نعمان اعجاز لگنے لگیں۔"

"ہیں! شاہ زین کی مونچھیں ہیں؟" طلال فوراً اس کی طرف پلٹا۔

"اور۔۔۔ نعمان اعجاز کی مونچھیں ہیں کیا؟" یہ رابعہ بھابھی تھیں۔

"تو کیا نہیں ہیں؟"

"ارے سنو! بھلا نعمان۔۔" بات کہاں سے کہاں جا نکلی تھی۔

شاہ زین کو دیر ہونے کا احساس ہوا تو جھٹ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ یوں بھی اب محفل میں "جان" نہ رہی تھی تو وہ کیونکر رکتا۔



"ہرگز نہیں۔ اس رشتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" شیراز حسن نے سنا اور انکار کردیا۔

قطعی اور فوری انکار۔

ایسا انکار جس سے پہلے سوچ کا ایک لمحہ بھی انہوں نے ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ تائی اماں تو بات کرکے ابھی سانس بھی نہ لے پائی تھیں کہ شیراز حسن نے یہ ٹکا انکار ان کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

"عائشہ نے بڑے مان سے کہا ہے مجھ سے۔ حالانکہ مدیحہ شاہ زین کے لیے اوما کا کہہ چکی ہے مگر وہ۔۔۔"

"اماں! مجھے بہت ضروری کام ہے اس وقت۔" ایسا خشک اور کورا لہجہ۔

ان کی آنکھیں بھر آئیں۔۔۔ ابھی تو عائشہ ان کے کمرے میں ہی بیٹھی ہوں گی، ابھی تو دل میں بڑا جوش کن سا خیال ابھرا تھا کہ اوما اور شیراز میں دوستی، ہوسکتا ہے کسی نئے تعلق کی بنیاد بن جائے۔۔۔ ہوسکتا ہے کچھ ایسے جذبات ان کے درمیان جڑ پکڑ چکے ہوں جو نئے رشتے استوار کرسکیں۔۔۔ مگر یہاں۔۔۔ وہ چہرے پہ پتھر سی سنجیدگی لیے اپنے لیپ ٹاپ پر کھٹا کھٹ کیے جارہا تھا۔۔۔ وہ مرے مرے قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف چلیں۔

اور پھر یہ ہی ٹکا سا انکار اوما تک بھی پہنچ گیا۔

"لو جی۔۔۔ جان چھوٹی۔۔۔ ایک منٹ میں انکار۔۔۔ ادھر بھابھی گئیں۔۔۔ ادھر واپس۔ کوئی دوسری بات تو اس نے سنی ہی نہیں۔۔۔ تم نے اپنا فرض نبھایا۔۔۔ اچھا کیا۔ اب بھلا ہو تمہارا، کچھ خیال دل میں ہے بھی تو اب نکال چکو، شام کو تمہارے تایا ابو سے بات کرکے مدیحہ کو خوشی کی خبر سنا دوں گی۔" امی کی تو جیسے مراد بر آئی تھی۔

"یوں تو شیراز بھی اپنا ہی بچہ ہے۔۔۔ لیکن پہلی محبت کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں، اسی سے خوف آتا تھا۔۔۔ اب دیکھ لو، اسی کی یادوں کو سینے سے لگائے بیٹھا ہے، کوئی کرے تو کرے کیا۔"

اوما سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ سر جھکائے عید کے لیے لائے جانے والے سامان کی فہرست بناتی رہی۔

امی کہہ چکنے کے بعد جائے نماز بچھا کر کھڑی ہوگئیں۔

اس نے طیش میں آکر ساری لسٹ پرزے پرزے کرکے اڑائی، باتھ روم میں جاکر ڈھیر سارا روئی۔

"اپنا دل اجاڑ کر ان کا خیال کر رہی ہوں، اور یہ ہیں کہ۔۔۔"

رو پیٹ کر بھی سکون نہ آیا تو دھڑ دھڑ دو، دو سیڑھیاں الانگتی پھلانگتی سیدھی شیراز حسین کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"ٹھکرائے جانے کا غم سہا ہے آپ نے۔۔۔ پھر بھی ٹھکرا دیا، یوں بھی کوئی کرتا ہے، بہت ظالم ہیں آپ شیراز حسن۔" آنسو تو ساون بھادوں کی بارش ہوگئے، چھاجوں چھاج برس رہے تھے۔

"بہت بڑا نقصان کرلیں گے آپ اپنا، مت انکار کریں، میں نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔"

"سوچ سمجھ کا اس فیصلے سے کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا، سراسر نادانی، کم عقلی۔" کتاب میں مگن، بڑے آرام سے کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ لہجہ

۔۔۔ دل کے مطابق تھا۔

۔۔ نے کتاب جھپٹ کر دور اچھالی اور بدتمیزی ۔۔۔ یں گھورنے گئی۔

۔۔ فی گرم ہے۔" انہوں نے کسی خدشے کے ۔۔۔ تایا۔

"۔۔ تا نہیں کس زعم میں ہیں آپ؟ میں روز، روز ۔۔ منتیں کرنے نہیں کھڑی ہوں گی یہاں۔۔۔ بیٹھے ۔۔ یں گے یوں ہی، کرسی پہ، پھپھوندی لگ جائے ۔۔ پوچھنے والا بھی نہ ہوگا، ہر کوئی عظمیٰ نایاب ۔۔ ہو تاکہ گھڑی گھڑی چائے، کھانا لے کر حاضری ۔۔ ہے، وہ بزرگوار والدہ ہیں آپ کی جنہیں دنیا کے ۔۔ سے ہی فرصت نہیں۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ مردہ محبت کا ۔۔ ب تک اٹھائے رکھیں گے۔۔۔ وہ محترمہ چار ۔۔ اماں جان بن گئی ہوں گی اور یہاں ابھی سوگ ۔۔ ہے، اب مسکرائے چلے جارہے ہیں۔" وہ تھک ۔۔ ن پہ بیٹھ گئی۔

"۔۔ ں بھئی۔۔۔ کشکول ہاتھوں میں لے کر آگئی ہوں، ۔۔ ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے۔"

"۔۔ گلی ہو تم اوما۔۔۔ بالکل فضول بول رہی ہو۔" ۔۔ نے ہولے سے جھڑکا۔

"۔۔ یں۔۔۔ آپ مجھے اس طرح نہیں کہہ سکتے۔۔۔ ۔۔ نے کوئی پاگل پن نہیں دکھایا۔" وہ سچ مچ روٹھی ۔۔ ی۔

"میں آپ کی خوشی چاہتی ہوں، آپ کو ہنستے ۔۔۔"

"۔۔ ری خوشی چاہتی ہو تو۔۔۔ وہ کرو جو میں کہتا ہوں، ۔۔ گھر کی بڑی ہونے کی حیثیت سے تمہیں بلا کر ۔۔ یں گے اور تمہیں ہاں کے سوا اور کچھ نہیں ۔۔۔"

"۔۔ سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں، میں جانتی ۔۔ ایا کرنا ہے۔" اس کا ارادہ اٹل لگ رہا تھا۔

"۔۔ یاد رکھو، میری طرف سے کوئی حوصلہ افزائی ۔۔۔"

۔۔ اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے دوسروں کے

حوصلوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔" وہ تن کر اٹھ کھڑی ہوئی' اس سے پہلے کہ کمرا چھوڑ جاتی انہوں نے سخت لہجے میں پکار لیا۔

"صرف ایک بات کا جواب دے دو۔"

اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ان کی گہری نگاہیں اس کے چہرے کو کھوج رہی تھیں۔

"تم مجھے آباد کرنا چاہتی ہو' یا آباد ہوتے دیکھنا چاہتی ہو؟"

اس ایک سوال پر وہ لحہ بھر کے لیے تھرا کر رہ گئی تھی۔ یوں ہی آنکھیں کھولے چپ انہیں دیکھے گئی۔

"اگر میں کسی اور کی ہمراہی چاہوں تو تم دستبردار ہو جاؤ گی؟"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں؟"

"نہیں' میں جھوٹ نہیں بولتا' لیکن اگر واقعی کوئی ہو تو؟"

"اف خدایا! مت امتحان لیں شیراز بھائی' اگر کوئی ہے تو بتا کیوں نہیں دیتے؟ کیوں مشکل میں ڈالتے ہیں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"کوئی ہے تو سہی ادما! لیکن ابھی بتانا نہیں چاہتا' لیکن یہ ہے کہ اگر تم شاہ زین کے لیے ہاں کہہ دو تو اسی روز میں بھی کوئی بندھن باندھ لوں گا۔" ان کی زیرک نگاہیں واضح طور پر ادما کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو محسوس کر رہی تھیں۔

جیسے پھانسی گھاٹ پر کھڑے شخص کو زندگی مل جائے' بالکل ویسی ہی چمک اس کی آنکھوں میں یک لخت ہی اتر آئی تھی۔

"میں واقعی تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں ادما!" وہ کچھ سوچ کر مسکرائے۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں نا' بالکل سچ؟"

انہوں نے پر یقین انداز میں سر ہلایا۔ تو وہ جیسے کسی بھاری بوجھ سے آزاد ہوتے ہوئے سرشاری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو کیا میں شاہ زین کے لیے ہاں کہہ دوں؟"

شیراز حسن کے چہرے پہ بے اختیار ہی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بصد شوق' اور ہاں' یہ نظم صرف تمہارے لیے' منگنی کا تحفہ سمجھو۔"

انہوں نے ایک کتاب میں نشان لگایا پھر اسے تھما دی۔

☆ ☆ ☆

اتنا ہی یاد رکھ مجھے
جیسے کسی کتاب میں
بیتے دنوں کے دوست کا
اک خط پڑا ہوا ملے
لفظ مٹے مٹے سے ہوں
رنگ اڑا اڑا سہی
لیکن وہ اجنبی نہ ہو
اٹھ کر تیرے گلے لگے
بھولے ہوئے تمام سکھ
بیتے دنوں کی سب کتھا
تجھ سے کہے اور رو پڑے
اتنا ہی یاد رکھ مجھے
بیتے دنوں کے دوست کا
جیسے کوئی خط ہوں میں
رکھا ہوا کتاب میں

اس نے کئی بار اس نظم کو پڑھا اور پھر کتاب تکیے کے نیچے رکھ کر کروٹ بدل لی۔ رات ہولے ہولے بھیگ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج تیسواں روزہ تھا۔

اور کل انتیسویں روزے ان سب نے گھر کی تیسری منزل کی چھت پر کیسا شور اور ہنگامہ مچایا ہوا تھا۔ لیکن چاند تھا کہ گھنے بادلوں کی اوٹ سے اپنی چھب دکھلانے پر راضی ہی نہ ہوا۔ ٹیپو کی نئی نکور دوربین بھی کوئی فائدہ نہ دے سکی۔ وہ اس کی مدد سے ایک ایک کے چہرے کا بغور جائزہ لیتا رہا۔

"تمہارے چہرے پہ ناک بہت عجیب لگتی ہے۔" ...خواہ مخواہ ہنڈی کو تنگ کرتا رہا۔

"تم لوگوں کا دماغ خراب ہے' اتنے بادلوں میں پہلی تاریخ کا چاند بھلا کہاں دکھائی دے گا۔" رابعہ بھابھی سر اٹھائے گھنے بادلوں کی بڑھتی ہوئی تاریکی دیکھ رہی تھیں۔

"ارے دیکھ' وہ چاند۔" کوئی پکارا۔

"نہیں کم بخت! وہ تو بخاری انکل کی چندیا ہے' ہاہا۔۔۔ہا۔"

"نہیں یار' وہ تو ان کی نازک مزاج صاحب زادی کا ابرو مثل چاند دکھائی دے رہا ہے۔"

"تو بڑا پہچانتا ہے' اسی لیے آئے روز۔۔۔" پتا نہیں کہنے والا کیا بھید کھولنے جا رہا تھا۔ اسے بانہوں میں جکڑ کر منہ ہی دبوچ لیا گیا۔ اب وہ غوں غوں غاں' غاں کرتا ہاتھ کے اشارے سے دوسروں کو کچھ سمجھانے کی کر رہا تھا۔

"روزہ دارو' اللہ کے پیارو' جنت کے حق دارو!"

"عید کا چاند نظر نہیں آیا' تیسویں روزے کی تیاری کر لو۔"

ضویا بھونپو بجاتی تینوں منزلوں پہ اعلان کرتی رہی۔

"ہم سب یہاں کتنے آزاد ہیں' ہم اور فطرت کے کتنے قریب۔" ادما دونوں بازو پھیلائے تیز ہوتی ہوا میں جھوم رہی تھی۔

"ابھی کچھ دیر بعد ہم بادلوں کے رتھ پر سوار ہوں گے۔۔۔ اور۔۔۔"

"دھڑام سے پائیں باغ میں جا گریں گے۔۔۔ ہاہا۔۔۔ ہا۔"

اور پھر رات گئے تک وہ سب ہی دائرہ بنائے محو گفتگو رہے' تاریکی بڑھتی رہی اور بادلوں کا ہجوم بھی۔ نہ چاند نظر آیا' نہ بارش برسی' وہ لوگ آہستہ آہستہ کھسکنے لگے تو ایک ایک کر کے نیچے اتر آئے' جہاں تائی چچیاں آج پہلی دفعہ سحری بنانے کی ابتدائی تیاریوں میں لگ گئی تھیں۔

آخری روزے کی افطاری کا وقت تھا۔

تایا ابا نے رقت آمیز لہجے میں ایک طویل دعا کی تھی۔ رمضان کی مبارک ساعتیں آج رخصت ہو رہی تھیں۔ خدا جانے دوبارہ یہ مبارک مہینہ دیکھنے کو ملے یا نہ ملے۔ انہوں نے باقی سب کو بھی اداس کر دیا تھا۔

افطاری کے بعد کھانے کا طویل دور چلا' پھر چائے اور کافی' مدیحہ پھوپھو بھی افطاری میں موجود تھیں۔ نوجوان نسل ان سے کچھ ہٹ کر اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہوئی' تو انہوں نے تایا ابا کے سامنے اپنی گزارش نہایت موزونیت کے ساتھ پیش کر دی۔

"عائشہ سے بات کی ہے میں نے' مگر وہ چاہتی ہے کہ اس گھر کے سربراہ کی حیثیت سے فیصلے کا حق آپ کو ہی حاصل ہے۔"

تائی اماں کے توسط سے عائشہ یہ بات پہلے ہی تایا ابو تک پہنچا چکی تھیں۔ بڑی' چھوٹی چچی کو البتہ جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہے؟" نظروں ہی نظروں میں اس سوال کا تبادلہ ہوا۔

"تم لوگوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔" تایا ابا نے دھیمے لہجے سے باقیوں کی رائے لی۔

"جو آپ مناسب سمجھیں بھائی جان! آپ کا فیصلہ ہی ہمارا ہے۔" بڑے چچا نے بڑے سبھاؤ سے ان کا مان بڑھایا۔

"ہوں۔" چند لمحوں کی سوچ پھر سوال۔

"بچوں سے رائے لی؟"

"شاہ زین نے انتخاب کا حق مجھے دیا ہے' بھیا! ادما باقی لڑکیوں سے بڑی ہے' پھر باپ کی طرف سے نا آسودہ ۔۔۔ ہو سکتا ہے میں اس عمل سے گزشتہ رویوں کی تلافی کر سکوں۔ وحید کے ساتھ کوئی بہت اچھا سلوک نہیں کیا ہم نے۔" انہوں نے سکھا' پڑھا کر بھیجا گیا جواب دیا۔

"ہوں' بلال کو بلاؤ ذرا' قاران کو بھی۔"

دونوں آموجود ہوئے۔

"رات کو فنکشن ہے ادما اور شاہ زین کی منگنی کا' انتظام کرو' اور بچیوں کو بتا دو۔"

"کیا؟"

"نہیں۔"

"ہائے۔۔۔ اوما اور شاہ زین؟"

"نہیں' نہیں شاہ زین اور اوما۔"

"مدیحہ پھوپھو کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"طبیعت ٹھیک۔۔۔ نظر کمزور ہے۔"

"آہا۔۔۔ ہم تو چلے مہندی لگوانے۔" ضویا لچکتی' مٹکتی' ارم کی طرف چل دی۔

"اُفوہ۔۔۔ اتنی جلدی' یہ کیا بھئی۔" اوما بڑی کسلمندی سے پڑی تھی جب اسے کھینچ کھانچ کر گاڑی میں بٹھا گیا۔

"جاکر شکل درست کر آؤ اپنی۔" رابعہ بھابھی گویا گاڑی کو دھکا لگا کر ہی واپس پلٹی تھیں۔

"کیا ہو جاتا' اگر یہ کام صبح عید کے روز رکھ لیا جاتا۔" خضریٰ اس کے ساتھ پریشان سی بیٹھی تھی۔

"کیوں تمہیں کیا تکلیف ہو رہی ہے۔" اوما مزے سے بیوٹیشن کے سامنے بیٹھی مسکرائے جا رہی تھی۔

واپسی پر ارسلان لینے آیا تھا۔ ساتھ میں کوئی اور بھی جلا بھنا بیٹھا تھا۔

"یہ بڑے ماموں نے میرے داخلے پر پابندی کس خوشی میں لگائی ہے۔"

"بڑے ماموں سے پوچھیے۔" ازلی بے نیازی۔

"تو میرے بغیر منگنی کیسے ہوگی۔"

"یہ بھی ان ہی سے پوچھیے۔"

"انگوٹھی کون پہنائے گا۔" ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو میں وہ خاصا غمگین لگ رہا تھا۔

"یار! اگر کوئی بے اعتباری ہے تو میں پہنا دوں گا۔" ارسلان سنجیدہ تھا۔

"بکو نہیں۔" وہ سچ مچ رنجیدہ تھا۔

"اچھا بھئی کرتے ہیں کچھ' ویسے اوما آج خوب صورت لگ رہی ہے۔" ارسلان نے آنکھ دبا کر شاہ زین کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

"ہمیشہ کی طرح۔" وہ چہکی' مگر سامنے جذبے لٹاتی دو آنکھوں نے بے اختیار ہی نظریں چرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

پائیں باغ میں روشنیوں' رنگوں اور خوشبوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔

ہنسی' لطیفے' مذاق' قہقہے' باتیں۔

رات اپنے جوبن پر تھی۔

ہوا پچھلے پہر ہونے والی بارش کی نمی سے بوجھل ہو رہی تھی' ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ معطر ہوا لڑکیوں کی نوخیزی چھوتی تو وہ خوامخواہ ہی اپنے آپ میں سمٹنے لگتیں۔

انجو مامی اور ریاض ماموں بھی بچوں کے ساتھ پہنچ چکے تھے۔

"یہ اچھا کیا بڑے بھیا نے جو کھانے کا انتظام کر لیا' دیکھیے کچھ دیر میں سب کو بھوک بھی لگنے لگی۔" عائشہ چچی نے بلال بھائی کو برتن لگواتے دیکھ کر کہا تھا۔

"یار پلیز! میرا بھی کچھ کرو نا۔" ضویا خضریٰ کے کندھے دبا رہی تھی۔

"ذرا انتظار میری بچی! ہم قربانی بس بڑی عید پر ہی کرتے ہیں۔" خضریٰ اسے تھپکی دینے لگی۔

شیراز حسن فاران بھائی کے ساتھ سیٹ سنبھالے بیٹھے تھے۔

"بھئی لے کر آؤ' کہاں ہے اوما' چلو بھئی مدیحہ! رسم کرو' وہ لڑکے ادھر اندھیرے میں کیا کر رہے ہیں؟ بلاؤ سب کو۔" تایا ابا آئے تو آتے ہی تھرتھلی مچا دی۔

"جلدی کرو' تایا ابو ڈانٹ۔۔۔" رابعہ بھابھی کی دہائی' اوما کی سینڈل پہنی اور بھاگ کر مرکزی سیٹ سنبھال لی۔

"لاؤ بھئی' اب کیا سوچ رہی ہو؟" انہوں نے مدیحہ کے ہاتھ سے انگوٹھی جھپٹی' گھما پھرا کر دیکھی' اس سے قبل کہ خود ہی پہنا دیتے کوئی سیاہ چادر میں لپٹا وجود ان پہ جھکا۔

"دکھایے تو ذرا۔" تایا ابا کی ایک ثانیے کی حیرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگوٹھی ان کے ہاتھ سے بڑی

مہارت سے اچک لی گئی تھی۔

"والدہ حضور۔۔۔ تھوڑی جگہ۔" والدہ حضور ہنستی ہوئی پرے کھسکیں۔

اس کے ساتھ ہی سیاہ چادر اتار کر لڑکوں کی طرف اچھالی گئی' موصوف بال سنوارتے گھٹنوں کے بل اوما کے عین سامنے بیٹھے۔

"اجازت ہے؟" شرارت بھرا انداز۔

تایا ابا بڑی دیر بعد اپنی حیرت سے نکلے' اور پھر اکیسویں صدی کی نوجوان نسل سے سمجھوتا کر کے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ایک لمحے کا توقف کیے بغیر اس کے ہاتھ سے انگوٹھی اوما کی انگلی میں منتقل ہو گئی تھی۔ لڑکوں کی ہاؤ ہو اور مبارک باد سے سارا ماحول گونج اٹھا تھا۔

"چلو بھئی' اب تم اٹھو یہاں سے' نیکسٹ۔"

"ہائیں۔" کسی نے اوما کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

اور اگلے ہی پل ارم شرماتی' لجاتی اس کی جگہ فٹ ہو گئی تھی۔

"کیوں بھئی شیراز حسن تمہارا کیا ارادہ ہے؟" تایا ابا نے برابر بیٹھے شیراز کو دیکھا اور شاہ زین کی نقل میں اسی انداز میں پوچھا۔

"اجازت ہے؟"

اس بات پر سب ہی نے قہقہہ لگایا' اور تایا ابا نے ارم کو شیراز حسن سے منسوب کرتے ہوئے انگوٹھی اسے پہنا دی تھی۔

"اف بدتمیز! وہ تم تھیں' چھپی رستم' نہ بتایا' نہ پوچھا' الٹا میری جان مصیبت میں۔" اوما مٹھیاں بھینچے ارم کی طرف لپکی۔

باقی سب کھانے میں مصروف تھے۔ ارم آنکھوں میں نمی لیے بس مسکراتی جا رہی تھی۔

"کل مدیحہ پھوپھو کے ہاں دعوت طعام کی عام دعوت ہے۔ خاص دعوت صرف اوما جی کے لیے اور ان ہی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ حوض کنارے انار کا درخت لگ چکا ہے' اس کی شاخیں البتہ ابھی پانی میں نہیں جھکیں۔ تاہم پرزور اصرار پر جناب حضرت شاہ زین شاخیں ہاتھ میں لے کر پانی میں جھکائے رکھیں گے' مزید اطلاع۔۔۔ کہ گلاس وال کے پاس اسٹیریو بھی رکھ دیا ہے۔ جگجیت صاحب کی سی ڈی نے چلنے سے انکار کر دیا' فی الحال جو سی ڈی چلنے کے لیے تیار حالت میں پڑی ہے وہ نور جہاں صاحبہ کی ہے اور گانا۔۔۔ ٹیپو۔" رومی کی پکار اور پھر ان کی بے ہنگم آوازیں۔

میں تے میرا دلبر جانی
بلیاں تے پیار کہانی
سانوں وچ آیا ای طوفان
موسم ہویا اے بے ایمان

☼

نفیسہ سکیم

سمٹی ہوئی کرنوں کی جھلملاتی چادر

کچھ سالوں بعد جب ابا نے اپنے کندھوں کا بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر اپنی دور دراز کی رشتہ دار بہن کے گھر اس کا رشتہ طے کیا تو جن لوگوں کے وجود سے وہ ناواقف تھی' وہ یکایک ہی اچھے لگنے لگے تھے۔ گھر میں تو صرف ابا' خالد اور مزنہ تھے لیکن سسرالی خاندان کافی لمبا چوڑا تھا اور اس کو ابھی سے لگتا کہ افسانوں اور کہانیوں کے مطابق جو ڈھیروں کزن ہوتے ہیں' وہ دیور کی' جیٹھ کی شکل میں ملیں گے۔ اور پانچ نندیں بھی ساس' سسر علیحدہ۔ وہ مزے سے زبان سے سی کی آواز نکالتی جیسے ڈھیروں املی کھائی ہو۔ نمک مرچ لگا کے خوب چٹخارے بھر کے۔ "مزہ آئے گا اتنے لوگوں کے بیچ خوب گپیں لگاؤں گی نندوں کے ساتھ۔ دیوروں سے مذاق چلے گا اور ساس سسر کی تو خوب خدمت کروں گی۔ خصوصاً" ساس کی کہ اماں تو بچپن میں وفات پا چکی تھیں۔ ابا نے مجھے اور خالد کو بہت پیار سے پالا تھا۔ ماں کا مبہم خاکہ اس کے ذہن میں تھا۔

لیکن ماں کے پیار میں کوئی کمی اسے محسوس نہ ہوتی تھی۔ ابا نے دونوں بہن بھائیوں کی خاطر دوسری شادی نہ کی تھی۔ انہیں پڑھایا لکھایا۔ اب خالد بھی برسر روزگار تھا اور مزنہ کو بھی گورنمنٹ جاب مل گئی تھی۔ ابا نے اسی سال ریٹائرمنٹ لی اور ساتھ ہی اس کی شادی کردی کہ اب صحت ٹھیک نہ رہتی تھی اور زندگی کا بھی کوئی بھروسہ نہیں۔

منگنی اور شادی کے درمیانی عرصے میں جتنی بار بھی سسرال سے لوگ آئے' اسے بڑی خوشی ہوئی۔ عام لڑکیوں کے برعکس اس نے صرف منگیتر کے خواب نہ دیکھے تھے بلکہ ہر رشتہ دار سے پرخلوص سا پیار کیا تھا۔ کیونکہ نہ ان لوگوں نے اشرف کی کوئی تصویر دکھائی تھی' نہ ہی اس کے دل میں کوئی خواہش ابھری تھی کیونکہ اسے ابا اور خالد بھائی کی پسند پر پورا بھروسہ تھا۔

شادی کے اولین دنوں میں اسے گھریلو ماحول کا پتا نہ چلا کیونکہ شروع کے دن تو آنے جانے اور دعوتوں میں کٹ گئے تھے۔ ہفتے ڈیڑھ بعد جب دعوتیں ختم ہوئیں اور اشرف بھی نوکری پر چلا گیا' ساتھ ہی اس کی چھٹی بھی ختم ہونے والی ہو گئی تو اس نے سامان کی سیٹنگ پر توجہ کی کہ اسکول سے آنے کے بعد یہ کام ناممکن تھا۔ اس کا اسکول سسرالی گاؤں سے بہت دور تھا ابا نے کہا تھا کہ کوشش کرکے اس کا ٹرانسفر کروا دیں گے۔ لیکن اس وقت تک اسے دو تین بسیں بدل کر اسکول پہنچنا تھا کہ گھر میں سائیکل تھی موٹر سائیکل نہ تھی۔ زمین دار لوگ تھے سو زمین سے متعلق تمام زرعی آلات گھر میں موجود تھے۔

گھر اتنا بڑا تھا کہ کمروں سے نکل کر صحن میں آتے آتے وہ تھکنے لگتی۔ صحن کے دونوں جانب پر کمرے تھے۔ درمیان میں صحن اور دوسری طرف غسل خانے۔

شادی کے چوتھے دن جب اسے پتا چلا کہ گاؤں میں ابھی تک بجلی نہیں آئی ہے تو وہ غش کھاتے کھاتے رہ گئی۔

"ہائے ابا! میں نے کیا گناہ کیا تھا جو یہ سزا دی۔"

شادی کے پہلے تین دن سسرال والوں نے کسی رشتہ دار کا جنریٹر ادھار مانگ رکھا تھا۔ خود وہ گھر میں جنریٹر



لگانے کے خواہش مند نہ تھے کہ شور بہت ہوتا ہے۔ کوئلوں والی استری دہکا کر اپنے اور اشرف کے کپڑے استری کرنے لگی تو کپڑوں کو نم کرنے کی ضرورت نہ رہی کہ آنکھوں سے آنسو ٹپاٹپ گر رہے تھے۔

مزنہ نے اپنے گھر میں خوب مزے کیے تھے۔ ابا' بھائی اور وہ تین لوگوں کا کام ہی کتنا ہوتا تھا اور جب بھی طبیعت خراب ہوتی "ابا اور بھائی فوراً" بازار سے کھانا لا آتے تھے۔ لیکن یہاں تو اس کا تصور بھی محال تھا۔

تین شادی شدہ نندیں مع ان کے بچے اور میاں ابھی یہیں تھے۔ گھر ہر وقت لوگوں سے یوں بھرا رہتا تھا گویا ابھی شادی ہو۔

وہ خود شرمیلی تھی۔ کچھ یہ تھا کہ نہ ماں نہ بہن سمجھانے والا بھی نہ تھا۔ اشرف جب ہفتے بعد آتا تو وہ گھر والوں کے ساتھ ہی بیٹھی رہتی اسے سب سے ٹوٹ کر شرم آتی کہ دیور جیٹھ کیا کہیں گے کہ اگر وہ کمرے میں اشرف کے پاس بیٹھ جائے گی۔ لیکن اس بات پر اس نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ شاید اپنی سادگی میں یا بھولپن میں کہ اگر کبھی وہ دو منٹ کے لیے بھی دن کے وقت اشرف کے ساتھ کمرے میں رہ جاتی ہے تو اماں فوراً" ہی اشرف کو کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر آواز دے لیتی ہیں۔ یہ تو سالوں بعد عقل میں آیا کہ گھر والوں نے بہت ہوشیاری سے انہیں ایک دوسرے سے زیادہ میل ملاقات کا موقع نہیں دیا۔ شاید ان کا خیال تھا کہ شہری بہو ان کے تنخواہ دار بیٹے پر قبضہ نہ کرلے' کیونکہ فی الحال صرف اشرف ہی نوکری کرتا تھا۔

ایک بھائی اشرف سے بڑا تھا' وہ زمین سنبھالتا تھا۔ اس کی بیوی بچہ جنم دیتے مر چکی تھی۔ اب دوسری کی تلاش تھی۔ خاندان کافی لمبا چوڑا تھا۔ خاندان میں لڑکیاں بھی بہت تھیں۔ اس نے ایک دن یوں ہی کہہ

دیا کہ خاندان میں ہی دیکھ کر رشتہ کردیں۔ تو ساس، سسر نے ہر لڑکی میں کوئی نہ کوئی عیب نکال کر اسے خاموش کرادیا تھا۔

گھر کے کام کاج سے وہ کبھی نہ گھبرائی تھی تو یہاں کیوں پریشان ہوتی۔ ساس جیسے جیسے بتاتی جاتیں وہ ویسے ویسے کرتی جاتی کہ ان کے گھر کے اور اس کے ابا کے گھر کے طور طریقوں میں فرق تھا۔

کھیتوں سے سبزی آتی ڈھیروں کے حساب سے ٹینڈے، کدو... اماں کی کوشش ہوتی کہ ڈھیر ساری سبزی ایک دفعہ نہ پکے۔ بلکہ تینوں ٹائم تازہ ہانڈی بنے کہ تازہ ہانڈی کی لذت ہی اور ہے۔ وہ مان جاتی لیکن جس دن تینوں دفعہ ٹینڈے ہی پکانے پڑتے۔ صبح بھجیا، دوپہر شوربے والے اور شام بھرکے، تو اسے اپنا آپ بھی ٹینڈے جیسا لگنے لگتا۔ کہا تھا اماں ایک دفعہ ہی پتیلا بھر کر پکوا لیتیں تاکہ وہ کپڑے سلائی کرلیتی یا کمرے کی سیٹنگ بدل لیتی۔

لیکن نہ جی! اماں کی کوشش ہوتی کہ ہر بیٹے کی آمد پر توے سے تازہ روٹی اترے۔ نندیں بھی ساتھ تھوڑا بہت کرواتیں لیکن بڑی بہو کی بڑی ذمہ داریاں۔

چھٹی کا سارا دن چولہے کی نذر ہوجاتا۔ تو شام کو جب بڑے صحن میں سارے مل کر چارپائیوں پر بیٹھتے تو اماں کا ماضی نامہ شروع ہوجاتا، جس میں وہ گھر بھر کا کام کرکے کھیتوں سے گھاس بھی نکال لاتی تھیں۔ جانوروں کا دودھ دوہتیں۔ اپنے دس بچوں کی پرورش بھی کرتی تھیں۔ پورے گھر میں مٹی کی لپائی بھی کرتی تھیں اور رات کو چرخہ کات کر پاؤ بھر روئی کی اٹیوں سے سوت بنا کر سوتی تھیں اور صبح اذانوں سے بہت پہلے اٹھ کر دودھ بھی رڑکتی تھیں۔

پھر جب وہ رات کے کھانے کا آخری آئٹم چائے کی پیالیاں، سب کے ہاتھوں میں تھما کر دودھ کو ضامن لگا کر تنکوں کے بڑے بڑے ٹوکروں کے نیچے سنبھالتی اور سب کی چارپائیوں کے نیچے سے چائے کی خالی پیالیاں اٹھاتی تو سوچتی کہ اماں کے وقت میں دن بہت لمبے ہوں گے۔ تب ہی تو اتنے کام نمٹ جاتے تھے ورنہ جبکہ آج تو سارا دن چولہے کے آگے گزار کر اس کے اپنے سارے کام رہ جاتے تھے۔

پھر سب کاموں سے تھک کر جب وہ چارپائی پر لیٹتی تو لگتا کہ کمر کی جگہ زخم ہیں جو رس رہے ہیں تکلیف دے رہے ہیں۔ لیکن آہ کرنے کی بھی اجازت نہ تھی اتنے عرصے میں اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ اشرف اگرچہ واحد کماؤ پوت ہے لیکن گھر میں اس کی قدر ایک آنے کی بھی نہیں۔ اس کی اچھی نوکری اور اچھی تنخواہ تھی لیکن گھر والے اس کی ساری تنخواہ لے لیتے تھے کہ یہ ضائع کردے گا، اسے سنبھالنا نہیں آتا، جبکہ ہم نے اس کو پالا پوسا، پڑھایا لکھایا، تو اب اس کی تنخواہ پر ہمارا حق ہے۔ پہلی بار یہ بات سن کر وہ حق دق رہ گئی کہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب اس کی پہلی تنخواہ آئی تھی تو ابا نے لینے سے انکار کردیا تھا اور کہا تھا۔

"مزنہ! یہ تمہارے پیسے ہیں۔ تم انہیں سنبھالو یا خرچ کرو تمہاری مرضی۔ لیکن میرے گھر میں تم انہیں خرچ نہیں کرو گی۔"

اور وہ اپنی ضروریات کے لیے تھوڑے سے رکھ کر باقی بینک میں جمع کروا دیتی اب وہ سوچتی کہ یہ کیسے والدین ہیں، جو پورا حق وصول رہے ہیں۔ بعض اوقات اشرف اپنی ضروریات کے لیے بھی اس سے پیسے مانگتا تو اسے انتہائی شرم آتی۔

ایک دن نند نے اسے سنا دیا تھا کہ تم نے اپنی تنخواہ کہاں لے جانا ہے۔ اپنی ضروریات خود پوری کرنا کہ اشرف پر ابھی بڑی ذمہ داریاں ہیں اور وہ کوئی احتجاج نہ کرسکی تھی کہ اگر وہ اس کی ذمہ داری نہ اٹھا سکتا تھا تو شادی کیوں کی تھی۔

ان ہی دنوں اس کی طبیعت خراب ہوئی۔ الٹیوں نے اسے ادھ موا سا کرکے رکھ دیا۔ گھر بھر خوش ہوگیا کہ نئے مہمان کی آمد ہوگی۔ گھر کے ڈھیروں کام اور اوپر سے اپنی طبیعت مزنہ کا دل کرتا کہیں منہ لپیٹ کر پڑی رہے۔ کوئی کام نہ کرے۔ لیکن جہاں وہ ایک کام ختم کرکے چارپائی پر بیٹھنے لگتی اماں بڑے پیار سے دوسرا

... سنبھالیتیں۔

"... لی! یہ وقت ہر عورت پر آتا ہے۔ کام کاج ... والی عورت کی زچگی آسانی سے ہوجاتی ہے اور ... چارپائی پر بیٹھی رہتی ہیں، ان کے آپریشن ہوتے ہیں۔ بھلا بتاؤ پچھلے زمانے میں کسی کے آپریشن ہوتے تھے؟ گھروں میں ہی پیدائش ہوجاتی تھی۔ اللہ ہر کسی کا ... رکھے۔ اب تو لڑکیوں نے فیشن ہی بنالیا ہے۔ ذرا ... تکلیف ہوتی ہے اور ڈاکٹر کی طرف دوڑ پڑتی ہیں۔ ... میرے دس کے دس بچے گھر میں ہوئے۔ صرف پانچ ... دن آرام کرواتی تھیں ساس نندیں۔ پھر کہتیں لو بھئی ... اپنا گھر سنبھالو اور میں پانچویں دن اٹھ کھڑی ہوتی۔ سارا ... کام بھی کرنا اور بچہ بھی سنبھالنا۔ ارے بھئی ہم میں صبر تھا۔ ہائے وائے کی عادت ماں باپ نے نہ ڈالی تھی۔"

اور وہ ٹوٹی کمر پر ہاتھ رکھ کر اندر سے نکلتی۔ کراہوں کو اندر ہی دبالیتی کہ وہ اپنے ابا کی تربیت پر کیوں حرف آنے دے۔

اماں کے موڈ کی اسے سمجھ نہ آتی۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ اور اشرف کے آنے پر یہ موڈ لحظہ بدلتا۔ وہ سارا وقت ماں کی نازبرداری میں گزار دیتا۔ یا اماں اسے اپنے پاس بٹھالیتیں اور سر میں انگلیاں پھیرنے لگتیں کہ میرا بچہ تھکا ہوا آیا ہے اور تھکا ہوا بچہ وہیں سو جاتا۔ تھکاوٹ سے چور کسی دوسرے بدن کا اسے احساس نہ ہوتا تھا۔ یا شاید اسے کرنے نہ دیا جاتا تھا۔

اب تو دبی دبی زبان میں اس سے تنخواہ کا مطالبہ بھی ہونے لگا تھا اور وہ حیران پریشان کہ اگر تنخواہ دے دی تو اپنی ضروریات کہاں سے پوری ہوں گی۔

اس نے اشرف سے کہہ دیا کہ میں تنخواہ نہیں دوں گی۔ آخر میری بھی ضروریات ہیں۔ کرایہ، اسکول میں ... دین۔ پہننا اوڑھنا۔ وہ چپ رہا اور ہفتہ گزار کر چلا گیا۔

اگلے دن سے سب گھر والوں کے موڈ اس سے ... خراب ہوگئے۔ سب یوں کھنچنے لگے کہ جیسے وہ ... اچھوت ہو۔

اماں کہتیں "رزق میرے گھر سے کھائے اور تنخواہ نہ دے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ یہاں جو رہ رہا ہے۔ گھر چلانے میں حصہ ڈالتا ہے۔ یہ تین ٹائم روٹی نہیں کھاتی کیا؟ ارے اگر حصہ نہیں ڈالتی تو چھوڑ آؤ اس کے ابا کے گھر۔ میرے بیٹے کو کوئی کمی تھوڑی ہے۔ دیتی ہوگی تنخواہ اپنے ابا کو جو ریٹائر ہوا بیٹھا ہے۔ ہمیں ماں باپ سمجھا ہوتب نا۔"

ان کی باتوں نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ جب اشرف آیا تو اس نے رات کو روتے ہوئے آدھی تنخواہ اس کے حوالے کردی کہ باقی آدھی سے وہ اپنا گزارا کرلے گی۔ صبح سب گھر والوں کے موڈ اس کے ساتھ ٹھیک تھے۔ لیکن اب آنسو آنکھوں سے نہیں دل پہ گرتے تھے۔

مہینے میں ایک دفعہ ابا کی طرف چکر لگ جاتا تھا۔ خالد بھائی نے اپنے دفتر میں ساتھ کام کرنے والی کو پسند کرلیا تھا اور اب آج کل میں ابا سادگی سے اسے بیاہ کر لانے والے تھے۔ گھر میں اللہ کے فضل سے کسی چیز کی کمی نہ تھی، اس نے بھی جہیز نہ لینے کی زور و شور سے تائید کی تھی۔

جوں جوں اس کے دن قریب آرہے تھے۔ خوف سے اس کا برا حال تھا۔ جانے کیا بنے گا۔ درود و وظائف، سورہ مریم۔ سورہ یوسف سب اس عرصے میں مستقل اس کے غم خوار رہے تھے۔

اسکول میں سینئر ساتھی اسے اچھے مشورے دیتیں۔ لیکن گھر میں ان پر عمل ناممکن تھا۔ گھر میں اماں کی حکمرانی تھی۔ ان کے اپنے قانون تھے اور ان قوانین سے روگردانی کرنے والا شاید زندہ نہ بچ سکتا تھا کہ جب وہ غصے میں آتیں تو مقابل کو اپنے پرخچے اڑتے نظر آتے۔ بیٹیاں کہتیں "اماں کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے تو انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔"

زچگی سے مہینہ پہلے بڑی نند نے کہا "مزنہ! اندر سے وہ کلو والا ڈبہ لاؤ۔ میں تمہیں دیسی گھی ناپ کر دوں۔" اور ناپ کے لفظ نے اس کے اندر کی ضدی

لڑکی کو بیدار کردیا۔

"ارے نہیں آپا! میرا دل نہیں کرتا دیسی گھی کھانے کو۔" اور آپا کا چہرہ یہ سن کر کھل اٹھا کہ گھی کی بچت ہو گئی۔

"ہاں ہاں' نہیں جی کرتا تو نہ کھاؤ بعد میں کھالینا۔ بعد والی خوراک تو تمہیں ہی لگے گی۔ بچہ جتنا کمزور ہو گا' ماں کے لیے اتنی آسانی ہو گی۔" اور مزنہ نے یہ اقوال بھی اپنے اندر چپ کرکے اتار لیے تھے۔

موت و حیات کی کشمکش سے گزر کر اس نے چاند سے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اماں نے عین وقت پر گاؤں کی دائی کو بلوایا تھا کہ کہیں وہ زیادہ دیر کا زیادہ معاوضہ نہ مانگ لے۔

عبدالرافع کی پیدائش نے اسے ساری تکلیفیں ساری پریشانیاں بھلا دیں۔ ابا اور خالد بھائی گاؤں آئے تو ابا نے ماؤں کی طرح عبدالرافع کی خریداری کی تھی۔ بچھونیاں' کپڑے' فیڈر' جوتے' کھلونے' کمبل' پیسے سونے کی ننھی سی انگوٹھی' مزنہ اور اشرف کے سوٹ امی ابا کا سوٹ' دائی کا سوٹ' دیسی گھی اور مٹھائی وغیرہ۔

وہ ابا کو عبدالرافع کو پیار کرتے دیکھتی رہی اور آنکھوں کی ساری نمی اپنے اندر اتارتی گئی۔

رات کو چیزوں کو سنبھالتے ہوئے ہر ہر چیز پر آنسوؤں نے نقش و نگار بنائے تھے اور اشرف کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ عرصہ ہوا اس نے اشرف سے دل کی باتیں کرنا چھوڑ دی تھیں کہ بے حس لوگوں اور پتھر کی دیواروں میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔

اماں نے پوتے کی پیدائش پر کوئی مٹھائی نہیں بانٹی تھی کہ یہ خوامخواہ کا خرچا ہے۔ ہمیں اپنے پوتے کی خوشی ہے۔ لوگوں کو مٹھائی کیوں کھلائیں۔ البتہ اس نے گھر والوں کی نظر میں آئے بغیر سارے کولیگز کو مٹھائی کے ڈبے دیے تھے کیونکہ انہوں نے بھی تحائف اور پیسے دینے میں اور خوشی ظاہر کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اسکول میں ہی اس نے ساتھیوں کو پارٹی بھی دے دی اور باوجود خواہش کے اپنے گھر سے کچھ بنا کر نہ لے جا سکی۔ بازار سے ہی منگوایا کہ اماں کے بقول "لوگوں کو اپنا گھر نہیں کھلانا چاہیے۔ بے وقوف لوگ دوسروں کو اپنا گھر کھلاتے ہیں۔"

سسرال والوں کی طرف سے ابھی تک پوتے کو کچھ نہ ملا تھا۔ بلکہ جو نقدی عبدالرافع کو ملی' وہ اماں نے یہ کہہ کے سنبھال لی کہ "جو لوگ دے کر گئے ہیں' انہیں ہم پورا کر چکے ہیں اور آئندہ بھی ہم ہی کریں گے۔"

کپڑے پہلے اماں نے اسی لیے نہ بنائے تھے کہ پتا نہیں پوتا' ہو یا پوتی۔ تو خوامخواہ کپڑے ضائع ہوں گے اور چھوٹے بچے چونکہ جلدی جلدی بڑے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ان کے کپڑے کم ہی بنانے چاہئیں۔ پہلے وہ آسانی سے مان جاتی لیکن اب جب اشرف آتا تو وہ اپنے بیٹے کے لیے اس سے لڑتی رہتی۔ تکیے پر آنسو دائیں بائیں گرتے اور وہ سرگوشیوں' سسکیوں میں اپنی خواہشیں اور ارمان جو اس نے بیٹے کے حوالے سے دیکھے تھے' اسے بتاتی رہی اگرچہ وہ جان گئی تھی کہ وہ بھی مجبور ہے لیکن اسے لگا کہ اگر اندر سے گھٹن نہ نکالی تو ایک دن دم گھٹ جائے گا۔ بیٹے کی ماں بن کر اب وہ قدرے طاقت میں آگئی تھی کہ اشرف اب اس کی بات سننے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ لیکن دن کو دونوں اپنے اوپر لبادہ چڑھا کر گھر والوں کی مرضی سے کردار ادا کرنے لگتے۔

وقت کا کام گزرنا ہے' گزر جاتا ہے۔ یکے بعد دیگرے اللہ تعالیٰ نے اسے تین بیٹوں سے نوازا تھا۔ نندوں کی شادیاں ہو گئیں۔ اس نے ہر ہر موقع پر اپنا بھرپور حصہ ڈالا تھا۔ فطرتاً طبیعت میں خلوص تھا یا پھر نندیں اسے بے وقوف بناتی تھیں۔ انہیں اگر کوئی چیز چاہیے ہوتی تو مزنہ سے مانگتیں اور وہ دے دیتی' خواہ اسے بعد میں تنگ ہی ہونا پڑتا۔ اشرف کی تنخواہ ابھی تک گھر میں جاتی اور اس کی اپنی بھی آدھی تنخواہ اور باقی آدھی تنخواہ سے وہ اپنے بچوں اور اپنی ضروریات

پورا کرتی۔ گھر والوں کو اگر کبھی مزید ضرورت پڑتی تو وہ مانگنے میں عار نہ سمجھتے تھے اور یہ کبھی ہفتہ پندرہ دن میں ایک آدھ بار تو آہی جاتا تھا۔

مزنہ کی خواہش تھی کہ اس کے بچے اچھے اسکول میں پڑھیں لیکن اماں اور نندوں کے بقول سارے ڈاکٹر' انجینئر ٹاٹ والے گورنمنٹ اسکولوں سے پڑھ کر ہی ڈاکٹر' انجینئر بنے ہیں۔ بچوں کو گاؤں کے اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ جہاں سارا دن ہل ہل کر پہاڑا یاد کرتے اور تختی کو گاچی لگاتے اور کپڑوں کو سیاہی سے کالے کرکے گھر آجاتے۔

مزنہ اسکول سے آتی تو گھر کے ڈھیروں کام منتظر ہوتے۔ جب وہ کاموں سے فارغ ہوتی۔ تو بچے کوئی کہیں تو کوئی کہیں پڑا سو رہا ہوتا' اور اس کا دل جل کر خاک ہو جاتا۔ اسے لگتا شاید اس کے بچے کبھی پڑھ نہ سکیں گے۔ چراغ تلے اندھیرا ہی رہے گا۔ سارے کاموں سے فارغ ہو کر وہ جب عشاء کی نماز کے لیے مصلے پر کھڑی ہوتی تو آنسوؤں میں لپٹی اپنی دعائیں اپنے رب کے حضور پیش کر دیتی۔ روزانہ دو نفل شکرانے کے وہ ادا کرنا نہ بھولتی کہ سسرال والوں اور شوہر کی بے حسی نے اسے اس کے رب کے قریب کر دیا تھا۔

اور شاید ماتا کی التجا میں درد اور تڑپ اتنی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعاؤں کو قبولیت بخشی اور اشرف کا ٹرانسفر ڈیرہ غازی خان ہو گیا۔ ساتھ ہی ترقی بھی ہو گئی۔ کچھ دن تو وہ وہاں بیوی بچوں کے بغیر رہا لیکن پھر جب وہ آیا تو اپنی تنہائی اور بازاری کھانوں کا ایسا رونا رویا کہ اماں کے نہ ماننے کے باوجود ابا نے انہیں تیاری کا حکم دے دیا۔ گرمیوں کی چھٹیاں چند دنوں میں ہونے والی تھیں اور اس نے سوچ لیا تھا کہ اپنا ٹرانسفر بھی ابا سے کہہ کر وہیں کروا لے گی تاکہ بچے کسی اچھے اسکول اور اچھے ماحول میں پرورش پا سکیں۔

چھوٹے دیور کی بات اماں کی سگی بھانجی سے طے ہو چکی تھی اور جیٹھ کے لیے بھی نندوں نے رشتہ ڈھونڈ

لیا تھا۔ گھر والوں کی بھرپور کوشش تھی کہ باقی بیٹوں کے لیے بھی نوکری کرنے والی بہوئیں آئیں۔ خواہ ادھیڑ عمر اور بدصورت ہی کیوں نہ ہوں۔ تاکہ وہ اپنا اور اپنے بچوں کا خرچ خود اٹھائیں۔ لیکن ہر خواہش تو پوری نہیں ہوتی۔ اتنے عرصے کی تلاش کے باوجود دونوں بہوئیں بغیر نوکری والی ملیں۔

لیکن اندرون خانہ ان کے لیے چھوٹی موٹی نوکری کی تلاش جاری تھی۔

اشرف کے ساتھ علیحدہ گھر میں رہتے ہوئے پتا چلا کہ وہ اتنا بھی برا نہ تھا۔ گھریلو دباؤ اتنا تھا کہ وہ بے چارہ کبھی کھل کر بات بھی نہ کر سکا تھا۔

اس نے برسوں سے دبے ارمان اب پورے کرنے شروع کیے۔ بچوں کو قابو کرنے میں اسے سخت مشکل پیش آئی۔

گاؤں میں اسکول سے آنے کے بعد وہ کھیتوں میں نکل جاتے تھے۔ مارے باندھے ہوم ورک کر کے بکریوں اور مرغیوں کے پیچھے رہتے۔ کنچے کھیلتے اور پتنگ اڑاتے تھے۔ اگر وہ کبھی سختی کرتی تو اماں باقاعدہ دوہتڑ مارنا شروع کر دیتیں یہ بہو ہمارے سر چڑھ کر مارتی ہے اور اس کا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ جاتا تھا۔

بڑے پیار، سلیقے اور کھیل کھیل میں اس نے بچوں کا ٹائم ٹیبل سیٹ کیا۔ بچے ماشاء اللہ ذہین تھے۔ فوراً سمجھ جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ مزنہ کی بنائی ہوئی روٹین میں ڈھلتے چلے گئے۔

اشرف کی تنخواہ کا بڑا حصہ اب بھی گھر جاتا کہ اماں اور بہنوں کے بقول ہم جائیداد بنا رہے ہیں۔ ابھی شادیاں کرنا ہیں۔ لیکن اب اس نے اپنی تنخواہ دینا بند کر دی تھی کیونکہ مکان کا کرایہ، بجلی، گیس کے بل اور دیگر اخراجات پورے کر کے اگرچہ اس کے پاس بچتا کچھ نہ تھا۔ لیکن وہ اس بات کا شکر کرتی کہ بچے پڑھ رہے ہیں اور یہ اس کی سب سے بڑی بچت ہے۔

اشرف کو مزنہ کی خوبیاں تو پہلے سے ہی پتا تھیں۔ اب ان کا اعتراف کرنے میں اسے جھجک نہ تھی۔

"مزنہ! تم ہی تھیں جو میرے گھر والوں کے ساتھ گزارہ کر گئیں تمہارے ابا نے تمہاری تربیت بہت اچھی کی۔ اب دیکھنا گھر کی کیا حالت ہوگی۔"

اور یہ بات اس کو دیوروں کی شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی سمجھ میں آ گئی۔ اماں کی سگی بھانجی شادی کے دو ماہ بعد ہی روٹھ کر میکے جا بیٹھی تھی کہ اماں کی روک ٹوک بہت زیادہ ہے اور اتنا گھر کا کام وہ نہیں کر سکتی۔ اب اماں اس کی تربیت کو الزام نہیں دے سکتی تھیں کہ خاندان تو ان کا ہی تھا۔ مدمقابل بھی اماں کی بہن تھیں "یہ سیر وہ سوا سیر" اور جیسے ہی ساجدہ کے حاملہ ہونے کی خبر دیور تک پہنچی، وہ بھی اماں کو چھوڑ خالہ کے گھر جا بیٹھا۔

اماں ابا اور بہنوں کی مشترکہ محفل نے مسئلے کا حل نکالا کہ انہیں صلح صفائی سے گھر لا کر باعزت علیحدہ کر دیا جائے۔ ورنہ سگی بھانجی اور بیٹا نجانے کتنا خوار کرائیں گے۔ جیٹھ اور جیٹھانی بھی رنگ ڈھنگ دیکھ رہے تھے۔ جیٹھانی کے گھر والے تگڑے لوگ تھے۔ انہوں نے داماد کی نوکری لگوائی اور ساتھ ہی بیٹی کو بھجوا کر علیحدہ کروا دیا تھا۔

مزنہ سوچتی میں کیسے اتنے سال وہاں گزار آئی۔ ہر بات برداشت کی۔ ہر تکلیف اٹھائی۔ کیا دیورانی اور جیٹھانی کے گھر والوں نے انہیں برداشت کی، سمجھوتے کی چادر نہ اوڑھائی تھی۔ شاید میری بے وقوفی تھی۔ یا ان لوگوں کی ہوشیاری زیادہ تھی کہ اتنے سالوں تک مجھے ہوش نہیں رہا۔ لیکن اپنے خون نے ہی سمجھوتوں کی چادر کو پھاڑا اور دوسروں کے لیے بھی رستہ کھول دیا کہ زنداں سے اڑنے میں انہوں نے دیر نہیں کی۔

چھٹیوں میں وہ بچوں کے ساتھ گاؤں گئی تو گھر کے حالات دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ اماں کا سارا طنطنہ ختم ہو گیا تھا۔ گھر کے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے اب ایک ماسی رکھ لی گئی تھی۔ لیکن اماں کی عادت کی وجہ سے کوئی زیادہ دیر ٹکتی نہ تھی۔ تیسرے نمبر والے دیور نے یونیورسٹی میں کسی کو پسند کیا مگر اماں ابا کی مخالفت پر اس نے کورٹ میرج کر لی۔ آخری والا اماں ابا کے پاس تھا۔ لیکن واضح طور پر اس کے پر بھی پھڑپھڑا رہے تھے۔

مزنہ کی نندیں ملنے آئیں تو ہر کوئی گھریلو طور پر پریشان کوئی سکھ میں نہ تھی۔ وہ سب کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لائی تھی۔ حالانکہ وہ نندوں سے عمر میں چھوٹی تھی۔ لیکن رشتہ بڑا سمجھ کر شروع سے وہ دیتی دلاتی آئی تھی۔ اگرچہ ساس سسر کی جانب سے یا بڑی نندوں کی طرف سے کبھی عید بقر عید پر بھی اسے کچھ نہ ملتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اسے کون سا کمی ہے، تنخواہ لیتی ہے۔

اور وہ شکر ادا کرتی رب کا کہ جس نے واقعی کوئی کمی نہ رہنے دی تھی۔

تینوں بچے تمیزدار اور سلجھے ہوئے۔ بہت تھوڑے عرصے میں ماں کے رنگ میں رنگ گئے تھے۔

دادا، دادی کو جیسے چپ لگ گئی تھی وہ جن پر اپنی جان چھڑکتے تھے انہی کے لیے ڈالے بیٹھے تھے اور نواسے نواسیاں جنہیں اماں نے ہمیشہ فوقیت دی تھی پوتوں پر۔ نانی، نانا کے ساتھ بدتمیزی اور گستاخی کر رہے تھے۔ مزنہ کو برا تو لگا لیکن کچھ کہہ نہ سکی کہ جانتی تھی کہ اماں کی ہمدردیاں ابھی بھی بیٹیوں اور ان کی اولاد کے ساتھ ہیں۔

چھٹیاں گزار کر جب اس نے جانے کی تیاری شروع کی تو ایک بیگ میں اماں اور ابا کے کپڑے بھی رکھنے لگ گئی۔

"ارے ارے کاکی (اماں اول دن سے کاکی ہی کہتی تھیں) یہ میرے اور اپنے ابا کے کپڑے کیوں رکھنے لگ گئی بیگ میں؟"

اماں نے رولا ہی ڈال دیا اور گھر کے سارے لوگ جو انہیں رخصت کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ حیران ہو کر دیکھنے لگے۔

"اماں! آپ اور ابا ہمارے ساتھ چلیں گے، اس لیے۔" مزنہ نے جواب دیا۔

اشرف کے چہرے کی حیرانی ظاہر کر رہی تھی کہ اسے بھی اس فیصلے کی توقع اور علم نہ تھا۔

"لو بھلا وہ کیوں۔" بڑی آپا بولیں۔

"اپنی زمین جائیداد گھر بار چھوڑ کر وہاں شہر میں کیوں جائیں اور اماں وہاں رہ سکتی ہیں بھلا۔"

"کیوں نہیں رہ سکتیں۔ اماں ابا پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے کیا؟" وہ کہتے ہوئے اماں کے پیروں کی طرف آ بیٹھی۔

"اماں! جب میں بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی تو جو رعب اور دبدبہ آپ کا میں نے دیکھا تھا، مجھے آپ کا وہی روپ اچھا لگتا ہے۔ آپ کو یقیناً مجھ سے بہت گلے ہوں گے لیکن اماں! سچی بات بتاؤں کہ ابا اور آپ کو اس طرح رہتے دیکھ کر میرا دل بہت دکھا ہے۔ مجھے تو وہی اماں چاہییں۔ لڑتی، ڈانٹتی، رعب جماتی، مضبوط اور طاقتور..... یہ بچوں اور بہوؤں سے سہمی ہوئی اماں .....اور مستقبل سے پریشان ابا یہ میرے ماضی کے البم میں کہیں نہیں ہیں آپ بس میرے ساتھ چلیں۔" کہتے ہوئے اس کی آنکھیں جھلملا گئی تھیں اور اماں تو بہت پہلے سے رونے لگ گئی تھیں۔ ابا نے اپنے صافہ کے پلو سے آنکھوں کے نم گوشے صاف کیے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بیٹا تو واقعی مزنہ ہے۔ تیرے نام کا مطلب تو اب سمجھ میں آیا ہے۔ وہ سیپ جس میں پانی کا قطرہ موتی بن جائے..... تو واقعی موتی ہے۔ اشرف خوش قسمت ہے کہ اسے تیرے جیسے ہیرے ورگی بیوی ملی ہے۔"

سب کے سامنے ابا کی تعریف نے اس کا سر واقعی بلند کر دیا تھا۔ مزنہ دل میں سوچ رہی تھی۔

"آج اگر میں اشرف کے والدین کی قدر کروں گی تو شاید نہیں، یقیناً" یہی سمجھوتا میری بہوویں بھی میرے ساتھ کریں گی کیونکہ میرے بیٹے جو سلوک بزرگوں کے ساتھ میرے گھر میں دیکھیں گے۔ لازماً" اپنے بچوں سے بھی وہی سلوک کروائیں گے۔"

☼

نگہت عبداللہ

میرے خواب لوٹا دو

تیسری قسط ۳

توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا حماد اور دو بیٹیاں' سارہ اور اریبہ ہیں۔ یاسمین کی مستقل بدمزاجی اور بدزبانی سے تنگ آکر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی' خالدہ سے دوسری شادی کرلی۔ یاسمین اس پر اپنے جیٹھ' جٹھانی سے بھی شاکی ہے۔ اریبہ ماں سے قریب ہے' جب کہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اریبہ کی منگنی اس کے تایا زاد' اجلال رازی سے ہوچکی ہے جو اعلا تعلیم کے لیے امریکا گیا ہوا ہے۔ یاسمین' اریبہ کو باپ اور ددھیالی رشتے داروں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ اریبہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتا چلا تو وہ اپنے تایا اور تائی سے بھی بدظن ہوگئی اور اس نے اجلال سے منگنی توڑ دی۔ اجلال تعلیم مکمل کرکے واپس آیا تو اسے منگنی ٹوٹنے کا پتا چلا۔ وہ اریبہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔





توصیف احمد تو یہ سوچ کر بھاگے چلے آئے تھے کہ کہیں بات ساجدہ بیگم تک نہ پہنچ جائے اور اریبہ نے ڈائریکٹ بات پہنچائی ہی وہیں تھی۔ کتنی دیر وہ سکتہ کی حالت میں سارہ کو دیکھے گئے۔ اس کے بعد بمشکل بول پائے تھے۔

"یہ..... یہ کب کی بات ہے؟"

"کافی دن بلکہ مہینے ہو گئے۔" سارہ یہ نہیں کہہ سکی کہ جب ان کی دوسری شادی کا راز کھلا تھا۔

"مہینے.....!" وہ مزید حیران ہوئے۔ "رازی کے آنے سے پہلے کی بات ہے؟"

"جی.....!" سارہ نے سر جھکا لیا گو کہ وہ قصوروار نہیں تھی پھر بھی مجرم بنی ہوئی تھی۔

"آپ نے اسی وقت مجھے کیوں نہیں بتایا تھا؟" توصیف احمد نے ابھی بھی نرمی سے پوچھا تھا پھر بھی وہ خائف ہو کر رونے لگی۔ توصیف احمد نے اسے چپ نہیں کرایا اور اٹھ کر یاسمین کے کمرے میں آ گئے۔

یاسمین کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر بھڑک اٹھی۔

"توصیف احمد! جب میں تم سے تعلق نہیں رکھنا چاہتی تو میرے بیڈ روم میں آنے کا مطلب؟"

"شٹ اپ، تمہارا کیا خیال ہے میں یہاں تم سے تعلقات استوار کرنے آیا ہوں۔" توصیف احمد نے غصے سے طنز آمیز چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ سارہ کے سامنے انہوں نے خود پر بہت ضبط کیا تھا لیکن اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"پھر یہاں آنے کا مقصد؟" یاسمین نے ان ہی کے انداز میں پوچھا تھا۔

"میں تم سے اریبہ کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں وہ بھابھی بیگم کے پاس کیوں گئی تھی؟" وہ اب کوشش سے بھی اپنے غصے پر کنٹرول نہیں کر پا رہے تھے۔

"مجھے کیا پتا!" یاسمین نے نخوت سے سر جھٹکا۔

"سب پتا ہے تمہیں، سب جانتی ہو اور تم ہی اکساتی ہو اسے میرے خلاف۔ میرے پورے خاندان کے خلاف، لیکن تم سن لو یاسمین! اریبہ کی شادی رازی کے ساتھ ہی ہو گی۔ یہ تم اسے اچھی طرح سمجھا دینا اگر اس نے دوبارہ ایسی کوئی حرکت کی تو وہ اس گھر میں تمہارا آخری دن ہو گا۔"

توصیف احمد اسے متنبہ کر کے رکے نہیں اسی وقت باہر نکل آئے۔ ان کا ڈپریشن مزید بڑھ گیا تھا کہ انہیں خلاف عادت، خلاف مزاج یاسمین کے ساتھ اسی کی طرح چلانا پڑا تھا ورنہ وہ خود ہمیشہ سے دھیمے مزاج کے نفیس انسان تھے۔ بہر حال اس وقت انہوں نے سوچا تو یہ تھا کہ اسی وقت ساجدہ بیگم کے پاس جا کر ان سے معذرت کریں گے لیکن اپنے خراب موڈ کی وجہ سے انہوں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

چھٹی کا دن تھا۔ صبح معمول کے مطابق اجلال رازی کی آنکھ کھلی تو تھی لیکن وہ پھر سو گیا تھا۔ اس کے بعد تقریباً" دس بجے کچھ کھٹ پٹ کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ پہلے اس نے گھڑی میں ٹائم دیکھا پھر اٹھنے لگا تھا کہ سنبل پر نظر پڑی۔ وہ ٹیبل کے پاس کھڑی پتا نہیں کیا کر رہی تھی۔ اسے اس سے غرض نہیں تھی بلکہ وہ اس کی اپنے کمرے میں موجودگی پر حیران ہوا تھا۔ کیونکہ اس کے ساتھ اس کی اتنی بے تکلفی تو کبھی بھی نہیں تھی۔ بس کزن ہونے کے ناتے رسمی علیک سلیک ہوا کرتی تھی۔ بہر حال اسے متوجہ کرنے کے لیے وہ کھنکارا تو سنبل فوراً" اس کی طرف پلٹی اور دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

"آپ اٹھ گئے۔ اتنی دیر سے اٹھتے ہیں آپ؟ دس بج رہے ہیں۔"

"ہاں وہ..... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" وہ اس کی بات کا جواب دیتے دیتے ایک دم وہی پوچھ گیا جو سوچ رہا تھا۔

"میں آپ کو دیکھنے آئی تھی۔" سنبل نے کہا تو اسے بڑا عجیب سا لگا۔

"دیکھنے آئی تھی، کیا مطلب، پہلے کبھی نہیں دیکھا مجھے۔" سنبل کھلکھلا کر ہنس پڑی، پھر اپنی بات کی وضاحت کرنے لگی۔

"آپ سمجھے نہیں۔ میں یہ دیکھنے آئی تھی کہ آپ اٹھ گئے یا نہیں۔"

"مجھ سے کوئی کام ہے؟" وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"نہیں کام تو کوئی نہیں ہے۔ آپ کے لیے چائے لاؤں؟" سنبل اب کچھ سٹپٹائی تھی۔

"کیوں ثناء کہاں ہے؟" اس نے پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا۔

"وہ فون پر اپنی کسی سہیلی سے بات کر رہی ہے۔ اسی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ کو اٹھا دوں۔" سنبل نے اس کے تیور بگڑتے دیکھ کر ثناء پر بات رکھ دی۔

"انتہائی فضول لڑکی ہے۔ جاؤ، اس سے کہو چائے لے کر آئے اور جلدی۔" اس نے قصداً" غصہ ظاہر کیا۔

سنبل جاتے جاتے رک کر پوچھنے لگی۔

"آپ ناراض کیوں ہو رہے ہیں؟"

"تم جاؤ پلیز۔" وہ کہہ کر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ اسے واقعی غصہ آ رہا تھا۔ پتا نہیں آج کا دن کیسے گزرے گا۔ اٹھتے ہی موڈ خراب ہو گیا تھا۔ اسے سنبل سے کوئی پرخاش نہیں تھی مگر اس کے یوں کمرے میں چلے آنے پر جھنجلا رہا تھا۔ وہ بھی ایسے وقت، جب وہ سو رہا تھا۔ جب ثنا چائے لے کر آئی تو وہ اس پر بھی بگڑ گیا۔

"سنبل کو تم نے بھیجا تھا میرے کمرے میں؟"

"جی اصل میں میں وہاں کچن میں مصروف تھی۔ میں نے سنبل آپی سے کہا، آپ کو اٹھا دیں۔" ثنا نے بظاہر سادگی سے بات بنائی پھر فوراً" کہنے لگی۔

"امی بھی نہیں ہیں۔ شام میں اخلاق چچا کی بیٹی کی شادی ہے ناں۔ امی ابھی چلی گئی ہیں۔"

"کس کے ساتھ گئی ہیں؟" اس کا دھیان بٹ گیا۔ ثنا کا یہ ہی مقصد تھا۔ بہت چالاکی سے بات گھما دی تھی۔

"بلال کے ساتھ، ہم لوگ رات میں چلیں گے۔ چلیں گے ناں بھائی؟"

"ہاں کیوں نہیں، ضرور چلیں گے۔ اسی بہانے سب سے ملاقات ہو جائے گی۔" اس نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا پھر پوچھنے لگا۔ "امی ابھی کیوں چلی گئیں؟"

"وہ اخلاق چچا اور چچی رات ہی انہیں روک رہے تھے۔ آپ کو تو پتا ہے امی کو اپنے بستر کے علاوہ کہیں نیند ہی نہیں آتی۔ اس لیے معذرت کر کے چلی آئیں۔ اس وعدے کے ساتھ کہ صبح جلدی آ جائیں گی۔ اس لیے ابھی چلی گئیں۔ آپ کے لیے ناشتا بناؤں؟" ثنا نے روانی سے بتا کر پوچھا۔

"نہیں ناشتے کا موڈ نہیں ہے اور ہاں سنبل کب آئی؟" اسے پھر اچانک سنبل کا خیال آ گیا تھا۔

"امی کے جانے سے پہلے۔ میں نے بلوایا ہے انہیں۔ میں اکیلی ہو گئی تھی ناں۔"

ثنا نے فوراً" توجیح بھی پیش کر دی۔ اس نے مزید کچھ نہیں کہا۔ چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ ثنا کی طرف بڑھا دیا۔ ثنا کپ لے کر چلی گئی تو وہ ادھر ادھر یوں دیکھنے لگا جیسے کیا کرنا چاہیے۔ گھر میں رہ کر تو اس کے پاس کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ عموماً" چھٹی کا دن اس کا بور ہی گزرتا تھا۔ جب امریکہ میں تھا تو وہاں دوستوں کے ساتھ کہیں نہ کہیں جانے کا پروگرام بنا لیا کرتا تھا لیکن یہاں تو کوئی دوست ہی نہیں تھا اور جس کے ساتھ وہ بہت سارے سال گزار کر آیا تھا وہ بات تک کرنے کی روادار نہیں تھی۔

اریبہ کے بارے میں سوچتے ہوئے اچانک اسے خیال آیا کہ شام میں شادی کی تقریب میں وہ بھی تو آئے گی۔ گویا اس سے ملاقات متوقع تھی۔ گو کہ اس کی طرف سے کسی اچھی بات کی امید نہیں تھی پھر بھی وہ اس سے ملتے رہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہ محض اس کی خوش فہمی نہیں تھی بلکہ اسے یقین تھا کہ کسی دن اچانک وہ اس کے سامنے ہار جائے گی۔ اسے اپنی محبت پر بھروسا تھا اور اس کی محبت سے بھی واقف تھا۔ بدلتے حالات کے پیش نظر وہ لاکھ منہ موڑے لیکن اپنے دل سے اس کی محبت نکال کر نہیں پھینک سکتی تھی۔



وہ گاؤں سے اپنی بہن تاجور کی فکر ساتھ لایا تھا۔ کتنی مرجھا گئی تھی وہ اور کمزور بھی بہت ہو گئی تھی۔ گو کہ اس کی طرف سے اسے اطمینان تو پہلے بھی نہیں تھا بس یہ سوچتا کہ ابا کچھ نہ کچھ خیال تو کرتے ہی ہوں گے' آخر وہ ان کی اولاد ہے پھر تاجور نے بھی کبھی شکایت نہیں کی تھی۔ ہمیشہ اس کے پوچھنے پر یہی کہتی کہ وہ ٹھیک ہے' خوش ہے۔ لیکن اس بار اس نے خود دیکھ لیا تھا کہ ابا کو بھی اس کی کوئی پرواہ نہیں رہی بلکہ ہر بات میں اسے ہی سخت سست کہتے تھے۔ اس پر بھی وہ اف نہیں کرتی تھی۔ شاید اندر ہی اندر کڑھتے رہنے سے وہ اس حال کو پہنچ گئی تھی اور وہ اسے یوں اس کے حال پر تو نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ وہ اس کی ماں جائی تھی۔

ماں' جو اسے جنم دیتے ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً" دس گیارہ سال تھی۔ جہاں وہ اپنی ننھی بہن کو پا کر خوش تھا' وہاں ماں کی ابدی جدائی نے اسے بے تحاشا رلایا تھا اور شاید اسے سنبھلنے میں بہت وقت لگ جاتا لیکن ننھی تاجور نے اس کا دھیان بٹا دیا تھا۔ اب وہ سارا وقت اسی کے ساتھ لگا رہتا۔ ابا تو کام پر چلے جاتے تھے۔ شام میں آتے بھی تو تھوڑا وقت ہی دونوں بچوں کو دے پاتے' پھر جو چارپائی پر گرتے تو صبح ہی اٹھتے تھے۔

بہر حال اتنی سی عمر میں وہ کافی سمجھ دار اور ذمہ دار ہو گیا تھا اور شاید حالات سے سمجھوتا بھی کر لیتا۔ لیکن اس کے اندر پڑھنے اور بڑا آدمی بننے کی جو امنگ اس کی ماں نے پیدا کی تھی' وہ اس سے دستبردار نہیں ہو سکا۔

"تو دل لگا کر پڑھنا۔ پتا بھی نہیں چلے گا وقت گزر جائے گا۔ پھر تو بڑا آدمی بن جائے گا۔ تیرے پاس موٹر کار ہو گی۔ اتنا بڑا گھر ہو گا۔ پھر میں تیری دلہن لاؤں گی۔"

ماں روزانہ اسے اسکول کے لیے تیار کرتے ہوئے ایسی ہی باتیں کرتی تھی اور وہ ماں کا چہرہ دیکھ کر خوش ہوتا تھا جس پر اسے اس کے خوابوں کی تعبیر کا عکس نظر آتا تھا اور اس کا دل چاہتا' وہ پلک جھپکتے بڑا ہو جائے۔ لیکن تقدیر کی ستم ظریفی کہ ماں' جس نے کہا تھا "پتا بھی نہیں چلے گا وقت گزر جائے گا۔" وہ خود گزر گئی لیکن اپنے خواب اسے دان کر گئی تھی تب ہی وہ بے چین رہتا تھا۔ سارے دن میں جب بھی اسے موقع ملتا خصوصاً" جب تاجور سو جاتی' تب وہ اپنی کتابیں کھول لیتا۔ اس وقت وہ چھٹی جماعت میں تھا' گو کہ اس کا اسکول چھوٹ گیا تھا لیکن اس نے پڑھنا نہیں چھوڑا تھا۔

وہ اپنے اسکول کا سب سے لائق بچہ تھا اس لیے اسکول کے ہیڈ ماسٹر خود ابا کے پاس کئی بار آئے تھے کہ اس کا اسکول نہ چھڑائیں۔ لیکن ابا بھی کیا کرتے۔ وہ اپنا کام دھندا چھوڑ کر گھر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ یوں وہ گھر کا ہو کر رہ گیا۔ پھر سال بھر بعد جب ابا نے دوسری شادی کی تب وہ پھر سے اسکول جانے لگا لیکن اس کی دوسری ماں جسے وہ خالہ کہنے لگا تھا وہ اس کے اسکول جانے کے سخت خلاف تھی۔ صبح جب وہ اٹھتا تو جان بوجھ کر اسے اِدھر اُدھر کے کاموں میں لگا دیتی۔ یہاں تک کہ اسکول کا وقت نکل جاتا۔

ہفتے میں ایک دو دن ہی وہ اسکول جا پاتا تھا۔ لیکن اس کے اندر کی لگن نے کہیں بھی اس کے حوصلے پست نہیں

ہونے دیے۔ جیسے تیسے اس نے مڈل پاس کر لیا۔ گاؤں میں کوئی ہائی اسکول نہیں تھا اور ابا چاہتے تھے وہ ان کے ساتھ کھیتی باڑی میں لگ جائے۔ جبکہ وہ مزید پڑھنا چاہتا تھا۔ پھر جب ابا نے سختی کی تو وہ گھر سے بھاگ کر قریبی شہر رحیم یار خان چلا گیا۔ جہاں محنت مزدوری کے ساتھ اس نے اپنی تعلیم جاری رکھی گو کہ یہ کٹھن وقت تھا خصوصاً" تاجور کے لیے وہ بہت تڑپتا تھا لیکن اس نے ٹھان لی تھی کہ وہ کچھ بن کر ہی واپس جائے گا پھر تاجور کو اپنے ساتھ لے آئے گا۔

یوں اس نے میٹرک فرسٹ ڈویژن سے پاس کر لیا پھر کالج جوائن کرنے سے پہلے اسے تاجور کی کشش واپس کھینچ لائی۔ لیکن وہ کچھ دن ہی اس کے پاس رہا پھر واپس چلا گیا پھر تو اس کے لیے وقت کاٹنا اور مشکل تھا۔ کیونکہ اس دوران گھر میں اس کے اور بہن بھائی کا اضافہ ہو گیا تھا جس سے تاجور کو جو تھوڑی بہت توجہ ملتی تھی' وہ اس سے بھی محروم ہو گئی تھی۔ بس ایک پڑوس میں تاباں اور اس کی اماں تھیں جو خصوصاً" تاجور کے لیے آتی تھیں اور اس کا کچھ خیال کر لیتی تھیں۔

بہر حال وقت جیسا بھی ہو' گزر ہی جاتا ہے۔ اس نے رحیم یار خان سے بی کام کیا اس کے بعد کراچی کا رخ کیا۔ اس دوران وہ چھٹیوں میں اور امتحانوں کے بعد گاؤں جاتا رہا تھا اور صرف تاجور کو ہی نہیں اچھے دنوں کی آس دلاتا تھا' تاباں بھی تھی' اس کی بچپن کی ساتھی۔ جس کے ساتھ بڑے خاموش عہد و پیمان ہوئے تھے۔

تاباں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ بے حد لاڈلی ہونے کے باعث اپنی بات منوا لیا کرتی تھی۔ لیکن گزشتہ سال اس کی اماں کا انتقال ہو گیا تو اس کے بعد اس کا ابا اس پر کچھ سختی کرنے لگا تھا۔ خصوصاً" گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ اس لیے اب وہ گاؤں جاتا تو تاباں سے ایک آدھ بار ہی ملاقات ہو پاتی تھی اور اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اسے دیکھ لیتا ہے۔

بہر حال اس کی اماں نے جو خواب اس کے لیے دیکھے تھے ان کی تعبیر اب زیادہ دور نہیں تھی۔ اب وہ ایک گارمنٹ فیکٹری میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ ساتھ ہی سی اے بھی کر رہا تھا۔ رہائش کے لیے اس نے دو کمروں کا فلیٹ کرائے پر لیا ہوا تھا گو کہ اس اکیلے کے لیے جاب بھی ٹھیک تھی اور رہائش بھی لیکن یہ اس کی منزل نہیں تھی۔ اسے ابھی اور آگے بڑھنا تھا۔ سی اے میں دو سال باقی تھے اور جیسے پچھلا وقت گزرا یہ دو سال بھی گزر جانے تھے لیکن اب وہ تاجور کو جس طرح کمزور اور لاغر دیکھ کر آیا تھا' خود کو اطمینان نہیں دلا پا رہا تھا کہ محض دو سال ہی کی تو بات ہے' اور تاجور کو لانے کی سوچتا تو آگے یہ مسئلہ زیادہ گمبھیر تھا کہ وہ اکیلی کیسے رہے گی۔ کیونکہ وہ تو صبح آفس کے لیے نکلتا تو پھر رات گیارہ بارہ بجے ہی گھر لوٹتا تھا اور اس شہر کے حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ تاجور کو اکیلے گھر میں چھوڑ دیتا نہ ہی کسی پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔

"پھر کیا کروں!" وہ جب سے آیا تھا' اسی ایک بات میں الجھتا رہتا تھا۔ لیکن اس کا کوئی فوری حل اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔



اریبہ نے دور سے ہی اجلال رازی کو آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ فوراً" منہ موڑنا چاہتی تھی لیکن اس کے ساتھ سنبل پر نظر پڑی تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ حالانکہ سارہ نے پہلے ہی اسے خبردار کیا تھا کہ رازی کی کزن سنبل اس کے بہت آگے پیچھے پھر رہی تھی لیکن اس نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اس لیے نہیں کہ اس کے نزدیک واقعی اس کی اہمیت نہیں تھی بلکہ اسے یقین تھا کہ رازی بحالت مجبوری تو اس سے دستبردار ہو سکتا ہے خوشی سے نہیں اور اتنی جلدی وہ کیسے مجبور ہو سکتا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے دیکھے گئی۔ سرمئی

رنگ کے سوٹ میں وہ بہت نمایاں نظر آرہا تھا۔ وہ اپنی نظروں پہ پہرے بٹھانے میں ناکام ہو رہی تھی۔ سب سے ملتا ہوا آخر میں وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"ہیلو، کیسی ہو؟" رازی کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی، جو صرف اس کے لیے مخصوص تھی۔

"بہت اچھی۔" وہ یکدم بے نیاز بن گئی۔

"گڈ! اس کا مطلب ہے میں تمہارے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں۔" رازی نے خوش ہو کر کہا۔

"کیوں اس کے ساتھ جا کر بیٹھو، جسے ساتھ لیے پھرتے ہو۔" اریبہ کی زبان سے بلا ارادہ ہی پھسل گیا، جس پر وہ اندر ہی اندر خود کو کوسنے لگی تھی۔

"کون؟" وہ ایک لحظہ کو حیران ہوا پھر سمجھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"سنبل کی بات کر رہی ہو؟"

"کون سنبل میں کسی سنبل کو نہیں جانتی۔" وہ اب لاکھ انکار کرتی رازی کو کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔

"نام سے واقف نہیں ہو گی۔ وہ میری ماموں زاد ہے۔ آج کل ہمارے ہاں رہنے آئی ہوئی ہے، بڑی رونق ہو گئی ہے اس کے آنے سے۔"

"تو..... میں کیا کروں۔" وہ تنک کر بولی تھی۔

"یونہی بتا رہا ہوں۔ تمہاری معلومات میں اضافے کے لیے۔" وہ اندر ہی اندر بے حد محظوظ ہو کر بولا تھا۔

"کر چکے میری معلومات میں اضافہ؟ اب جاؤ یہاں سے۔" وہ بری طرح سلگ رہی تھی۔ اگر تقریب میں نہ کھڑی ہوتی تو اسے بے نقط سناتی۔ اب صرف دانت پیس رہی تھی۔

"اب کہاں جاؤں تم سے آگے تو کچھ نہیں ہے۔ آئی مین! میرا سفر تم پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔" رازی کا لہجہ یک لخت جذبوں سے چور ہو گیا تھا۔ نظروں میں بھی وارفتگی سمٹ آئی تھی۔

"لیکن میرا سفر یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ جس کے اختتام کی کوئی حد نہیں۔" وہ سلگتے لہجے میں اسے بھی سلگا رہی تھی۔

"غلط بالکل غلط تم سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔ یہ دھوکا ہے اریبہ! خود کو دھوکا مت دو۔" رازی نے دھیرے سے اسے جھٹلا کر کہا۔

"دھوکا تو تم اپنے آپ کو دے رہے ہو۔ میرے واضح انکار کے بعد بھی تم نے کیوں مجھ سے امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اپنا فیصلہ واپس لے لوں گی؟ نہیں کبھی نہیں۔ مجھے تم سے نفرت ہے اور اس نفرت کی بھی کوئی حد نہیں۔" وہ انتہائی غصے سے اسے ٹھکرا کر پیر پٹختے ہوئے وہاں سے نکل کر یاسمین کے پاس آ بیٹھی۔ رازی وہیں کھڑا ہونٹ بھینچے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا بیٹا؟" یاسمین نے اس کے تپے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں، سارہ کہاں ہے؟" اس نے بمشکل اپنے غصے پر کنٹرول کرتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں مل رہی ہو گی اپنے ددھیال والوں سے۔" دوسری بات یاسمین نے بڑبڑانے کے انداز میں کہی تھی پھر بھی اس نے سن لی لیکن فوراً" کوئی تبصرہ نہیں کیا البتہ نخوت سے سر جھٹکا پھر اٹھتے ہوئے بولی۔

"میں اسے بلاتی ہوں مما! پھر چلتے ہیں۔"

"ہاں حماد کو بھی دیکھ لینا۔"

"جی!" اس نے پہلے وہیں کھڑے رہ کر سارہ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں پھر اسے ڈھونڈتی ہوئی اسٹیج کی طرف آئی تو وہ اگلی رو میں امینہ پھوپھو کے پاس بیٹھی نظر آئی۔

"سارہ!" وہ چند لمحوں میں سارہ کے سر پر پہنچ گئی۔ "چلو ہم جا رہے ہیں۔"

"کیوں، میرا مطلب ہے ابھی تو کھانا بھی نہیں لگا۔" سارہ نے کہا تو وہ چڑ کر بولی۔

"کھانا گھر پر بھی مل جائے گا، چلو اٹھو۔"

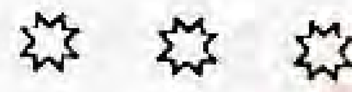
"بیٹا! میرے پاس بیٹھو۔ تم تو آتی ہی نہیں ہو۔" امینہ پھوپھو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ وہ جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر بولی۔

"آپ کون سا آتی ہیں۔"

"میں تو آنا چاہتی ہوں پر....." امینہ پھوپھو خاموش ہو گئیں۔ اس نے ان کی ادھوری بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور سارہ کو دیکھنے لگی۔

"کیا ہے اریبہ! کچھ دیر رکو ناں۔ دلہن تو دیکھ لیں۔" سارہ نے منت سے کہا۔

"بہت شوق ہے تمہیں دلہن دیکھنے کا۔ چلو اٹھو۔" اس نے سارہ کا ہاتھ کھینچ کر زبردستی اٹھا دیا تھا۔



توصیف احمد حیران تھے کہ ساجدہ بیگم نے اشارتاً" بھی ان سے اریبہ کی اس حرکت کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ بقول سارہ کے اس بات کو کافی مہینے ہو گئے تھے اور اس عرصے میں ان کا کتنی بار ساجدہ بیگم سے سامنا ہوا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح ہی ملی تھیں۔ اب پتا نہیں انہوں نے اریبہ کی اس حرکت کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی یا اپنے طور پر وہ بھی بات ختم کر کے بیٹھ گئی تھیں۔ انہیں بہرحال اس معاملے کو نبٹانا تھا اور اس وقت وہ اسی ارادے سے ساجدہ بیگم کے پاس آئے تھے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں خاص طور پر رازی کا اتنی جلدی بزنس سنبھال لینا موضوع رہا، اس کے بعد وہ کہنے لگے۔

"بھابھی بیگم! مجھے ابھی چند روز پہلے پتا چلا کہ اریبہ آپ کے پاس آئی تھی بہت غلط حرکت کی اس نے۔"

"نادان ہے۔" ساجدہ بیگم فوراً" بولی تھیں۔ "جذباتی ہے۔ غصے میں تھی شاید، کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو انگوٹھی واپس کرنے چلی آئی۔"

"لیکن بھابھی بیگم! آپ کو مجھے تو بتانا چاہیے تھا۔" وہ شاکی ہوئے۔

"کیا فائدہ ہم بھی غصے میں آجاتے اور غصے میں معاملے ٹھیک نہیں ہوتے اور بگڑ جاتے ہیں۔ جبکہ میں معاملہ بگاڑنا نہیں چاہتی۔ اس لیے میں نے خاموشی اختیار کر لی اور تمہیں بھی میں یہی مشورہ دوں گی کہ بچی پر دباؤ ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے خود سمجھنے دو۔" ساجدہ بیگم نے اسی بردباری سے کہا جو ان کا خاصا تھی۔

"وہ خود سے کیسے سمجھ سکتی ہے۔ آپ جانتی تو ہیں یاسمین کو۔ وہی اسے مسلسل ورغلاتی رہتی ہے۔ وہ کبھی بھی اریبہ کو اس کی غلطی کا احساس نہیں ہونے دے گی بلکہ اور اکسائے گی۔" توصیف احمد بہت فکر مندی سے بولے تھے۔

"تو تم کیا چاہتے ہو، اس رشتے کو ختم کر دیا جائے؟" ساجدہ بیگم نے پوچھا تو توصیف احمد پریشان ہو کر انہیں دیکھنے لگے، وہ اس وقت خود کو بہت بے بس محسوس کر رہے تھے۔

"تم نہیں چاہتے ہمیں بھی نہیں چاہتی۔ رازی بھی اس رشتے کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔" ساجدہ بیگم ان کی خاموشی سے سمجھ کر بولی تھیں۔

"پھر کیا کیا جائے؟" توصیف احمد کا انداز ایسا تھا جیسے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔

"صبر..... صبر سے کام لو اور اللہ پر بھروسا رکھو۔ اگر اللہ نے یہ جوڑی لکھی ہے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ساجدہ بیگم نے انہیں تسلی دی تھی اور اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔
"میں تو سوچ رہا تھا فوری شادی کردی جائے۔" توصیف احمد قدرے توقف سے بولے تھے۔
"زبردستی نہیں۔ اس سے بعد میں زیادہ مسئلے کھڑے ہو جائیں گے۔ اریبہ کبھی بھی یہاں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش نہیں کرے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ صبر سے اچھے وقت کا انتظار کرو اور ساتھ میں نرمی سے اریبہ کو سمجھانے کی کوشش کرو۔ ضرور سمجھ جائے گی۔ آخر سارہ بھی تو اسی گھر میں رہتی ہے۔ اس پر تو یاسمین کی باتوں کا اثر نہیں ہوتا۔" ساجدہ بیگم سمجھانے کے انداز میں بولے چلی گئیں۔ توصیف احمد خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے، پھر کہنے لگے۔
"بہرحال میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں بھابھی بیگم! اریبہ نے اگر آپ کے ساتھ بدتمیزی کی ہے تو۔"
"نہیں نہیں، کوئی بدتمیزی نہیں کی اور تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اریبہ جیسے تمہاری بچی ہے ویسے میری، مجھے اس کی کوئی بات بری نہیں لگی۔" ساجدہ بیگم نے بڑے ظرف کا مظاہرہ کیا تھا۔ توصیف احمد کے دل میں ان کا مقام مزید بڑھ گیا — بے اختیار ان کے ہاتھ تھام کر بولے۔
"بھابھی بیگم! میں اپنی بچیوں کی طرف سے بہت فکر مند ہوں۔"
"کیوں، کیوں فکر مند ہو۔ کیا بات پریشان کرتی ہے تمہیں؟" ساجدہ بیگم کچھ ٹھٹکی تھیں۔
"وہی یاسمین کی۔" وہ اسی قدر کہہ سکے تھے۔
"ہاں فکر کی بات تو ہے۔ بچیاں اب ماشاءاللہ بڑی ہو گئی ہیں۔ تم وہاں جاتے آتے ہو کہ نہیں۔" ساجدہ بیگم نے ان کی بات کو سوچتے ہوئے اچانک پوچھا تھا۔
"بہت کم مہینے میں ایک آدھ بار، وہ بھی یاسمین کو کھلتا ہے۔ اس کا بس نہیں چلتا کسی طرح میرا اس گھر میں داخلہ بند کروا دے۔" انہوں نے بتایا تو ساجدہ بیگم کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگیں۔
"تم یاسمین کی پرواہ مت کرو اور اپنے بچوں کے لیے وہاں زیادہ وقت گزارو اور یوں نہیں کہ گئے آئے۔ کچھ دن خالدہ کے پاس رہو اور کچھ دن وہاں۔ بیٹیوں کے سر پر باپ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ ماں کو اولاد کی سرے سے پرواہ ہی نہ ہو۔"
"آپ ٹھیک کہتی ہیں بھابھی بیگم! دعا کریں میری بیٹیاں عزت آبرو سے اپنے گھروں کی ہو جائیں۔" توصیف احمد بہت دل گرفتہ تھے۔
"اللہ بہتر کرے گا۔ تم پریشان مت ہو اور جیسا میں نے کہا ہے، ویسا کرو۔" ساجدہ بیگم نے انہیں تسلی دے کر کہا تو اثبات میں سرہلاتے ہوئے توصیف احمد کو اپنے دل پر پڑا بوجھ سرکتا محسوس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

چھٹی کا دن تھا اس لیے وہ دیر سے اٹھا تھا۔ بارہ بجنے والے تھے۔ اس نے اطمینان سے شاور لیا پھر کچن میں آگیا اور ابھی چولہے پر چائے کا پانی رکھا تھا کہ ڈور بیل بجنے لگی۔ اس نے پہلے چولہا جلایا پھر جا کر دروازہ کھولا تو سامنے پہلی منزل والے الیاس صاحب کھڑے تھے، جو اکثر چھٹی کے دن اس کے پاس آجایا کرتے تھے۔
"السلام علیکم۔ آیئے تشریف لایئے۔" اس نے سامنے سے ہٹ کر انہیں راستہ دیا تو وہ اندر آتے ہوئے بولے۔
"میاں! تم تو آتے نہیں، ہم ہی چلے آتے ہیں۔"
"کیا کروں انکل! میری روٹین تو آپ کو پتا ہی ہے۔ خیر، آپ بیٹھیں میں چائے لاتا ہوں۔" وہ انہیں لاؤنج میں

بٹھا کر خود کچن میں آگیا۔ جلدی جلدی دو کپ چائے بنائی پھر ان کے پاس آبیٹھا۔
"میاں! کب تک خود چائے بناتے رہو گے۔ اب چائے بنانے والی لے ہی آؤ۔" الیاس صاحب پہلے بھی کئی بار اس سے یہ بات کہہ چکے تھے۔ وہ جھینپ کر سر جھکا لیتا۔ ابھی بھی یہی ہوا۔
"کوئی مسئلہ ہے کیا؟" الیاس صاحب نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"مسئلہ!" وہ انہیں دیکھنے لگا۔ "نہیں انکل! کوئی مسئلہ نہیں۔ بس میں پہلے اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتا ہوں۔"
"تعلیم بھی مکمل ہو جائے گی۔ بلکہ پھر تمہارے لیے آسانی ہو جائے گی۔ بیوی گھر سنبھالے گی تم آرام سے پڑھ لینا۔" الیاس صاحب نے کہا تو اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا کیونکہ وہ ان سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آنے والی کے بھی کچھ خواب ہوں گے۔
"میں غلط نہیں کہہ رہا بیٹا! گھر کے سو بکھیڑے ہوتے ہیں، تمہیں ان میں بھی دماغ کھپانا پڑتا ہوگا۔ اس کے بعد پڑھائی کیا خاک ہوتی ہوگی۔ بیوی کے آنے سے کم از کم تمہیں گھر کے بکھیڑوں سے تو نجات مل جائے گی۔" الیاس صاحب شاید آج اسے قائل کرنے کا سوچ کر آئے تھے۔
"جی!" اس نے یونہی سر ہلا دیا۔
"پھر میں تمہاری آنٹی سے کہوں۔ کوئی لڑکی دیکھیں تمہارے لیے؟" الیاس صاحب یوں آرام سے بیٹھ گئے جیسے ابھی سارے معاملات طے کر کے ہی اٹھیں گے۔
"نہیں انکل!" وہ بوکھلا گیا۔ "ابھی نہیں۔ میرا مطلب ہے میری انگیجمنٹ ہو چکی ہے۔"
"اچھا...!" الیاس صاحب نہ صرف مایوس ہوئے بلکہ ان کا انداز بھی بدل گیا تھا۔
"پھر شادی کیوں نہیں کرتے!"
"کرلوں گا۔" اس نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑے۔
ہاں جلدی کرلو تو اچھا ہے۔ خوامخواہ لوگ باتیں بناتے ہیں۔"
"جی...!" وہ حیران ہوا۔ "میں سمجھا نہیں۔"
"میاں! چھڑے چھانٹ رہتے ہو۔ یہاں سب کے گھروں میں بہو بیٹیاں ہیں۔ کوئی بھی بات بنا سکتا ہے۔" الیاس صاحب کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے جبکہ وہ سناٹے میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ جب وہ چلے گئے تب سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔
یہ الیاس صاحب کیسی باتیں کر رہے تھے۔ میں صبح نکلتا ہوں تو پھر رات میں ہی واپس ہوتی ہے۔ مجھے یہ تک نہیں پتا کہ سامنے فلیٹ میں کون رہتا ہے۔ الیاس صاحب بھی خود ہی آجاتے ہیں۔ میں ان کے اصرار پر بھی کبھی ان کے گھر نہیں گیا پھر لوگ کیا باتیں بناتے ہیں اور کیوں؟ میں چھڑا چھانٹ ہوں یا میرا پورا کنبہ یہاں رہتا ہو، کسی کو اس سے کیا غرض... وہ سارا دن وقفے وقفے سے یہ ہی باتیں سوچتا اور کھولتا رہا تھا۔ پھر شام میں محض اپنا دھیان بٹانے کی خاطر باہر نکلا تھا۔
دن بھر حبس زدہ گرمی کے بعد اب ہوا چلنے لگی تھی۔ جب ہی وہ ٹہلتا ہوا بہت دور نکل آیا تھا اور ابھی جانے کہاں تک جاتا کہ بھوک سے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ تب جہاں تھا وہیں جو ریسٹورنٹ نظر آیا اس میں آجا بیٹھا اور کھانا آرڈر کر کے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال رہا تھا کہ کسی نے اسے پکارا تھا۔
"ہے شمشیر!" اس نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا تو وہ اس کا آفس کا ساتھی جاوید تھا اور اس کے ساتھ غالباً اس کی بیوی تھی جب ہی اس نے مسکرا کر ہاتھ ہلانے پر اکتفا کیا۔
"یہاں آجاؤ یار!" جاوید نے کہنے کے ساتھ ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا تو وہ اٹھ کر ان کی ٹیبل پر آگیا۔

”یہ میری وائف ہے فائزہ اور فائزہ! یہ میرے آفس کے ساتھی شمشیر علی ہیں۔“ جاوید نے تعارف کروا کر ساتھ اس سے پوچھا۔

”اکیلے آئے ہو......؟“

”ہوں......!“ اس نے اختصار سے کام لیا۔

”یہیں قریب رہتے ہو......؟“ جاوید نے پھر پوچھا تو وہ خود چونکا کہ کہاں آگیا ہے‘ پھر نفی میں سرہلا کر کہنے لگا۔

”نہیں میری رہائش نارتھ میں ہے۔ بس ٹہلتے ہوئے ادھر نکل آیا۔ اچانک بھوک نے ستایا تو یہاں آگیا۔“

”اچھا اچھا۔ ہم بھی نارتھ میں ہی ہوتے ہیں۔ لیکن اتنی دور تمہاری طرح ٹہلتے ہوئے نہیں آگئے۔“ جاوید نے کہا پھر معنی خیزی سے پوچھنے لگا۔ ”ویسے اتنی دور پیدل مارچ کس سلسلے میں؟“

”کسی سلسلے میں نہیں۔ اصل میں میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔ یعنی اس شہر میں میرا کوئی عزیز رشتے دار نہیں ہے۔ اس لیے چھٹی کے دن خاصا بور ہو جاتا ہوں۔ پھر آج ایک پڑوسی کی باتوں نے پریشان کردیا۔“ وہ آخری جملہ بلا ارادہ کہہ گیا تھا۔

”پڑوسی تو یار ہوتے ہی پریشان کرنے کے لیے ہیں۔ ویسے انہیں تم سے کیا شکایت ہے؟“

جاوید ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس نے ایک نظر فائزہ کو دیکھا جو ان کی گفتگو میں شریک نہیں تھی لیکن سن ضرور رہی تھی‘ جب ہی وہ ٹال گیا۔

”چھوڑو یار! کھانا شروع کرو۔ بھابھی آپ لیں ناں۔“ اس نے ڈش اٹھا کر فائزہ کے سامنے رکھی تو وہ شکریہ کے ساتھ کہنے لگی۔

”شاید آپ میری وجہ سے بات نہیں کرنا چاہ رہے۔ میں ایسا کرتی ہوں اپنے کان بند کرلیتی ہوں‘ آپ آرام سے بات کریں۔“ وہ کچھ نہیں بولا جاوید کو دیکھنے لگا تھا۔

”بتا دو یار! ورنہ خاتون مائنڈ کریں گی۔“ جاوید نے ہنس کر کہا تو اس سے پہلے کہ فائزہ احتجاج کرتی وہ شروع ہو گیا۔ الیاس صاحب کی تمام باتیں دہرا کر کہنے لگا۔

”میں وہاں دو سال سے رہ رہا ہوں۔ اس سے پہلے تو انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اب اچانک انہیں میرا اکیلا رہنا کھلنے لگا ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کیوں۔“

”کیونکہ آپ ان کی مجبوری سمجھ نہیں رہے۔“ فائزہ فوراً بولی تھی۔

”کون سی مجبوری؟“ وہ بالکل نہیں سمجھا اور فائزہ کے بجائے جاوید کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”کتنی بیٹیاں ہیں ان کی؟“ جاوید کی معنی خیز مسکراہٹ سے وہ سٹپٹا گیا۔

”مجھے کیا پتا۔“

”پتا کرو نا یار! اصل بات یہی ہے کہ تم کسی کو لفٹ نہیں کروا رہے۔ مانا کہ شریف آدمی ہو مگر کبھی کبھی شرافت بھی الزام بن جاتی ہے۔“

وہ جاوید کی بات سمجھ گیا تھا لیکن اس پر عمل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ کوئی دل پھینک قسم کا نوجوان نہیں تھا نہ ہی اسے تاک جھانک کی عادت تھی۔ اپنے فلیٹ کی بالکونی میں بھی وہ ضرورتاً جاتا تھا یا پھر رات کے اس پہر‘ جب ہر سُو سناٹا چھا جاتا۔ اس لیے جاوید کی بات پر اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ جلدی جلدی کھانا ختم کیا اور انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دے کر اٹھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگر سانسیں مہک جائیں

اگر آنکھیں چھلک جائیں
اگر خوابوں کی خواہش ہو
اگر پھولوں کی بارش ہو
اگر ہنستے ہوئے رونے کو جی چاہے اکیلے میں
اگر کوئی دیکھ کر تم کو کہیں کھو جائے میلے میں
اگر تم پوچھنے جاؤ کہ آخر کیا حقیقت ہے
اور اس کا یہ جواب آئے۔ مجھے تو تم سے نفرت ہے
سمجھ لینا محبت ہے
سمجھ لینا محبت ہے

اریبہ اپنے موبائل کی اسکرین پر نظریں جمائے کھو سی گئی تھی۔ جیسے رازی پر پہلی نظر پڑنے پر اس کا دل بے اختیار دھڑکتا تھا اس کے بعد اپنا رویہ تبدیل کرنے میں سراسر اس کے ارادے کو دخل ہوتا تھا۔ اسی طرح اس کا ایس ایم ایس دیکھتے ہوئے وہ پہلے کھو سی گئی تھی۔ دل بھی مدھم لے پر دھڑکنے لگا تھا لیکن پھر اچانک اس کے اندر ابال اٹھا تھا۔

نان سینس۔ اس نے موبائل تکیے پر پٹخ دیا تو سارہ اسے دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا؟“

”رازی کا میسج ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا‘ آخر وہ میرے پیچھے کیوں پڑا ہے۔“ وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں بولی تھی۔

”ظاہر ہے تم ان کی منگیتر ہو۔“ سارہ نے اطمینان سے کہا تھا۔

”شٹ اپ......!“ وہ سلگ کر بولی۔ ”خبردار جو مجھے اس کی منگیتر کہا تو۔“

”میرے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ جب رازی بھائی بضد ہیں۔ پتا ہے اس دن وہ کہہ رہے تھے کہ وہ صرف تمہارے میڈیکل کمپلیٹ ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ایک دن نہیں رکیں گے۔“ سارہ رازی کے پیغام قسطوں میں پہنچا رہی تھی۔

”اچھا!“ وہ استہزائیہ ہنسی پر سارہ کو دیکھ کر کہنے لگی۔ ”اور اگر اس دوران میرے لیے کوئی اچھا پرپوزل آگیا تو تمہارا کیا خیال ہے میں منع کردوں گی؟“

”یہ تو مجھے نہیں پتا لیکن یہ میں کہہ سکتی ہوں کہ تمہارے لیے پرپوزل آ ہی نہیں سکتا کیونکہ سب جانتے ہیں کہ تم انگیج ہو۔“ سارہ اس کے انگیج ہونے کو جتانے سے باز نہیں آئی تھی۔

”انگیجڈ تھی۔“ وہ زور دے کر کہنے لگی۔ ”اب سب کو پتا چل گیا ہے کہ وہ منگنی ٹوٹ چکی ہے۔ ڈیڈی اس دن اسی سلسلے میں آئے تھے۔ بہرحال مجھے اب خاندان میں شادی کرنا ہی نہیں ہے اور تمہیں بھی میں یہی مشورہ دوں گی۔“

”شکریہ‘ جب وقت آئے گا تو تمہارے مشورے پر غور کروں گی۔“ سارہ نے کسی بحث سے بچنے کی خاطر مسکرا کر کہا تب ہی دروازے پر پہلے دستک ہوئی پھر سمیر اندر جھانک کر پوچھنے لگا۔

”میں آسکتا ہوں؟“

”ضرور آؤ۔“ اریبہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سمیر اندر آگیا تب اس سے پوچھنے لگی۔ ”کیا میں نے تمہیں یہاں آنے سے منع کیا تھا؟“

"نہیں تو؟" سمیر قدرے سٹپٹا کر سارہ کو دیکھنے لگا۔
"اسے کیا دیکھ رہے ہو' میں بات کر رہی ہوں تم سے' بتاؤ میں نے کیا غلط کہا تھا۔" وہ باقاعدہ کلاس لینے کھڑی ہو گئی۔ "میں بڑی ہوں تم دونوں سے۔ اگر میں کوئی اچھی بات سمجھانے کی کوشش کروں تو اسے سمجھو نہ کہ احتجاج کرنے لگو۔ انتہائی غلط حرکت کی تم دونوں نے' باہر ملنے کی کیا ضرورت تھی۔"
"وہ ہم تو..... میرا مطلب ہے ہم باقاعدہ پلاننگ کر کے نہیں گئے تھے۔ اتفاقاً" راستے میں ملاقات ہو گئی تو پزا ہٹ چلے گئے اور ہم وہاں بیٹھے بھی نہیں۔ پزا لے کر چلے آئے۔ کیوں سارہ! تم نے گھر آ کر کھایا تھا ناں؟" سمیر بوکھلا کر بولتے ہوئے آخر میں سارہ کو مدد طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ بے چارہ بری طرح پھنس گیا تھا۔
"مجھے پتا ہے۔ میرے سامنے ہی کھایا تھا اس نے۔ فالتو پیسے آ گئے ہیں تمہارے پاس؟ ابھی کمانے والے تو ہوئے نہیں' کہاں سے لیے تھے پیسے۔" وہ کسی طرح بخشنے پر تیار نہیں تھی۔ اب سارہ نے مداخلت ضروری سمجھی۔
"اریبہ! یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔ پیسے کہاں سے آئے..... کمانے والے....."
"تمہارا بولنا ضروری ہے کیا؟" اس نے سارہ کو ٹوکا تو سمیر فوراً" اس کی طرف ہو کر کہنے لگا۔
"ہاں' تمہیں کیا ضرورت ہے بولنے کی ہم بڑے بات کر رہے ہیں ناں۔ میں بتاتا ہوں۔"
"رہنے دو۔" وہ سر جھٹک کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ پھر پلٹ کر سارہ سے بولی تھی۔ "سارہ! میں اپنی دوست کے پاس جا رہی ہوں اور وہاں سے ہم کہیں اور جائیں گے۔ مما کو بتا دینا۔"
"کہیں اور کہاں؟" سارہ نے پوچھا۔
"یہ میں واپس آ کر بتاؤں گی۔" وہ کہہ کر باہر نکل گئی۔ سمیر نے شکر کے انداز میں ہاتھ اٹھائے۔ پھر بیڈ پر گرتے ہوئے بولا تھا۔
"کیا چیز بنائی ہے اللہ نے۔" سارہ ہنسنے لگی۔
"ایمان سے صرف تمہاری خاطر آیا ہوں ورنہ اس دن تو میں نے قسم کھائی تھی کہ کبھی تمہاری گلی سے بھی نہیں گزروں گا' خیر چھوڑو یہ بتاؤ کیسی ہو۔ کچھ احساس وحساس جاگا کہ نہیں۔" سمیر سر جھٹک کر اپنے مطلب کی بات پر آ گیا۔
"کیسا احساس؟" وہ فوراً" نہیں سمجھی تھی۔
"محبت کا؟"
"تم صرف احساس کی بات کرتے ہو۔ میں تو سراپا محبت ہوں۔ اللہ نے میرا خمیر ہی محبت کی مٹی سے اٹھایا ہے۔"
"اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن میں اپنی بات کر رہا ہوں۔ میرے لیے تمہارے احساسات کیا ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں۔" وہ اپنی محبت کا اعتراف کرنے کے بعد سے بے چین اور بے صبرا ہو رہا تھا۔ سارہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کیا سننا چاہتا ہے لیکن اسے تنگ کرنے میں مزہ آ رہا تھا' تب ہی سادگی کا لبادہ اوڑھ کر بولی۔
"پتا نہیں سمیر! میری سمجھ میں تمہاری باتیں نہیں آتیں۔"
"کیا مشکل ہے۔ چلو سیدھے سادے طریقے سے پوچھ لیتا ہوں۔ کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟" سمیر نے بیڈ پر اچھل کر اپنا رخ اس کی طرف موڑ لیا اور براہ راست اسے دیکھنے لگا تھا۔
"کرتی ہوں۔ سب سے کرتی ہوں۔" وہ مزید معصوم بن گئی۔
"یہ سب کہاں سے آ گئے بیچ میں۔" وہ بری طرح جھنجلا تھا۔ "میری بات کرو' صرف میری اور اپنی۔"

"گھبرا کیوں رہے ہو۔ آرام سے بات کرو نا۔" اس نے خود کو خائف ظاہر کیا۔
"آرام سے۔" سمیر نے ہاہ کی آواز نکال کر خود کو ریلیکس کیا اور لہجہ بھی ملائم بنا لیا۔
"ہاں اب بتاؤ مجھ سے شادی کرو گی یا سب سے؟"
"تم کیا کہہ رہے ہو۔ شادی تو ایک سے ہی ہوتی ہے۔"
"شکر ہے یہ تو تم نے تسلیم کیا کہ شادی ایک سے ہوتی ہے۔"
"اب میں اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں۔" اس نے روٹھے لہجے میں کہا۔
"پتا ہے کتنی عقل مند ہو۔ خیر اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے میری بات کا جواب دو۔ مجھ سے شادی کرو گی؟" سمیر کے انداز میں حد درجہ عجلت تھی جیسے ابھی وہ ہامی بھرے گی اور ابھی وہ بینڈ باجے بجوا دے گا۔
"پہلے تو اریبہ کی شادی ہو گی ناں۔" اس نے پھر معصومیت سے کہا۔ سمیر کا ضبط جواب دے گیا۔
"ہاں میری ماں! پہلے اریبہ کی ہو گی۔ پھر خاندان بھر میں جتنے بھی کنوارے ہیں ان سب کے بینڈ بجیں گے' آخر میں ایک میں رہ جاؤں گا۔ اف! کیسی کوڑھ مغز لڑکی پر میرا دل آیا ہے۔ اف۔" وہ اپنے بال نوچتا ہوا چلا گیا اور اس کے پیچھے سارہ ہنستے ہنستے دہری ہو گئی تھی۔



اریبہ کے دوستوں میں لڑکے لڑکیاں سب ہی شامل تھے اور وہ سب اس کے کالج فیلو تھے۔ یعنی اسے فالتو دوستوں کا شوق نہیں تھا اور نہ ہی خواہ مخواہ کسی سے راہ و رسم بڑھاتی تھی۔ کالج فیلوز کے ساتھ کیونکہ مستقل رابطہ رہتا تھا اس لیے وہ ان سے کٹ کر بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ البتہ اس کی خاص دوستوں میں صرف عروسہ' مہک اور جمال تھے۔ جن کے ساتھ وہ کالج کے علاوہ بھی رابطہ میں رہتی تھی۔ وہ اکثر اپنی شاپنگ عروسہ اور مہک کے ساتھ کرتی تھی اور اگر اس کی گاڑی کوئی مسئلہ کرتی تو وہ جمال کی خدمات حاصل کرتی تھی۔ البتہ لائبریری میں چاروں ایک ساتھ پڑھائی کرتے اور ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے تھے۔ اس وقت آخری پیپر دے کر وہ چاروں لان میں کھڑے ایک دوسرے سے چھٹیوں کا پروگرام پوچھ رہے تھے۔
"میں اسلام آباد جاؤں گی اپنی مما کے پاس اور تم؟" عروسہ اپنا پروگرام بتا کر ان تینوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
"میرا کہیں جانے کا باقاعدہ کوئی پروگرام نہیں ہے' ہو سکتا ہے اچانک بن جائے تو پھر لاہور جاؤں گی خالہ کے پاس۔" مہک نے بتایا..... جمال نے لمبی آہ بھری پھر کہنے لگا۔
"تم لڑکیوں کے مزے ہوتے ہیں۔ آرام سے چچا ماموں کے ہاں رہ آتی ہو۔ ہم لڑکوں کو تو چاچیاں' ممانیاں برداشت ہی نہیں کرتیں۔" وہ تینوں بے ساختہ ہنسی تھیں۔
"تم ان کی بیٹیوں کو جو تاڑتے ہو۔" عروسہ ہنسی روک کر بولی تھی۔
"توبہ کرو۔" جمال نے برا سا منہ بنایا پھر اریبہ سے پوچھنے لگا۔
"تمہارا کیا پروگرام ہے۔ کہاں جاؤ گی؟"
"کہیں نہیں۔ یہیں اپنے شہر میں گھوم پھر لوں گی' ویسے بھی کوئی اتنی لمبی چھٹیاں نہیں ہیں۔ دو چار دن تو آرام کرنے اور خود کو فریش کرنے میں ہی نکل جائیں گے۔" اس نے کہا تو جمال فوراً" تائید کرتے ہوئے بولا۔
"یہ تو ہے۔ میں تو آج لمبی تان کر سوؤں گا۔"
"ضرور سونا لیکن ابھی تمہیں میرا ایک کام کرنا ہے بلکہ میرے ساتھ چلنا ہے۔" اریبہ کہہ کر فوراً" اپنا پرس

چیک کرنے لگی۔

"کہاں ۔۔۔؟" جمال سوالیہ نشان بنا کھڑا تھا اور وہ پرس میں ہاتھ مار رہی تھی پھر اطمینان سے پرس بغل میں دبا کر بولی۔

"مجھے بائیک لینا ہے۔"

"لے لینا یار! لیکن ابھی نہیں۔ ابھی میں بہت تھک گیا ہوں۔ یقین کرو رات بھر نہیں سویا بہت نیند آرہی ہے۔"

جمال نے دونوں بازو پھیلا کر یہ اشارہ بھی دیا کہ اس کا بدن ٹوٹ رہا ہے لیکن وہ کہاں ماننے والی تھی۔ باقاعدہ پلان کر کے آئی تھی۔ مزید عروسہ اور مہک نے بھی اس کا ساتھ دیا اور جمال کو اس کے ساتھ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ایک بات بتاؤ۔" جب وہ بائیک کی ادائیگی کر چکی تب جمال اس سے پوچھنے لگا۔ "تمہیں بائیک لینے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟"

"کسی نے نہیں میں نے ضرورت محسوس کی' لے لی۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"کیوں' تمہارے پاس گاڑی بھی تو ہے۔ اس سے تمہاری ضرورت پوری نہیں ہوتی۔"

"نہیں ۔۔۔!" وہ جمال کو دیکھ کر اس انداز سے ہنسی جیسے بیکار ہے مجھے سمجھانے کی کوشش مت کرنا۔

"اوکے میں چلتا ہوں۔" جمال نے اس کا اشارہ سمجھ کر کندھے اچکائے اور اپنی بائیک اسٹارٹ کر کے بھگا لے گیا اور اس نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کو چند لمحے سوچا پھر بائیک اسٹارٹ کی اور تقریباً" بیس منٹ میں رازی کے آفس پہنچ گئی تھی۔

"تم!" رازی اسے دیکھ کر بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ "زہے نصیب' آؤ' بیٹھو۔"

"تھینک یو۔" وہ آرام سے اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور چاروں طرف گردن گھما کر آفس کا جائزہ لینے لگی۔

"ابھی میں نے آفس سیٹ نہیں کیا۔ نئے آفس میں کام ہو رہا ہے۔ جلدی وہاں شفٹ ہو جاؤں گا۔" رازی نے اس کے تبصرہ کرنے سے پہلے ہی وضاحت کر دی۔

"یہ بھی اتنا برا نہیں ہے۔" وہ سرسری انداز میں کمر کر سیدھی ہو بیٹھی۔

"اصل میں جگہ کم ہے۔ مزید اسٹاف کے لیے گنجائش بالکل نہیں ہے۔ خیر تم بتاؤ کیا پیو گی یا اگر لنچ کرو تو۔" رازی انٹرکام کا ریسیور ہاتھ میں لے کر اسے دیکھنے لگا۔

"نہیں کچھ نہیں میں تو بس یونہی آئی تھی ۔۔۔ یہاں سے گزر رہی تھی سوچا تم سے مل لوں۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ رازی الجھ گیا۔ اس کا رویہ بالکل سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"رات سارہ نے بتایا تم گھر آئے تھے؟" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"ہاں' تمہارے ایگزام ہو رہے تھے۔ ہو گئے؟" رازی کو وہ معمہ لگنے لگی تھی۔

"آج ہی فارغ ہوئی ہوں۔ سوچا پہلے تمہارا حساب بے باق کر دوں۔" وہ کھڑکی سے باہر کا جائزہ لینے کے بعد اس کی طرف پلٹ کر بولی۔

"میرا حساب!" وہ فوراً" سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں۔ یہاں آکر دیکھو۔ باہر ٹریفک کے ہجوم میں۔" اس نے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا پھر الوداعی مسکراہٹ اس کی نذر کر کے آفس سے نکل گئی۔ رازی ابھی بھی کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا اور سمجھنے کے لیے ہی وہ کھڑکی کے قریب آ

اپنے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ اسی کی بلڈنگ سے نکلتی نظر آئی اور پھر ایک بائیک کو زوردار کک مار کر آناً" فاناً" نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

ابلاال رازی کا دماغ گھوم گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"سارہ' سارہ!" وہ بائیک اسٹینڈ پر کھڑی کر کے ہلا چلا کر سارہ کو پکارنے لگی۔ تیسری آواز پر سارہ بھاگتی ہوئی آئی لیکن بائیک دیکھتے ہی فاصلے پر رک گئی تھی۔

"کیا ہوا' یہاں آؤ ناں۔" اس نے کہا۔ سارہ سست روی سے قریب آگئی اور تاسف سے بولی۔

"تو تم نے اپنی ضد پوری کر لی۔"

"جو بھی سمجھو' یہ بتاؤ کیسی ہے' بیٹھو گی؟" وہ خوش ہو رہی تھی۔

"نا بابا ۔۔۔!" سارہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"کیوں؟ سمیر کے ساتھ تو بیٹھ جاتی ہو۔" اس نے فوراً" جتایا۔ سارہ کو ناگوار تو گزرا لیکن خاموش رہی۔

"سوری' تمہیں شاید برا لگا اور دیکھو رازی کیا کہتا ہے۔ میں پہلے اسی کے پاس گئی تھی۔ اس کے آفس۔" اس نے بتایا پھر مسکرا کر سارہ کو دیکھا وہ پریشان ہو گئی تھی۔

"تم رازی بھائی کے پاس گئی تھیں بائیک لے کر؟"

"ہاں' یہ بتانے کہ مجھے اس کی ناراضی کی کوئی پروا نہیں ہے۔" اس نے سارہ کی پریشانی قصداً" نظرانداز کر دی اور بے نیازی سے کہتے ہوئے اندر کی طرف چل پڑی تھی۔

"رازی بھائی نے کچھ نہیں کہا؟" سارہ نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

"تم اتنا ڈرتی کیوں ہو۔ اول تو رازی کو ہمارے کسی معاملے میں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ پھر بھی اگر کچھ کہے تو پروا مت کرو۔ بلکہ صاف کہہ دینا کہ اپنے کام سے کام رکھے۔" اس نے سارہ کی بات کا جواب ہی نہیں دیا۔ الٹا اسے سمجھا کر تیز قدموں سے اپنے کمرے میں آگئی۔ اب بھوک بھی لگ رہی تھی۔ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ڈائننگ روم میں آگئی اور سب کو دیکھ کر حیرت سے بولی۔

"ارے آپ لوگوں نے ابھی کھانا نہیں کھایا۔"

"اس سے یہ مت سمجھنا کہ ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔" سارہ نے فوراً" کہا اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ جلدی جلدی سب کی پلیٹوں میں سالن نکالا پھر اپنی پلیٹ میں نکالتے ہی کھانا شروع ہو گئی۔

"آج تمہیں دیر کیوں ہو گئی؟" یاسمین نے سرسری انداز میں اس سے پوچھا۔

"میں بائیک لینے چلی گئی تھی مما! مل گئی۔" اس نے بتایا تو حماد خوش ہو کر پوچھنے لگا۔

"میرے لیے آپی؟"

"شٹ اپ! اور خبردار جو تم نے بائیک کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو۔ ابھی تمہاری عمر بائیک چلانے کی نہیں ہے۔" اس نے فوراً" حماد کو تنبیہہ کر دی۔

"لیکن آپی! کالج میں لڑکے بائیک پر آتے ہیں۔" حماد نے بڑی آس سے اسے دیکھا تھا۔

"دوسرے لڑکے کیا کرتے ہیں کیا نہیں' ہمیں اس سے کیا غرض' تمہیں بہرحال بائیک نہیں چلانا' سمجھے تم؟" وہ اس کے معاملے میں بہت سخت تھی۔

"نہیں چلائے گا بیٹا! نہیں چلائے گا۔ تم غصہ مت کرو۔" یاسمین نے نرمی سے اسے ٹوکا۔

"میں غصہ نہیں کر رہی مما! سمجھا رہی ہوں اسے۔" اس نے آخری نوالہ لے کر پانی کا گلاس اٹھالیا اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے اٹھتے ہوئے بولی۔

"میں سونے جا رہی ہوں اور خود ہی اٹھوں گی۔ تم سن لو سارہ! کمرے میں آکر کوئی شور شرابا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"فکر مت کرو، میں آؤں گی ہی نہیں۔" سارہ جل کر بولی تھی اور اس کے جاتے ہی حماد کو دیکھنے لگی جو منہ پھلائے بیٹھا تھا۔

"کوئی فائدہ نہیں منہ پھلانے کا، کچھ بھی کر لو اریبہ بائیک نہیں دے گی۔ چلو کھانا کھاؤ۔" اس نے حماد کو نرمی سے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"آپی ابھی تک مجھے بچہ سمجھتی ہیں، میں بچہ نہیں ہوں۔ کالج میں پہنچ گیا ہوں، اور وہاں سب لڑکے بائیک پر آتے ہیں۔" حماد روٹھے لہجے میں بولا تھا۔

"مجھے پتا ہے۔ تم ڈیڈی سے کہنا، وہ تمہیں بائیک دلا دیں گے۔" اس نے کہا تو یاسمین نخوت سے بولی تھی۔

"ہونہہ ڈیڈی دلا دیں گے۔ اریبہ کو تو جیسے انہوں نے دلا دی ہے۔"

"اریبہ لڑکی ہے مما! اس کے بائیک چلانے کو کوئی بھی پسند نہیں کر رہا۔" اس نے زور دے کر کہا۔ یاسمین نے صرف سر جھٹکا، بولی کچھ نہیں۔ اس کا ذہن اس وقت کسی اور ہی بات میں الجھا تھا۔

"تم ڈیڈی سے میری سفارش کرو گی؟" حماد نے اس سے پوچھا۔

"بالکل کروں گی۔ پُر زور سفارش کروں گی، اب کھانا کھاؤ۔" اس نے پھر حماد کی توجہ کھانے کی طرف دلائی اور خود بھی کھانے لگی۔



شام میں رازی گھر لوٹا تو بہت چپ چپ سا تھا۔ ساجدہ بیگم کے پاس کچھ دیر بیٹھا پھر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور ثنا تو اسی ٹوہ میں رہتی تھی کہ کوئی بات ہو اور وہ بڑھا چڑھا کر ساجدہ بیگم کے سامنے بیان کر کے انہیں سوچنے پر مجبور کرے۔ کیونکہ اس کے دل میں بھی گرہ پڑ چکی تھی۔ جس طرح اریبہ توصیف احمد کی دوسری شادی کا الزام ساجدہ بیگم پر رکھ کر انہیں معاف کرنے پر تیار نہیں تھی اسی طرح ثنا اریبہ کے انگوٹھی واپس کرنے اور ساجدہ بیگم کے ساتھ بدتمیزی کی حد تک تلخ کلامی کرنے کی وجہ سے اس سے صرف متنفر ہی نہیں بلکہ اس کے خلاف دل میں حد درجہ بغض رکھتی تھی اور وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ رازی کی شادی اریبہ سے ہو۔ لیکن ساجدہ بیگم کے سامنے اس کی ایک نہیں چلتی تھی۔ کتنی بار وہ ان سے ڈانٹ سن چکی تھی پھر بھی باز نہیں آتی تھی۔ اس وقت بھی اسے موقع ہاتھ آگیا تھا۔

"کیوں آپ بھائی کی دشمن بنی ہوئی ہیں۔ دیکھ نہیں رہیں، کتنے مرجھا کر رہ گئے ہیں۔ ضرور اریبہ نے کچھ کہا ہوگا، جب ہی ان کا چہرہ اترا ہوا ہے۔"

"وہ اریبہ کی باتوں کا برا نہیں مانتا۔" ساجدہ بیگم گو کہ خود متوحش بیٹھی تھیں لیکن ثنا کو سکون سے جواب دیا تھا۔

"برا نہ مانتے تو اس طرح منہ لٹکائے ہوئے آتے؟" ثنا مزید سلگ کر بولی تھی۔

"آفس کا کوئی مسئلہ ہوگا۔ تم نے اپنے آپ کیسے سمجھ لیا کہ اریبہ نے ہی کچھ کہا ہوگا۔ ابھی اس نے تو اریبہ کا نام بھی نہیں لیا۔" ساجدہ بیگم نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"وہ نام لیں گے تب ہی آپ سمجھیں گی۔ ایسا نہیں ہے امی! آپ سب سمجھتی ہیں اور جان بوجھ کر بھائی کو وہاں بھارہی ہیں۔" ثنا نے اب روٹھا لہجہ اختیار کیا پھر اسی انداز میں بڑبڑانے لگی۔ "بے چارے رازی بھائی۔ اتنے برس پردیس میں اکیلے رہے اور یہاں آکر بھی اکیلے ہی ہیں۔"

"اکیلا کیوں ہے، ماشاء اللہ سب ہیں۔" ساجدہ بیگم نے اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے ٹوکا۔

"سب میں وہ کہاں مل بیٹھتے ہیں۔ ابھی بھی دیکھیں اپنے کمرے میں بند پڑے ہیں۔" ثنا ڈرڈر کر ہی سہی بات بڑھائے چلی جا رہی تھی۔

"آخر ان باتوں سے تمہارا مقصد کیا ہے۔" ساجدہ بیگم زچ ہو گئیں۔

"میں اپنے بھائی کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ میرے دل میں ان کے لیے کتنے ارمان ہیں۔ ان کی شادی کا ارمان۔ ان کے بچے کھلانے کا شوق اور میں بھابھی کے ناز نخرے بھی اٹھانا چاہتی ہوں اور یہ کوئی انوکھے ارمان نہیں ہیں ساری بہنوں کو یہی شوق ہوتا ہے۔" وہ پھر روٹھے انداز میں بولتی چلی گئی۔

"تو پریشان کیوں ہوتی ہو اللہ تمہارے سارے شوق پورے کرے گا۔" ساجدہ بیگم نرم پڑ گئیں۔

"پتا نہیں کب پورے کرے گا۔" وہ سر جھٹک کر اٹھنے لگی تھی کہ بلال آگیا اور ساجدہ بیگم کے پاس بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"امی میں امینہ پھوپھو کی طرف چلا گیا تھا۔ بہت سلام کہہ رہی تھیں آپ کو۔"

"وعلیکم سلام، کیسی ہے امینہ اور بچے۔" ساجدہ بیگم پوری طرح بلال کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"ٹھیک ہیں۔ رازی بھائی کی شادی کا پوچھ رہی تھیں کہ کب تک کرنے کا ارادہ ہے۔ بلال نے کہا تو ثنا کو پھر موقع مل گیا۔

"ایک امینہ پھوپھو کیا سب پوچھتے ہیں۔"

"سب کو یہ بھی پتا ہے کہ اریبہ ڈاکٹری پڑھ رہی ہے۔ جب پڑھ لے گی تو شادی بھی ہو جائے گی۔" ساجدہ بیگم آرام سے بولی تھیں۔

"اور سب کو یہ بھی پتا ہے امی کہ اریبہ منگنی توڑ چکی ہے۔ اسی لیے تو سب پوچھتے ہیں۔" ثنا کے اشارے پر بلال نے کہا تھا۔

"اریبہ نادان ہے۔ بڑوں میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی اور نہ ہوگی۔ ان شاء اللہ اریبہ ہی اس گھر میں دلہن بن کر آئے گی۔ سب دیکھیں گے توصیف تو ابھی شادی کرنے کو کہہ رہے تھے میں نے ہی روک دیا کہ پہلے اریبہ پڑھ لے۔" ساجدہ بیگم بہت ضبط سے بول رہی تھیں پھر بھی ان کی آواز سے غصہ ظاہر ہو رہا تھا۔

"لیجیے خوامخواہ آپ نے بات آگے بڑھا دی اگر توصیف چچا شادی کا کہہ رہے تھے تو آپ کو فوراً "ہاں" بھر لینا چاہیے تھی۔ قصہ ہی ختم ہو جاتا۔ سب کو جواب تو ہمیں ہی دینا پڑتا ہے ناں آپ سے تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔" بلال بہری موقع کھونے پر جھنجلا گیا تھا۔

"تم سے کیا کہا جاتا ہے بس شادی ہی کا پوچھتے ہیں ناں کہہ دیا کرو جب اللہ کو منظور ہوگا۔" ساجدہ بیگم نے کہا پھر موضوع ختم کرنے کی غرض سے ثنا سے بولیں۔

"جاؤ رازی کو دیکھو۔ بلکہ کھانے کا پوچھو اس سے۔"

"پوچھنا کیا ہے لگا دیتی ہوں۔ بلال تم بلاؤ بھائی کو۔" ثناء کہتے ہوئے اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔



وہ نیند میں بے چین اور شاید پریشان بھی ہو رہا تھا۔ پھر اچانک اس کی آنکھ کھل گئی تو اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا

محسوس ہوا۔ سانس بھی سینے میں اٹک رہی تھی۔ کتنی دیر وہ ساکت لیٹا نیم اندھیرے میں چھت کو گھورتا رہا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا بلکہ سمجھ کر ہی خائف تھا۔ بہت واضح خواب تھا۔ اس کی اماں زاروقطار رو رہی تھیں اور اس کا دامن پکڑ کر تاجور، تاجور کہے جا رہی تھیں۔ گویا منوں مٹی تلے سوئی اماں بھی تاجور کے لیے پریشان تھیں اور گو کہ وہ اس خواب کو بھی نہیں جھٹلا سکتا تھا لیکن اس سے آگے حقیقت سوچ کر ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ کہیں روز محشر اماں نے اس کا دامن پکڑ لیا تو۔

"میرے خدا!" اس کا پورا وجود پسینے میں بھیگ رہا تھا جبکہ زبان خشک اور حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ انتہائی بے بسی سے اس نے ادھر ادھر نظریں گھمائیں پھر بمشکل اٹھ کر کچن تک گیا۔ نل سے گلاس بھر کر پانی پیا پھر بالکونی میں نکل آیا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ پوری کائنات خاموشی کی دبیز چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ اس کے چہرے کو چھو کر گزرتی ٹھنڈی ہوا بھی جیسے احتیاط کا دامن تھامے ہوئی تھی۔ لیکن اس کا ذہن کچھ بھی سوچنے سے قاصر تھا بس ایک تاجور کا خیال کہ وہ اسے کیسے یہاں لے آئے اور لے بھی آئے تو کس کے پاس چھوڑے۔

اس سلسلے میں اس نے آفس میں ایک دو لوگوں سے ذکر کیا تھا کہ اسے کل وقتی بوڑھی ملازمہ کی ضرورت ہے اور جب بہن کا بھی بتایا تو سب نے الٹا اسے ہی سمجھایا تھا کہ کسی پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ پھر ایسے ایسے واقعات سنائے تھے کہ وہ خائف ہو گیا تھا۔ ملازمہ کا خیال تو چھوڑ دیا لیکن تاجور کے لیے اس کی فکریں کم نہیں ہوئی تھیں اور اب تو اماں نے بھی جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا اسی وقت اُڑ کر بہن کے پاس پہنچ جائے جو جانے کس حال میں تھی کہ اماں کی روح بھی تڑپ گئی تھی۔

"کیا کروں؟" سوچ سوچ کر اس کا ذہن چٹخنے لگا تھا اور ادھر فجر کی اذانیں بھی شروع ہو گئیں۔ گیٹ پر اونگھتا چوکیدار اللہ اکبر کا نعرہ لگاتا اٹھا تب وہ بھی اندر آ گیا۔ پہلے دھیمی آنچ پر چائے کا پانی رکھا پھر وضو کر کے لاؤنج میں ہی جاء نماز بچھالی۔ نماز سے دل کو سکون ملا تھا پھر اس نے سورہ یاسین تلاوت کر کے اماں کی روح کو ثواب پہنچایا اس کے بعد چائے لے کر کمرے میں آیا تو خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ گو کہ ذہن پر ابھی بھی تاجور سوار تھی لیکن اب وہ سکون سے سوچ رہا تھا تب ہی اچانک ایک راستہ نظر آیا تھا۔ اس نے جلدی جلدی چائے ختم کی پھر موبائل اٹھا کر ابا کو فون کر ڈالا۔

"السلام علیکم ابا!" ابا کی ہیلو کے جواب میں اس نے سلام کیا تو وہ جواب کے ساتھ پوچھنے لگے۔

"آج سویرے سویرے میں کیسے یاد آ گیا؟"

"ایک بات کہنا ہے ابا!" وہ ان کی بات ان سنی کر گیا۔

"ہاں بول۔" ابا کے نزدیک اس کی اور تاجور کی شاید کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

"وہ..... میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے فوراً کہہ دیا۔ ادھر ابا اچھل پڑے۔

"ہائیں شادی؟ کوئی لڑکی پھنسالی ہے کیا۔ پھر مجھ سے کیوں کہہ رہا ہے۔ جا کر لے۔"

"ایسے کیسے کر لوں۔" وہ جھنجلا گیا "اور یہاں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ شادی وہیں گاؤں میں کروں گا۔ آپ جا کر بات کر لیں۔"

"کس سے؟" ابا اب ڈھیلے پڑے تھے۔

"تاباں سے۔ میرا مطلب ہے تاباں کے ابا سے بات کر لیں اور ان سے یہ بھی کہہ دیجیے گا کہ مجھے جلدی شادی کرنا ہے۔" اس نے وضاحت کر کے جلدی پر زور دیا تھا۔

"پہلے بہن کا تو خیال کر، وہ بھی جوان ہو گئی ہے۔" ابا نے احساس دلانے کی کوشش کی۔

"اس کا خیال ہے ابا! لیکن آپ نہیں سمجھیں گے۔ بس آپ سے جو کہا ہے وہ کریں، ٹھیک ہے ناں۔" اس نے ابا پھر باقی سب کی خیریت پوچھ کر فون بند کر دیا تھا۔



اجلال رازی کو اریبہ پر بہت غصہ آیا تھا۔ اس کا دل تو یہ چاہا تھا کہ اسی وقت اس کے پیچھے گھر تک جائے اور اس کے منہ پر اتنے طمانچے مارے کہ اس کا دماغ ٹھکانے آ جائے لیکن بہت مشکل سے اس نے خود پر ضبط کیا تھا کیونکہ ادھر کچھ دنوں سے وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچ رہا تھا بلکہ اس کا نفسیاتی تجزیہ بھی کر رہا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اسے ہر ایک سے ضد ہو گئی ہے، خود تلملائی ہوئی ہے اور سب کو طیش دلانے کی خاطر الٹے سیدھے کام کر رہی ہے۔

ایسا کر کے نہ جانے خود اسے تسکین ملتی تھی یا وہ خود بھی بے چین رہتی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ اسے یاسمین کی حمایت حاصل ہے اور ظاہر ہے یاسمین اس کی ماں تھی۔ وہ یا کوئی بھی اس کے سامنے یاسمین کی کسی بات یا حمایت کو غلط قرار نہیں دے سکتا تھا اس لیے اس نے اریبہ کو طریقے سے اور محبت سے راضی کرنے کا سوچا اور بجائے اسے روکنے ٹوکنے کے پہلے اس کا ساتھ دے گا۔ یاسمین کی طرح ہی اس کی حمایت کرے گا پھر جب وہ اس پر بھروسا کرنے لگے گی تب اسے سمجھانے کی کوشش کرے گا۔ کیونکہ ابھی تو وہ بات کرنے کی روادار بھی نہیں تھی۔ سمجھنے سمجھانے کا مرحلہ تو بعد کا تھا۔ جو بہرحال اسے طے کرنا تھا۔ کیونکہ اس کا دل کسی طرح بھی اس کی محبت سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ اریبہ لاکھ متنفر سہی اس کا دل ابھی بھی اس کے لیے دھڑکتا ہے۔ مزید جس بات کو وہ اپنے حق میں سمجھ رہا تھا، وہ اریبہ کی تعلیم تھی۔ یعنی یہ پہلے سے طے تھا کہ اریبہ کے میڈیکل کرنے کے بعد ہی اس کی شادی ہوگی۔ یوں بھی امریکہ سے لوٹتے ہوئے وہ یہ تصور لے کر نہیں آیا تھا کہ جاتے ہی اریبہ اس کی ہو جائے گی۔ اسے پتا تھا کہ ابھی اسے دو سال مزید

انتظار کرنا ہے۔ البتہ یہ اس نے نہیں سوچا تھا کہ آگے اسے کن امتحانوں سے گزرنا ہے۔ بہر حال اب وہ ہر امتحان کے لیے تیار تھا۔

اریبہ کے بائیک پر آنے پر اس کے اندر ابال اٹھنا فطری تھا۔ پھر دقتوں سے ہی سہی اس نے خود پر قابو پا لیا تھا اور اس وقت اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ تم بائیک چلانے میں ایکسپرٹ ہو۔"

"اب تو پتا چل گیا ناں۔" وہ گردن اکڑا کر بولی تھی۔

"ہاں لیکن تم نے یہ ہنڈا کیوں لی؟" وہ اس کے شوق میں دلچسپی ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ فوراً بول پڑی۔

"مجھے یہی پسند ہے۔"

"اچھی ہے اور کتنا اچھا ہو جو ہمارے ملک میں بھی لڑکیوں کا بائیک چلانا عام ہو جائے۔" اس نے کہا تو وہ مشکوک نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا' کچھ غلط کہہ دیا میں نے؟" وہ اندر سے ٹھٹکا تھا۔

"نہیں لیکن دل سے نہیں کہا۔" وہ سر جھٹک کر بولی تھی۔

"تمہارا دل رکھنے کی خاطر تو کہہ دیا ناں۔" وہ قصداً ہنس کر بولا تھا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے رازی! تم میری دل شکنی کرتے تب بھی مجھے فرق پڑنے والا نہیں تھا۔" اس کی کدورتیں اتنی آسانی سے دھلنے والی نہیں تھیں۔ جانے دل میں کتنا میل لیے کھڑی تھی۔ وہ اگر خود پر پہرے نہ بٹھا چکا ہوتا تو فوراً کوئی سخت بات کہہ جاتا مگر اب بات بدل گیا۔

"سارہ نظر نہیں آ رہی؟"

"اندر ہے' وہیں چلے جاؤ۔" وہ لاپروائی سے کہہ کر بائیک پر بیٹھ گئی۔

"تم بھی آؤ ناں' ساتھ چائے پئیں گے۔" اس نے فوراً پیشکش کی کہ کہیں وہ بائیک اسٹارٹ نہ کر دے۔

"سوری! میں باہر جا رہی ہوں۔" وہ بائیک اسٹارٹ کر کے گیٹ سے نکال لے گئی۔ رازی کو گو کہ اس کی طرف سے اسی رویے کی توقع تھی پھر بھی اسے مایوسی ہوئی تھی۔ کچھ دیر وہیں رک کر خود کو تسلی دیتا رہا کہ ابھی تو ابتدا ہے آگے جانے کیا کچھ ہوتا' پھر اندر آیا تو سارہ لاؤنج میں بیٹھی نظر آئی۔

"ہیلو!" اس کے متوجہ کرنے پر سارہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی' کچھ پریشان بھی ہو گئی تھی۔

"رازی بھائی آپ' آپ کب آئے؟"

"کیا بات ہے تم مجھے دیکھ کر پریشان کیوں ہو گئیں۔" وہ اس کا سوال نظر انداز کر گیا۔

"نہیں تو' آپ بیٹھیں' چائے لاؤں آپ کے لیے۔" سارہ کی بوکھلاہٹ اور پریشانی اس وجہ سے تھی کہ وہ اریبہ کی بائیک پر ناراض ہو گا اور وہ سمجھ ہی نہیں پایا۔

"چائے بھی پی لوں گا' جلدی کیا ہے' بیٹھو ابھی۔" وہ کہتے ہوئے بیٹھ گیا پھر سارہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی بٹھا دیا اور ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"یاسمین آنٹی گھر پر نہیں ہیں کیا؟"

"نہیں' فون پر بات کر رہی ہیں۔ بلاؤں مما کو؟" سارہ غالباً بھاگنا چاہ رہی تھی۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہو۔" رازی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

"آپ کو پتا تو ہے اور پلیز آپ مجھ سے کچھ مت کہیے گا۔ جو کہنا سننا ہو ڈائریکٹ اریبہ سے کہیں۔" وہ جلدی

سے کہہ گئی۔ رازی نے پہلے ذرا سے ہونٹ سکیڑے یوں جیسے اس کی پریشانی سمجھ گیا ہو پھر مسکرا کر بولا تھا۔

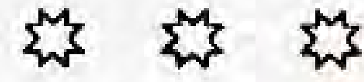
"اسی سے کہوں گا بلکہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیا مطلب۔ یعنی آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ رہے ہیں۔" سارہ نے مایوسی سے کہا۔

"شاید۔" وہ چند لمحے کے لیے کھو سا گیا تھا۔ پھر کہنے لگا۔ "اصل میں ہمارے بندھن کی ڈور میں بہت تناؤ آ گیا ہے۔ کسی ایک طرف سے بھی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی تو ٹوٹنے کا اندیشہ ہے اور چونکہ میں نہیں توڑنا چاہتا۔ اس لیے ڈھیل مجھے ہی دینا ہو گی۔"

"رازی بھائی آپ بہت اچھے ہیں۔" سارہ جذباتی ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی بھی تیرنے لگی تھی۔ وہ افسردگی سے مسکرایا پھر اس کا ہاتھ تھپک کر بولا۔

"جاؤ' چائے لے آؤ۔"



جب سے ساجدہ بیگم نے توصیف احمد سے یہ کہا تھا کہ انہیں زیادہ وقت اریبہ اور سارہ کو دینا چاہیے اور ان کی خاطر اس گھر میں قیام بھی ضرور کرنا چاہیے تب سے وہ خود بھی سنجیدگی سے سوچنے لگے تھے اور ایک دو بار وہاں قیام کے ارادے سے گئے بھی تھے لیکن وہاں یاسمین نے گھنٹہ بھر انہیں برداشت نہیں کیا تھا۔ بنا کسی بات کے ایسا ہنگامہ کھڑا کیا کہ وہ رک ہی نہیں سکے اور اس وقت انہوں نے سوچا تھا کہ وہ آئندہ اتنی دیر کے لیے بھی نہیں آئیں گے لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ جب تک وہ اریبہ اور سارہ کے فرض سے سبکدوش نہ ہو جاتے انہیں اس گھر کی فکر کرنا تھی اور یاسمین کو بھی برداشت کرنا تھا۔

گو کہ یاسمین کو تین لفظ طلاق کے کہہ کر گھر سے نکال باہر کرنا ان کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا لیکن جس طرح اریبہ کو اس نے مٹھی میں کیا ہوا تھا اس سے وہ خائف تھے کہ طلاق کے بعد تو وہ مکمل طور پر اریبہ کو اپنے رنگ میں رنگ لے گی۔ اس لیے وہ کوئی انتہائی قدم اٹھانے کا صرف سوچ کر رہ جاتے تھے۔

بہر حال اس وقت وہ بہت سوچ کر آئے تھے اور یہ غنیمت تھا کہ یاسمین موجود نہیں تھی' کسی تقریب میں گئی ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے سارہ ہی بھاگ کر ان کے پاس آئی تھی اور بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا۔

"ڈیڈی! آپ بہت اچھے وقت پر آئے ہیں۔ میں نے ابھی کیک بنایا ہے۔ چاکلیٹ۔ آپ کو بہت پسند آئے گا۔"

"یقیناً۔ میری بیٹی اپنے ہاتھوں سے بنائے اور مجھے پسند نہ آئے' یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔" انہوں نے بہت پیار سے سارہ کا گال تھپک کر کہا۔

"بس بوا چائے بنا لیں پھر میں لے کر آتی ہوں۔" سارہ ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"اریبہ اور حماد کہاں ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"حماد اکیڈمی گیا ہے اور اریبہ میں بلاتی ہوں اسے۔" وہ فوراً کھڑی ہو گئی پھر جاتے جاتے پلٹ آئی اور دھیرے سے پوچھنے لگی۔ "ڈیڈی! آپ ناراض تو نہیں ہیں؟"

"کیوں بیٹا آپ کو یہ خیال کیوں آیا۔" انہوں نے قدرے حیرت سے دیکھا۔ سارہ کچھ ہچکچائی پھر ان کے قریب آ کر کہنے لگی۔

"وہ ڈیڈی! اریبہ نے بائیک لی ہے ناں۔ آپ پلیز ڈانٹیے گا نہیں۔ رازی بھائی نے بھی کچھ نہیں کہا۔"

"کہا اس سے جاتا ہے بیٹا جو سننے والا' سمجھنے والا ہو۔" وہ افسوس سے بولے پھر سوچ میں پڑ گئے۔ ان کے چہرے

پر بے بسی نظر آنے لگی تھی۔ سارہ کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے اپنے باپ پر بہت رحم آتا تھا۔ کبھی یوں لگتا جیسے توصیف احمد اس کے باپ نہیں' وہ ان کی ماں ہو۔ اس کے اندر سے شفقتیں پھوٹنے لگتی تھیں۔

"ڈیڈی! آپ ڈس ہارٹ نہ ہوں بس چند دن کا شوق ہے۔" اس نے تسلی دی' تب ہی اریبہ آگئی اور توصیف احمد کو دیکھ کر اسے پہلا خیال یہی آیا کہ وہ اسے بائیک لینے پر سخت سست کہنے آئے ہیں۔ اس لیے پہلے ہی نروٹھی بن گئی۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" توصیف احمد نے پہلے جواب دیا پھر چونک کر اریبہ کو دیکھنے لگے۔ وہ فوراً" سارہ سے مخاطب ہو گئی۔

"سارہ' تم نے شاید کیک بنایا تھا۔"

"ہاں میں ابھی ڈیڈی کو یہی بتا رہی تھی۔"

"بتا چکی ہو تو لے آؤ تاکہ ڈیڈی بھی ٹیسٹ کرلیں۔" اریبہ نے خود کو صوفے پر گراتے ہوئے کہا پھر توصیف احمد کو دیکھ کر بولی۔ "آپ کو جانے کی جلدی ہوتی ہے ناڈیڈی!"

"نہیں بیٹا مجھے جلدی نہیں ہوتی' آپ کی مما کو میرا آنا اچھا نہیں لگتا۔" وہ بلا ارادہ کہہ گئے پھر پچھتائے بھی کیونکہ انہوں نے کبھی بچوں سے ان کی ماں کی شکایت نہیں کی تھی۔

"میں کیک لاتی ہوں۔" سارہ نے فوراً" کہا کہ کہیں اریبہ یاسمین کی طرف داری کرتے ہوئے کچھ کہہ نہ دے۔

"بیٹا! پہلے میں شاور لوں گا۔ اس کے بعد چائے وغیرہ۔" توصیف احمد اٹھ کھڑے ہوئے۔ اریبہ نے حیران ہو کر سارہ کو دیکھا' وہ خوش ہو گئی تھی۔

"ڈیڈی! میں آپ کا سوٹ نکال دیتی ہوں۔" سارہ بھاگی گئی۔ توصیف احمد اس کے پیچھے چل پڑے تھے۔ کچھ دیر بعد سارہ واپس آکر شوق سے اریبہ کو بتانے لگی۔

"اریبہ! ڈیڈی آج یہیں رہیں گے بلکہ اب ہر ویک اینڈ پر وہ ہمارے پاس رہا کریں گے۔"

"واقعی......" اریبہ کو یقین نہیں آیا۔

"ہاں' ابھی خود انہوں نے کہا ہے۔ دیکھو تم کوئی ایسی بات مت کرنا جس سے وہ پریشان ہوں اور یہاں رہنے کا پروگرام کینسل کردیں۔" سارہ اس کے پاس بیٹھ کر منت سے بولی۔

"مثلاً"...." وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"مثلاً"۔مثلاً" مجھے نہیں پتا۔" سارہ جھنجلا گئی۔

"مجھے پتا ہے۔" وہ چڑانے والے انداز میں مسکرائی تو سارہ منہ پھلائے اٹھ کر چلی گئی۔

تقریباً" پندرہ منٹ بعد توصیف احمد فریش ہو کر آگئے اور خوشگوار ماحول میں بچوں کے ساتھ کیک کے ساتھ چائے پی۔ اس دوران حماد بھی اکیڈمی سے آگیا تھا۔ توصیف احمد خاصے دوستانہ انداز میں تینوں سے تعلیم کے ساتھ دوسری مصروفیات کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ پھر رات کا کھانا بھی کھا لیا گیا۔ اس کے بعد یاسمین آئی تھی اور توصیف احمد کو بالکل گھریلو انداز میں تینوں بچوں کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر ٹھٹکی ضرور لیکن فوراً" ناگواری کا اظہار نہیں کرسکی اور پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"آپ کیسے آگئے!"

"اوکے بیٹا! اس سے پہلے کہ آپ کی مما مجھے صبح کا بھولا کہنے لگیں' گڈنائٹ۔" توصیف احمد نے قصداً" یاسمین کی بات نظرانداز کردی اور ایسے ہی خوشگوار موڈ میں تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"گڈنائٹ ڈیڈی!" حماد پہلے چلا گیا۔ اریبہ نے چند لمحے رک کر یاسمین کو دیکھا کہ کہیں وہ توصیف احمد کی وجہ سے پریشان تو نہیں ہو رہی اور یاسمین پریشان تھی بھی تو شاید خود نہیں سمجھ پارہی تھی کہ اسے کیا کہنا چاہیے البتہ یہ اندازہ اسے ضرور ہو گیا تھا کہ اس وقت کوئی ردِعمل ظاہر کرنے سے خود اس کی پوزیشن کمزور ہو جائے گی اس لیے اریبہ کے دیکھنے پر زبردستی مسکرائی تھی۔

"گڈنائٹ مما۔" اریبہ نے جواباً" مسکرا کر کہا پھر سارہ کو چلنے کا اشارہ کرکے اس کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ توصیف احمد پہلے ہی کھڑے ہو چکے تھے۔ یاسمین کو بیٹھتے دیکھ کر بھی نہیں رکے اور بیڈروم میں آگئے۔ اس وقت گھڑی کی سوئیاں گیارہ بجا رہی تھیں۔ توصیف احمد عموماً" اسی وقت سوتے تھے۔ ابھی بھی نیند آرہی تھی لیکن انہوں نے سگار سلگا لیا اور بیڈ کی پشت کے ساتھ تکیہ سیدھا کرکے آرام سے بیٹھ گئے گو کہ وہ یاسمین سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ یاسمین آرام سے آکر سو نہیں جائے گی۔ شور شرابا نہ بھی کرے جلی کٹی سنائے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ اس لیے وہ اس کے انتظار میں بیٹھ گئے تھے۔

یاسمین خاصی تاخیر سے کمرے میں آئی اور ان کی موجودگی کا یقین ہونے کے باوجود تعجب سے پوچھنے لگی۔

"آپ کا یہیں سونے کا ارادہ ہے کیا۔"

"ہوں......!" ان کا انداز بے حد سرسری تھا' جیسے یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ یاسمین نے مزید کچھ نہیں کہا غالباً" کچھ سوچ کر آئی تھی۔ خاموشی سے ڈریسنگ روم میں چلی گئی اور پانچ منٹ میں چینج کرکے واپس آگئی۔ توصیف احمد اس کی طرف دیکھ نہیں رہے تھے' پھر بھی اس کی ایک ایک حرکت محسوس ہو رہی تھی۔

یاسمین نے الماری کھولی بند کی' واش روم گئی' واپس آئی پھر اپنا تکیہ اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ توصیف احمد اس خیال سے پریشان ہو گئے کہ صبح بچے کیا سوچیں گے کہ انہوں نے یاسمین کو کمرے میں نہیں آنے دیا' بے دخل کردیا ہے۔

"یہ عورت کبھی مجھے اولاد کے سامنے سرخرو نہیں ہونے دے گی۔"

(باقی آئندہ ماہ انشاءاللہ)

بُشریٰ سعید

سفال گر

ساغرِ جم سے میرا جام سفال اچھا ہے

انسان شخصی ارتقا کے ابتدائی ادوار میں "گیلی مٹی" کی مانند ہوتے ہیں۔ جنہیں معاشرے کا "کمہار" تربیت کے "چاک" پر دھرتا ہے اور بازارِ حیات کی "مانگ" کو مدِنظر رکھ کر اپنی نیت اور چاہت کے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس قالب سازی کے دوران اس کی "انگلیاں" ہر "برتن" کے بدن پر ریتوں، رواجوں، مذہب، سیاست، جذبوں، خوابوں اور سرابوں کی ان گنت پیچیدہ تحریریں رقم کرتی ہیں۔

گیلی مٹی کے یہ "سانچے" حالات کے "آوے" میں ڈھلتے ہیں۔ ان مراحل سے گزرتے ہوئے ہر برتن کا "ظرف" اور "نصیب" اس کی ہیئت کا تعین کرتا ہے۔ کچھ "سفال گر" کی بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں، کچھ اس کے اناڑی پن کی نذر ہوتے ہیں۔ کچھ "آوے" کی "دہک" برداشت نہیں کر پاتے اور تڑخ جاتے ہیں، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بازار تک تو پہنچتے ہیں مگر انہیں کوئی "خریدار" میسر نہیں آتا۔ ان کا نصیب اور بازار کا اسلوب ہر "ظرف" کا مقام طے کرتا ہے۔ گل دان اور پیک دان میں ساخت کا فرق بھلے نہ ہو مگر نصیب کا فرق ضرور ہوتا ہے۔ یہ ہی میرے ناول کی تھیم ہے۔

محض چند واقعات کو اپنے انداز میں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ کرداروں کے ساتھ انصاف کرنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی، کیونکہ میرا فہم و ادراک ناقص اور نامکمل ہے۔ میں یہ کام آپ پر چھوڑ رہی ہوں، میں آپ کو خود سے بہتر منصف پاتی ہوں۔ میں اپنی رائے بھی نہیں دے رہی۔ صرف آپ کی رائے مانگ رہی ہوں۔ آپ اس ناول کو جس بھی تناظر میں دیکھیں، مگر اسے مٹی کے بے جان برتنوں کی کہانی مت سمجھیے گا۔

یہ جیتے جاگتے وجود رکھنے والے اور جد کرنے والے انسانوں کی داستان ہے۔

بشریٰ سعید



١٢

بارہویں قسط

عمر باقاعدگی سے گرانٹ سے ملنے جاتا تھا۔ اس دن وہ واش روم میں ہاتھ دھو رہا تھا۔ تو اس نے گرانٹ کے کمرے میں ایک لڑکی کی آواز سنی۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ وہ سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والی بے پناہ حسین لڑکی تھی، لیکن جو کچھ وہ کہہ رہی تھی اس نے عمر کو حیرت سے منجمد کردیا۔ وہ کہہ رہی تھی"اب میں آزاد ہوں اور ہر وہ کام کروں گی جس سے تم مجھے روکتے رہے، جسے تم گناہ کہتے ہو، اب میں دیکھتی ہوں مجھے کون روکے گا۔" عمر اسے پہچان گیا وہ صوفیہ مارسیلو تھی۔ وہ باہر نکلی تو عمر اس کے پیچھے بھاگا۔

صوفیہ جھکی ہوئی گردن اور بوجھل قدموں کے ساتھ اسپتال کے سینٹرل گارڈن میں سے گزر رہی تھی۔ پتھریلی روش کی حدوں پر لگے درختوں کے پھیلے ہوئے تاریک سائے لیمپ پوسٹوں کی سفید روشنی سے یوں لپٹے تھے جیسے میدے کی روٹی کو سیاہ گبریلوں نے ڈھانپ رکھا ہو۔ اس پر بیزاری کا شدید غلبہ تھا۔ وہ بے خیالی میں باربار مٹھیاں کھولتی اور پھر انہیں بند کر لیتی تھی۔ اور کبھی کانوں کے آویزوں کو انگلیوں سے کھینچنے لگتی تھی۔

وہ کیا کرکے آرہی تھی؟ کیا بے مزہ اور پھیکے لمحات تھے جو وہ گرانٹ کے کمرے میں گزار کر آرہی تھی، جیسے کوئی سنگترے کی بے رس پھانک منہ میں لیے تادیر اسے پولتا رہے۔

کیا یہ ہی وہ وقت تھا جس کی آمد کی وہ ایک مدت سے منتظر تھی۔

کیا ملا تھا اسے گرانٹ پر گرج برس کر؟ وہ تو ٹس سے مس نہ ہوا تھا۔ کیا کیا سوچ رکھا تھا اس نے کہ گرانٹ ایسے بھڑکے گا، ویسے جلے گا لیکن کچھ بھی تو نہ ہوا تھا۔ وہ جیسے کسی لاش کو ٹھوکریں رسید کرکے آرہی تھی۔

ایک ٹھنڈی، اینٹھی ہوئی، فرسودہ لاش۔

وہ آخری لیمپ پوسٹ اور آخری درخت کو پار کرکے بے محرابی دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ سڑک پر روشنیوں اور آوازوں کا دریا بہہ رہا تھا۔ اس بپھرے ہوئے دریا کی طغیانی نے لحظہ بھر کے لیے اسے ہراساں کردیا تھا۔



لفٹ کے ذریعے وہ گراؤنڈ فلور پر آیا اور انٹرنس بلاک کی سمت دوڑ پڑا۔ نظر کی زد میں آنے والے ہر چہرے کو وہ کھوجتی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسپتال کے سینٹرل گارڈن کو بھی اس نے اسی رفتار سے پار کیا۔ وہ پارکنگ لاٹ کے رخ بڑھ رہا تھا کہ مخالف سمت میں سڑک کے کنارے رکے ہوئے فائر انجن کے عقب سے صوفیہ ظاہر ہوئی۔ وہ فٹ پاتھ پر چل رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ گاڑی پر نہیں آئی تھی۔ اگر اس کے پاس گاڑی ہوتی تو وہ یقیناً" پارکنگ کا رخ کرتی۔

عمر نے بے صبری سے سڑک پار کرنے کے موقع کا انتظار کیا اور دوسرے کنارے پر پہنچ کر اس کے تعاقب میں چلنے لگا۔ صوفیہ کے قدموں کی دھیمی رفتار غماز تھی کہ اسے کہیں پہنچنے کی جلدی نہیں تھی۔

وہ گردوپیش سے لاتعلق سر جھکائے چلی جارہی تھی۔

اس کے پیچھے چلتے چلتے اچانک عمر رک گیا۔ ایک سوال نے اس کے متحرک پیروں میں زنجیر ڈال دی تھی۔ کیا سوچ کر وہ اس کے پیچھے دوڑا چلا آیا تھا۔ آخر اس کی نیت کیا تھی؟ وہ صوفیہ کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کا سر اب بھی جھکا ہوا تھا۔ جوں جوں وہ دور جارہی تھی، عمر کے دل کی دھڑکن بھی مدھم پڑتی جارہی تھی۔ سڑک پر دوڑتی بھاگتی گاڑیوں کا شور اس کے کانوں میں گھس رہا تھا۔ فٹ پاتھ کے بیچ وہ کسی مجسّمے کی مانند بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

صوفیہ نے پلٹ کر دیکھا۔ غالباً" اس کے بالوں میں اٹکی ہوئی کلپ پھسل گئی تھی اور وہ رک کر اسے درست کررہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ بالوں کو سنوارنے میں مگن تھے اور اسٹریٹ لائٹ کی تیز روشنی میں اس کا چہرہ پوری وضاحت سے دکھائی دے رہا تھا۔ دوبارہ اس کی صورت دیکھنے پر عمر کو ویسی ہی حیرت ہوئی جیسی پہلی نظر میں ہوئی تھی۔ اس نے طوائفوں کے بارے میں سن رکھا تھا، پڑھ رکھا تھا۔ مگر اس نے کبھی کوئی طوائف دیکھی نہیں تھی۔

"کیا طوائف ایسی ہوسکتی ہے؟" صوفیہ کے چہرے کو یک ٹک گھورتے ہوئے اس نے خود سے سوال کیا۔ اس کے تخیل میں روایتی طوائف کا جو خاکہ تھا، صوفیہ کسی بھی زاویے سے اس سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔

وہ پھر سے چل پڑی۔ وہ دور جارہی تھی۔ جب فاصلہ اس حد تک بڑھ گیا کہ اس کے کانوں میں ہلتے ہوئے سفید آویزے نظر آنا بند ہوگئے تو عمر مڑ کر اسپتال کی طرف چلنے لگا۔ اس کا دل نہایت غمگین تھا۔ وہ اپنے دکھ کو کوئی نام نہیں دے پارہا تھا۔ بس ایسا لگ رہا تھا کہ سینے میں بائیں جانب بھیگی ہوئی روئی کا گولا رکھا تھا جو قطرہ قطرہ رس رہا تھا۔

اس وقت خدا جانے کیوں اسے بچپن کا ایک عظیم دکھ یاد آنے لگا۔ بچپن کے سب ہی دکھ عظیم ہوتے ہیں۔ کسی پسندیدہ کھلونے کا ٹوٹ جانا، ممنوعہ اوقات میں کھیل کود کی اجازت نہ ملنا یا کوئی بدذائقہ دوا پینے پر مجبور کیا جانا اتنا بڑا المیہ محسوس ہوتا ہے کہ ساری کائنات کے دکھ اس کے مقابل ہیچ لگتے ہیں۔ ایسا ہی ایک دکھ اس کی یادداشت سے ابھر رہا تھا۔

وہ گرمیوں کی ایک دوپہر تھی۔ حکیم بیگم چھپر کے نیچے چاک پر برتن بنارہی تھی۔ بے ہنر ہونے کے سبب وہ عموماً" کوئی نفیس شے تخلیق نہیں کرپاتی تھی۔ اس کے تراشے ہوئے ظروف میں بھدا پن خصوصیت سے نمایاں ہوتا تھا۔ البتہ اس روز معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ پسینے میں لت پت چاک سے اٹھی تو بہت پرجوش تھی اس نے عمر کو بلا کر ایک نہایت خوبصورت پیالہ دکھایا جو اس نے ابھی ابھی چاک سے اتار کر دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھا تھا۔ پیالے کی بناوٹ میں ایسی عمدگی تھی کہ عمر کو یقین ہی نہ آتا تھا وہ حکیم بیگم نے بنایا ہے۔

"جد آوے سے نکال کر پھل بوٹے بناؤں گی تو کیسا روپ نکلے گا۔ بس تو اس وچ دودھ پیا کرنا۔ اج تو بول کہ میں کججی (بے ہنر) نئیں۔"

خوشی کے مارے اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی۔

وہ ہانڈی پکانے چولہے کے آگے جا بیٹھی اور عمر وہیں گیلے برتنوں کی قطاروں کے قریب زمین پر کوئلے سے لکھنے لگا۔

معاً" موسم رنگ بدلنے لگا اور بدلیوں کے سرمئی ہاتھوں نے سورج کا کندنی چہرہ ڈھانپ دیا۔ حکیم بیگم کی ہدایت پر اس نے ایک ایک کرکے سارے برتن احتیاط سے اٹھا کر چھپر تلے ترتیب سے رکھ دیے۔ چند

لمحوں بعد آسمان کے پیالے سے ننھی ننھی بوندیں گریں جیسے حلوائی کے تھال سے چند نکتیاں کناروں سے اچھل جائیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا تھال الٹ پڑا۔ چھما چھم بارش کے چھینٹے' دھرتی سے ٹکرا کر اچھلتے اور چھپر تلے رکھے گیلی مٹی کے برتنوں پر مدھم نشان چھوڑ جاتے۔ عمر کے دل میں جانے کیا آئی۔ اس نے اوک میں بارش کا پانی بھرا اور اس کوزے میں چند قطرے گرا دیے جس کو بنا کر حکیم بیگم بجا طور پر فخر کے احساس میں گھری تھی۔

کوزے میں پانی کے قطروں نے چھوٹے چھوٹے گڑھے سے بنا دیے تو اسے یہ منظر بہت بھلا معلوم ہوا۔ کچھ دیر وہ ایسے ہی اوک میں پانی بھر بھر کوزے میں انڈیلتا رہا پھر اس نے حکیم بیگم کی نظروں کی زد سے بچتے ہوئے وہ پیالہ اٹھا کر اولتی (چھپر کا کنارا) تلے دھر دیا۔ بارش کی بوندیں اولتی سے ٹپکتی ہوئی پیالے میں گرتی رہیں اور چھوٹے بڑے گڑھے اور مبہم سی لکیریں بنتی مٹتی رہیں۔

اسے یہ کھیل بڑا دلچسپ لگ رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ بعد میں ٹھیک کر ان نشانات کو مٹا دے گا' جو بارش کے پانی سے کوزے کے بدن پر بن رہے تھے۔ پیالے کو دیکھتے ہوئے چھپر کی بیساکھی پر بازو لپیٹ کر وہ گول دائرے میں گھومنے لگا اور ساون کا ایک گیت گانے لگا۔ کچھ لمحوں کے لیے اس نے آبخورے سے نظریں ہٹائیں اور جب دوبارہ اسے دیکھا تو ٹھٹک کر بیساکھی سے ہاتھ ہٹا لیے۔ اب وہ بارش کی بوندوں سے پگھلنے لگا تھا۔

ہیئت بدل رہا تھا... اس کی صورت بگڑ رہی تھی۔ ... رفتہ رفتہ تحلیل ہو رہا تھا۔

اس نے یہ تو نہیں چاہا تھا۔ وہ اسے نیست ہونے سے بچانا چاہتا تھا لیکن اب یہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کیچڑ کے بے شکل لوتھڑے میں ڈھل گیا تھا۔ اس کے بے ضرر کھیل نے کیسا غضب ڈھایا تھا۔

وہ اس پیالے کو کبھی بھول نہیں پایا تھا اور آج فٹ پاتھ پر صوفیہ کی جانب پشت کر کے بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے وہ پیالہ اسے شدت سے یاد آ رہا تھا۔ اس کی صورت بگڑنے سے بچانے کی کیسی طاقتور خواہش اس کے اندر شور مچاتی تھی پر وہ وقت گنوا بیٹھا تھا۔

اس کے بعد اس نے کبھی حکیم بیگم کو ویسا عمدہ برتن بناتے نہیں دیکھا۔ ایسے بے عیب برتن کبھی کبھی ہی تراشے جاتے ہیں۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے صوفیہ جتنا مکمل حسن آج تک نہ دیکھا تھا۔ اگر یہ کہا جاتا کہ ایسی صورت بہت کم تخلیق کی جاتی ہے تو مبالغہ نہ ہوتا۔ اس نے گردن گھما کر عقب میں دیکھا۔ صوفیہ اب ایک سائے کی مانند نظر آ رہی تھی۔

صوفیہ اور اس پیالے میں کیا فرق تھا؟ وہ چھپر کی اولتی تلے پڑا ہوا گیلی مٹی کا کوزہ ہی تو تھی۔ بس ابھی تک بارش کی کوئی بوند اس پر ٹپکی نہیں تھی۔ جوں ہی پہلا قطرہ گرتا' زوال شروع ہو جاتا۔ کیا وہ اسے اولتی کے نیچے سے ہٹائے گا نہیں؟ کیا اس بار بھی وہ دیکھتا ہی رہ جائے گا؟

وہ گھوم کر پلٹا اور سرپٹ دوڑ پڑا۔ بس اسٹاپ کے قریب اس نے دوبارہ صوفیہ کو جا لیا تھا۔ جس بس میں وہ سوار ہوئی' اس میں وہ بھی سوار ہو گیا۔ بس قریب قریب خالی پڑی تھی۔ گنتی کے چند مسافر ایک دوسرے سے دور دور نشستوں پر بیٹھے تھے۔

صوفیہ کسی خالی نشست پر بیٹھنے کی بجائے ایک درمیانی عمر کے تنہا مرد کے ساتھ بیٹھ گئی جو اسپینش خدوخال کا مالک تھا۔ عمر نے قریب سے گزرتے ہوئے صوفیہ کو غور سے دیکھا تھا۔ نزدیک سے دیکھنے پر وہ اور بھی زیادہ دلکش دکھائی دی تھی۔ وہ اس کی جانب متوجہ نہیں تھی۔ وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے مرد کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

عمران کی پشت پر ایک نشست چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے متوازی دروازے کے پہلو سے جڑی ہوئی نشست پر براجمان ادھیڑ عمر موٹی عورت نے اپنے لیپ ٹاپ سے سر اٹھا کر ایک نظر اسے دیکھا تھا۔ لیپ ٹاپ کے علاوہ اس کی گود میں کچھ فائلیں' کاغذات اور ایک

لالی ڈسک رکھی تھی۔ اس کے ہمراہ پانچ چھ سال کی گھنگھریالے بالوں والی بچی تھی جو لیپ ٹاپ اور دیگر چیزوں سے چھیڑ چھاڑ میں مگن تھی۔ لیپ ٹاپ کی بٹنوں پر تیزی سے انگلیاں چلاتے ہوئے وہ عورت کاغذات کو بھی نگاہ میں رکھے ہوئے تھی اور بار بار بچی کو چیزوں کو چھونے سے منع کر رہی تھی۔

عمر نے صوفیہ کو اس مرد سے اجنبی زبان میں کچھ کہتے سنا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک نمائشی مسکراہٹ تھی۔ جواب میں وہ مرد چند ساعتیں خاموشی سے اسے گھورتا رہا پھر اس کے ہونٹ اتنے کھل گئے کہ اس کے دونوں جبڑے نمایاں ہو گئے۔ اس نے بھی نامانوس زبان میں طویل جملہ بولا تھا اور کھسک کر صوفیہ کے نزدیک ہو گیا تھا۔ وہ دونوں روانی سے گفتگو کرنے لگے۔

صوفیہ کا مخاطب مرد نہایت خوش نظر آتا تھا۔ وہ شاید اسپینش میں بات کر رہے تھے۔ عمر بھلے مفہوم سے نا آشنا تھا مگر اس مرد کے تاثرات سے اسے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کیسے صوفیہ کے سراپے میں گڑی جاتی تھیں۔ ان دونوں کے ایک مشترکہ قہقہے پر لیپ ٹاپ والی نے ناگواری سے سر ہلاتے ہوئے عمر کی طرف یوں دیکھا جیسے اسے یقین ہو کہ وہ اس کا ہم خیال تھا۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے اس نے صوفیہ اور اس اسپینش مرد پر قہر آلود نگاہ ڈالی اور پھر ایک کاغذ میں الجھ گئی۔

کیا صوفیہ نے بس میں اپنے لیے کسٹمر ڈھونڈ لیا تھا؟ اس سوچ نے عمر کو سن کر دیا۔ اگر ایسا ہی تھا تو وہ اسے کیسے باز رکھ سکتا تھا۔ لازم نہیں تھا کہ وہ جو سوچ رہا تھا' حقیقت وہ ہی ہو۔ کیا معلوم صوفیہ پہلے سے اسے جانتی ہو اور بس میں اچانک سامنا ہو گیا ہو۔ یہ معاملہ ایک بے ضرر اتفاقی ملاقات سے زیادہ کچھ بھی نہ ہو۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دی تھی۔

"تم بھی ان کمینوں کی وجہ سے پریشان ہو رہے ہو نا؟" لیپ ٹاپ کی اسکرین سے نظر ہٹائے بنا موٹی عورت نے کہا۔

یہ سوال شاید اسی سے کیا گیا تھا۔ وہ خاموش رہا اور اس آدمی کو دیکھنے لگا جس کا شانہ اب صوفیہ کے شانے سے ملا ہوا تھا۔

"میں زیادہ قانون نہیں جانتی لیکن اتنی خبر ہے مجھے کہ عوامی جگہ soliciting کیلی فورنیا کے پینل کوڈ میں قابل سزا ہے۔ کیا برا وقت آ گیا ہے۔ ایک hooker ہمارے درمیان اپنے گاہک سے بھاؤ تاؤ کر رہی ہے۔ میرے تو بچے بھی انہی بسوں میں سفر کرتے ہیں۔ دل تو چاہ رہا ہے کہ پولیس کو بلا کر ان دونوں کو ابھی گرفتار کروا دوں لیکن مجھے گھر پہنچنے کی اس قدر جلدی ہے کہ میں معمولی تاخیر کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی۔" اس عورت کی آواز بڑبڑاہٹ سے ذرا ہی اونچی تھی۔

عمر نے اپنے دل کو رکتے ہوئے پایا۔ اس کے خدشات سچ تھے۔ صوفیہ نے اسپتال کے کمرے میں گرانٹ سے جو کچھ کہا تھا' وہ حقیقت میں اس پر عمل پیرا ہو گئی تھی۔ وہ غصے میں کیے جانے والے بے روح دعوے نہیں تھے۔

بس رک گئی تھی۔ صوفیہ اور وہ آدمی اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھے۔ عمر ایک بار پھر کشمکش میں گھرا تھا۔ آخر اس مہم جوئی کا مطلب کیا تھا؟ اس نے کیا لائحہ عمل طے کیا تھا جس کے ذریعے وہ صوفیہ کو روک لیتا۔ کس ذہنی رو میں وہ اس کے پیچھے آ گیا تھا؟ وہ کوئی مصلح نہیں تھا۔ کوئی مبلغ نہیں تھا کہ اس کی تاثیر باتوں سے صوفیہ کا دل بدل جاتا۔

اسے اس سلسلے کو یہیں ختم کر دینا چاہیے تھا۔ وہ مفلوج جسم لیے نشست پر جما رہا۔ وہ نیچے اتر گئے تو موٹی عورت نے ایک اطمینان بھری طویل سانس لی۔ عمر سے اب بھی ہلا نہ گیا۔ اس اسٹاپ پر اترنے والے صرف وہ دونوں ہی تھے۔ دروازہ بند ہو گیا۔ عمر نے کھڑکی میں سے انہیں اکٹھے ایک سمت بڑھتے ہوئے دیکھا۔ بس روانہ ہو گئی۔ اس نے نشست سے اوجھل کر انہیں دیکھنے کی کوشش کی۔ چند لمحوں میں وہ نظر سے اوجھل ہو گئے۔ عمر نے حلق میں کانٹوں کی چبھن

محسوس کی۔ اس کا گلا سوکھ رہا تھا۔

"بس روک دو۔ ابھی فوراً"۔"

اس نے موٹی عورت کو چلاتے ہوئے سنا۔ وہ کھڑے ہو کر بدحواسی میں ڈرائیور کو پکار رہی تھی۔

"اگلے اسٹاپ سے قبل بس نہیں رکے گی۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔" ڈرائیور نے تحمل سے اسے بتایا۔

"آرام گیا بھاڑ میں۔ میری بیٹی نے فلاپی ڈسک دروازے سے باہر پھینک دی ہے۔ وہ ایک نہایت اہم دستاویز ہے۔ اگر وہ کھو گئی تو میری ملازمت چلی جائے گی۔ بس رو کو ورنہ میرا دل بند ہو جائے گا؟" وہ وحشت سے چیخ رہی تھی۔

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرنے کے بعد اس کی بات مان لی گئی۔ بس رکنے پر عمر نے سوچا۔

"کیا اب بھی مجھے نہیں اترنا چاہیے؟" پھر اس نے خود کو سڑک پر بھاگتے ہوئے پایا تھا۔ وہ صوفیہ اور اس آدمی کے قریب پہنچا تو اس کا سانس بری طرح پھول چکا تھا۔ اس کے دوڑتے قدموں کی آہٹ پر ان دونوں نے بیک وقت مڑ کر دیکھا اور پھر باتوں میں مشغول ہو گئے۔

"میں تمہیں لے جانا چاہتا ہوں۔" عمر نے اونچی آواز میں اٹکتے ہوئے کہا۔

صوفیہ کسی کل دار گڑیا کی طرح گھومی اور سیاہ آنکھوں میں حیرانی سمو کر عمر کو دیکھا۔

جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس وہ دراز قد نوجوان اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہانپ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کہیں دور سے بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر صوفیہ کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ وہ پاکستانی یا انڈین تھا اور اتنا خوبصورت تھا کہ اس کو نظر بھر کر دیکھنے سے دل کو کچھ ہونے لگتا تھا۔ اس کے گالوں پر ہلکا سا بھورا رواں تھا۔

بھرپور جسامت کا مالک ہونے کے باوجود اس کی عمر کے بارے میں صوفیہ کا اندازہ تھا کہ اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ جیسے پہلے بھی اس لڑکے کو کہیں دیکھ چکی تھی۔ مانوسیت کا یہ احساس بڑا طاقت ور اور کسی حد تک خوف زدہ کرنے والا تھا۔ اس کے اندر سنسنی سی پھیل گئی۔

"تم نے ابھی کیا کہا؟"

صوفیہ نے پوچھا تو اس نے پہلے سے بڑھ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں اپنی بات دہرائی۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

"کیا مطلب؟ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

صوفیہ کے ساتھ مرد نے مداخلت کی۔ "چھوڑو اسے۔ پتا نہیں کون ہے اور کیوں ہمارا وقت ضائع کر رہا ہے۔"

"تم مت بولو۔ مجھے اس سے بات کرنے دو۔"

صوفیہ نے سختی سے کہا تو اس کی صورت پر کبیدگی پھیل گئی۔

"تو تم کیا کہہ رہے تھے؟" صوفیہ عمر کی جانب متوجہ ہوئی۔

"جیسے یہ آدمی تمہیں لے کر جا رہا ہے' اسی طرح میں تم کو لے جانا چاہتا ہوں۔" وہ لکنت زدہ آواز میں سمجھانے لگا۔ اس کی آنکھیں زمین پر مرکوز تھیں۔

"میں تمہیں اس سے زیادہ رقم دوں گا۔ تم اس کے ساتھ مت جاؤ۔"

اس کے الفاظ نے صوفیہ کو الجھا دیا۔ وہ اس بات سے کیسے واقف تھا؟ اسے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا تھا۔

"کیا بے معنی باتیں کر رہے ہو۔ میں اس سے رقم کیوں لوں گی؟ یہ تو میرا دوست ہے۔" اس نے صاف مکرنا چاہا۔

"نہیں تم جھوٹ بول رہی ہو۔ میں حقیقت جانتا ہوں میں بس میں تمہارے نزدیک بیٹھا ہوا تھا مجھے تم بہت اچھی لگی ہو۔ مجھے مایوس نہ کرو۔ تم جتنی بھی رقم کہو گی۔ میں دوں گا۔" وہ اب بھی زمین کو دیکھ رہا تھا۔

اسپینش مرد غصے میں بھرا ہوا آگے آیا اور اس کی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر اسے عقب میں دھکا دیا۔

"دفع ہو جاؤ! تم نے ایک لفظ بھی اور کہا تو تمہارے ساتھ وہ سلوک کروں گا کہ تم ساری زندگی بھول نہیں سکو گے۔"

صوفیہ نے اسے کالر سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے عمر سے دور کر دیا۔ "وہ مجھ سے بات کر رہا ہے تو مجھے جواب دینے دو۔ تم بیچ میں مت پڑو۔"

اس کے جھڑکنے پر وہ آگ بگولہ ہو گیا تھا۔

"تمہاری جرات کیسے ہوئی مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے کی۔ کیا تمہیں کسی نے سکھایا نہیں کہ ایک گھٹیا hooker کو معزز لوگوں سے کس انداز میں مخاطب ہونا چاہیے۔ کیا تم خود کو میرے برابر تصور کرتی ہو؟ میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر۔ جہنم میں جاؤ۔" وہ صوفیہ پر گرجتا برستا وہاں سے چلا گیا تھا۔

صوفیہ نے پلٹ کر اسے جواب نہیں دیا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

عمر نے اس کے جانے پر اطمینان محسوس کیا تھا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ جو تم سمجھ رہے ہو' ویسا کچھ نہیں ہے۔ تم نے خوامخواہ اپنا اور میرا وقت برباد کیا ہے۔" صوفیہ نے عمر سے کہا۔

اس دوران وہ بغور اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے ہوکر کے لیے رہنما اصولوں پر مبنی ایک کتاب کا مطالعہ کیا تھا اور ہالی وڈ کی فلموں نے بھی کسی حد تک اس موضوع پر اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔ اسی فی صد احتیاطیں اس بات کو یقینی بنانے کے لیے بیان کی گئی تھیں کہ John (گاہک کے لیے اصطلاح) سادہ کپڑوں میں پولیس والا نہ ہو۔ ذہن نشین کیے ہوئے کلیوں سے اس کی شخصیت کا تجزیہ کرنے پر اس نے طے کیا کہ ایسا امکان بعید از قیاس تھا۔ ایک تو وہ اتنا کم عمر ظاہر ہوتا تھا کہ سرکاری عہدیدار ہونے کا شک کرنا بے بنیاد تھا۔ اور پھر اس کی ٹی شرٹ اور پتلون اس کے توانا بدن پر کسی مقام سے بھی ڈھیلی نہ تھی۔ اگر اس لباس کے نیچے اس نے گن چھپائی ہوئی ہوتی تو اس سے بننے والا ابھار کبھی بھی نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکتا تھا۔ پولیس والے عموماً ایسا لباس منتخب کرتے تھے کہ محض دیکھنے سے گن کی نشاندہی کرنا ممکن ہی نہ ہوتا تھا۔

"مجھے انکار نہ کرو۔ تم واقعی مجھے پسند آئی ہو۔ تمہیں رقم ہی چاہیے نا۔ میں تمہیں کوئی بھی قیمت ادا کرنے پر تیار ہوں۔ پھر تم کیوں منع کر رہی ہو۔"

صوفیہ کو اس کے غیر معمولی انداز نے مخمصے میں ڈال دیا۔ اگر وہ اسے اچھی لگی تھی تو اس کی آنکھیں زمین سے کیوں نہیں اٹھتی تھیں۔ وہ اس پر نظر ڈالنے سے کیوں کترا رہا تھا؟ اس سے بڑھ کر ایک اور مکاشفے نے صوفیہ کو پریشان کیا۔ اس کے دل میں شدید خواہش تھی کہ وہ لڑکا آنکھ اٹھا کر اسے دیکھے۔ اس کی نظر میں آنے کی ایسی زور آور تمنا اس کے اندر کیوں مچل رہی تھی؟ اسے محسوس ہوا کہ کشش کے اس حصار کو توڑنا لازم تھا۔ وہ لڑکا ایک موزوں کلائنٹ نہیں تھا۔ اس کی خامی یہ تھی کہ اس میں کوئی خامی نہ تھی۔ اس کی رائے میں ایک John کو جیسا ہونا چاہیے تھا' وہ لڑکا ہرگز ویسا نہیں تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کی پیشکش کو رد کر دے گی۔

"جب میں کہہ رہی ہوں کہ تم غلط جگہ پر کوشش کر رہے ہو تو تم باز کیوں نہیں آ جاتے۔ میں جا رہی ہوں۔ اب میرا پیچھا کرنے کی غلطی مت دہرانا۔"

اسے یہ کہنے کے باوجود وہ اس مقام سے سرکی نہیں تھی۔

"ابھی اس آدمی نے تمہیں ایک برے نام سے پکارا تھا۔ اگر میں غلطی پر ہوں تو اس نے ایسا کیوں کہا۔" وہ اپنی ہتھیلیوں پر آنکھیں گاڑے ایک دلیل دے رہا تھا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا لگتا تھا۔ اس کے گداز ہونٹوں کے کناروں پر پسینے کی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔

"کیونکہ وہ غصے میں تھا۔ غصے میں اکثر لوگ گالیاں دیا کرتے ہیں۔ کیا یہ کوئی انوکھا واقعہ ہے؟"

اس توجیہہ نے اسے قائل نہ کیا۔ "اگر میں غلط جگہ پر قسمت آزما رہا ہوتا تو میری زبان سے اس طرح کی بات سن کر تمہیں طیش آ جاتا۔ تم مجھے برا بھلا کہتیں۔ کبھی اتنی آسانی سے مجھے اپنی توہین کرنے نہ دیتیں۔ اس کے برعکس تم پرسکون ہو۔ تلخی تو کیا'

تمہاری آواز تک اونچی نہیں ہوئی۔" اس نے دوسری دلیل پیش کی۔

صوفیہ کو اعتراف کرنا پڑا کہ اس کی بات میں وزن تھا۔

"سب کا مزاج ایک سا نہیں ہوتا۔ میں اتنی جلدی غصے میں نہیں آتی۔ تمہاری بات سے مجھے دکھ ہوا لیکن چیخنا چلانا کوئی حل نہیں۔" صوفیہ نے پھر اس کی منطق کو جھٹلا دیا۔

"لیکن اگر تمہارا دعوا بجا ہے تو تم فوراً" چلی کیوں نہیں گئیں؟ اب تک یہاں رک کر مجھے وضاحتیں کیوں دے رہی ہو؟"

اس بار وہ لاجواب ہوئی تھی۔ بولتے ہوئے وہ بے اختیار ہکلائی۔ "یہ تو ہے..... مجھے چلے جانا چاہیے تھا۔ یہاں رکنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔"

اس پر ایک آخری نگاہ ڈال کر وہ مڑی اور سمت کا تعین کیے بغیر چلنے لگی۔ وہ اس کے پیچھے آرہا تھا۔

"تمہیں کتنی رقم چاہیے — بے جھجک تقاضا کرو۔"

وہ رک گئی اور یکسر بدلے ہوئے تاثرات کے ساتھ بولی۔ "تم کتنی دے سکتے ہو؟"

عمر نے ذرا سی نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ "مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ایسی صورت حال کا سامنا نہیں کیا۔ تم خود ہی بتا دو۔"

جواب دیتے ہوئے صوفیہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس کی چھٹی حس مسلسل سرخ اشاروں کی ترسیل کر رہی تھی۔ اس لڑکے سے دور ہو جانے کو کہہ رہی تھی۔ مانوسیت کا جو احساس اسے دیکھتے ہی جاگا تھا۔ اب اور بھی گہرا ہو گیا تھا اس سے جان چھڑانے کا ایک آسان حل تھا کہ وہ اسے ایسی قیمت بتا دے جو اس کی پہنچ سے باہر ہو۔ ایک دم اس کے ذہن میں وہ جوتے آگئے جن کی وجہ سے میبل زندگی اور موت کے درمیان معلق تھا۔

"تین سو bucks - میں تم سے تین سو bucks لوں گی۔"

اس لڑکے کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔ صوفیہ اسی ردعمل کی توقع کر رہی تھی۔ "تم چپ کیوں ہو گئے؟ تین سو bucks نہیں ہیں تمہارے پاس؟"

"یہ تو بہت زیادہ ہیں۔" ایک لمبی چپ کے بعد اس نے کہا تھا۔

"مجھے معلوم ہے، لیکن تم نے خود ہی کہا تھا کہ تم کوئی بھی قیمت ادا کرو گے۔"

"ہاں میں نے کہا تھا لیکن یہ تو... کیا تم اپنا مطالبہ گھٹا نہیں سکتیں؟ میری جیب میں تمہیں دینے کے لیے زیادہ سے زیادہ نوے ڈالر ہیں۔ باقی تیس ڈالر ٹیکسی اور ہوٹل کے کمرے کے کرایے پر خرچ ہوں گے۔ اگر میں وہ بھی تمہیں دے دوں تو پھر سڑک پر رات گزارنا ہو گی۔"

ایک نو آموز کے لیے یہ معاوضہ کم نہیں تھا۔ اس کے دل نے اسے ہاں کہنے پر اکسایا۔

"نوے؟" وہ استہزائیہ سے ہنسی۔ "تین سو اور نوے کے ہندسوں کی تعداد بھی آپس میں نہیں ملتی۔ مجھے اجازت دو۔" وہ جانے کے بجائے اس کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

عمر تیزی سے سوچ رہا تھا۔ فوری طور پر دو سو ڈالر کا بندوبست کرنا کیونکر ممکن تھا۔ صوفیہ سے اسے امید نہیں تھی کہ وہ لچک دکھائے گی، پھر بھی اس نے منت بھری آواز میں کہا۔ "تم مان جاؤ۔ نوے ڈالر کم نہیں ہوتے۔ یہ ایک معقول رقم ہے۔"

"تین سو سے ایک سینٹ کم نہیں۔ میری بات حتمی ہے۔ بحث سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

اس نے بدقت خود کو دوبارہ چلنے پر آمادہ کیا۔ پراسرار لڑکے نے ایک بار پھر اس کا راستہ روک لیا تھا۔

"کیا تم مجھے تھوڑی سی مہلت دے سکتی ہو؟ میں تمہاری بتائی ہوئی رقم کا انتظام کر دوں گا لیکن تمہیں میرا انتظار کرنا ہو گا۔ میں چند منٹ میں واپس آتا ہوں۔"

شاید وہ اے ٹی ایم مشین سے رقم نکلوانے کی نیت سے جا رہا تھا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارے لوٹنے پر میں یہیں ملوں گی۔"

"ہاں! مجھے اس پر یقین ہے۔" اس نے جاتے ہوئے وہ عجیب جملہ کہا تھا۔

"کس پر یقین ہے؟"

اسے جواب نہیں ملا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ایک رہن شاپ — میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ کوئی چیز گروی رکھنے گیا تھا۔ ایسی کون سی قیمتی چیز اس کے پاس تھی جس کے عوض وہ دو سو ڈالر قرض حاصل کر سکتا تھا۔ اس کے پاس اسے چھوڑ کر چلے جانے کا موقع تھا، لیکن اس کا یقین توڑتے ہوئے اسے ڈر لگ رہا تھا۔

Pawn shop کا مالک اس وقت اکیلا تھا۔ عمر کو اندر آتے دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھا اور پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اسے خوش آمدید کہا۔

"میں اسے بیچنا چاہتا ہوں۔" بنا کسی تمہید کے عمر نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی اتار کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ وہ revue thommen گھڑی تھی جو اس کی سولہویں سالگرہ پر آمنہ نے تحفے میں دی تھی۔ وہ اس کی ہر سالگرہ پر اسے کوئی تحفہ ضرور دیا کرتی تھی۔ وہ گھڑی اس کے دیے ہوئے تحائف میں سب سے مہنگی چیز تھی۔

بوڑھے مالک نے گھڑی کا تفصیلی معائنہ کیا، پھر "بلو بک" کی ورق گردانی کر کے کچھ مزید حساب کتاب کیا اور گھڑی کو اپنے سامنے کاؤنٹر پر بے نیازی سے رکھتے ہوئے بولا۔

"ایک سو نوے ڈالر۔"

عمر نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟ ایسی نئی گھڑی کی قیمت تقریباً سترہ سو ڈالر ہے۔"

اس احتجاج نے کائیاں بوڑھے پر کوئی اثر نہ ڈالا۔ "نئی گھڑی کی قیمت بے شک اتنی ہی ہے مگر یہ گھڑی نئی نہیں ہے۔ ظاہری حالت بھی اتنی اچھی نہیں ہے۔ اور سب سے بڑی قباحت تو یہ ہے کہ اس پر رقم خرچ کرنے کی صورت میں مجھے خسارہ اٹھانے کا خطرہ مول لینا پڑ رہا ہے۔ یہ فیک (جعلی) بھی ہو سکتی ہے۔ اس میں کچھ ایسے نقائص ہو سکتے ہیں جو فوری طور پر قابل نشاندہی نہ ہوں مگر جن کی وجہ سے اس کی وقعت دھات کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہ ہو۔" وہ روایتی ہتھکنڈے آزمانے لگا۔

"یہ فیک (جعلی) نہیں ہے۔ یہ اصلی thommen ہے۔ اس برانڈ کی بہت مانگ ہے۔" عمر نے بے قراری سے کہا اور مڑ کر کانچ کے دروازے کے پار دیکھا۔

"اتنی بھی مانگ نہیں ہے۔ جتنی تم کہہ رہے ہو۔ یہ رولیکس تو نہیں ہے کہ اس کا خریدار ڈھونڈنے میں کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ میں نے تمہیں معقول پیشکش کی ہے۔" وہ اڑیل اور بحث سے لطف اندوز ہونے والے لوگوں میں سے تھا۔

"اگر مجھ پر ایسی افتاد نہ پڑی ہوتی تو کبھی اس گھڑی کے اتنے غیر مناسب دام قبول نہ کرتا۔ پھر بھی میری کم سے کم مانگ دو سو دس ڈالر ہے۔ میں اسے بیچنے پر تیار ہوں۔" عمر نے ہتھیار ڈال دیے۔

"اور میری زیادہ سے زیادہ حد ایک سو نوے ہے۔ اس سے آگے بڑھنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔" وہ اپنی ضد پر قائم تھا۔

عمر نے ایک بار پھر باہر نظر دوڑائی تھی۔ "تمہارا رویہ غلط ہے۔ تم استحصال کر رہے ہو۔ اخلاقی اقدار اور کاروبار....."

"بوڑھے نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اگر میں اخلاقیات نبھانے میں لگ گیا تو کر چکا کاروبار۔"

"ٹھیک ہے۔ رقم مجھ دے دو۔" عمر نے بے بسی سے کہا۔

وہ بدستور دروازے سے باہر دیکھ رہا تھا۔

"تم نے دانش مندانہ فیصلہ کیا ہے۔ مجھے اپنا

ڈرائیونگ لائسنس دے دو تاکہ میں رسمی کارروائی پوری کرلوں۔"

"وہ میرے پاس نہیں ہے۔"

"تو کوئی شناخت نامہ... پاسپورٹ، سوشل سیکیورٹی کارڈ، تاکہ تمہاری شناخت ہوسکے۔"

"ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے اور میرے پاس وقت بھی نہیں ہے۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ مجھے فوراً" رقم دے دو۔ اگر میں اس قدر عجلت میں نہ ہوتا تو ایسا برا سودا کرتا ہی کیوں؟" اس نے دروازے سے نظر ہٹائے بنا تیز آواز میں کہا۔

"تو یہ معاملہ ہے۔ میرے پاس اکثر ایسے عاجل لوگ آیا کرتے ہیں۔" بوڑھے کا لہجہ معنی خیز تھا۔

عمر نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ اس کے انداز میں محسوس کیا جانے والا بدلاؤ آگیا تھا۔ عمر کو پچھتاوا ہوا کہ اس نے کچھ غلط جملے بول دیے تھے۔

"میں تمہیں اس گھڑی کے عوض ایک سو ستر ڈالر دوں گا۔ ظاہر ہے رسید کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں تو میں تمہیں کہیں دستخط کرنے پر بھی مجبور نہیں کروں گا۔"

عمر کو اس پر شدید طیش آیا تھا۔ "ابھی تو تم نے ایک سو نوے ڈالر دینے کی ہامی بھری ہے۔ پھر اب اپنی زبان سے پھرتے کیوں ہو۔"

بوڑھا بروکر طنزیہ ہنسنے لگا۔ "تم اتنی جلدی میں ہو کہ اپنی شناخت تک نہیں کرواسکتے اور بقول تمہارے اپنی بڑھیا گھڑی نہایت ادنیٰ نرخوں پر فروخت کر رہے ہو تو میں یہ فرض کیوں نہ کروں کہ یہ گھڑی چوری کی ہے اور تم ایک مجرم ہو۔ یہ تکرار طول پکڑ سکتی ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے قیمتی وقت کو ضائع ہونے سے بچالو۔"

وہ ایک دراز میں سے نقدی نکال رہا تھا۔

صوفیہ ٹہلتے ہوئے رک گئی۔ وہ لڑکا واپس آگیا تھا۔

اس نے باریک بینی سے معائنہ کیا تو اسے پتا چل گیا کہ وہ رہن کی دکان میں کیوں گیا تھا۔ اس کی بائیں کلائی اب خالی تھی۔

"رقم کا انتظام ہوگیا؟"

"ہاں لیکن یہ پورے تین سو نہیں ہیں۔ بیس ڈالر کم ہیں۔ مجھے امید ہے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" اس نے جھجکتے ہوئے کچھ نوٹ اسے دکھائے۔

صوفیہ نے جان بوجھ کر نوٹوں پر دھیان نہیں دیا تھا۔

"تم pawn shop میں اپنی گھڑی رہن رکھوانے گئے تھے نا تو اس کے بدلے میں تمہیں کتنا قرض ملا ہے۔"

صوفیہ کے سوال پر وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ "میں نے قرض نہیں لیا۔ ایک سو ستر ڈالر میں وہ گھڑی بیچ دی ہے۔"

"کس برانڈ کی گھڑی تھی وہ؟"

"revue thommen"

صوفیہ کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ وہ بروکر کے ہاتھوں صریحاً" لٹ کر آرہا تھا۔ اگر وہ پہلے اس کی نیت سے واقف ہوجاتی تو رقم کے بجائے اس سے وہ گھڑی مانگ لیتی۔

کیا وہ اس پر اس درجہ ریجھ گیا تھا یا وہ بے وقوف تھا؟ اس دوسرے قیاس کو اس نے رد کردیا۔ وہ بے وقوف نہیں تھا اس کی اجلی پیشانی اور چمکدار آنکھیں ذہانت سے معمور تھیں۔ وہ جو کر رہا تھا، سوچ سمجھ کر کر رہا تھا۔ اب اس سے پیچھا چھڑانا لازمی ہوگیا تھا۔ کوئی تدبیر سوچنے لگی۔ پھر اس کی نظران نوٹوں پر ٹک گئی جو اس لڑکے نے ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے۔

"میں تین سو bucks لوں گی۔ ان میں سے ایک بھی کم ہوں چاہے ایک۔ مجھے منظور نہیں تم کسی اور سے۔"

اس نے صوفیہ کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔ "ٹھیک ہے میں کچھ کرتا ہوں۔ ایک آخری موقع دے دو تھوڑا سا اور انتظار کرو۔"

اس کا جواب سنے بغیر وہ پوری قوت سے رہن کی دکان کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ چند لمحے تجسس نے صوفیہ کے قدم جکڑے رکھے۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کیا کرنے والا تھا۔ پھر خود کو سمجھاتے ہوئے وہاں سے چل پڑی۔ وہ حتی الوسع تیزی سے دور جا رہی تھی لیکن محض دو منٹ بعد ہی اسے رک جانا پڑا تھا۔ وہ اسی رفتار سے بھاگتا ہوا لوٹ آیا تھا۔ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کچھ کہا جو وہ سمجھ نہ پائی اور اپنی جیب پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سر سے اشارہ کیا جیسے کامیابی کی یقین دہانی کروا رہا ہو۔ اس کے جسم کا سارا خون گویا سمٹ کر چہرے پر آگیا تھا اور پسینے کے قطرے کنپٹیوں اور گردن پر رینگ رہے تھے۔ صوفیہ کو پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ اس بار وہ کیا بیچ کر آیا تھا۔ وہ ننگے پاؤں کھڑا تھا۔

"وہ بیس ڈالر میں میرے جوتے خریدنے پر فوراً" ہی آمادہ ہوگیا حالانکہ میرا خیال تھا وہ آسانی سے نہیں مانے گا۔" اس نے جھینپے ہوئے انداز میں بتایا۔

"میں نے تمہارے جوتوں پر غور نہیں کیا تھا۔ کیا وہ کسی مہنگی برانڈ کے تھے؟" صوفیہ نے اس کے ننگے پیروں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، وہ میری بہن نے مجھے ایک خاص موقع پر تحفے میں دیے تھے۔ بازار میں ایسے نئے جوتوں کے جوڑے کی قیمت اندازاً" چار سو پچاس ڈالر ہے۔" اس کی آواز میں سادگی اور سرسری پن تھا۔

"کیا تمہارے پاس ایسے بہت سے جوتے اور گھڑیاں ہیں؟"

"نہیں۔ ان کے علاوہ اور تو نہیں ہیں۔ اتنی مہنگی چیزیں رکھنے کی استطاعت نہیں ہے میری۔"

صوفیہ کو اس سے خوف آیا تھا۔

اس کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے اسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی دلدل میں پاؤں رکھ رہی ہے۔

وہ دونوں خاموشی سے پہلو بہ پہلو چلتے رہے۔ صوفیہ کو اس کے ننگے پیروں سے وحشت ہو رہی تھی۔ عمر

نے محسوس کیا کہ صوفیہ کی چال میں مصنوعی بندش تھی۔ شاید اس کے جوتے آرام دہ نہیں تھے اور جانے وہ اتنی اونچی اور نوکیلی ایڑیوں کے ساتھ وہ چل بھی کیسے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دو سرخ میخوں پر چلی جارہی ہو۔

"تم مجھے کہاں لے جارہے ہو؟ کیا تم نے موٹیل کا تعین کر رکھا ہے۔"

"نہیں۔" یک لفظی جواب آیا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

عمر نے متعدد دفعہ گزرتی ہوئی ٹیکسیوں کو رکنے کا اشارہ کیا تھا مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

"کیا تم پہلی بار لاس اینجلس آئے ہو یا اس شہر میں اس سے قبل کبھی ٹیکسی کے ذریعے سفر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا؟"

"کیا مطلب؟" اس نے الجھ کر پوچھا۔

"یہ نیویارک نہیں ہے کہ جہاں جی چاہا ٹیکسی روک لی۔ لاس اینجلس میں ٹیکسی اسٹینڈ کے سوا کسی دوسری جگہ سے مسافر بٹھانے پر ڈرائیور کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ تم بے کار خود کو تھکا رہے ہو۔ ویسے اگر تمہارے ذہن میں کوئی خاص موٹیل نہیں ہے تو یہاں قریب ہی چند سستے موٹیلز ہیں۔ ہم پیدل وہاں تک جاسکتے ہیں۔" صوفیہ نے تجویز دی۔

ان کے راستے میں جو پہلا خستہ حال موٹیل آیا۔ اس کے سامنے رکتے ہوئے عمر نے کہا۔ "یہ مجھے ٹھیک لگ رہا ہے اور لکھا ہے کہ گھنٹوں کے حساب سے کمرے دستیاب ہیں۔" وہ بورڈ پر درج شدہ الفاظ پڑھ رہا تھا۔

صوفیہ نے سر کی خفیف جنبش سے تائید کی تھی۔ اس کی گھبراہٹ میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ ہر لحظہ وہ گہری دلدل میں دھنستی جارہی تھی۔

استقبالیہ کلرک اکتاہٹ زدہ چہرے لیے بیٹھا تھا۔ اندر ایسا سناٹا تھا جیسے برسوں سے وہاں کسی کا گزر نہ ہوا ہو۔ عمر کے جوتوں کے بغیر پاؤں اس کے ماتھے پر شکنیں لے آئے' البتہ مصلحت کے تحت اس نے زبانی اظہار سے پرہیز کیا۔

کلرک سے کرایہ دریافت کرنے کے بعد عمر نے کمرہ دیکھنے کی فرمائش کی تھی۔ کلرک نے ایک بیل بوائے کو بلا کر چابیوں کا گچھا اسے دیتے ہوئے عمر کے ساتھ جانے کی ہدایت کی۔

"تم ذرا یہیں رکو۔ میں ایک نظر کمرے کو دیکھ آؤں۔"

"جوں ہی وہ بیل بوائے کے ہمراہ بوسیدہ لفٹ میں سوار ہوا' صوفیہ کنکھیوں سے کلرک کو دیکھتے ہوئے اٹھی اور سبک چال سے داخلی دروازے تک چلی گئی/ دروازے کے پٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے مڑ کر ایک نگاہ ڈالی تھی۔ کلرک ٹیلی وژن کی اسکرین پر آنکھیں جمائے ہوئے تھا۔ وہ باہر آگئی مگر آگے نہیں بڑھی' وہیں ایک ستون کی اوٹ میں رک گئی۔

"آخر میں کس چیز سے خوف زدہ ہوں؟ کیا میری پریشانی کی وجہ صرف یہ ہی ہے کہ مجھے بنا کسی دوڑ دھوپ کے تین سو بکس مل رہے ہیں۔ میں بد قسمت تو ہمیشہ سے تھی۔ احمق کب سے ہوگئی۔ کیا یہ ایسی رقم ہے جس کو اس طرح سے ٹھوکر مار دی جائے۔"

وہ دیر تک اسی جگہ ٹھہر کر خود سے الجھتی رہی' پھر جی کڑا کر کے لابی میں داخل ہوگئی۔

اسی لمحے لفٹ نیچے آکر تھمی تھی۔ اس لڑکے نے اب پیروں میں سلیپر پہن رکھے تھے جو یقیناً "موٹیل کے کمرے سے دستیاب ہوئے ہوں گے۔ اس نے صوفیہ کو باہر سے آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ جیسے اسے صوفے پر بیٹھا ہوا چھوڑ کر گیا تھا' وہ اسی حالت میں اسے ملی تھی۔ اس نے صوفیہ کو اپنے ساتھ آنے کو کہا تھا۔

کمرہ حسب امید چھوٹا' گندا اور ارزاں فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اندر قدم رکھتے ہوئے اس کی ناک سے ایک بو ٹکرائی جس سے تاثر ملتا تھا کہ وہ کمرہ عرصہ دراز سے بند پڑا تھا۔ اس کے پہلے کلائنٹ نے دروازہ کھلا رہنے دیا تھا اور اب وہ کمرے میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔

"تم دروازہ بند کرنا بھول گئے ہو۔" صوفیہ نے مدھم آواز میں کہا۔

"نہیں میں بھولا نہیں ہوں۔ اسے کھلا ہی رہنا چاہیے۔"

وہ دیوار میں نصب الماری کی درازیں باری باری کھولتے ہوئے ان میں جھانک رہا تھا۔ صوفیہ کندھے اچکا کر رہ گئی۔ اس نے بیٹھنے کے لیے کوئی موزوں جگہ منتخب کرنے کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور بیڈ کے پاس بچھی ہوئی دو کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔

"تم کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ ریسپشن ڈیسک پر کال کر کے کیوں نہیں منگوا لیتے؟"

صوفیہ نے بولتے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ وہ کام نہیں کر رہا تھا۔ اس نے ریسیور واپس رکھ دیا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مجھے مل گئی ہے۔" وہ لڑکا ایک دراز بند کرتے ہوئے گھوما تو اس کے ہاتھ میں بستر کی ایک دھلی ہوئی چادر تھی۔

"اس سے اپنا سر اور جسم ڈھانپ لو۔" چادر صوفیہ کو دیتے ہوئے اس نے کہا۔

"کس لیے؟ کمرے میں ٹھنڈ تو نہیں ہے جو مجھے خود کو ڈھانپنا پڑے۔" بے دھیانی میں چادر پکڑ کر وہ اس کی تہیں کھولنے لگی۔

"میں ٹھنڈ کی وجہ سے نہیں کہہ رہا۔"

"تو پھر؟"

"جسم چھپا ہوا نہ ہو تو وہ خوش ہوتا ہے۔"

"وہ کون؟"

"وہ جنوں میں سے ایک ہے اور اس کا خوش ہونا اچھی بات نہیں ہے۔"

وہ لڑکا عجیب تھا اور اس کی باتیں عجیب تر۔ اس نے چادر اپنے سر اور شانوں پر ڈال لی۔ اگر وہ اس عمل سے کوئی تسکین حاصل کر رہا تھا تو صوفیہ کا کیا جاتا تھا۔ آخر وہ اسے منہ مانگے دام ادا کر رہا تھا۔

"تمہیں گھبراہٹ ہو رہی ہوگی۔ قدرتی طور پر ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے اس سے پہلے کبھی تمہیں ایسا تجربہ نہیں ہوا۔"

خوف کی ایک لہر صوفیہ کے بدن کو کاٹتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے بستر کے آخری سرے پر خود سے دور ہٹ کر بیٹھے ہوئے مرد کا خوبصورت چہرہ پھیلی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ کیسے جانتا تھا کہ وہ اس کا پہلا کسٹمر تھا۔ اس کا خوف ٹھوس شکل اختیار کرنے لگا۔ وہ کسی اتفاق کے نتیجے میں اس سے نہیں ٹکرایا تھا بلکہ کسی خاص مقصد کے تحت اسے یہاں تک لے آیا تھا۔

"تم نے یہ کیوں کہا کہ میرے لیے یہ پہلا تجربہ ہے۔"

وہ خاموش تھا۔

صوفیہ جانتی تھی' وہ جواب نہیں دے گا۔

"تم نے ایسا کیوں کہا؟" اس نے سوال دہرایا۔

"کیا میں نے غلط کہا ہے؟"

صوفیہ چپ رہی۔

"تمہاری عمر کتنی ہے؟ مجھے تو تم اٹھارہ سے بھی کم کے لگتے ہو۔ کہیں مجھے کسی قانونی پیچیدگی میں نہ پھنسا دینا۔" بالآخر اس نے اعتماد بحال کرنے کی خاطر کہا تھا۔

"میری عمر بیس سال اور ایک ماہ ہے۔ تمہارے دنیا میں آنے کے ٹھیک پندرہ ماہ بعد میں پیدا ہوا تھا۔"

یہ دوسرا دھچکا پہلے سے زیادہ شدید تھا۔ وہ اس کی بالکل صحیح عمر بتا رہا تھا۔ کئی لمحوں تک وہ گنگ رہی۔ اس نے درحقیقت دلدل میں پاؤں رکھ دیا تھا اور اب وہ اسے نگل رہی تھی۔

"تمہیں اپنے اندازوں کی درستی پر بہت اعتماد ہے۔ میں تردید یا تصدیق کر کے تمہارا مان نہیں توڑوں گی۔" خود کو سنبھالتے ہوئے صوفیہ نے اونچی آواز میں کہا تھا۔

"میرا نام عمر ہے۔ کیا تم اپنا نام مجھے بتاؤ گی؟"

"میرے پیشے میں ناموں کی کوئی اہمیت نہیں۔ اگر میں تمہیں کچھ بتاؤں گی بھی تو وہ جھوٹ ہوگا۔ تم خود کوئی اندازہ کیوں نہیں لگاتے۔"

اس نے پرس کھول کر آئینہ نکالا اور اپنا عکس دیکھتے ہوئے ایک رومال سے ٹھوڑی اور گردن کو بلا ضرورت

پونچھنے لگی۔ اس کا مقصد خود کو پراعتماد ظاہر کرنا تھا۔

"اور میں تو اس پر بھی یقین نہیں کر سکتی کہ تم نے اپنا نام درست بتایا ہے۔ مجھے اس سے غرض بھی نہیں۔" اس نے آئینہ اور رومال پرس میں ڈالتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"تم یہ کیوں کر رہی ہو؟"

"میں سمجھی نہیں تم کیا پوچھ رہے ہو۔"

"کیا تمہیں رقم چاہیے؟"

رقم تو سب کو ہی چاہیے ہوتی ہے مگر میرا یہ مسئلہ نہیں۔"

"تم تنہا ہو۔"

"تم مجھے بتا رہے ہو یا مجھ سے پوچھ رہے ہو؟"

"کیا تمہیں اکیلے پن سے نجات چاہیے؟"

"نہیں یہ بھی میرا مسئلہ نہیں ہے۔"

"تمہیں کسی نے یہ راستہ اپنانے پر مجبور کیا ہے؟"

"میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ مجھے کوئی مجبوری نہیں ہے۔ کہیں تم صحافی یا مصنف قسم کی مخلوق تو نہیں ہو۔ کیا تم میری ذات میں کوئی دلچسپ کہانی ڈھونڈ رہے ہو؟ اگر ایسا ہے تو تم نے انتخاب کرنے میں غلطی کی۔" اس نے ہنسنا چاہا مگر اس کے جبڑے اینٹھے ہوئے تھے۔

"تو کس شے نے تمہیں اکسایا ہے۔ مجھے ایک ٹھوس وجہ بتاؤ جس کی بنیاد پر تم نے اپنے لیے یہ پیشہ چُنا ہے۔"

"میں گناہ کرنا چاہتی ہوں۔ کیا یہ وجہ کافی نہیں۔"

اس کے الفاظ نے عمر پر سکتہ طاری کر دیا۔ وہ اٹھا اپنا والٹ اور سیل فون بستر پر رکھ دیا اور کچھ بھی کہے بنا باتھ روم میں گھس گیا۔ اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ گر کر بہتے ہوئے پانی کی آواز صوفیہ تک آ رہی تھی۔

فرار ہونے کا ایک آخری موقع اسے مل گیا تھا۔ اگر وہ جوتوں سمیت چل کر باہر جاتی تو اونچی ایڑیوں سے ابھرنے والی آہٹیں اس لڑکے کے کانوں میں پہنچ جاتیں۔ تیزی سے نیچے جھکتے ہوئے وہ اپنے جوتے اتارنے لگی۔ دائیں پاؤں کے جوتے کے اسٹریپ میں سے بکل نہیں نکل رہا تھا۔ اس نے خاصی زور آزمائی کی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ تنگ آ کر اس نے اسٹریپ کھولنے کی کوشش ترک کر کے انگلیاں گھسا کر اسٹریپ کو کھینچتے ہوئے پاؤں کو سکیڑ کر بدقت جوتے سے باہر نکال لیا۔ دونوں جوتے ہاتھ میں لٹکائے وہ والٹ اٹھانے کی نیت سے بڑھی ہی تھی کہ وہ باتھ روم سے باہر آ گیا۔ اس کا چہرہ' بازو اور پاؤں گیلے تھے۔ اس نے صوفیہ کے ہاتھ میں دبے ہوئے جوتوں کو ایک نظر دیکھا پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"تم یہ سلیپر پہن لو۔" اس نے سلیپروں کو پیروں سے الگ کرتے ہوئے ایک ٹھوکر سے انہیں اس کی جانب کھسکا دیا۔ "جا کر وضو کر آؤ۔"

"کیا؟" وہ محض اتنا ہی کہہ سکی۔

اس نے اپنا والٹ اٹھا کر اس میں سے چند نوٹ نکالے اور صوفیہ کو دے دیے۔

"یہ تین سو ڈالر ہیں۔ انہیں گن لو اور جو میں کہہ رہا ہوں' وہ کرو۔ وضو کر کے آؤ۔" صوفیہ نے نوٹوں کو گنے بغیر بے جان ہاتھ سے پرس میں ڈال لیا۔ "مجھے نہیں پتا تم کیا کرنے کو کہہ رہے ہو۔ وضو کیا ہوتا ہے؟"

"تم پھر جھوٹ بول رہی ہو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو' وضو کیا ہوتا ہے۔ تم مسلمان ہو تم نے سینکڑوں بار وضو کیا ہے۔"

اس کے الفاظ ہتھوڑے کی مانند صوفیہ کے اعصاب پر برسے تھے۔ اب خود کو مزید دھوکا دینا ممکن نہیں تھا۔ وہ اس کے بارے میں ہر بات سے واقف تھا۔ پھندے کی جانب رہنمائی کرنے سے قبل وہ کب سے گھات لگائے ہوئے تھا۔

"تم کون ہو؟" وہ اپنی آواز میں کپکپاہٹ کو چھپا نہیں پائی تھی۔

"میں عمر ہوں۔"

اسے کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ خود بخود اس کے پاؤں اسے باتھ روم کے اندر لے آئے۔ اس کی پشت پر دروازہ ایک ہلکی سی آہٹ کے ساتھ بند ہو گیا تھا۔ وہ واش بیسن کے سامنے کھڑی داغدار آئینے میں خود کو دیکھ رہی تھی۔ اپنے منتشر حواس کو مجتمع کرتے ہوئے وہ تمام واقعات پر غور کرنے لگی۔

اس لڑکے نے اس کے متعلق تمام معلومات اکٹھی کرنے کے بعد اس پر ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ cop نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو اسے یہ سب کھڑاگ پھیلانے کی حاجت نہیں تھی۔ یہ بات بھی یقینی تھی کہ وہ ماضی میں کبھی اس سے نہیں ملی تھی۔ ممکن تھا کسی دور میں وہ اسکول میں اس کے ساتھ پڑھتا رہا ہو یا... سوچتے ہوئے اس نے خود کو ٹوک دیا۔ اس وقت اس شخص کو پہچاننا اصل مسئلہ نہیں تھا بلکہ اصل مسئلہ خود کو اس سے محفوظ رکھنا تھا۔ وہ کیوں اس امکان سے آنکھ چرا رہی تھی کہ وہ شخص کوئی جنونی قاتل ہو سکتا تھا۔

بعض سیریل کلرز اپنے منتخب کیے ہوئے ہدف کے گرد گھیرا تنگ کرنے سے پہلے دنوں یا مہینوں اس کی نگرانی کیا کرتے ہیں' وار کرنے کے موزوں وقت کا انتظار صبر کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ اس کی ماں ایک ایسے ہی جنونی کے ہاتھوں انجام کو پہنچی تھی اور اب وہ خود... اس نے نل کو پوری رفتار سے کھول دیا تاکہ باہر موجود شخص مشکوک نہ ہو۔ دبے قدموں وہ دروازے کے پاس گئی اور اسے قفل لگانے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے کہ دروازہ باہر سے بند تھا جبکہ اندر سے اسے بند کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ چٹخنی ٹوٹی ہوئی تھی اور خود کار تالا خراب تھا۔ اسے یہاں تک لانے والا کوئی اناڑی نہیں تھا۔ اس نے ہر طرح کا بندوبست کر رکھا تھا۔ کمرہ دیکھنے کی آڑ میں وہ یہ ہی انتظام کرنے آیا ہو گا۔ اس نے پرس کو ٹٹول کر اس میں پیپر اسپرے (peppe spray) کی موجودگی کا اطمینان کیا جو اس نے کسی جارحیت سے نمٹنے کی خاطر پرس میں رکھ لیا تھا۔ حملہ آور کی آنکھوں میں دردناک جلن پیدا کرنے والے محلول کی دھار گرا کر اسے عارضی طور پر اندھا بنایا جا سکتا تھا۔ اچانک ایک خیال نے اس کے جسم میں پھریری دوڑا دی۔ وہ یقیناً" کسی دراڑ یا خفیہ درز میں سے اسے دیکھ رہا ہو گا۔ وہ تیزی سے پلٹ کر واش بیسن کے پاس آ گئی۔ اگر اس وقت وہ اسے دیکھ رہا تھا تو اس کے وضو نہ کرنے پر کتنا ناخوش ہو گا۔ وہ اسے ناراض کر کے اپنی مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ہاتھ دھوتے ہوئے وضو شروع کیا۔ وہ نہایت سست روی سے وضو کر رہی تھی۔ اسے سوچنے کے لیے مہلت درکار تھی۔ باتھ روم سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک روشندان تھا' جس کی سلاخوں میں سے ایک بلی بھی نہیں گزر سکتی تھی۔

وہ چہرے پر پانی بہانے لگی۔

یہ کمرہ موٹیل کی پانچویں منزل پر تھا اور اس منزل پر اسے کوئی ایک کمرہ بھی آباد نظر نہیں آیا تھا۔ یہ بھی اس کے منصوبے کی ایک کڑی تھی۔ اس نے وہ کمرہ چُنا تھا جس کے آس پاس آواز سننے والا کوئی نہ ہو۔

وہ سر کا مسح کر رہی تھی۔

ٹیلی فون خراب تھا یا اسے خراب کر دیا گیا تھا۔ وہ سیل فون سے نائن ون ون پر اطلاع دے سکتی تھی مگر پولیس کو یہ صورت حال سمجھانا کتنا دشوار تھا۔ پھر بھی جان گنوانے سے بہتر تھا کہ وہ پولیس کے سوالات کا سامنا کر لے۔

پاؤں دھونے کے علاوہ وضو مکمل ہو چکا تھا۔ اس نے دایاں پاؤں اٹھا کر باتھ ٹب کے پھسلواں کنارے پر جمایا اور نل سے چلوؤں میں پانی بھر کر پیر دھونے لگی۔

"مجھے قتل کرنے کے لیے وہ کیا طریقہ اپنائے گا؟"

بائیں پاؤں پر پانی گراتے ہوئے اس کے ہاتھ بری طرح کانپے تھے۔

دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔

"کیا اب میں دروازہ کھول دوں؟"

وہ اس کی بے بسی سے لطف لے رہا تھا۔ اگر وہ نفی میں جواب دیتی تو کیا وہ دروازہ بند ہی رہنے دیتا۔

"ہاں! میں وضو کر چکی ہوں۔"

اس نے پرس میں ہاتھ ڈال کر پیپر اسپرے کی بوتل کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر

چاہتی تھی۔

دروازہ کھل گیا۔ اس نے پھرتی سے اسپرے والی بوتل کو باہر نکالنا چاہا پر وہ اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ ایسی جگہ کھڑا تھا کہ دروازہ کھلنے پر پٹ کی آڑ میں آگیا تھا۔ وہ ایک محتاط اور پیش بین لڑکا تھا۔ صوفیہ نے اس کی نظر سے بچتے ہوئے پرس میں سے ہاتھ کھینچ لیا اور آہستگی سے چلتی ہوئی اسی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں کمرے کے طول و عرض میں بھٹک رہی تھیں۔ وہ کسی ایسی شے کی کھوج میں تھی جس سے وہ اپنا بچاؤ کرسکے۔

عمر اس کے قریب آیا اور اس کے گرد ہوا میں انگلی سے ایک دائرہ بنانے لگا۔

"میں جو کہوں گا، تمہیں میرے پیچھے اسے دہرانا ہوگا۔ حرف بہ حرف۔ شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔" عربی میں پڑھنے کے بعد اس نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا تھا۔

صوفیہ نے بوکھلا کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ کیا کرنے جارہا تھا۔

"ہاں پڑھو۔ ڈرو مت۔ اس سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

صوفیہ نے اٹکتے ہوئے اس جملے کو دہرادیا تھا۔

"کہو پناہ مانگتا ہوں میں صبح کے رب کی۔
شر سے ان چیزوں کے، جو اس نے پیدا کیں۔"

صوفیہ کے لیے وہ الفاظ اجنبی نہیں تھے۔ وہ قرآن کے تیسویں پارے کی آخری دو سورتوں میں سے ایک کی ابتدائی آیات تھیں۔ اس نے تیسویں پارے کی کئی سورتیں حفظ کی تھیں مگر وہ ان کے مفہوم سے ناآشنا تھی۔ اس نے انہیں عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں پڑھا یا سنا نہیں تھا۔

"شر سے ان چیزوں کے جو اس نے پیدا کیں۔"

عمر کی آواز میں بے پناہ سوز تھا۔ وہ اس کی تقلید میں آیتوں کو دہرانے لگی۔

"اور شر سے اندھیرے کے جب چھا جائے وہ۔
اور شر سے گرہوں میں پھونک مارنے والیوں کے۔"

اس کی گردن کی پشت پر رونگٹے اٹھنے لگے۔ وہ پہلی بار خدا کے کلام کو اس زبان میں سن رہی تھی جو اس کی سمجھ میں آتی تھی۔

"اور شر سے حاسد کے جب حسد کرے وہ۔"

اس کے بازوؤں پر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ "اور شر سے حاسد کے جب حسد کرے وہ۔" اس کا روم روم بولنے لگا تھا۔

عمر نے ایک بار پھر تسمیہ پڑھ کر قرآن کی اختتامی سورہ کا آغاز کیا۔

"کہو پناہ مانگتا ہوں میں انسانوں کے رب کی۔"

وہ کیوں اسے یہ آیات سنا رہا تھا؟ کیا وہ اوجھا (عامل) تھا۔ اس پر کوئی عمل کررہا تھا۔

"کہو پناہ مانگتا ہوں میں انسانوں کے رب کی۔
انسانوں کے بادشاہ کی۔
انسانوں کے معبود کی۔"

صوفیہ کی رگوں میں خون شراٹے بھر رہا تھا۔ اس کی زبان اس کے اختیار میں نہیں تھی۔

"شر سے وسوسہ ڈالنے والے کے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے۔"

خون اس کی شریانوں میں وحشت سے اچھلتا اور گرتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سرخی چھانے لگی۔

"جو وسوسے ڈالتا ہے انسانوں کے دلوں میں۔"

اس کی گردن کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔ مرگی میں مبتلا کسی شخص کی طرح اس کے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں مڑ کر اکڑ گئی تھیں۔

"جو وسوسے ڈالتا ہے انسانوں کے دلوں میں۔" عمر کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

"وہ جنوں میں سے ہو خواہ انسانوں میں سے۔"

صوفیہ کسی معمول کی مانند پکار اٹھی۔ "وہ جنوں میں سے ہو خواہ انسانوں میں سے۔"

وہ چپ ہوگیا تھا۔ ساری کائنات چپ ہوگئی تھی۔ ہر شے ٹھہر گئی تھی۔ سانسیں، دھڑکن، نظر، وقت۔۔۔ ہر چیز تھم گئی تھی۔

وہ کیفیت گزر گئی تو صوفیہ نے روہانسی آواز میں اس سے کہا تھا۔

"تم نے مجھ پر جادو کیا ہے؟"

"نہیں۔ یہ جادو کا توڑ ہے۔" وہ ہتھیلی سے اپنے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو صاف کررہا تھا۔

"مجھ پر کوئی جادو نہیں ہوا، پھر جادو کا توڑ کیوں؟"

"تم پر ہوا تھا لیکن تم جانتی نہیں۔ تم پر آگ سے پیدا ہونے والے نے جادو کیا تھا۔ اس نے تمہیں دھوکے کے جال میں الجھا دیا تھا۔ اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ وہ جادو ختم ہوگیا ہے۔ میں نے تمہیں اس کی پناہ میں دے دیا ہے، جس کے جلال کے سامنے قوی سے قوی جادو بھی ناکام ہے۔ میں نے تمہارے گرد نور کا ہالہ قائم کردیا ہے۔ اس ہالے کو پار کرنا کسی جادوگر کے بس میں نہیں۔"

صوفیہ نے اس کے پیروں کی چاپ کو لکڑی کے فرش پر گونجتے ہوئے سنا۔ اس نے گردن اٹھا کر دھندلی آنکھوں سے آس پاس دیکھا تھا۔

باتھ روم میں واش بیسن پر جھکا وہ آنسوؤں سے تر چہرہ دھو رہا تھا۔

وہ ایک دم اٹھ کر بھاگی اور باتھ روم کا دروازہ بند کرتے ہوئے باہر سے مقفل کردیا۔ پھر اس نے سر سے چادر اتار کر پھینکی۔ پرس اور جوتے ایک ہاتھ میں اٹھائے اور ایک لمحہ رکے بغیر کمرے سے باہر نکل آئی۔ وہ باتھ روم کے بند دروازے کے عقب سے آنے والی آوازوں پر ذرا بھی دھیان نہیں دے رہی تھی۔ اسے اتنی فرصت بھی میسر نہ تھی کہ ٹھہر کر جوتے پہن لیتی۔ اس نے سوچا تھا کہ انہیں لفٹ کے اندر پہن لے گی۔

عمر بڑی دیر تک دروازے پر دستک دیتا رہا اور صوفیہ کو پکارتا رہا۔ اس نے روشندان کے نیچے کھڑے ہو کر آوازیں بھی دیں لیکن جب کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا اور وہ اس لاحاصل مشقت سے تھک گیا تو وہ باتھ ٹب کے خم دار کنارے پر بیٹھ گیا۔

صوفیہ کو آخر تو جانا ہی تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اسے روک کر نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے ٹب کی ٹھنڈی سطح پر ہاتھ پھیرا اور بازو لمبا کرکے اس نل کو بند کیا جس میں سے پانی کی پتلی دھار گر رہی تھی۔ جو اس کی طاقت کے دائرے میں تھا' اس نے کردیا تھا۔ عمل کا وقت پورا ہوچکا تھا۔ اب دعا کرنے کا وقت تھا۔

دعا جو مقدر بدلتی ہے۔
دعا جو دل پھیر دیتی ہے۔
دعا جو معجزے کرتی ہے۔

لیکن اس کی دعا میں وہ اثر کہاں تھا۔ وہ یقین کے معرکے میں کئی بار پسپا ہوچکا تھا۔ وہ لڑنے سے پہلے ہی گھٹنے ٹیک دیتا تھا۔

"اس بار میں نہیں ہاروں گا۔ اب مجھ سے چوک نہیں ہوگی۔ میری دعا میں وہ یقین ہوگا جو شک کی آلائش سے پاک ہوگا۔ میری زبان جو کہے گی، میرا دل وہ مانے گا اور میری نظر اسے ہوتا ہوا دیکھے گی۔ میں تجھ سے اس انداز میں مانگوں گا کہ میری عاجزی تجھے پسند آجائے۔ میرا گڑگڑانا تجھے بھا جائے۔ میں تجھ پر یقین کروں گا۔ ہاں میں تیری رحمت پر یقین کرتا ہوں۔"

حکیم بیگم نے کہا تھا دعا فرشتے کے پر جیسی کوری ہونی چاہیے۔ فرشتے کا پر کیسا ہوتا ہوگا؟ وہ آنکھیں بند کرکے سوچنے لگا۔ اس کی آنکھ فرشتوں کو دیکھنے کی قوت نہیں رکھتی تھی۔ وہ کیسے جان سکتا تھا کہ فرشتے کی ہیئت کیسی ہوتی ہے۔ ہاں اسے یہ معلوم تھا کہ وہ نور سے بنے ہیں۔ تو نور کیسا ہوتا ہے؟ وہ نور کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا البتہ نور کے تصور سے اس کے ذہن میں روشنی آتی تھی۔۔۔ دھلی ہوئی سفیدی جس میں کوئی ملاوٹ نہ ہو۔ کوئی داغ نہ ہو، حتیٰ کہ آلودگی کا ایک ریزہ بھی نہ ہو۔ جو پاک ہے، وہ نور ہے۔۔۔ جو خالص ہے، وہ نور ہے۔۔۔ جو روشن ہے وہ نور ہے۔۔۔ اور نور سے خلق کیے گئے فرشتے کا نور سے بنا ہوا پر۔۔۔

"ایسے دعا مانگنی ہے مجھے۔"

اس نے آنکھیں کھولتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔

باتھ ٹب کے پیندے اور دیواروں پر پیلے دھبے، بھوری لکیریں بکھری ہوئی تھیں۔ واش بیسن کے کنارے چکناہٹ زدہ اور لیس دار تھے۔ آئینے کی سطح پر چھوٹے بڑے داغ اور صابن کی جمی ہوئی چھینٹیں چپکی تھیں۔ کموڈ کے فلش ٹینک کا سرا ٹوٹا ہوا تھا اور اس میں سے مسلسل پانی گر رہا تھا۔ سامنے والی دیوار کی جڑ میں جہاں جھاگ دار پانی ٹھہرا تھا ایک تل چٹا رینگ رہا تھا۔ اس غلیظ جگہ پر اسے فرشتے کے پر جیسی دعا مانگنا تھی۔ یہاں اسے نور کا تصور کرنا تھا۔ اس گندگی کے ہوتے ہوئے نور.... کیا ایسا ممکن تھا؟

"یہ گندگی رکاوٹ نہیں ہے۔ رکاوٹ میری نظر ہے۔ میں اس کی اطاعت نہیں کروں گا۔ اسے اپنے تابع کرلوں گا۔ اب میری رہنما نظر نہیں ہوگی۔ میں دل کو اپنا رہنما بناؤں گا۔"

اس نے پھر سے آنکھیں بند کیں اور دعا مانگنا شروع کی۔



وہ بس میں سوار ہوکر watts کے ایک ایسے علاقے میں آگئی جہاں ہوکرز بھی روزمرہ استعمال کی اشیاء کی طرح بکتی تھیں۔

بس سے اتر کر مرکزی بازار کی طرح جاتے ہوئے راستے میں اسے تین سیاہ فام اور دو مخلوط نسل کی عورتیں نظر آئیں جن کا حلیہ اور انداز چیخ چیخ کر ان کے پیشے کا اعلان کر رہا تھا۔ وہ دکانوں کی نمائشی الماریوں میں سجے ہوئے روغنی پتلوں کی مانند سڑک کے کنارے اور دکانوں کے چبوتروں میں کھڑی تھیں۔ ادھورے پہناوے، بھڑکتی ہوئی سجاوٹ۔ صوفیہ کو ان کے مقابلے میں اپنا حلیہ، بے ضرر، اور بے کیف لگا۔ وہ جب تک زبان سے اظہار نہ کرتی، کوئی اسے ایک hooker ماننے پر تیار نہ ہوتا اور اس بات نے اسے افسردہ کیا تھا۔

"اگلی دفعہ میں لباس کے انتخاب میں احتیاط برتوں گی۔" اس نے خود کو باور کرایا تھا۔ اس نے اپنے سیل فون پر وقت دیکھا۔ گیارہ بج کر پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ ابھی اس کے پاس وافر وقت تھا۔ وہ گھوم پھر کر لوگوں کا مطالعہ کرنے لگی۔ ایک مدقوق چہرے والا پختہ عمر کا مرد سیٹی بجاتا ہوا چلا آرہا تھا۔ وہ نظر میں آنے والی ہر عورت کو ہوس زدہ آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ نزدیک آنے پر صوفیہ نے قصداً" اس کے کندھے سے کندھا ٹکرا دیا اور مسکراتے ہوئے معذرت کرنے لگی۔ وہ اس پر توجہ دیے بغیر گزر گیا تھا۔ اسے حیرانی ہوئی تھی کیا اس آدمی کی فطرت کے بارے میں اس نے غلط اندازہ لگایا تھا؟ سر جھٹکتے ہوئے وہ ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں گھس گئی۔ اندر زیادہ تر عورتیں تھیں۔ جو اکا دکا مرد تھے وہ یا تو اپنے کنبے والوں کے ساتھ تھے یا عمر کی اس منزل پر تھے جہاں انہیں نرس اور باورچن کے علاوہ عورت کے کسی روپ سے سروکار نہ تھا۔ کاؤنٹروں کے درمیان تھوڑی دیر آگے پیچھے چلنے کے بعد اس نے sobranie کا ایک پیک نقد ادائیگی کرکے خریدا اور اسٹور سے نکل آئی۔ اس برانڈ کے سگریٹ اسے بہت پسند تھے، لیکن ایک پیک کی قیمت چار ڈالر پچیس سینٹ ہونے کی وجہ سے وہ کبھی خریدنے کی ہمت نہیں کرپاتی تھی۔ اسے جب بھی sobranie سگریٹ درکار ہوتے، وہ انہیں چرایا کرتی تھی۔ آج پہلی دفعہ اس نے ان کی قیمت ادا کی تھی۔ اسے فخر محسوس ہو رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر ٹھہر کر اس نے پیک کھولا اور ایک سگریٹ نکال کر اس کا سنہرا فلٹر ہونٹوں میں دبالیا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے ایک طویل کش کھینچا تھا۔ نہایت نفیس تمباکو کا ذائقہ اسے تلخ اور کسیلا لگا تھا۔ اس نے دوسرا کش لیا اور اسے بھی ویسا ہی پایا۔ آج سے قبل کبھی sobranie برانڈ کے سگریٹ نے اسے مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ بے دلی سے سگریٹ پینے لگی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے لگاتار تین سگریٹ پیے، لیکن اس کا اعصابی تناؤ کم نہ ہوا۔ وہ اس کمرے اور اس لڑکے کے سحر سے نکل ہی نہ پارہی تھی۔ اس کا چہرہ اور اس کی باتیں رہ رہ کر اس کے اندر کلبلاتی تھیں۔ وہ کسی بھی طرح اسے فراموش کردینا چاہتی تھی۔ اس کا تصور کسی جونک کی مانند اس کے دماغ کی نسوں میں پیوست ہوگیا تھا۔

"تم پر جادو ہوا تھا، لیکن تم جانتی نہیں۔ تم پر آگ سے پیدا ہونے والے نے جادو کیا تھا۔"

اس نے جھنجلا کر چوتھا سگریٹ جو ابھی پورا خاکستر نہ ہوا تھا، فٹ پاتھ پر اچھال دیا اور ایک نیا سگریٹ جلا کر اس کے سرے سے پھوٹنے والے نیلگوں دھوئیں کو گھورنے لگی۔

"میں نے تمہیں اس کی پناہ میں دے دیا ہے جس کے جلال کے سامنے قوی سے قوی جادو بھی ناکام ہے۔"

اس نے ذہنی تمام تر توجہ اس بھیڑ پر مرکوز کردی جو ایک بار میں داخل ہو رہی تھی یا وہاں سے باہر آرہی تھی۔ اس نے بار کے اندر جانے کا قصد کیا۔ وہاں وہ آسانی سے کلائنٹ ڈھونڈ سکتی تھی۔ رات کا باقی حصہ اسے وہ دہشت انگیز باتیں یاد کرتے ہوئے نہیں گزارنا تھا۔ وہ فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک پر آگئی۔ پہلے قدم پر ہی ایک آواز اس کے تن سے لپٹ گئی۔

"کہو میں پناہ مانگتا ہوں۔ انسانوں کے رب کی۔

انسانوں کے بادشاہ کی۔

انسانوں کے معبود کی۔"

اس کا پاؤں ہوا میں معلق رہ گیا۔

"میں نے تمہارے گرد نور کا ہالہ قائم کردیا ہے۔ اس ہالے کو پار کرنا کسی جادوگر کے بس میں نہیں۔"

وہ آواز اس کی پسلیوں کو بھینچ کر اس کا دم گھونٹ رہی تھی۔

"دفعہ ہو جاؤ۔ میری جان چھوڑ دو۔" اس نے یوں ہوا میں ہاتھ چلایا جیسے ان دیکھی چیزوں کو دور بھگا رہی ہو۔

"نور کا ہالہ۔" وہ ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔

"میں بھی کس کی باتوں میں آگئی ہوں۔ شعبدہ باز تھا۔ ڈھونگی۔ نوٹنکی کرنے والا.... نور کا ہالہ۔" وہ اتنے زور سے ہنسی کہ اسے کھانسی آگئی۔

ایک ابھری ہوئی توند والا میکسیکن اس سے کچھ فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگائے چھوٹی سی بوتل ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا اور وقفے وقفے سے اس میں سے گھونٹ بھر رہا تھا۔ صوفیہ ایک ادا سے چل کر اس کے سامنے پہنچ گئی۔ اس کا سر اس کے بھاری جسم کے مقابلے میں نسبتاً" چھوٹا تھا۔ ماتھے کی کھال میں باریک نیلی نسیں پروئی ہوئی تھیں اور آنکھوں کے نیچے سیاہ تھیلیاں بنی تھی۔

"اگر تم ایک سو bucks خرچ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہو تو تمہارا وقت بہت عمدگی سے کٹ سکتا ہے۔"

میکسیکن نے بوتل منہ سے الگ کرتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔

"وضاحت سے کہو کیا چاہتی ہو۔"

"تم ایک سمجھ دار آدمی دکھائی دیتے ہو۔ پھر بھی وضاحت مانگ رہے ہو۔" اس نے ذو معنی لہجہ اختیار کیا۔

"اگر میں تمہاری آنکھوں میں الکحل پھینک دوں تو تمہیں کتنی تکلیف ہوگی۔"

میکسیکن کی بے سروپا بات اس نے تعجب سے سنی تھی۔

"تمہیں دیکھ کر میری آنکھوں کو ایسی ہی تکلیف ہو رہی ہے۔ مجھ پر رحم کھاتے ہوئے فوراً" یہاں سے چلی جاؤ۔ کہیں تمہاری مکروہ شکل مجھے قے کرنے پر مجبور نہ کردے۔"

صوفیہ کے ہونٹ نیم وا ہوئے اور سگریٹ پھسل کر زمین پر جا گرا۔

وہ مخنث رخ پھیر کر دوسری سمت میں دیکھ رہا تھا۔ صوفیہ چپ چاپ آگے بڑھ گئی۔ ایک گفٹ شاپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے قد آدم آئینے میں اسے اپنا عکس نظر آیا۔ غیر ارادی طور پر ٹھٹک کر وہ خود کو دیکھنے لگی۔ اس چمکتے ہوئے آئینے میں وہ اتنی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی کہ وہ دیر تک اپنے عکس سے نظر

نہیں ہٹا سکی۔

شاید اس نے اس سے ایسی قیمت طلب کی تھی جو اس علاقے کے حساب سے بہت زیادہ تھی اور یقیناً" وہ شخص نشے میں بھی تھا۔ اس نے خود کو دلاسا دیا اور نئے سرے سے کلائنٹ کی تلاش میں سرگرداں ہو گئی۔

دھرتی ایک سرمئی بانات کی مانند بچھی تھی اور رات ایک مشک فام نرتکی تھی جو اس سرمئی بانات پر بجے تلے قدموں سے ناچتی تھی۔ روشنیوں کے زیورات سے بجی، خوشبوؤں میں بسی اس رقاصہ کے ہر غمزے میں ایک بھید تھا۔

شہر اس کے کانوں میں شہد کے چھتے کی طرح بھنبھناتا تھا۔ اس مصروف سڑک پر وہ یوں قدم گھسیٹ رہی تھی جیسے اس کے پاؤں گیلی روئی سے بنے ہوئے ہوں۔

بار سے نکلتے ہوئے تین کورین لڑکوں کو دیکھ کر وہ رک گئی تھی۔ جب وہ قریب پہنچے تو اس نے اپنی دلکش ترین مسکراہٹ چہرے پر تانی اور مخمور آواز میں پکار کر انہیں متوجہ کیا۔

"کیا ارادہ ہے۔۔؟ ایک گھنٹے کے پچاس بکس ۔۔۔ خیال برا نہیں۔ کیا سوچتے ہو؟"

وہ چند ثانیے خاموشی سے اسے گھورتے رہے، پھر ان تینوں نے آپس میں سوالیہ نظروں کا تبادلہ کیا اور اتنی شدت سے ہنسے کہ ان کی چندی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔

"اگر پچاس اپنی جیب سے ہمیں دو، پھر بھی تم مہنگی ہو۔"

ان میں سے ایک زرد رو لڑکے نے، جس کے دانتوں پر بریسز (braces) لگے تھے، ہنسی کے دوران بمشکل کہا۔

"تم ہارر فلموں میں قسمت آزماؤ۔" وہ بے تحاشا ہنستے چلے گئے تھے۔ وہ بت بنی انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔

یہ دوسری بار ہوا تھا۔

اس چربیلے میکسیکن نے بھی اسے بدصورت کہہ کر دھتکار دیا تھا۔ تب اس نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا تھا کہ وہ نشے میں تھا لیکن کورین لڑکوں نے بھی وہی بات کہی تھی۔ اس نے پرس سے آئینہ نکالا اور دیر تک اپنے عکس پر نظریں جمائے رہی۔ کہیں کچھ غلط نہیں تھا۔ وہی آنکھیں، وہی ہونٹ، ویسی ہی رنگت، اس کے سارے نقوش ہمیشہ کی طرح ہی تھے۔ پھر اس کے ساتھ دوبار ایسا کیوں ہوا تھا۔

کیا اس کی سماعت اسے دھوکہ دے رہی تھی یا شاید وہ خود نشے میں تھی مگر کس شے کا نشہ ۔۔۔ ان پانچ سگریٹوں کا جو پچھلے ایک گھنٹے میں اس نے پھونک ڈالے تھے۔

اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ چھٹا سگریٹ سلگا کر اس نے ایک گہرا کش لیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ ڈھلتی عمر کے ہسپانوی مرد سے مخاطب تھی جو پارکنگ لاٹ سے گاڑی باہر نکال رہا تھا۔

"بیس بکس ۔ جواب دینے سے پہلے سوچو کہ اس سے کم میں تم کیا خرید سکتے ہو۔ شاید چند ہاٹ ڈاگ۔"

کھڑکی سے اندر جھانکتے ہوئے اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ خاموش رہا اور ہاتھ ہلا کر اسے جانے کا اشارہ کیا۔

"پندرہ۔"

اس نے ایک کوشش اور کر دیکھی۔

"اگر تم دنیا کی آخری عورت ہو تو بھی میرا جواب نہ ہو گا۔ تم نے اپنی شکل دیکھی ہے۔ تم عورت نہیں، عفریت ہو۔"

اس پر گویا کسی نے تیزاب انڈیل دیا ہو۔ اس کی گھبراہٹ خوف میں بدل رہی تھی۔

گنجے جرمن اور اس کے ایشیائی ساتھی کے پاس جاتے ہوئے اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔

"دس بکس تم دونوں کے۔"

"hassliche fratze" جرمن نے کراہت سے کہا۔

"اس نے کیا کہا ہے۔"

ایشیائی نے سرد مہری سے جواب دیا۔ "ڈراؤنا چہرہ۔"

اسے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی اس کے کانوں میں ناقوس بجا رہا تھا۔

"hassliche fratze ۔۔ ڈراؤنا چہرہ۔ عفریت۔۔۔"

وہ بھاگتے ہوئے سڑک کے پرلے کنارے پہنچی اور لوگوں کے چہروں کو کھوجنے لگی۔ وہاں ہر نسل، ہر رنگ اور ہر عمر کے مرد تھے، مگر اسے ایک بدصورت مرد کی تلاش تھی، جس کی شکل اتنی گھناؤنی ہو کہ کوئی عورت پیار کرنا تو کجا، ایک نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کرتی ہو۔

پھر وہ اسے مل گیا تھا۔

وہ ایک سیاہ فام تھا جس کا ہونٹ نصف سے زائد کٹا ہوا تھا اور اوپری جبڑے کے پیلے دانت دکھائی دیتے تھے۔ اس پر پہلی نظر پڑتے ہی اس کے بدن میں ایک پھریری دوڑ گئی تھی۔ وہ گفٹ شاپ کے دروازے میں کھڑا ونڈ چائمز کو اپنے بھدے ہاتھوں سے دھیرے دھیرے چھیڑ رہا تھا۔ رات کے اس پہر بھی اس نے سیاہ چشمے لگا رکھے تھے۔

"تمہارے لیے صرف پانچ بکس ۔" حروف اس کے تالو سے چمٹ گئے تھے۔

وہ اسے دیکھ کر مسکرایا یا شاید اسے وہم ہوا تھا۔ اس کٹے ہوئے ہونٹ نے ایک ابدی مسکراہٹ اس کے چہرے پر چسپاں کر رکھی تھی۔

"ایک بات ایمان داری سے بتاؤں؟"

اس نے سانس روک لیا تھا۔

"میں نے اتنا خوفناک چہرہ اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔"

وہ دوبارہ ونڈ چائمز سے کھیلنے لگا تھا۔

وہ کسی کافکائی کابوس (جرمن مصنف فرانز کافکا کے تخلیق کردہ دہشت ناک خواب) میں مبتلا تھی اور اس بھیانک خواب کا کوئی اختتام نہ تھا۔

وہ پاگلوں کی طرح بھاگ کر کاؤنٹر پر پہنچی اور سیلز گرل کا بازو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر چلانے لگی۔

"مجھے دیکھو! کیا میں بدصورت ہوں۔ دیکھو میرا چہرہ۔ کیا تمہیں مجھ سے خوف آ رہا ہے؟"

"دفع ہو جاؤ۔ باؤلی کتیا۔"

وہ اس سے اپنا بازو چھڑانے کے لیے جدوجہد کرنے لگی۔

"شراب پینے سے پہلے خود کو کمرے میں بند کر لیا کرو۔"

"اس شہر کا سب سے بدصورت مرد مجھے بدصورت کہتا ہے۔ اسے دیکھو کیا وہ اس قابل ہے کہ کوئی عورت اس کے قریب جائے۔ وہ مجھے بدصورت کہتا ہے۔"

"یہ واہیات مذاق کرنے کے لیے تمہیں میں ہی ملی ہوں۔ کیا میں نہیں جانتی وہ رہمنڈ مادر زاد (پیدائشی اندھا) ہے۔"

اسے لگا جیسے اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا ہو۔ وہ گھٹنوں کے بل فرش پر ڈھے گئی تھی۔ اس کا پورا بدن یوں لرزتا تھا جیسے آندھی کی زد میں آیا ہوا خشک گھاس کا تنکا۔

"اس نے مجھ پر جادو کیا ہے اور کہتا ہے میں جادو کا توڑ کر رہا ہوں۔ وہ میرا دشمن ہے اور کہتا ہے۔ "ڈرو نہیں" میں کیوں نہ ڈروں۔۔۔ وہ دشمن ہے۔۔۔ کھلا دشمن۔"

وہ سسکتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ)



مکمل ناول

نگاہ آئینہ ساز میں

شازیہ ہمایوں

امریکہ کے شہر سان فرانسسکو میں ٹیکسی چلاتے ہوئے آج مجھے دوسرا ہفتہ تھا۔ آج چونکہ ویک اینڈ تھا اس لیے خاصا مصروف دن تھا۔ ہر طرف گہما گہمی تھی سردی اپنے عروج پر تھی۔ ساحلی علاقے کی یخ بستہ ہوائیں جسم کو چیرتے ہوئے گزر رہی تھیں۔ موسم سرد ہونے کے باوجود لوگ تفریح کرنے نکلے ہوئے تھے۔ یہ گورے لوگ پانچ دن تندہی سے کام کرتے تھے اور ویک اینڈ پر مکمل عیاشی اور پارٹیز۔ ایسی پارٹیز جو حدود و قیود سے مکمل طور پر آزاد ہوتیں۔ ہم ٹیکسی ڈرائیوران ہی دنوں میں اپنی جیبیں بھرتے تھے۔

"ٹیکسی۔"

میں مشن اسٹریٹ سے ٹرن لینے لگا تھا جب سائیڈ واک پر چلتی ہوئی تین نوجوان لڑکیوں میں سے ایک نے ہاتھ دیا۔

"یس میم!" میں نے ٹیکسی روک کر دروازے کھولے تو وہ تینوں اندر بیٹھ گئیں۔

"آل رائٹ۔" میں نے گاڑی آگے بڑھا کر یوٹرن لیا دس پندرہ منٹ کا راستہ تھا۔

"تم انڈین ہو؟" آپس میں بات کرتے کرتے ایک میری جانب متوجہ ہوئی۔

"جی نہیں۔"

"پھر؟"

"پاکستانی ہوں۔"

"کب سے ہو یہاں پر؟" دوسری نے بات آگے بڑھائی۔

"اچھا سنو، تم ہمیں ایک فیور دو گے؟" وہ اپنے مقصد پر آگئی۔ جسے میں پہلے ہی سمجھ چکا تھا۔

"کیسی فیور؟"

"کسی لکر سٹور پر رکو اور ہمیں دو بوتل وائن لے دو۔"

"یہ ہمیں خرید کر دے سکتی تھی مگر اسے پینا پسند نہیں ہے۔" درمیان میں بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا جو تب سے خاموش تھی۔

"حالانکہ یہ ہمارے پڑوس میں جاب کرتی ہے۔ مگر کبھی کبھی ٹیکسی شیئر کرنے کے علاوہ یہ ہمیں کوئی فیور نہیں دیتی۔"

"اسے خریدنا بھی پسند نہیں ہے۔" دوسری نے لقمہ دیا۔

"اگر تم خرید دو تو ہم تمہیں زیادہ ٹپ دیں گے۔"

"شیور۔" میں نے گاڑی پارک کر کے انہیں دو بوتلیں خرید دیں اور وہ خوش ہو گئیں۔ یہاں کے قانون کے مطابق اٹھارہ سال سے کم عمر شخص شراب یا سگریٹ وغیرہ نہیں خرید سکتا اور اس ملک میں قانون کا مطلب اس پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے مجھے استعمال کیا تھا اور یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اکثر اسٹوڈنٹس یہ فیور لے لیا کرتے تھے اور میں بھی بخوبی یہ کام کر دیا کرتا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اگر میں نہیں تو کوئی دوسرا یہ کام کر دے گا۔ ہم مسلمانوں کے انکار کرنے سے یہ پینا تو نہیں چھوڑ دیں گے۔ تو پھر خرید کر دینے میں کیا حرج ہے۔

اگلے ویک اینڈ پر میں اسی کلب کے سامنے کھڑا تھا۔ رات کے دو بج گئے تھے اور تمام کلب بند ہو رہے تھے۔ اس وقت یہاں سے اچھے کسٹمر مل جاتے تھے۔ میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جب میری نظر ان تینوں پر پڑی۔ وہ کلب سے نکل رہی تھیں۔ میں چونکہ لائن میں سب سے آگے تھا اس لیے وہ میری جانب ہی آئی تھیں۔

"اسریٹو!" انہوں نے بیٹھ کر بتایا۔ میں نے وقت دیکھا۔ میری شفٹ ختم ہونے میں تقریباً" ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اس ایک گھنٹے میں میں اسریٹو سے باسہولت واپس آسکتا تھا۔ لہٰذا میں نے فوراً" گاڑی اسٹارٹ کی۔ آخر میں اچھا فیئر مل گیا تھا اس لیے میں خوشی خوشی ڈرائیو کر رہا تھا۔

وہ دونوں نشے میں دھت تھیں اور پارٹی کی باتیں کر رہی تھیں۔ اپنے اپنے بوائے فرینڈ کی باتیں سنا رہی تھیں۔ جبکہ تیسری اس بار بھی خاموش تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" سبز آنکھوں والی نے مجھ سے پوچھا۔

"خضر۔۔۔ اور آپ کا؟" میں نے یونہی بات بڑھانے کو پوچھا۔

"میں توری، یہ سنڈی اور یہ میری۔" اس نے اس کم گو اور کھوئی کھوئی سی لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ جو ان دونوں کے درمیان بہت اجنبی سی لگتی تھی۔ یوں جیسے عام سی چیزوں کے درمیان کوئی خاص چیز رکھ دی جائے۔

"آپ لوگ اسریٹو سے یہاں ہر ویک اینڈ پر آتی ہیں؟"

"ہر ویک اینڈ پر نہیں بس کبھی کبھی۔ ہاں، یہ یہاں جاب کرتی ہے!" اس نے میری کی جانب اشارہ کیا۔

"لیکن ابھی تو آپ لوگ پچھلے ویک اینڈ پر بھی آئی تھیں۔"

"تمہیں کیسے پتا؟" وہ حیران ہوئیں۔

"جب آپ لوگ یہاں ہینگ آؤٹ کر رہی تھیں تو میں نے ہی آپ کو رائیڈ دی تھی۔" میں نے یاد دلایا۔

"اوہ تو تم وہی ہو جس نے ہمیں وائن لے کے دی تھی۔"

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"مجھے بھی۔۔۔ گاڑی روکو میں پزا لے لوں۔" Domino کے پاس سے گزرتے ہوئے میری نے کہا۔ میں نے سائیڈ پر گاڑی روک دی۔

"تم کھاؤ گے؟" سنڈی نے پوچھا۔

"نو تھینکس۔۔۔" میں نے کہا تو میری اتر کر پزا لے آئی۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ نسبتاً" مختلف اور کم گو تو تھی ہی لیکن مجھے بالکل ہی لفٹ نہیں کرواتی تھی یہاں تک کہ اتر کر فیئر دیتے ہوئے ۔۔۔ تھینک یو کہتے ہوئے میں مسکرایا تھا مگر اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا جبکہ دوسری دونوں نشے میں ہونے کے باوجود الوداعی کلمات کہنا نہیں بھولی تھیں۔ لیکن اسے تو شاید ان کا مجھ سے بات کرنا بھی ناگوار گزرتا تھا۔ اس کی کیا وجہ تھی میں نہیں جانتا تھا۔

☼ ☼ ☼

مجھے امریکہ آئے ہوئے تقریباً" ڈیڑھ سال ہو گیا تھا اور یہاں آکر احساس ہوا تھا کہ جو خواب ہم وہاں سے لے کر آتے ہیں انہیں حاصل کرنا اتنا آسان ہرگز نہیں ہوتا جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ پہلے تین مہینے میں نے ایک ریسٹورنٹ میں ڈش واشنگ کی تھی۔ پھر ایک کار واش پر کام ملا تھا۔ کچھ قانونی مجبوریوں کی وجہ سے کسی مناسب جگہ پر جاب نہیں ملتی تھی اور اس طرح کی جو کمتر درجے کی جاب ملتی تھیں، وہاں پر اجرت بھی کم ہوتی تھی۔ اب جا کر تھوڑی بہت جان پہچان ہوئی تھی تو ٹیکسی ملی تھی۔

رات کو دس گھنٹے ٹیکسی چلا کر تھکا ہارا لوٹ کر آتا تو اگلے روز دو بجے تک ہوش نہ رہتا۔ تین بجے تیار ہو کر دوبارہ کام سے نکل جاتا۔ ہفتے میں چھ دن کام کر کے ساتواں دن آرام کا آتا تو اس روز کئی کام منتظر ہوتے بلکہ چھٹی کا دن سب سے زیادہ مصروف ہوتا۔

سان فرانسسکو میں رہنا خاصا مہنگا تھا۔ سنا ہے یہ دنیا کے مہنگے ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس لیے میں آج کل یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ اس روز میں کمپیوٹر پر بیٹھا کریگ لسٹ پر گھر دیکھ رہا تھا۔ برکلے اور اسریٹو میں کچھ اسٹوڈیوز نظر آئے۔ میں نے فون پر اپائنمنٹ لی اور اگلے روز انہیں دیکھنے چلا گیا۔ برکلے یونیورسٹی ایونیو پر ایک بلڈنگ میں مجھے ایک اسٹوڈیو اپنے لیے خاصا مناسب لگا۔ کرایہ بھی مناسب تھا اور لوکیشن بھی اچھی تھی۔ بلڈنگ کے عین سامنے ہالیڈے ان تھا۔ دائیں جانب کبابنہ ریسٹورنٹ تھا۔ اور بالکل نیچے افغانی ریسٹورنٹ تھا۔ حلال اسٹور اور ریسٹورنٹ بھی قریب قریب ہی تھے۔ بلڈنگ منیجر سے ضروری انفارمیشن لے کر میں نے اسے فوراً" ہی فائنل کر لیا۔

☼ ☼ ☼

صبح سے گھر سیٹ کر کے میں بری طرح تھک گیا تھا۔ فی الحال گھر پر کھانا پکانے کا قطعی کوئی ارادہ نہ تھا۔ ایک تو تھکاوٹ اس پر بکھرا ہوا کچن۔ کوئی چیز ٹھکانے پر نہ تھی۔ گو کہ تھوڑا سا سامان تھا لیکن ایڈجسٹ ہونے میں کچھ وقت تو لگنا ہی تھا۔ لہٰذا میں نے چابیاں اٹھائیں اور باہر نکل آیا۔ واکنگ ڈسٹینس پر ویج ریسٹورنٹ تھا۔ یہاں بیٹھ کر کچھ دیر کے لیے ساری تھکن غائب ہو گئی تھی۔ ہلکی آواز میں لگا ہوا اردو میوزک، دیسی کھانوں کی مہک، دیواروں پر پنجاب کے دیہاتی مناظر کی قد آور میورل۔

پل بھر کو اپنا ہی آنگن یاد آگیا۔ پردیس میں رہ کر انسان کتنی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی یاد کرتا ہے۔ یہ کسی پردیسی سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔

میں کھانا کھا رہا تھا جب وہ اندر داخل ہوئی۔ آج وہ اکیلی تھی۔ کاؤنٹر پر آرڈر کر کے وہ واش روم کی طرف چلی گئی تھی۔ واپس آئی تو اس کا کھانا ٹیبل پر لگ چکا تھا۔ کرسی کھینچتے ہوئے اس کی نظر مجھ پر پڑی۔

"ہائے!" میں نے گرم جوشی سے کہا۔

"ہائے!" اس نے مروتاً" ہی جواب دیا تھا۔

"آپ اس دیسی ریسٹورنٹ میں؟"

"اس میں کیا عجیب بات ہے؟" اس نے رکھائی سے کہا اور واقعی اب تو اکثر گورے لوگ دیسی ریسٹورنٹ میں بریانی، چکن اور ہمارے، دیگر روایتی کھانے رغبت سے کھاتے تھے۔ میں اپنے سوال پر خود ہی شرمندہ ہو گیا۔

"آج آپ کی فرینڈز نہیں آئیں؟"

"وہ ہر وقت میرے ساتھ نہیں ہوتیں ویسے بھی وہ میری فرینڈز نہیں پڑوسی ہیں۔"

"میں ادھر موو (آگیا) ہو گیا ہوں برکلے میں ہالیڈے ان کے سامنے والی بلڈنگ میں میرا اسٹوڈیو ہے۔"

میں نے اسے یوں بتایا گویا وہ میری پرانی جاننے والی

ہو۔ اس نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ تو میں بھی خاموش ہوگیا۔

"ایکسکیوزمی۔" اس نے کھانے کی پلیٹ اپنی جانب کھسکائی تو مجھے احساس ہوا کہ میری موجودگی اسے ناگوار گزر رہی ہے۔

"اوکے بائے۔"

"بائے۔" میں کاؤنٹر پر بل ادا کرکے باہر آگیا۔

☼ ☼ ☼

اپنے میل باکس سے ڈاک نکال کر اوپر آیا۔ پاکستان سے اماں کا خط آیا ہوا تھا۔ مہینے میں ایک دو دفعہ فون پر اماں سے بات ضرور ہوتی تھی لیکن پھر بھی وہ خط ضرور لکھتی تھیں۔ حالانکہ میں جواب میں ہمیشہ فون ہی کرتا تھا۔ مگر ان کی تسلی غالباً "خط لکھنے سے ہی ہوتی تھی اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بھی خط پڑھ کر مزا آتا تھا۔ میری ماں پرانے خیالات کی ایک سادہ سی عورت تھیں جو آج بھی منڈیر پر کوا بولنے سے مہمان کی یقینی آمد کی منتظر ہوتی تھیں۔

دیگر ڈاک کو پس پشت ڈال کر میں نے سب سے پہلے اماں کا خط کھولا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کوئی نئی بات نہیں ہوگی اور ایسا ہی تھا۔ وہی معمول کی باتیں تھیں کہ وہ بہت اداس ہو گئی تھیں چار پیسے کما کر واپس آجاؤں۔ پھر اپنے وطن اور اپنوں کے پاس رہنے کے فوائد لکھے تھے۔ پھر ملیحہ کی سعادت مندی اور دیگر تعریفیں اور آخر میں وہی ایک بات کہ ملیحہ میری امانت ہے میں اس بات کو ہمیشہ یاد رکھوں۔

"کیوں یاد رکھوں؟" ظاہر ہے اس لیے کہ کوئی میم مجھے پھانس نہ لے۔ پاکستان کی سیدھی سادی چار دیواری میں بند رہنے والی مائیں ہمیشہ ایسے ہی وہموں اندیشوں میں گھری رہتی ہیں کہ کہیں کوئی گوری ان کے ہونہار بیٹے کو پھانس نہ لے اور یہاں پردیسی لوگ اپنے مقاصد کے لیے کس کس طرح انہیں پھنسانے کے چکر میں رہتے ہیں اس کا انہیں ہرگز اندازہ نہیں ہوتا۔

ملیحہ سے میری بات کب طے ہوئی تھی، یہ تو مجھے بھی پتا نہیں تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ بچپن ہی سے شعور کی حدوں کو چھونے تک ہم دونوں یہ بات سمجھ گئے تھے کہ ہماری بات طے ہو چکی ہے۔ لیکن ہم دونوں نے ہی کبھی اس تعلق کو غیر ضروری اہمیت نہیں دی تھی۔ ملیحہ کا تو مجھے پتا نہیں تھا لیکن خود مجھے کبھی بھی اس تعلق سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ میرے لیے بالکل ایسے ہی تھی جیسے خاندان کی باقی تمام لڑکیاں۔ بچپن سے لے کر اب تک جیسے باقی کزنز چھٹیوں میں آکر رہتی تھیں، ویسے ہی وہ بھی آتی تھی۔

میرا تعلق ایک سادہ سے معزز اور دین دار گھرانے سے تھا۔ پنجاب کے ایک قصبہ نما گاؤں میں ہمارا قدیم طرز پر بنا ہوا بڑا سا گھر تھا۔ جہاں پرانے رسم و رواج اور خاندانی روایتوں کی آج بھی پاس داری کی جاتی تھی۔ ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا ملیحہ کا۔

چھٹیوں میں تمام کزنز ہمارے ہی ہاں آکر رہتے تھے۔ ان میں وہ بھی ہوتی تھی اور میرا رویہ تمام لڑکیوں سے یکساں ہی ہوتا تھا۔ نہ کوئی پسند نہ ناپسندیدگی۔ دل میں کبھی کوئی ایسا جذبہ یا احساس نہیں ابھرا تھا کہ میں اسے کن انکھیوں سے دیکھتا یا کبھی سب سے چھپ چھپا کر ملنے کی کوشش کرتا۔

نہ کبھی کوئی سرگوشی، نہ شوخی نہ شرارت۔

اور مجھے تو ادھر بھی ایسا ہی لگتا تھا۔ اس نے کبھی بھی مجھے دیکھ کر لگنے چھپنے کی کوشش نہ کی تھی۔ دوسری کزنز کی طرح سادہ رویہ ہوتا تھا اس کا۔ کم از کم مجھے تو کچھ ایسا ہی لگتا تھا۔ ہو سکتا ہے میرا اندازہ غلط ہی ہو۔ سنا ہے لڑکیاں بڑی گہری ہوتی ہیں۔

بی سی ایس کرنے کے بعد مجھ پر امریکہ آنے کی ایسی دھن سوار ہوئی تھی کہ میں مزید پڑھائی کرنا ہی بھول گیا تھا۔ سب ہی میری اس خواہش کے خلاف تھے اور اٹھتے بیٹھتے اس فیصلے سے باز رکھنا اور سمجھانا گویا ان کا فرض بن گیا تھا۔

اس روز پھر ابا مجھے لے کر بیٹھ گئے تھے۔

"دیکھو بیٹا! سب کچھ تو ہے یہاں پر۔ تھوڑی بہت

زمین ہے۔ گھربار ہے۔ اچھا گزارا ہو رہا ہے۔ چار لوگوں میں عزت ہے۔ اللہ کا بڑا کرم ہے ہم پر، پھر پرائے دیس میں خوار ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

"بات صرف ضرورت کی ہی نہیں ہے ابا! شوق کی بھی ہے اور پھر یہ سب کچھ آئندہ زندگی کے لیے اتنا کافی بھی نہیں ہے جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔"

"بیٹا! وہ لوگ بھی تو ہیں جن کے پاس یہ سب کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم تو بہت سوں سے اچھے ہیں۔ بڑا فضل ہے رب کی ذات کا ہم پر۔ تو بھی شکر کرنے والوں میں سے بن۔ ناشکری نہ کر۔"

"میں ناشکری نہیں کر رہا ابا! میں تو آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ ترقی کرنا چاہتا ہوں۔ جدید وقت کے جدید تقاضوں پر پورا اترنا چاہتا ہوں اور یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔" میرے پاس بھی کئی دلیلیں تھیں۔

"مگر کیا ملتا ہے وہاں جا کر۔ اب اپنے علی مراد کو دیکھ لو۔"

"چھوڑیں ابا ہر بندے کے اپنے حالات و واقعات ہوتے ہیں۔ میں یہاں بیٹھ کر اپنا موازنہ کسی سے نہیں کر سکتا۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ مجھے جانا ہے تو بس جانا ہے۔" میرا لہجہ دو ٹوک تھا۔ حالانکہ میں ابا کے سامنے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کرتا تھا مگر اس وقت معاملہ کچھ سنجیدہ تھا اور بات منوانے کا یہی طریقہ تھا۔

"اچھا تو یہ تیری ضد ہے اور اگر ہم نہ مانے تو۔" اماں تب سے خاموش بیٹھی ہماری باتیں سن رہی تھیں۔ بالآخر بول پڑیں۔

"نہ مانے تو بھی میں ضرور جاؤں گا۔ لیکن آپ مجھے خوشی سے اجازت دے دیں تو میں مطمئن ہو کر جاؤں گا۔" میں خاصا رکھائی سے بولا۔

اور وہ جانتے تھے کہ میں اپنے عزائم کا پکا ہوں۔ جو بات ٹھان لوں، وہ پوری کر کے ہی دم لیتا ہوں۔

"اچھا تو پھر میری بھی ایک شرط ہے۔" حلیم مزاج اماں کو بھی غصہ آگیا۔

"جی بولیں کیسی شرط؟"

"تجھے جانے سے پہلے شادی کرنا ہوگی۔"

"شادی؟" میں حیران رہ گیا۔

"ہاں شادی۔"

"اماں! کیسی باتیں کرتی ہیں۔ میں بھلا کیسے شادی کر سکتا ہوں۔ ابھی تو مجھے اپنا کریئر بنانا ہے۔"

"میں ان ساری باتوں کو نہیں جانتی۔ تجھے یہ شرط ماننا ہوگی ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔" ان کے پاس ایک ہی ہتھیار تھا۔

"اماں! آپ کیوں میرے پیروں میں بیڑیاں ڈالنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا۔ جب واپس آؤں گا تو کر لینا شادی بھی۔" اماں کی شفقت کے سامنے میں زیادہ دیر اکڑ نہیں سکتا تھا اس لیے خود بخود ہی لہجہ نرم ہو گیا تھا۔

"لو بھلا تیرا کیا اعتبار آنے سے ہی انکار کر دے۔" اماں کا وہم زبان پر آگیا۔

"ایسا نہیں ہوگا اماں! میں بھلا اپنے پیاروں کو چھوڑ سکتا ہوں۔ مجھے اپنے وطن سے اور اپنے لوگوں سے بہت پیار ہے اماں! میں تو بس کچھ عرصے کے لیے جانا چاہتا ہوں۔ میں بھلا آپ لوگوں سے الگ ہو کر رہ سکتا ہوں۔"

"تو پھر شادی سے انکار کیوں کر رہا ہے۔" ان کی سوئی ادھر ہی اٹکی تھی۔

"میں آزادی سے کام کرنا چاہتا ہوں۔ شادی کی ذمہ داری برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اچھا تو پھر نکاح کر کے چلا جا۔" وہ کچھ نرم ہوئیں۔

"اماں پلیز! سمجھنے کی کوشش کریں۔ اڑنے سے پہلے میرے پر نہ باندھیں۔ میں ایسے کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔" میں زچ ہو گیا۔ پتا نہیں کیا بھوت سوار ہو گیا تھا ان کے ذہن پر۔

"چل ٹھیک ہے خضر کی ماں! نہ اس کی نہ تیری۔ ایسا کرتے ہیں جانے سے پہلے باقاعدہ منگنی کی رسم کر دیتے ہیں۔" ابا نے مصالحتی انداز اپنایا۔

دونوں کسی نہ کسی طرح مجھے پابند کرنا چاہتے تھے۔

نجانے کون سے وسوسے تھے ان کے دل میں۔
"کیوں پتر ٹھیک ہے۔ اس پر تو راضی ہے ناں تو۔"
"جی! ٹھیک ہے جیسے آپ مناسب سمجھیں۔" ناچار مجھے ماننے ہی بنی۔ میں ان کا مان نہیں توڑنا چاہتا تھا۔

آنے سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے ہماری منگنی کی باقاعدہ رسم ادا کر دی گئی تھی اور اس روز پہلی بار میں نے ملیحہ کے چہرے پر دھنک رنگ بکھرتے ہوئے دیکھے تھے۔

چونکہ ہم شروع سے ماموں کے گھر رہنے جاتے تھے اس لیے اب بھی کوئی پابندی نہ تھی۔ منگنی والے روز میں ماموں کے کہنے پر ساتھ ہی گیا تھا اپنے خاندان کے ہی سارے نزدیکی لوگ مدعو تھے۔ اسی لیے مجھے تو سب کچھ معمول ہی لگ رہا تھا لیکن ملیحہ کو میں نے پہلی بار شرماتے ہوئے دیکھا تھا۔

میں کچن میں داخل ہوا تھا جب وہ انگلی میں پڑی انگوٹھی کو گھماتے ہوئے شوخی سے کچھ گنگنا رہی تھی۔ میری اچانک آمد پر بری طرح گھبرا گئی اور چہرہ شرم سے سرخ پڑ گیا۔ باقی دونوں کزنز وہیں کھڑی تھیں اور وہ جھپاک سے کچن سے نکل گئی تھی۔ مجھے اس کا یہ انداز خاصا انوکھا اور قدرے اچھا لگا تھا۔

ایک انگوٹھی نے تعلقات کے رنگ کیسے بدلے تھے۔ کہاں وہ لاپرواہ سی ملیحہ اور کہاں یہ گھبرائی شرمائی سی لڑکی۔ یقیناً وہ اس منگنی سے بے حد خوش تھی۔ تب ہی تو سلونے چہرے پر گلاب کھلے پڑے تھے۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر میرا دل بھی خوشگوار انداز سے دھڑکا تھا گویا میں نے اس رشتے کو خوش دلی سے قبول کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اماں تو جیسے منگنی کی رسم ادا کر کے پوری طرح مطمئن ہو گئی تھیں۔ گویا انہوں نے اپنے تئیں مجھے ایک ڈور سے باندھ لیا تھا۔ اب انہیں میرے امریکہ جانے پر پہلے جیسا اعتراض نہیں تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے وقتاً فوقتاً کوئی نہ کوئی نصیحت ضرور کرتی رہتی تھیں۔ جو یقیناً میری منگنی یا منگیتر سے متعلق ہوتی تھیں۔

"دیکھو بچے! ہماری ناک نہ کٹوا دینا برادری میں۔"
"دیکھو بچے گوری چمڑی دیکھ کر پھسل نہ جانا۔"
"بزرگوں کے فیصلے کی لاج نبھانا۔"
"ملیحہ معصوم بچی ہے۔ اس کا دل نہ توڑنا۔"
"تیرے باپ کی خاندان میں بڑی عزت ہے' خیال رکھنا۔"

یہ وہ تمام جملے تھے جو میں تیاری کے دوران پچھلے کئی دنوں سے سنتا رہتا تھا۔ بلکہ ان کی تو کوشش تھی کہ ہم دونوں کا زیادہ سے زیادہ سامنا ہو۔ تب ہی وہ مجھے بہانے بہانے سے ماموں کے گھر بھیجتی رہتی تھیں اور میں بھی ان کی خوشنودی کے لیے چلا جاتا تھا۔ میرے وہاں جانے سے غالباً ان کی تشفی ہوتی تھی کہ اس ملنے جلنے سے یا کم از کم دیکھ لینے سے میرے دل میں اس کی محبت جڑ پکڑ لے گی یا کوئی ان دیکھی ڈور ایسے جکڑ لے گی کہ مجھے واپس کھینچ لائے گی یا شاید اس کی زلفوں کا ایسا اسیر ہو جاؤں گا کہ وہاں کسی پری کا جادو نہ چلے گا۔ نہ جانے انہیں کیسے وہم اندیشے تھے جو وہ ایسی تدبیریں کر رہی تھیں اور صرف یہی نہیں میرے جانے سے ایک روز قبل انہوں نے اسے گھر ہی بلا لیا تھا۔

"طاہرہ (میری بہن) رہنے آئی تو میں نے اسے بھی بلا لیا۔ سوچا ابھی تو گھر میں رونق ہے۔ اس کا دل بھی لگ جائے گا۔ ورنہ تم چلے جاؤ گے تو میرے اکیلی کے پاس کس نے آنا ہے۔"

انہوں نے بڑی سوچ سمجھ کر دلیل پیش کی۔ طاہرہ تو واقعی کم کم ہی رہنے آئی تھی لیکن میرے جانے سے بھلا اس کے نہ آنے کا کیا جواز تھا۔ میں مسکرا کر رہ گیا۔ میری بھولی بھالی اماں کو بیٹے کو قابو کرنے کے لیے کیسی کیسی چالاکیاں آ گئی تھیں۔

اس رات گیارہ بجے میری فلائیٹ تھی۔ گھر سے آٹھ بجے نکلنا تھا۔ آدھا گھنٹہ تو راستے میں ہی لگ جاتا

تھا۔ سات بجے نہا کر میں جلدی جلدی تیار ہونے لگا۔ استری شدہ کپڑے پلنگ پر رکھے تھے۔

"یہ آپ کا سامان۔" وہ باتھ روم سے شیونگ کٹ اور پرفیوم وغیرہ اٹھا لائی تھی۔

"یہ میرے Camy Bag میں رکھ دو اور ہاں ذرا نظر دوڑاؤ کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔" میں نے جرابیں پہنتے ہوئے کہا۔

"یہ پاسپورٹ وغیرہ؟"
"یہ باہر ہی رہنے دو۔ جیب میں رکھوں گا۔"
"ٹھیک ہے۔"
"کیا بات ہے؟" اس کی متورم آنکھیں دیکھ کر میں نے پوچھا۔
"کچھ نہیں۔"
"تم رو رہی ہو.....؟" اس کی بھیگی سی آواز پر میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں امڈنے والے آنسوؤں کو وہ یقیناً بڑی مشکل سے روک پا رہی تھی۔

"اس میں رونے والی کیا بات ہے۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔ اس نے نظر اٹھا کر بڑی متعجب نظروں سے مجھے دیکھا گویا یہ بڑی اچھنبے کی بات ہو۔

"ارے بھئی! میں کون سا ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ واپس تو یہیں آنا ہے۔"

میں نے پاسپورٹ اور ٹکٹ وغیرہ جیب میں ڈالے۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو۔"
وہ کچھ نہیں بولی۔ مگر مجھے دیکھا ضرور۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں ہزاروں وہم اور اندیشے تھے۔

"دیکھو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے واپس اپنے پیاروں کے پاس ہی آنا ہے۔ میں بھلا ان سب کے بغیر رہ سکتا ہوں۔" میں نے اپنے طور پر اسے تسلی دی۔

"تو پھر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" اس نے جیسے گلہ کیا۔

"ضرورت ہے۔ تب ہی تو جا رہا ہوں میں تمام عمر ایک تنخواہ کے بعد اگلی تنخواہ کے لیے دن نہیں گننا چاہتا۔ زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے اور آگے تب ہی بڑھا جاتا ہے۔ جب انسان جدوجہد کرے۔"

میں نے گھڑی باندھتے ہوئے اسے سمجھانا چاہا۔ وہ چند سیکنڈ خاموش کھڑی رہی۔ جیسے کسی اور جملے کی منتظر ہو اور پھر چپ چاپ باہر نکل گئی۔ وہ کیا سننا چاہتی تھی میں بخوبی جانتا تھا۔ مگر میں اسے کسی عہد و پیماں میں نہیں باندھنا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

بارش بڑے زوروں سے ہو رہی تھی۔ میں رات گئے تک کام کرتا رہا تھا۔ سو صبح دیر تک سویا رہا۔ آنکھ کھلی تو چار بجنے کو تھے۔ بھوک بڑی شدت سے لگ رہی تھی۔ کھانا بنانے میں کچھ ٹائم لگتا۔ لہٰذا میں منہ ہاتھ دھو کر باہر آ گیا۔

Jack in the Box سے سینڈوچ لیے پارکنگ سے گاڑی نکال کر مین روڈ پر آیا تو میری نظر اس پر پڑی۔ وہ بس سٹاپ پر کھڑی یقیناً بس کا انتظار کر رہی تھی۔ بارش اب بھی زوروں سے ہو رہی تھی۔

"ہائے!" میں نے گاڑی اس کے قریب روکی۔
"ہائے!"
"میں ڈراپ کر دوں؟"
"نو تھینکس۔ تین منٹ میں بس آ جائے گی۔"
"میرے ساتھ آنے میں کیا حرج ہے۔ بارش ہو رہی ہے۔ بس تو اسٹاپ پر اتارے گی۔ میں گھر پر اتاروں گا۔"
"اوکے۔" خلاف توقع وہ میری بات فوراً ہی مان گئی۔
"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔" وہ کچھ سست دکھائی دے رہی تھی۔
"ٹمپریچر ہے!" اس نے بتایا تو میں سمجھ گیا کہ اسی لیے وہ سواری لینے پر تیار ہو گئی تھی۔
"جاب سے آ رہی ہیں؟"
"ہاں۔"

"طبیعت خراب تھی تو آپ کو آج ریسٹ کرنا چاہیے تھا۔"

"چھٹی افورڈ نہیں کر سکتی۔ پہلے ہی پارٹ ٹائم جاب کرتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے مگر صحت کا خیال رکھنا زیادہ ضروری ہے۔ یہاں پر بیمار ہونا کوئی بھی افورڈ نہیں کر سکتا۔"

"تھرٹی تھری برمنگھم اسٹریٹ.....!" میری بات کے جواب میں اس نے ایڈریس بتایا۔ تو میں چپ چاپ ڈرائیو کرنے لگا۔

"اندر آئیں گے؟" خوب صورت سے اپارٹمنٹ کے سامنے گاڑی روکنے کا کہہ کر اس نے یقیناً "مروتاً" پوچھا تھا۔ لیکن میں سچ مچ اتر آیا۔ جانے کیوں میں انکار نہیں کر سکا تھا' حالانکہ اس کے لہجے میں کوئی اصرار نہیں تھا۔ شاید مجھے اس کی لاتعلقی' بیگانگی اور کج ادائی اچھی لگتی تھی۔ بہرحال میں اس سے پوچھے بغیر اندر آگیا۔

"آپ کا گھر بہت اچھا ہے۔" تین بیڈ روم کا صاف ستھرا اپارٹمنٹ تھا۔

دل چاہا اس کی فیملی کے بارے میں پوچھوں۔ لیکن پھر زیادہ پرسنل ہونا اچھا نہ لگا۔ یہاں بچے بالغ ہونے کے بعد جہاں جی چاہے' رہتے تھے۔ شاید وہ بھی اکیلی رہتی تھی۔

"کھانا کھایا آپ نے؟"

"نہیں۔"

"پھر تو آپ کو پہلے کچھ کھانا چاہیے۔ پھر دوائی لیں۔"

"ہاں میں دیکھتی ہوں کچھ۔" اس کا چہرہ بخار کی حدت سے سرخ ہو رہا تھا۔

"میں سینڈوچ لے کے آیا ہوں۔ وہ کھالیں' میں ابھی گاڑی سے لے کے آتا ہوں۔" میں اٹھنے لگا۔

"نہیں پلیز! میں نہیں کھاؤں گی۔"

"آپ تکلف نہ کریں۔ اس حالت میں باہر کیسے جائیں گی۔"

"میں کھانا گھر پر ہی بناتی ہوں۔ اس لیے آپ فکر

نہ کریں۔ کچھ نہ کچھ رکھا ہو گا فریج میں۔"

"واقعی۔" میں حیران ہوا۔ یہ واقعی حیرت کی بات تھی کہ وہ پڑھتی بھی تھی۔ جاب بھی کرتی تھی اور کھانا بھی گھر کا کھاتی تھی۔ حالانکہ یہاں پر کام کرنے والی لڑکیاں زیادہ تر باہر سے ہی کھاتی تھیں۔ مگر یہ لڑکی تھوڑی مختلف سی لگتی تھی۔

"اوکے! میں چلتا ہوں۔"

"اوکے۔" وہ یقیناً "اسی جملے کی منتظر تھی۔

"اپنا خیال رکھیے گا۔"

"اوکے۔" وہ دروازے تک آئی۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو میں کل آپ کی خیریت معلوم کرنے آجاؤں؟"

"شیور۔" اب بھلا وہ اور کیا کہتی۔

"تھینک یو.....

بائے.....

"بائے۔"

☼ ☼ ☼

اگلے روز میں دن کے تین بجے جاگا تھا۔ آج کام سے آف تھا لہٰذا کوئی جلدی نہ تھی۔ نہا دھو کر تھوڑے سے ناچو بنائے۔ جب کھانا بنانے کا موڈ نہ ہو تو میں اسی طرح کی چیزیں استعمال کیا کرتا تھا۔ کھانے کے بعد برتن دھو کر رکھے..... چابی اٹھائی اور گاڑی لے کر سیدھا اس کے اپارٹمنٹ آگیا۔

بیل بجائی تو دروازہ اسی نے کھولا تھا۔ اس کا تمتمایا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ بخار کی شدت ابھی بھی ہے۔ مجھے اپنی کم عقلی پر شرمندگی ہوئی۔ اس کے لیے کچھ لے ہی آتا۔ کیسے خالی ہاتھ چلا آیا تھا۔

"بیٹھو۔"

"تھینک یو۔ کیسی ہیں اب؟"

"ٹمپریچر ہے۔"

"دوائی کھائی ہے؟"

"ہاں ٹیبلٹ لی ہے۔"

"کچھ فرق پڑا ہے اس سے؟"

"ہاں رات کو تیز تھا۔ اب پہلے سے بہتر ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے۔ میں جلدی میں آگیا۔ ورنہ آپ کے لیے کچھ بنا کے لے آتا۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میری روم میٹ نے کھانا بنایا ہے۔ وہ ابھی ابھی جاب پر گئی ہیں۔"

"تمہارے ساتھ روم میٹ ہے۔"

"ہاں دو روم میٹ ہیں۔ دراصل یہ گھر میری ایک آنٹی کا ہے۔ میرے ساتھ دو لڑکیاں اور شیئر کرتی ہیں۔ یہ سامنے والا بیڈ روم آنٹی کا ہے۔" اس نے پہلی بار تفصیل سے کوئی بات کی تھی۔

"اور تمہاری آنٹی بھی جاب پر ہوں گی اس وقت۔"

"نہیں۔ وہ دو دن قبل ہی اپنے رشتے داروں سے ملنے دوسری اسٹیٹ گئی ہیں۔"

"آپ اس وقت اکیلی ہیں۔ کسی قسم کی ہیلپ چاہیے تو بلاجھجک بتائیں۔ مجھے آپ کے کام آکے خوشی ہو گی۔" میں نے بڑی پرخلوص پیشکش کی تھی۔

"نہیں شکریہ۔ میں ٹھیک ہوں۔ ویسے بھی یہاں پر اکیلے رہنا ایسا مشکل نہیں ہے۔ یہاں ہر چیز کا سلوشن ہوتا ہے۔"

"وہ تو اب میں بھی سمجھ گیا ہوں۔ ایک کال پر پولیس اور ایمبولینس مدد کے لیے آپ کے دروازے پر ہوتی ہے۔ اینی وے اب آپ ریسٹ کریں اور ہاں کل بھی جاب پر مت جائیں۔" میں نے نصیحت کی۔

"نہیں۔ کل تک بہتر ہو جاؤں گی۔ دو چھٹیاں افورڈ نہیں کر سکتی۔"

"لیکن کام کرنے کے لیے صحت مند ہونا بھی ضروری ہے۔ کہیں تھکاوٹ سے دوبارہ بیمار نہ ہو جائیں۔"

"ڈونٹ وری۔ میں اتنی نازک نہیں ہوں۔"

"اوکے! میں اب چلتا ہوں۔" میں نے ٹیبل سے چابی اٹھائی۔

"اوکے!"

"اپنا خیال رکھیے گا۔"

"آل رائٹ۔"

"بائے' بائے۔" اس نے ہاتھ ہلا کر دروازہ بند کیا۔

☼ ☼ ☼

رمضان المبارک کا رحمتوں' برکتوں والا مہینہ شروع ہوا تو پہلے روزے پر ہی اماں کا فون آگیا۔

"رمضان مبارک ہو تجھے بیٹا۔"

"آپ کو بھی اماں۔ روزہ رکھا آپ نے؟"

"ارے بیٹا ابھی تو چاند نظر آیا ہے۔ صبح ہو گا پہلا روزہ۔"

"اوہ ہاں' دراصل یہاں آج روزہ ہو چکا ہے ناں۔"

"ارے بچے تو کہاں جا کے بیٹھ گیا ہے۔ تاریخیں ہی بدل جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں دو ہو تو تیری پہلی ہوتی ہے۔ ہمارے اتوار کو تیرا ہفتہ' ہماری صبح تو تیری رات۔ تیرا روزہ پہلے ہمارا بعد میں۔"

"چھوڑیں اماں! اتنی دور بیٹھا ہوں تو ایسا ہی ہو گا ناں!"

"اچھا بیٹا! پورے روزے رکھنا۔ تجھے پتا ہے' ہم دین دار لوگ ہیں۔ تمام عمر نماز روزہ قضا نہیں ہونے دیا ہم نے۔" انہوں نے وہاں بیٹھ کر یاددہانی کروائی۔

"ہاں اماں! آپ فکر نہ کریں۔ ان شاءاللہ پورے روزے رکھوں گا۔"

"کیا کھایا تھا سحری میں؟" انہیں فکر ہوئی۔

"آلو بینگن بنائے تھے اماں۔"

"ہائے میرا بچہ! ہل کر پانی تک نہ پیتا تھا۔ کن چکروں میں پڑ گیا۔"

"اماں یہاں ایسے ہی ہوتا ہے۔ آپ خوامخواہ پریشان نہ ہوا کریں۔ یہاں نوکر چاکر نہیں ہوتے۔"

"اچھا تو افطاری کے لیے اذان کیسے سنے گا۔ وہاں تو مسجد بھی اکا دکا ہی ہو گی۔"

"کمپیوٹر پر اذان ہو جاتی ہے۔" میں نے اطمینان دلایا۔

"اے لو کمپیوٹر کو وقت کا کیا پتا۔ کہیں روزہ مکروہ نہ ہو جائے۔" انہوں نے تشویش سے کہا تو مجھے ان کی

سادگی پر ہنسی آگئی۔ میرے لیے وہ ایسے ہی فکر مند رہتی تھیں۔ بڑی مشکل سے مطمئن کرپاتا تھا انہیں۔

"اور سنائیں اماں! سب خیریت ہے۔" میں نے بات بدلی۔

"شکر ہے اللہ کی ذات کا' ارے ہاں ملیحہ نے کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔" انہوں نے اپنے تئیں بہت بڑی خوش خبری سنائی۔ جب میں یہاں آیا تھا تو وہ میٹرک کرکے پڑھائی چھوڑ چکی تھی۔

"یہ تو اچھی بات ہے لیکن اب کیا سوجھی اسے؟"

"لو! تو امریکہ چلا گیا تو کیا وہ نہ خود کو تیرے مطابق تیار کرے۔ تو انگریزی بولے گا تو اس کو بھی تو آنی چاہیے نا۔ میں نے ہی کہا تھا آگے پڑھنے کو اور اس نے فوراً" میری بات مان لی۔ بڑی سعادت مند بچی ہے۔"

اماں اس کی تعریف کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھیں۔ کچھ دیر ان سے مزید بات کی پھر ابا سے سلام دعا کرکے میں نے فون بند کردیا۔

☼ ☼ ☼

رمضان کا مہینہ ایسی مصروفیت میں گزرا کہ پتا ہی نہ چلا۔

عید کی نماز پڑھ کر میں دوستوں کے ساتھ قریبی پارک میں آگیا۔ مسلم کمیونٹی نے یہاں عید پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ مسجد سے تمام لوگ سیدھا ادھر ہی جمع ہو کر عید کی خوشیاں منا رہے تھے۔ مرد حضرات کھانے کا انتظام کررہے تھے۔ بچے کھیل کود میں اور عورتیں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ ایک جانب باربی کیو کی زبردست خوشبوئیں تھیں تو دوسری طرف رنگین آنچل' مہندی اور چوڑیاں بہار دکھا رہی تھیں۔ تصویریں' مووی' ہنسی مذاق سب کچھ ہو رہا تھا۔ پاکستان کی کسی بارونق سی شادی کا گمان ہورہا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں کچھ دیر دوستوں کے ساتھ بیٹھا گپیں لگاتا رہا پھر جب خالد اور تنویر جانے کے لیے اٹھے تو میں بھی اٹھ گیا۔

اسی ہٹو سے گزرتے گزرتے من میں جانے کیا سمائی کہ میں نے گاڑی کا رخ اس کے گھر کی جانب موڑ دیا۔

بیل بجانے کے بعد احساس ہوا کہ میں غلط حرکت کر بیٹھا ہوں۔ یہاں پر اس طرح منہ اٹھا کر کسی کے گھر چلے جانا مناسب نہیں تھا اور نہ جب کوئی دوستی بھی نہ ہو تو کم از کم فون ضرور کرلینا چاہیے۔ یہاں پر لائف بڑی بزی ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ گھر پر موجود بھی نہ ہو۔ عید تو مسلمانوں کی تھی۔ باقی سب تو معمول کے مطابق اپنی جاب کررہے تھے۔ بہرحال میں بیل بجا چکا تھا۔ اب کیا ہوسکتا تھا۔

میں خفت زدہ سوچ رہا تھا کہ ڈور کھلا اور کھولنے والی وہی تھی۔ اس نے تعجب سے مجھے دیکھا اور میں مزید شرمندہ ہوگیا۔

"وہ۔۔۔ تھوڑا سا پانی چاہیے۔۔۔ میری گاڑی گرم ہوگئی ہے۔"

انتہائی بودا بہانہ تھا۔ اس کا اپارٹمنٹ مین روڈ سے اوپر جاتی ہوئی پہاڑی کی عین چوٹی پر تھا۔ گرم گاڑی کے لیے پانی ڈھونڈنے کوئی اتنی بل کھاتی سڑکوں سے ہو کر پہاڑی کی چوٹی پر نہیں جاتا۔ مگر فی الحال مجھے یہی سوجھا تھا۔

"اندر آجائیں۔" اس نے کہا تو میں پیچھے چلا آیا۔

"سوری آپ کو ڈسٹرب کیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" اس نے بوتل مجھے تھمائی۔

"آپ آج گھر پر ہیں۔ میرا خیال تھا شاید آپ جاب پر ہوں گی۔"

"میں فرائیڈے کو آف لیتی ہوں۔"

"اوہ اچھا۔"

"بیٹھیں۔" اس نے اخلاقاً" کہا اور میں سچ مچ بیٹھ گیا۔

"طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔"

اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ یوں جیسے کچھ دیر قبل روتی رہی ہو۔ پلکیں ابھی بھی بھیگی بھیگی سی تھیں۔ نجانے اس پیاری سی لڑکی کے کیا مسئلے تھے۔ یہ ہمیشہ ہی مجھے الجھی ہوئی سی لگتی تھی۔

کچھ سوچتی ہوئی' کچھ مضطرب سی۔

دل تو چاہا اس سے کچھ پوچھوں۔ مگر اسے شاید اچھا نہ لگتا۔ لہٰذا ارادہ بدل دیا۔

"آج ہماری عید ہے۔" میں نے یونہی بات کرنے کو کہا۔

"یہ پورا مہینہ فاسٹنگ (روزہ) کا تھا۔ میں عید فیٹر سے آرہا ہوں۔" وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ کہتی بھی کیا۔ یقیناً" اسے عید کے بارے میں پتا بھی نہیں ہو گا۔

"آپ کی آنٹی جاب پر ہیں یا ابھی واپس ہی نہیں آئیں۔" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے موضوع بدلا۔

"ابھی واپس نہیں آئیں۔ عید کرنے ہی تو گئی ہیں وہ۔"

"اوہ' وہ مسلم ہیں۔"

"ہاں۔"

"اور آپ کی روم میٹ کہاں ہیں۔ لگتا ہے آج بھی اکیلی ہیں گھر پہ۔"

"وہ دونوں بھی اپنی فیملیز کے ساتھ عید گزارنے گئی ہیں۔"

"وہ بھی مسلم ہیں!" اب کے مجھے واقعی حیرت ہوئی۔ میں سوچ رہا تھا اسے عید کا پتا بھی نہیں ہو گا لیکن وہ مسلمانوں کے درمیان رہ رہی تھی۔

"پھر تو آپ ہمارے تہواروں کے متعلق بہت کچھ جانتی ہوں گی۔"

"ہاں۔ بہت کچھ۔" اس کے سادہ سے لہجے میں کوئی تاثر نہیں تھا۔

"آپ آئیں ناں کبھی میرے گھر۔۔۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"بس ایسے ہی۔ میں آتا ہوں تو آپ بھی آئیں۔ اب ہم دوست تو بن ہی گئے ہیں۔" میں زبردستی دوستی کا دعوا کررہا تھا۔ حالانکہ اس نے تو کبھی فالتو بات ہی نہ کی تھی۔ مجھے یہ لڑکی عجیب سی لگتی تھی۔ ایسی بند کتاب جس پر کوئی ٹائٹل نہیں تھا اور جانے کیوں میں اسے پڑھنا چاہتا تھا۔ شاید ہر پراسرار چیز کے لیے انسان ایسے ہی متجسس ہوتا ہے۔

"آئیں گی نا۔۔۔"

وہ ہلکے سے مسکرادی اور یقیناً" یہ جواب مثبت تھا۔ گھر آکر بھی میں اس کے متعلق سوچتا رہا۔

اپنی ذات کے گنبد میں بند وہ بڑی گم صم سی لڑکی تھی۔ دوسری لڑکیوں سے قطعی مختلف۔

کبھی کبھی تو وہ بہت ہی تنہا محسوس ہوتی تھی۔ جبکہ یہاں کی لڑکیاں نہ تو اس قدر خاموش اور اداس ہوتی ہیں اور نہ تنہائی کا شکار۔ یہاں پر زندگی کا مطلب ہی انجوائے منٹ ہے نجانے یہ ان سب سے الگ کیوں دکھائی دیتی تھی۔

☼ ☼ ☼

میں میڈیکل کے کچھ کورسز کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کالج میں ایڈمیشن لے لیا۔ ظاہر ہے ساری عمر ٹیکسی تو چلانی نہیں تھی اس لیے سوچا کچھ کرلوں۔ اس ملک میں ایک فائدہ تھا کہ محنت کرنے والوں کے لیے آگے بڑھنے کے چانس ہمیشہ رہتے تھے۔ کچھ بھی کرنا چاہو ہزاروں راستے منتظر ملتے ہیں۔ طرح طرح کی آرگنائزیشنز' قدم قدم پر آفیشل مددگار' کونسلز آپ کی رہنمائی کو تیار اور میں ان سب سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ کریئر ایڈوائزر سے مشورہ کرکے میں نے یہ لائن منتخب کی تھی۔

چند روز بعد کلاسز شروع ہوگئی تھیں۔ زندگی پہلے سے بھی مصروف ہوگئی تھی۔ رات کو ٹیکسی اور دن کو پڑھائی۔ خاصا ٹف شیڈول تھا میرا۔ کالج سے سیدھا کام پر نکل جاتا۔ رات دو تین بجے واپس آکر جو سوتا تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔

ان ہی مصروفیات میں وہ مجھے ایک بار مسجد کے سامنے والی حلال مارکیٹ میں نظر تو آئی تھی لیکن میرے پاس وقت نہیں تھا۔ اس لیے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

شب و روز ایک تواتر سے گزر رہے تھے۔ اس

دوران اماں کے خطوط اور نصیحت بھرے فون اپنے معمول کے مطابق آتے رہتے تھے۔

آج کل کرسمس کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ ہر چھوٹے بڑے اسٹور پر سیل لگی ہوئی تھی۔ شاپنگ مالز پر لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ خریدنے والے دھڑادھڑ فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ہر طرف رونق' ہر طرف گہما گہمی۔ کئی روز پہلے سے گھروں کی سجاوٹ اور لائٹنگ شروع ہو گئی۔ پورا شہر رنگ و بو اور روشنیوں میں نہا گیا تھا۔ اس روز کرسمس تھا۔ مکمل ہالیڈے۔

اور یہاں پر ایک عجب بات یہ تھی کہ کرسمس والے دن ہماری عید والی رونق اور گہما گہمی نہیں ہوتی۔ نہ کوئی شور نہ ہنگامہ۔

بلکہ ہر طرف ایک سناٹا سا ہوتا ہے۔ لوگ اس روز گھروں سے نکلتے ہی نہیں۔ ہر کوئی اپنی فیملی کے ساتھ کرسمس مناتا۔ گھروں کے اندر ہی پارٹیاں وغیرہ ہوتیں۔ چونکہ تیاریاں کئی روز پہلے سے شروع ہوتی تھیں لہٰذا ہمارے ہاں والی چاند رات جیسا بھی کوئی معاملہ نہیں تھا۔ تمام شاپنگ مالز اور سپر مارکیٹیں زیادہ سے زیادہ رات دس بجے تک بند ہو جاتی تھیں اور پھر کرسمس کے روز کوئی شخص باہر نظر نہیں آتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی تھا۔ میں گھر پر بور ہو رہا تھا۔ گاڑی لے کر لانگ ڈرائیو پر نکل آیا اور لانگ ڈرائیو کا مزا تو حقیقتاً" یہیں تھا۔ قدرتی مناظر دیدہ زیب تھے۔ پہاڑ' ندیاں' جنگل' سرسبز میدان' چھوٹی بڑی جھیلیں' قدرتی پھوٹتے ہوئے چشمے اور خوب صورت گھروں کے آگے پھلوں سے لدے ہوئے درخت۔ پل بھر کو تو لگتا تھا جیسے دنیا سے نکل کر جنت میں داخل ہو گئے ہیں۔ خدا نے اس ملک کو بڑی فیاضی سے قدرتی خوب صورتیوں سے نوازا تھا۔ لیکن یہاں کے لوگوں نے بھی اس نعمت کی بڑی قدر کی تھی۔ اپنی عقل و فہم سے اسے چار چاند لگا دیے تھے۔ یہاں کا سسٹم ایسا تھا کہ کوئی اپنے ذاتی مفاد کے لیے ایک درخت تک نہیں کاٹ سکتا تھا۔ یہاں تک کہ قدرتی مناظر اگر گھر کے اندر بھی آجائیں تو انہیں نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں تھی۔ کئی گھروں کے اندر سے قدرتی کریک (ندی) گزر رہی ہوتی' کہیں چھوٹی سی پہاڑی' کہیں جنگل کا کچھ حصہ گھروں کے اندر آجاتا تو اسے کاٹ چھانٹنے کے بجائے اس طرح سے برقرار رکھا جاتا کہ گھر کی خوب صورتی کو مزید دیدہ زیب بنا دیتا۔

میں جب بھی تنہائی محسوس کرتا گاڑی لے کر اسی طرح گھومنے نکل جاتا۔ اونچی نیچی بے ترتیب پہاڑیوں پر انتہائی ترتیب سے بنے بے حد خوب صورت گھروں کو دیکھتا رہتا۔ کبھی کبھی تو لگتا ہم بالکل ہی گھنے جنگل میں پہنچ گئے ہیں۔ مگر ذرا سی گردن گھما کر دیکھو تو انتہائی خوب صورت گھر اور بیچوں بیچ کشادہ سڑکیں' آزادی سے گھومتے پھرتے ہرن کہ پل بھر انسان مبہوت رہ جائے۔ ایک گھر بالکل پہاڑ کی چوٹی پر تو دوسرا بالکل وادی کی گہرائی میں بڑے مسحور کن مناظر تھے۔

"اگر دنیا اتنی خوب صورت ہے تو جنت کیسی ہو گی۔" میں نے یہاں آکر اکثر یہی سوچا تھا۔ یونہی گھومتے گھومتے میں روز گارڈن آگیا۔ یہ بڑا خوب صورت پارک تھا اور حقیقتاً" روز گارڈن ہی تھا۔ سینکڑوں قسم کے موسمی گلاب یہاں ہر موسم میں بہار دکھا رہے ہوتے۔

کرسمس کی وجہ سے آج یہاں لوگ نہ ہونے کے برابر تھے اور جو تھے وہ بھی دوسرے مذاہب کے تھے۔ چلتے چلتے گلابی پھولوں کے تختے کے پاس میں ٹھٹک کر رک گیا۔

کچھ ہی فاصلے پر سفید پھولوں کے کنج کے اس طرف سنگی بنچ پر وہ بیٹھی تھی میں بے ساختہ ہی آگے بڑھ آیا۔

"ہائے میری!"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ نجانے کس گہری سوچ سے جاگی تھی وہ۔

"آپ۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھو ناں۔" میرے کہنے پر وہ بیٹھ گئی۔ میں بھی ذرا ہٹ کر اسی بنچ پر بیٹھ گیا۔

"کیسی ہیں؟"

"فائن۔" مختصر ترین جواب تھا۔

"حیرت ہے تم آج کے دن یہاں۔۔۔ اکیلی!" میں اپنی حیرت چھپا نہ پایا۔

وہ چپ رہی۔

"کرسمس کے دن لوگ اپنی فیملیز کے ساتھ ہوتے ہیں اور آپ یہاں۔" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

وہ پھر بھی چپ رہی۔

"کرسمس نہیں مناتیں؟"

"نہیں۔"

"آرتھوڈکس ہیں؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"حانقاہ مناتی ہو۔" معاً" مجھے خیال آیا شاید وہ یہودی ہو اس لیے ان کے تہوار کا نام لیا۔

اس بار بھی اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"Budhist (بدھ)؟"

"نہیں۔۔۔۔" کیونکہ وہ دیکھنے میں یورپ کی نظر آتی تھی۔ پھر بھلا۔۔۔۔

"اوہ!" معاً" مجھے ایک اور خیال آیا۔ وہ Athiest (دہریہ) تھی۔

"تمہارا کوئی مذہب نہیں ہے۔"

"میرا کوئی تہوار نہیں ہے۔" وہ دھیرے سے گویا خود سے بولی تھی۔

اور میں سب کچھ سمجھ گیا۔ بہت سی گرہیں کھل گئی تھیں۔

کنچوں جیسی آنکھوں اور سنہری بالوں والی گڑیا سی لڑکی' عجیب و غریب رویہ' ڈرنک فرینڈز کے ساتھ ڈنک آؤٹ کرنا' مسلمان آنٹی کے ساتھ رہنا' عید والے روز پریشان' کرسمس کے روز اداس اور سب سے الگ تھلگ سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔

یہ بہت الجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اس کا اضطراب' اس کا روکھا پن' آنکھوں میں ہر پل کوئی تلاش۔

یقیناً" یہ راہ بھٹکی ہوئی لڑکی تھی۔ جو اندھیروں میں بھٹکتے بھٹکتے تھک گئی تھی اور اب یقیناً" روشنی کی تلاش میں تھی۔

یہاں بظاہر جتنی خوب صورتیاں تھیں در پردہ اتنی ہی غلاظت تھی۔ اکثر لوگ بچے پیدا کر کے ادھر ادھر چلے جاتے تھے۔ نہ ماں کو پرواہ ہوتی نہ باپ کو۔ کچھ عرصہ بعد کسی کو پتا بھی ہوتا اس بچے کا باپ کون ہے۔ یہ لڑکی بھی یقیناً" ایسے ہی حالات کا شکار تھی۔ ایسے بچے ننانوے فیصد اپنی ماں کے مذہب پر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ نجانے کیوں۔۔۔۔

"تم مائنڈ نہ کرو تو میرے گھر چلو گی۔"

میں نے ہمیشہ اسے کسی کشمکش میں مبتلا دیکھا تھا اور آج تو اس کا اضطراب سوا تھا۔ میں اسے تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

"کیوں۔۔۔۔؟"

"بس یونہی۔ کچھ دیر بیٹھیں گے۔ کافی پئیں گے۔"

"مگر۔۔۔۔!"

"چلو نہ پلیز۔ تم بہت Lonely (تنہا) لگ رہی ہو۔ میں بھی اکیلا ہوں کچھ دیر دل بہل جائے گا۔" میں نے پر زور اصرار کیا۔

"او کے۔" وہ خلاف توقع مان گئی۔

کچھ دیر بعد وہ میرے اسٹوڈیو میں تھی۔

"یہ کون ہیں؟" چھوٹے سے فریم میں اماں ابا کی تصویر دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"یہ میرے پیرنٹس ہیں۔ ہم تین بہن بھائی ہیں۔ بہن مجھ سے بڑی ہے۔ بھائی مجھ سے چھوٹا ہے!" میں اسے اپنے بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتانے لگا۔

"ہم بڑے سادہ مگر معزز لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں نماز روزے کی بڑی پابندی کی جاتی ہے۔ لوگ ہماری بڑی عزت کرتے ہیں۔ گاؤں میں کوئی بھی مسئلہ ہو جائے' میرے ابا ہی حل کرتے ہیں۔ عورتیں اپنے اپنے مسائل لے کر اماں کے پاس آتی ہیں جنہیں وہ بڑی خوش اسلوبی اور دانش مندی سے سلجھاتی ہیں۔ سارے گاؤں کی بچیاں میری اماں سے قرآن پڑھنے آتی ہیں۔ اماں بہت سادہ اور نیک دل خاتون ہیں۔" وہ خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔ اس سے پہلے کہ

میں اسے مزید کچھ بتاتا' اچانک خیال آیا کہ اسے بھوک نہ لگی ہو۔

"تم نے کچھ کھایا ہے؟"

"ہاں۔ میں نے بریک فاسٹ کیا تھا۔"

"بس اب تو پانچ بجنے کو ہیں۔ تمہیں بھوک لگی ہو گی۔ عجیب لڑکی ہو تم۔ اپنے آپ سے بھی لاپرواہ!" میں اسے سرزنش کرتے ہوئے کچن میں آگیا۔

اسنیکس کے طور پر تھوڑے سے کریکر اور پنیر نکالا' ساتھ مفن بنانے لگا۔

"چلو میں تمہیں اپنی فیملی کی تصویریں دکھاتا ہوں۔" اس کی بوریت کے خیال سے میں اپنی البم نکال لایا۔ جو آتے وقت اماں نے میرے سوٹ کیس میں رکھ دی تھی کہ جب دل اداس ہو دیکھ لیا کرنا۔ مگر میں نے شاید تب سے آج تک اسے نہیں کھولا تھا۔

"لو دیکھو!" میں نے البم کھول کر اس کے سامنے رکھی۔

"یہ میری پھوپھو ہیں۔ یہ ان کی بیٹیاں' یہ بہو اور یہ بیٹا۔ یہ میرے ماموں ممانی ہیں یہ ان کے بچے!" میں ایک ایک تصویر دکھاتے ہوئے بتا رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟" ملیحہ کی بڑی سی تصویر البم سے پھسل کر گری تھی۔ سرخ فینسی سوٹ میں دوپٹہ سر پر لیے وہ شرمائی لجائی سی کھڑی تھی۔ یہ ہماری منگنی والے دن کی تصویر تھی اور یقیناً" اماں نے خصوصاً" ساتھ رکھی تھی۔

"یہ میرے ماموں کی بیٹی ہے!" میں نے بس اتنا ہی تعارف کروایا۔

"یہ میرے دادا' دادی ہیں اور یہ چچا اور ان کی فیملی۔ اصل میں میرے یہ چچا بھی..... ارے میرے مفن۔" مفن بیک ہونے کی خوشبو آئی تو میں بات ادھوری چھوڑ کر کچن میں بھاگا۔ اوون سے ٹرے نکال کر کاؤنٹر پر رکھی۔ کافی تیار کی۔ ڈرائی فروٹ نکالے اور سب کچھ اٹھا کر باہر آگیا۔

وہ غالباً" باتھ روم گئی تھی۔ میں کریکر پر پنیر لگانے لگا۔ تھوڑی دیر میں وہ باہر آئی تو اس کی آنکھیں اور ناک سرخ ہو رہی تھی۔ منہ پر خوب چھینٹے مار کر باہر آئی تھی مگر پھر بھی اس کا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ رو کر آئی ہے۔ مجھے ندامت ہوئی۔ آج کے روز وہ پہلے ہی اداس تھی' میں نے اپنی فیملی کی تصویریں اور باتیں سنا کر اسے اور بھی اپ سیٹ کر دیا تھا۔ یقیناً" وہ بہت کچھ مس کر رہی تھی۔

"یہ مفن لو!" میں نے پلیٹ اس کی جانب بڑھائی۔

"نو تھینکس.....!" اس نے آہستگی سے کہا۔

"نہیں بھئی۔ تم میری مہمان ہو۔ تم نہیں جانتیں ہمارے مذہب میں مہمان کی کتنی عزت ہے۔ جس دسترخوان پر مہمان بیٹھا ہو اس کا حساب نہیں ہوتا۔" میں جان بوجھ کر اپنے مذہب کا حوالہ دے کر بات کر رہا تھا۔ میرے اصرار پر اس نے مفن لے لیا۔ مگر پھر میرے کہنے پر اور کچھ نہ لیا اور کافی پینے لگی۔

"اچھا کچھ نہ کھاؤ۔ مگر یہ تو لو پلیز!" میں نے ڈرائی فروٹ کی پلیٹ آگے بڑھائی تو اس نے دو چار کاجو اٹھا لیے۔ اسی دوران اس کے موبائل کی بیل بجی۔ اس کی روم میٹ کا فون تھا۔

"اب مجھے چلنا چاہیے۔" فون بند کر کے اس نے بیگ اٹھایا۔

"کیا میں تمہارا فون نمبر لے سکتا ہوں۔"

"شیور....." اس نے نمبر بولا تو میں نے اپنے سیل میں محفوظ کر لیا۔ تصدیق کرنے کے لیے اسے بیل بھی دی۔

"اوکے۔ میرا نمبر تمہارے پاس آگیا ہے۔ اسے سیو کر لو۔" اسے باہر تک چھوڑتے ہوئے میں نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بائے۔"

"بائے۔" وہ سیڑھیاں اتر گئی تو میں کچھ سوچتے ہوئے واپس آگیا۔



وہ راہ بھٹکی ہوئی لڑکی تھی جو یقیناً" منزل کی تلاش میں تھی۔ اسے رہنمائی کی ضرورت تھی۔ میرا نام خضر

ہے اور خضر کا تو مقصد ہی بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانا ہے۔ میں دکھاؤں گا اسے سچا راستہ۔

اس کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ وہ کسی کو نہیں مانتی تھی تب ہی تو کوئی مذہبی تہوار نہیں مناتی تھی۔ وہ اندھیروں میں بھٹک رہی تھی۔ میں اسے روشنی دکھاؤں گا۔ میں اسے سچے دین کی طرف بلاؤں گا۔ دعوت حق دوں گا۔

میں اسے بتاؤں گا کہ اسلام کیا ہے۔ مسلمان کیسے ہیں۔ اسلام کا پیغام کیا ہے۔ اگر ہندو، سکھ، عیسائی اور یہودی اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام کی سچائی سے متاثر ہو کر دین حق قبول کر لیتے ہیں تو میری کے لیے تو یہ اور بھی آسان ہو گا۔ وہ تو بے مقصد، بے سمت چل رہی تھی۔ تاریکیوں میں بھٹک رہی تھی اور اس کا اضطراب بتاتا تھا کہ وہ روشنیوں کی تلاش میں ہے اور یہ کام میں کروں گا۔ شاید میرے رب نے مجھے یہاں اسی مقصد کے لیے بھیجا ہو۔ اگر میرے ہاتھوں ایک منکر دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے تو میں خود کو خوش قسمت سمجھوں گا۔ وہ معصوم لڑکی اسلام قبول کرے تو اس کی نسلیں سنور جائیں گی۔ میرا چہرہ فرط جذبات سے سرخ ہو گیا تھا اور آنکھوں کی سطح نم ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

جمعہ کی نماز کے بعد میں وہیں رک گیا۔ میرے جاننے والے اور کچھ دوست احباب جن سے اکثر مسجد میں ہی ملاقات ہوتی تھی وہاں موجود تھے۔

"کیا بات ہے، واپس نہیں جانا۔" دو تین دوستوں کو رخصت کر کے میں نے تنویر کو واپس اندر کی جانب بڑھتے دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں یار! ہمدانی صاحب آئے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھوں گا۔"

"وہ کون ہیں؟"

"تم نہیں جانتے انہیں یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ اسلامک اسٹڈیز میں پی ایچ ڈی ہیں۔ اسلامک سینٹرز میں لیکچر بھی دیتے ہیں۔ ان سے بات کرنا، ان کی باتیں سننا بہت اچھا لگتا ہے۔ تم شاید کبھی نہیں ملے۔"

"نہیں تو۔۔۔؟"

"آجاؤ پھر کچھ دیر بیٹھتے ہیں ان کے پاس!" اس نے کہا تو میں اس کے ساتھ چلا آیا۔ مسجد کے برآمدے میں وہ کچھ لوگوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ کریم کلر پینٹ، دھاری دار شرٹ وہ بڑے سوبر سے لگ رہے تھے۔ مسکراتا چہرہ، کنپٹیوں کے سفید بال، آنکھوں پر نظر کا گولڈن چشمہ، عمر پچاس کے لگ بھگ پہلی نظر میں ہی ان کی پرسنالٹی انتہائی متاثر کن تھی۔

کسی نے شاید کوئی سوال کیا تھا اور وہ بڑی سنجیدگی سے اور مدبرانہ انداز میں اس کا جواب دے رہے تھے۔ حاضرین محفل بڑی توجہ اور خاموشی سے ہمہ تن گوش تھے۔ ہم دونوں بھی چپ چاپ ان کے دائیں جانب بیٹھ گئے۔

"دیکھو، کسی کو دعوت حق دینا بڑا آسان ہے۔ مگر سوچو تم اسے قائل کیسے کرو گے۔ کسی کو مسلمان بنانے کے لیے پہلے تمہیں خود رول ماڈل بننا ہو گا۔ اسلام تلوار کے زور پر نہیں پھیلا تھا۔ اخلاق سے متاثر ہو کر پھیلا ہے۔ لوگ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرتے تھے۔ آج اگر کوئی دائرہ اسلام میں آنا چاہے تو ہمارے اعمال و اخلاق دیکھ کر پیچھے ہٹ جائے گا۔ دین عمل سے مکمل ہوتا ہے سبق سے نہیں۔

ہم کسی کو کیسے متاثر کر سکتے ہیں۔ ہمارے قول و فعل میں ہی تضاد ہے۔ ہم کہتے ہیں ہمارے مذہب میں حرام کھانا منع ہے اور ہم یہاں پر ہر طرح سے حرام کھاتے ہیں اور عجب بات تو یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو اس کی پرواہ بھی نہیں ہیں۔ ہم حلال گوشت کھا کر خود کو پرہیز گار سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن باقی سب کچھ کھاتے ہیں۔ جانتے ہو یہاں پر روٹی، نان، کیک، مفن، ڈونٹ، آئسکریم ہر چیز حرام ہے۔ یہاں کا میک اپ، کریمیں، لوشن، ٹوتھ پیسٹ حتیٰ کہ ٹوتھ برش تک حرام ہے۔ چیونگم، چاکلیٹ، ٹافیاں نہ صرف خود کھاتے ہیں بلکہ یہاں سے جاتے ہوئے اپنے عزیزوں کے لیے بھی تحفتاً" لے کر جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر ہم انہیں خریدنے سے پہلے ان پر لکھی ingrediants کو پڑھ لیں تو یقیناً" اس گناہ سے بچ سکتے ہیں اور اب تو انٹرنیٹ کی سہولت بھی موجود ہے ایک منٹ میں حلال حرام پروڈکٹس کی فہرست سامنے آجاتی ہے لیکن کسے فرصت ہے ان چکروں میں پڑا رہے۔

کیا کہیں گے ہمارے مذہب میں بے حیائی نہیں ہے لیکن ہم ویلنٹائن ڈے مناتے ہیں۔ اسلام میں ہولوین ڈے کا کوئی تصور نہیں ہے لیکن ہمارے اسکولوں میں محض مغرب کی تقلید کے لیے بلا سوچے سمجھے منایا جا رہا ہے اور تو اور ٹی وی ڈرامے ہی دیکھ لیجئے۔ ایک اسلامی ملک کے چینلز کیسے کیسے اپنی بہو بیٹیوں کی نمائش کر رہے ہیں۔

محفل پر ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ حاضرین پوری توجہ سے ہمہ تن گوش تھے۔ پروفیسر صاحب کی باتیں بڑی فکر آمیز تھیں۔ ان کا کہا ہوا حرف حرف سچ تھا۔ لیکن مجھے لگا تھا میں اس امتحان میں سرخرو ہو گیا ہوں۔

ہمارا خاندان قدرے قدامت پسند خاندان تھا۔ ان تمام غلاظتوں سے مبرا تھا۔ ہماری تربیت جن خطوط پر ہوتی تھی وہاں ابھی بھی بزرگوں کے سامنے اونچی آواز میں بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہماری لڑکیاں ابھی بھی چادر اور چار دیواری میں رہتی تھیں۔ یہ ویلنٹائن، یہ ہولوین، یہ فادر، مدر ڈے جیسے دنوں کا ہمارے ہاں کوئی تصور نہ تھا۔ ہمارے ہاں آج بھی عید اور بقر عید جیسے مذہبی تہوار ہی خوشی سے منائے جاتے تھے۔ آج بھی شب برات، شب قدر اور شب معراج جیسی بڑی راتوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔

میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ یقیناً" ہم جیسے لوگ ہی اسلام کی دعوت دے سکتے ہیں۔ یقیناً" میری فیملی ہی اسے متاثر کر سکتی ہے۔ میں مسرور سا مسجد سے نکلا تھا۔

☼ ☼ ☼

امتحان سر پر تھے لہٰذا میں خاصا مصروف ہو گیا تھا۔ کام سے آکر پڑھائی اور پڑھائی کے بعد سونا اور کچھ ہوش نہ تھا۔ کئی روز سے میری نہ تو ملی تھی نہ میں نے اس کے بارے سوچا تھا۔ بس ایک ہی لگن تھی کہ اچھے گریڈ سے پاس ہو جاؤں تاکہ اپنا کریئر بنا سکوں۔

اس روز میری طبیعت خاصی ناساز تھی۔ نزلہ زکام کھانسی سب نے اکٹھے ہی حملہ کر دیا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا دوائی لے کر سو جاؤں۔ مگر اگلے روز آخری پیپر تھا لہٰذا پڑھنا ضروری تھا۔ سو بادل نخواستہ کتابیں لے کر بیٹھ گیا۔

ابھی پڑھتے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ فون کی بیل بجی۔ دیکھا تو میری کا فون تھا۔ مجھے حیرت ہوئی جب سے میں نے اسے نمبر دیا تھا آج پہلی بار اس نے کال کی تھی۔

"ہیلو میری! کیسی ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں۔"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ آج فون کیسے کر لیا۔"

"بس ایسے ہی۔ کافی دنوں سے آپ نظر نہیں آئے۔ سوچا حال پوچھ لوں۔ کیا ہو رہا تھا۔"

"بس اسٹڈی کر رہا تھا۔ ایگزیم ہو رہے ناں۔"

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

"ہاں، زکام ہو رہا ہے۔ کھانسی بھی ہے۔"

"تو پھر اسٹڈی کیوں کر رہے ہیں؟"

"بتایا تو ہے کل پیپر ہے۔"

"پھر بھی اپنی کیئر کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اکیلا بندہ بیمار ہو جائے تو مشکل ہوتی ہے۔" اس کا اپنے لیے پریشان ہونا مجھے اچھا لگا تھا۔ شناسائی، دوستی میں بدل رہی تھی اور میرا عزم پورا ہونے میں آسانی ہو رہی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں جلدی سونے کی کوشش کروں گا۔ میں تھوڑا سا اور پڑھ لوں۔"

"سونے سے پہلے دوائی ضرور لے لینا۔" اس نے تاکید کی۔

"ہاں لے لوں گا۔"

"اوکے۔ کل بات کروں گی۔"

"اوکے بائے۔"

"بائے۔" فون بند کرنے کے بعد میں پھر سے پڑھنے لگا۔ اسے کہنے کے باوجود جلدی نہ سو سکا۔ صبح اٹھا تو سر بھاری ہو رہا تھا۔ دوائی بھی نہیں لے سکتا تھا ورنہ نیند آجاتی۔ بہرحال تیار ہو کر کالج چلا گیا۔ جیسے تیسے پیپر ختم کر کے واپس آیا تو اچھا خاصا بخار ہو رہا تھا۔ گھر پہنچتے ہی اس کا فون آگیا۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟"

"ٹمپریچر ہو رہا ہے۔"

"رات کو جاگتے رہے ہوں گے۔"

"مجبوری تھی۔ ابھی پیپر دے کر آرہا ہوں۔"

"کیسا ہوا ہے؟"

"اچھا ہو گیا ہے۔"

"چلیں۔ اب دوائی لے کر سو جائیں۔"

"نہیں بھئی۔ پہلے کچھ کھانے کا انتظام کرنا ہو گا۔"

"اس حالت میں آپ کیا کریں گے۔ اچھا آپ کچھ نہ کریں۔ میں ابھی آتی ہوں۔" مزید کوئی بات کیے بغیر اس نے فون بند کر دیا اور ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ میرے اسٹوڈیو میں موجود تھی۔

"آپ کے لیے بریتو لائی ہوں۔" وہ کچن سے پلیٹیں وغیرہ اٹھا لائی۔

"مگر تم نے تکلیف کیوں کی؟ میں کچھ کر لیتا۔"

"جب میں بیمار تھی تو آپ بھی تو میرا حال پوچھنے آئے تھے۔"

"بدلہ اتار رہی ہو۔"

"اچھے بدلے اتارنے ہی چاہئیں۔" اس نے برجستہ کہا۔ تو میں مسکرا کر بریتو کھانے لگا۔ میرے کھانے تک وہ کافی بنا لائی۔ کافی پیتے ہوئے وہ میرے ایگزیم کے بارے میں پوچھ رہی تھی جب اماں کا فون آگیا۔ میں انہیں بتانا نہیں چاہتا تھا مگر وہ تو میری آواز سنتے ہی سمجھ گئی تھیں کہ میری طبیعت خراب ہے اور مجھے بتانا ہی پڑا کہ کل سے بخار میں مبتلا ہوں۔

"ہائے میرا بچہ کل سے بخار میں ہے۔ پردیس میں اکیلا کیا کر رہا ہو گا۔" وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے ابا سے بھی مخاطب تھیں۔

"معمولی بخار ہے! اماں آپ پریشان نہ ہوں۔ دوائی لوں گا اتر جائے گا۔"

"جانتی ہوں تجھے۔ سدا کا لاپروا ہے تو۔ ہل کر پانی تک نہیں پیتا تھا۔ دوائی کیسے خود سے لے لے گا۔ وہاں کون خیال رکھے گا تیرا۔ لوگ تو دو دو چار چار مل کر رہتے ہیں۔ تجھے کسی کے ساتھ بھی رہنا پسند نہیں ہے اور اب اکیلے بیمار پڑا ہے۔ اسی لیے کہا تھا شادی کر کے جاؤ ملیحہ ساتھ ہوتی تو......"

"اماں! خوامخواہ پریشان نہ ہوں میں بچہ تھوڑی ہوں۔ پھر آپ کی دعائیں تو ہر وقت میرے ساتھ ہیں مجھے بھلا کیا ہو سکتا ہے۔"

"ہاں بچے میں تو صبح و شام آیتہ الکرسی اور دیگر دعائیں پڑھ کر پھونکتی رہتی ہوں تجھ پر۔ اللہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔" انہوں نے فون پر ہی دعائیں پڑھ کر پھونک ماری۔

"بہت جلد پریشان ہو جاتی ہیں میری اماں۔" میں نے فون رکھ کر میری سے کہا جو خاموش بیٹھی میری اماں سے بات سن رہی تھی۔

"ظاہر ہے 'ماں جو ہیں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"ہمارے ہاں ماں باپ کچھ زیادہ ہی ایموشنل ہوتے ہیں۔ اولاد کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کو ہر وقت تیار۔ انہیں اپنی اولاد سے آگے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اماں میرے یہاں آنے پر راضی نہیں تھیں۔ لیکن میری خوشی کی خاطر موم ہو گئیں۔ دراصل ہمیں ایک دوسرے کی محبت نے اس طرح جکڑا ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی خوشی کے لیے ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں اور یہ رشتے ناتوں سے پیار محبت ' قربانی ' ایثار یہ سب ہمیں ہمارا مذہب سکھاتا ہے۔"

وہ بڑی توجہ اور غور سے سن رہی تھی۔ کبھی کبھی تو لگتا تھا جیسے وہ میرے بیک گراؤنڈ کے بارے میں اس سے بھی زیادہ سننا چاہتی ہو' جاننا چاہتی ہو۔ مگر ایسا کیسے

ہو سکتا تھا۔ اسے بھلا کیا انٹرسٹ میرے بیک گراؤنڈ اور میری فیملی سے۔

☆ ☆ ☆

دوائی کے زیر اثر رات بھر بڑی پر سکون نیند سویا تھا۔ جاگا تو بخار مکمل طور پر اتر چکا تھا۔ بس تھوڑی نقاہت تھی۔ آج آف ڈے تھا۔ پیپر بھی ختم ہو چکے تھے۔ لہٰذا میں ناشتہ کر کے ٹی وی دیکھنے لگا۔ تب ہی میری کی کال آئی۔ وہ نیچے کھڑی تھی میں نے کاریڈور کی ونڈو سے بلڈنگ کے مین ڈور کی چابی پھینکی۔ ڈور کھول کر وہ اوپر آگئی۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟"

"بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہاری نصیحت پر عمل جو کیا تھا۔"

"اچھی بات پر عمل کرنا ہی چاہیے۔ کچھ کھایا آپ نے۔"

"ہاں سیریل کھایا ہے۔ تم جاب پر نہیں گئیں!"

"آج کل ایوننگ میں جا رہی ہوں۔ پرانی والی چھوڑ دی ہے۔"

"آنٹی کی لانڈری ہے ناں اس کی ذمہ داری سنبھال رہی ہوں۔" وہ آنٹی کی لانڈری کے بارے میں بتا رہی تھی جب پاکستان سے فون آگیا۔

"کیا حال ہے تمہارا بخار اترا......؟" اماں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"جی اماں! بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں۔"

"چلو شکر ہے میرے رب کا۔ اچھا یہ ملیحہ سے بات کرو۔ میں تیرے ماموں کی طرف آئی ہوئی ہوں۔ جب سے پتا چلا ہے بچی پریشان ہو رہی ہے۔" اماں نے فون اسے تھما دیا۔

"کیسی ہو ملیحہ......؟" سلام کے جواب میں میں نے پوچھا۔ وہ واقعی بہت پریشان لگ رہی تھی۔

"پھوپھو بتا رہی تھیں ' آپ بیمار ہیں۔ اب کیسی طبیعت ہے۔"

"ارے بھئی ' معمولی بخار تھا۔ اب تو ہٹا کٹا ہوں۔ اماں تو بس......"

"آپ کو اپنا خیال رکھنا چاہیے۔ پتا ہے آپ کی وجہ سے ہم سب کتنا پریشان ہو جاتے ہیں۔" وہ تو جیسے رو دینے کو تھی۔

"اچھا بھئی۔ اب بہت خیال رکھوں گا اور بخار کو منع کر دوں گا کہ میری کزن پریشان ہو جاتی ہے آئندہ میرے گھر میں مت آنا۔" میں نے شرارت سے کہا۔

"آپ بھی بس......" وہ جھینپ گئی۔

"ماموں ' ممانی سب ٹھیک ہیں؟"

"یہاں تو سب ٹھیک ہیں۔ بس آپ کی فکر رہتی ہے۔" کال ڈسکنکٹ ہو گئی تھی۔

"میری کزن پریشان ہو رہی تھی۔ اماں نے بتایا ہو گا ناں۔"

"ہاں میں سن رہی تھی۔"

"تم اردو سمجھ لیتی ہو۔"

"تھوڑا بہت بول بھی لیتی ہوں۔"

"اچھا گڈ۔" اس کی آنٹی اور روم میٹ دیسی تھیں اس لیے مجھے حیرت نہیں ہوئی۔

"یہ آپ کے چچا کی بیٹی تھی؟" اس نے جانے کیوں پوچھا تھا۔

"نہیں۔ یہ میرے ماموں کی بیٹی تھی۔ چچا کی تو اولاد ہی کوئی نہیں ہے۔ بہت ترستے ہیں وہ اولاد کے لیے۔ اللہ نے اوپر تلے تین بچے دیے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھو۔ تینوں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ حالانکہ بالکل نارمل پیدا ہوتے ہیں۔ مگر پیدائش کے کچھ عرصہ بعد فوت ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹرز کی بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کیا ہوتا ہے۔ کہاں کہاں نہیں گئے اولاد کی منت کے لیے ہر طرح سے علاج معالجہ کروایا مگر اللہ کی مصلحت کے آگے سب بے بس ہیں۔ میری بہن طاہرہ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں اس میں مجھے اپنی بیٹی نظر آتی ہے۔"

"آپ کو بیٹی اچھی لگتی ہے؟" غیر متوقع سا سوال تھا۔

"ہاں بہت اچھی اور بیٹیاں کس کو اچھی نہیں لگتیں۔ پتا ہے طاہرہ کی شادی پر ابا ہم سے چھپ چھپ کر آنکھیں صاف کرتے تھے۔ شروع سے ہی اسے ہم سے زیادہ پیار ملا ہے۔ اگر کبھی ہم دونوں بھائی کسی چیز کے لیے ضد کرتے تو اتنی پرواہ نہیں کی جاتی تھی۔ لیکن طاہرہ کی بات فوراً" مان لی جاتی تھی۔ ابا ہمیشہ ایک ہی بات کہتے تھے کہ میں اپنی بیٹی کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ چچا بھی یہی کہتے تھے کہ بیٹی تو مہمان ہوتی ہے اس کے لاڈ زیادہ اٹھانے چاہئیں۔"

وہ ساکت بیٹھی میری باتیں سن رہی تھی یوں جیسے کوئی پتھر کا مجسمہ ہو اور میں اسے اپنے خاندان، اپنے مذہب سے متاثر کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

"معلوم ہے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو بیٹی کو رحمت کہتے تھے۔ ہمارے ہاں بیٹیاں سانجھی ہوتی ہیں۔ خاندان کی یا گاؤں کی۔ بیٹی سب کی بیٹی ہوتی ہے۔ پتا ہے ہم بڑے روایت پرست لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں رشتوں ناتوں کی بڑی پرواہ کی جاتی ہے۔ یہ سب ہمیں ہمارے مذہب نے سکھایا ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے۔"

میں جان بوجھ کر نبی اور مذہب کا حوالہ دے کر بات کر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا، وہ میرے مذہب سے متعلق مجھ سے سوال کرے۔ اس کے بارے میں متجسس ہو۔ اس کو سمجھنے کی کوشش کرے اور پھر ایک دن خود بخود اس سچے دین کو قبول کرنے کی خواہش کرے۔ میں اپنی باتوں سے اس کے دل میں ننھے ننھے بیج بونے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ خاموش تھی۔ بالکل خاموش۔

مگر اس کی خاموشی میں راز بولتے تھے۔ کیسے راز؟ میں سمجھ نہیں پاتا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہماری ملاقاتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اب ملنے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت نہیں تھی۔ جس دن دونوں کو تھوڑی فرصت ملتی، کچھ دیر کے لیے مل بیٹھتے۔ ان ملاقاتوں میں ایک بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ وہ یہاں کی لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔ نہ ویسی بے باکی نہ بے حیائی۔ نہ ویسا بے ہودہ لباس اور نہ ان جیسا رہن سہن۔ اس کے انداز میں بڑا رکھ رکھاؤ تھا۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، بات چیت کا انداز بڑا مہذب تھا۔ یا تو اس کی تربیت بڑے اچھے خطوط پر ہوئی تھی یا پھر وہ فطرتاً" ہی بڑے اچھے سبھاؤ کی لڑکی تھی۔ بے حد سلجھی ہوئی اور سنجیدہ مزاج۔ ایک دو بار میں نے سرسری طور پر اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے ٹال دیا تھا اور میں نے بھی کریدنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ یہاں کے سسٹم کے مطابق ویسے بھی یہ سب کچھ نارمل ہی تھا۔

"تمہاری برتھ ڈے کب ہے میری؟" کافی پیتے ہوئے یونہی مجھے خیال آیا تو پوچھا۔

"پتا نہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی بھلا۔"

"بس ایسے ہی۔ میں نے کبھی منائی ہی نہیں۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"عجیب لڑکی ہو تم۔" میں نے خالی کپ ٹیبل پر رکھا۔ کچھ دیر پہلے ہی میں اس کے اپارٹمنٹ پر آیا تھا۔ وہ لانڈری سے جمعہ کو آف لیتی تھی۔ لہٰذا آج گھر پر تھی۔ آنٹی حسب معمول لانڈری پر تھیں اور دونوں روم میٹ بھی جاب پر تھیں۔ ہم دونوں یونہی ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔

"تمہارا کوئی دوست نہیں ہے میری؟"

"آپ جو بن گئے ہیں۔"

"میں تو زبردستی بنا ہوں۔" میں نے جتلایا۔

"مگر اب تو بن گئے ہیں ناں۔"

"لیکن میں بوائے فرینڈ کی بات کر رہا ہوں۔"

اس نے اک پل کو میری جانب دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ناگواری سی دکھائی دی۔ مگر اگلے ہی پل وہ نارمل ہو گئی۔

"نہیں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"مگر کیوں نہیں۔"

"کیونکہ مجھے ایسی باتیں پسند نہیں۔" اس کے انداز سے اس کی ناگواری ظاہر تھی۔

"تم سے ایک بات پوچھوں میری؟"

"جی......؟"

"تم دوسری لڑکیوں سے قطعی مختلف ہو۔ ایسا کیوں ہے؟"

"آپ کو ایسا لگا ہے ورنہ ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"نہیں تم ٹوٹلی مختلف ہو۔ تمہارے بوائے فرینڈز نہیں ہیں۔ تم پورے کپڑے پہنتی ہو۔ مسلمانوں کے ساتھ رہتی ہو۔ ڈرنک نہیں کرتی ہو۔"

"ایسی اور بھی لڑکیاں ملیں گی آپ کو......!" وہ لاپرواہ نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے تم بہت اچھی لڑکی ہو۔"

"اچھا۔" وہ ہلکے سے مسکرائی۔

"ایک بات پوچھوں تم سے، سچ بتانا۔"

"کیا کیا پوچھیں گے آج......؟"

"صرف یہ کہ میں تمہیں کیسا لگتا ہوں!"

"اچھے لگتے ہیں!" وہ سادگی سے بولی۔

"میری کیا بات اچھی لگتی ہے؟"

"آپ ہمدرد ہیں۔ کیئرنگ ہیں۔" اس نے سوچ کر جواب دیا۔

"یہ سب میری ماں کی تربیت ہے۔ ہم لوگ بڑے مذہبی لوگ ہیں۔ تمہاری روم میٹ، تمہاری آنٹی مسلمان ہیں۔ تم ان کے ساتھ رہتی ہو۔ تم اسلام کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو جانتی ہو گی۔" میں اپنے مقصد کی جانب آرہا تھا۔

وہ خاموش رہی۔

"میں چاہتا ہوں تم اسلام کے بارے میں جانو، اس کا مطالعہ کرو۔ اس پر ریسرچ کرو۔ اسلام بڑا پیارا مذہب ہے۔ یہ سچا دین ہے، مکمل ضابطہ حیات ہے۔"

وہ خاموشی سے سن رہی تھی اور میں تو جیسے وجد کی کیفیت میں تھا۔

"تم ہماری مورل ویلیوز (اخلاقی اقدار) کو دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔ ہمارے یہاں شادی بڑا مقدس بندھن ہے۔ ہمارے ہاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر طلاقیں نہیں ہوتیں۔ بچے پیدا کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیے جاتے۔ ہمارے لیے اولاد سب سے قیمتی چیز ہوتی ہے۔ تم اسلام کے بارے میں پڑھو گی تو یقیناً" اس پر ایمان لے آؤ گی۔"

میں جذباتی ہو گیا تھا۔ جذبات میں بہہ کر وہ سب کہہ بیٹھا تھا جس کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ حالانکہ یہ میرے پلان میں نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسے آہستہ آہستہ اس طرف لاؤں گا۔ مگر اس وقت مجھے خود پر اختیار نہیں رہا تھا۔ کوئی انجانی کشش مجھے اس کی جانب کھینچتی تھی۔ وہ اچھی لڑکی تھی۔ میں اسے ضائع نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ تب ہی تو میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ تب ہی تو مناسب وقت کا انتظار کیے بغیر یہ سب کہہ دیا تھا۔

وہ حیرت انگیز طور پر ساکت بیٹھی خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"بولو میری! پڑھو گی ناں۔ میں تمہیں اسلام کے متعلق تمام مواد لا کر دوں گا۔ قرآن پاک لا کر دوں گا۔ میں چاہتا ہوں تم مسلمان ہو جاؤ۔ اسلام قبول کر لو۔ ان تاریکیوں سے نکل آؤ میری۔ تم مسلمان ہو جاؤ۔ اللہ کے رسول اور قرآن پر ایمان لے آؤ۔" میں جذباتی ہو گیا تھا۔

"میں مسلمان ہوں!" اس نے جیسے دھماکا کیا تھا۔ مجھے اپنی سماعتوں پر شبہ ہوا تھا۔ میں نے بے یقینی و حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔ میں مسلمان ہوں۔ پیدائشی مسلمان!" اس نے دوبارہ کہا۔

میرا سر گھوم گیا۔

"تم جاننا چاہتے ہو۔ میں کون ہوں۔ آؤ میں تمہیں بتاؤں۔" وہ اٹھی اور کلوزٹ میں سے چند تصویریں نکال لائی۔

"یہ ہے میرا مکمل تعارف ......!" اس نے تصویریں میرے سامنے رکھیں۔

"یہ ...... یہ۔" الفاظ کہیں گم ہو گئے۔ میری نظر تصویروں پر تھی۔ اب کی بار میرا سر نہیں زمین و آسمان گھوم گئے تھے۔



"اللہ اکبر ...... اللہ اکبر ...... پنجاب کے قصبے نما گاؤں خیر پور کی چھوٹی سی مسجد کے گنبدوں میں فجر کی اذان کی صدا گونجی تھی۔

بی بی جان نے میاں جی کے اذان دیتے ہی معمول کے مطابق وضو کر لیا تھا۔

"علی مراد! اٹھ جا پتر اذان ہو گئی ہے۔ جماعت کھڑی ہونے والی ہے۔ تیرے میاں جی کہتے ہیں، نمازیوں میں سب سے پہلے ان کے اپنے بیٹوں کو مسجد پہنچنا چاہیے۔"

"بی بی جان! میاں جی سے بولیں، وقت دیکھ کر گھر سے نکلا کریں۔ مجھے تو لگتا ہے عشاء کے ساتھ ہی فجر کی اذان دے دیتے ہیں۔" اس نے تکیہ منہ پر رکھ کر جواب دیا۔

"اچھا زیادہ باتیں نہ بنا۔ کنیز فاطمہ! اٹھ جا پتر! اذان ہو گئی ہے۔ حسن دین کو دیکھو۔ خود بخود اٹھ جاتا ہے۔ تم لوگوں کو آوازیں دینی پڑتی ہیں۔"

"اٹھ گئی ہوں بی بی جان۔"

"سب اٹھ جائیں گے۔ ایک علی مراد کو ہی مشکل ہوتی ہے۔"

بی بی جان نے مرغیوں کا ڈربہ کھولا۔ کٹاکٹ کرتی مرغیاں آزادی سے ادھر ادھر گھومنے لگیں۔ قرآن پاک پڑھنے کے بعد کنیز فاطمہ باورچی خانے میں جا کر آٹا گوندھنے لگی۔

بی بی رات کی روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے لگیں۔ پو پھٹنے کو تھی۔ جامن کے پیڑ پر چڑیوں نے شور مچا رکھا تھا۔ بی بی جان نے مٹی کا پیالہ دھو کر پانی بھرا، دوسرے پیالے میں روٹی کے ٹکڑے ڈالے اور دونوں پیالے منڈیر پر رکھ دیے۔ چڑیاں تو جیسے پہلے سے منتظر تھیں۔ جھٹ منڈیر پر اتر آئیں اور اپنے اپنے حصے کا رزق چگنے لگیں۔

میاں جی اور حسن دین اکٹھے ہی مسجد سے لوٹے تھے۔ بی بی جان پراٹھے بنانے لگیں۔ کنیز فاطمہ نے رات کا سالن گرم کیا۔

"علی مراد سب سے آخر میں مسجد پہنچتا ہے۔" میاں جی نے ناشتہ کرتے ہوئے کہا۔

"بس نیند پیاری ہے اسے۔ کئی آوازیں دیتی ہوں۔ تب اٹھتا ہے۔"

"مگر اسے وقت پر آنا چاہیے۔ لوگ کہیں گے امام مسجد کا بیٹا ہی دیر سے آتا ہے۔"

"اس کی عادت ہے، رات کو دیر سے سوتا ہے۔ صبح دیر سے آنکھ کھلتی ہے۔"

"تو رات کو جلدی سویا کرے۔ سب کے ساتھ اٹھے۔"

"کالج میں پڑھتا ہے میاں جی! ہم سے مختلف تو ہو گا۔" کنیز فاطمہ نے بھائی کی حمایت کی۔

"ٹھیک ہے مگر نیک کاموں میں مختلف نہیں ہونا چاہیے۔" میاں جی کافی ناراض لگ رہے تھے۔

"اچھا آپ ناشتہ کریں۔ میں سمجھا دوں گی اسے!" بی بی جان نے کہا تو وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگے۔

ناشتے کے بعد کنیز فاطمہ برتن دھونے لگی۔ ارد گرد کے گھروں کی بچیاں سپارہ پڑھنے آگئی تھیں۔ بی بی جان انہیں سبق پڑھانے لگیں۔ علی مراد ایکسرسائز کر کے ابھی ابھی لوٹا تھا۔ میاں جی واپس مسجد جا چکے تھے۔ وہ بھی کالج کے لیے تیار ہونے لگا۔

یہ تھی خیر پور گاؤں کے امام مسجد دین محمد کے گھر کی ایک صبح۔



"پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟ علی مراد روز مجھ سے پوچھتا ہے۔" میاں جی کھانا کھا کے فارغ ہوئے تو بی بی جان نے ذکر چھیڑا۔

"کس بارے میں؟" انہوں نے پانی کا گلاس رکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"بتایا تو تھا آپ کو۔ باہر جانے کو کہہ رہا ہے۔ کاغذ وغیرہ بھی جمع کروا دیے ہیں اس نے۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔ چار جماعتیں کیا پڑھ لی ہیں اپنا ملک ہی برا لگنے لگا ہے۔ آخر کیا کرے گا وہاں جا کر۔"

"اجازت دے دیں میاں جی۔ شوق تو اسے شروع سے ہی ہے۔ کالج جا کر اور بھی بڑھ گیا ہے۔" حسن دین نے بھائی کی سفارش کی۔

"وہ اجازت مانگ کہاں رہا ہے۔ سنا نہیں تم نے کاغذ بھی جمع کروا دیے ہیں۔" میاں جی خفگی سے گویا ہوئے۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ آپ اجازت دیں گے تب ہی جائے گا' کاغذ وغیرہ تو اس لیے جمع کروائے ہیں کہ تاریخ نہ نکل جائے۔" بی بی جان نے وضاحت کی۔

"پتا نہیں کیا ہو گیا ہے آج کل کے لڑکوں کو۔ ماسٹر علم دین کا بیٹا گیا تھا ناں ولایت' آج تک پلٹ کر نہیں آیا۔ بیوی بچے بھی ادھر ہی بلا لیے۔ پیچھے سے ماں مر گئی اور باپ بیچارہ اکیلا سارا دن مسجد میں بیٹھا رہتا ہے۔ چار پیسے بھیج کر بیٹے کی ذمہ داری ختم۔"

"ہمارا بیٹا ایسا نہیں ہے۔ کیوں بدگمان ہوتے ہیں۔"

"ساری مائیں ایسے ہی کہتی ہیں۔ اپنے بچوں کے بارے میں۔"

"میں جانتی ہوں' ہمارا بیٹا نافرمان نہیں ہے۔ بس آپ خوشی سے اجازت دے دیں۔ بچے کا دل رہ جائے گا۔" انہوں نے بھرپور سفارش کی۔

"اچھا دیکھیں گے!" میاں جی نے فی الحال بات ختم کی۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ دونوں بیٹوں میں سے کوئی بھی اتنی دور جائے۔ لیکن بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ علی مراد کا ایک ہی شوق تھا کہ وہ امریکہ جانا چاہتا تھا اور اس کے لیے وہ حسن دین اور بی بی جان کے پیچھے لگا ہوا تھا کہ میاں جی سے کسی بھی طرح اجازت دلوائیں۔

امریکہ جانا کوئی آسان نہیں تھا لیکن قسمت اچھی تھی کہ اسے ایسا شخص مل گیا تھا جو پیسے لے کر بھجوا سکتا تھا۔ اور وہ یہ موقع کسی صورت گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

اور پھر اس کے بے حد مجبور کرنے بلکہ منت سماجت کرنے پر میاں جی راضی ہو ہی گئے تھے۔ دل تو بی بی جان کا بھی راضی نہ تھا لیکن اس کی خوشی کی خاطر انہوں نے دل پر پتھر رکھ ہی لیا تھا۔

کام کیا ہوا' علی مراد کے دل کی مراد پوری ہو گئی۔ نیویارک کے ایئرپورٹ پر اتر کر اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کا خواب اتنی آسانی سے پورا ہو گیا ہے۔

مگر اس ایک خواب کی تکمیل کے بعد کتنی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے گا اس کا اسے ہرگز اندازہ نہیں تھا۔

پورے تین سال ادھر ادھر دھکے کھانے پڑے تھے تین سال چھپتے چھپاتے کام کرنے کے بعد بڑی مشکل سے ورک پرمٹ حاصل کرنے کے قابل ہوا تھا۔ اس کے بعد کم از کم اتنا ہو گیا تھا کہ وہ قانونی طور پر کام کر سکتا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے وہ جہاں بھی کام کرتا تھا اس کے غیر قانونی ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے کم سے کم تر اجرت دی جاتی تھی۔ اور یہ فائدہ اٹھانے والے ہوتے بھی زیادہ تر دیسی ہی تھے۔

بہرحال اب ورک پرمٹ حاصل ہو گیا تھا تو کچھ بہتر کام ملنے کی بھی امید ہو گئی تھی اور پھر تھوڑی سی تگ و دو کے بعد اپنے کسی جاننے والے کے توسط سے ایک اسٹور میں جاب مل گئی تھی۔ سیلری بھی نسبتاً اچھی تھی اور کام بھی پہلے کاموں کی نسبت بہتر تھا۔ سو وہ قدرے مطمئن ہو گیا تھا۔ اب فکر تھی تو کسی نہ کسی طرح گرین کارڈ حاصل کرنے کی تھی اور غیر قانونی آنے والوں کے لیے یہ کام کس قدر کٹھن تھا یہ صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو اس صورت حال سے گزرا ہو۔

یہ ایک بہت بڑا اور مشہور گروسری سٹور تھا۔ بہت سے ملازمین میں سے ایک لینٹ (Lanet) بھی تھی۔ کنجوں جیسی نیلی آنکھوں اور ریشمی بالوں والی مکمل بلانڈ لینٹ کافی سنجیدہ سی شخصیت کی مالک تھی۔

یہ اسٹور چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ علی مراد کی جاب رات کی تھی اور وہ بھی رات کی شفٹ میں کام کرتی تھی۔ شروع شروع میں تو وہ کافی ریزرو رہی تھی۔ مگر پھر ایک ساتھ ایک ہی جگہ پر کام کرتے کرتے کسی حد تک ہیلو ہائے ہو ہی گئی تھی۔ رات کو کسٹمر نہ ہونے کے برابر ہوتے تھے۔ اس لیے وہاں موجود تمام کولیگز کو آپس میں بات چیت کرنے کا نسبتاً زیادہ موقع مل جاتا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ رفتہ رفتہ ان کی جان پہچان بھی شناسائی میں بدل گئی تھی۔

اب تو اکثر وہ بریک میں تھوڑی بہت بات چیت کر لیتے۔ کبھی کبھی اکٹھے کافی بھی پی لیتے اور باقی تمام کولیگز کی طرح تھوڑا بہت ہنسی مذاق بھی کر لیتے۔

ایک سال تقریباً یونہی گزر گیا تھا۔ شاید آئندہ بھی بہت سا وقت اسی طرح گزر جاتا۔ لیکن اس ایک چھوٹے سے واقعے نے اس کی شناسائی میں کسی حد تک اضافہ کر دیا تھا۔

وہ دونوں آف کر کے اکٹھے ہی اسٹور سے باہر آئے تھے۔ سردی زوروں پر تھی۔ نیویارک کے موسم ہمیشہ سے شدت پسند تھے۔ سردی پڑتی تو ہڈیوں کو چیر کر اندر گھس جاتی۔ برف پڑتی تو چہار سو روئی کے سفید پہاڑ نظر آتے اور گرمی میں ایسی چپچپاہٹ کہ بس.....!

برف باری تو ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ لیکن بارشیں وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھیں جس کی وجہ سے ہوا کی ٹھنڈک اور سردی کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی مینہ بڑی زوروں سے برس رہا تھا۔

"اوہ نو۔" لانگ کوٹ کے کالر اوپر کرتے ہوئے وہ بے اختیار بولی تھی۔

"کیا ہوا۔"

"میں چھتری لانا بھول گئی ہوں۔ حالانکہ ویدر رپورٹ (موسم کی رپورٹ) سن کر آئی تھی مجھے پتا تھا اس وقت بارش ہو گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں گاڑی تک چھوڑ دیتا ہوں۔" اس نے اپنی چھتری اس کے اوپر بھی کر دی۔

"لیکن میری گاڑی خراب ہے۔ میں بس پر آئی ہوں۔ اب مجھے بس اسٹاپ تک جانا ہے۔" اس نے پریشانی کی وجہ بتائی۔

"اوہ یہ بات ہے۔"

"ہاں تم ایسا کرو' مجھے اسٹاپ تک رائیڈ دے دو۔"

"اتنی تیز بارش اور سردی میں تم بس اسٹاپ پر کھڑی رہو گی اور پھر بس سے اتر کر پیدل گھر کیسے جاؤ گی۔ چلو میں تمہیں گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔" اس نے گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے آفر کی۔

"نہیں۔ تمہیں دیر ہو جائے گی۔" وہ یقیناً تکلف کر رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ مجھے گھر ہی تو جانا ہے' دیر کیسی۔ جلدی سے ایڈریس بتا دو۔"

اس کے بیٹھنے پر اس نے گاڑی کا ہیٹر آن کرتے ہوئے کہا۔ تو اس نے مزید انکار کیے بغیر ایڈریس بتا دیا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد ان کے گھر کے ڈرائیو وے میں تھے۔

"اندر آؤ۔ میں تمہیں ممی' ڈیڈی سے ملواؤں۔"

"نہیں پھر کبھی سہی۔"

"آ جاؤ' اتنی سردی ہو رہی ہے۔ کافی پیتے ہیں۔" اس نے اصرار کیا تو وہ اس کے ساتھ آ گیا۔

اس کے ممی ڈیڈی اپنے اپنے کام پر نکلنے ہی والے تھے۔ اس کے تعارف کروانے پر انہوں نے عجلت میں ہاتھ ملایا اور باہر نکل گئے۔

"ڈیڈی کو چرچ ٹائم پر پہنچنا ہوتا ہے اور ممی پراپرٹی نیجر ہیں۔"

"اس کے علاوہ اور کون ہے تمہارے گھر میں؟" ان کا خوب صورت اور کشادہ گھر دیکھ کر وہ واقعی متاثر ہوا تھا۔

"ہم تین بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ بڑی بہن میلوڈی نے شادی کر لی ہے۔ دوسری جینا ہے۔ وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کے بھی دو بچے ہیں۔"

"اس نے شادی نہیں کی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ ابھی تو اس کا کوئی ارادہ نہیں شادی کرنے کا۔ ڈیوس نے بھی تین بچوں کے بعد شادی کی ہے۔ شاید اس کا بھی موڈ بن جائے۔"

"اور تمہارا بھائی؟"

"وہ تینوں سے چھوٹا ہے۔ اس وقت اسکول گیا ہوا ہے۔" کافی کے دوران اس نے اپنی فیملی کے بارے میں مختصراً بتایا۔ پھر اسے مختلف فریم میں لگی ہوئی تصویروں کے متعلق بتانے لگی۔

بس اس روز کے بعد ان کی دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ اب وہ کبھی کبھار اس کے گھر بھی آجاتا تھا۔ اس کے ممی ڈیڈی اور بھائی بہنوں سے بھی مل چکا تھا۔ لیکن اس نے ایک بات نوٹس کی تھی کہ اس کے پیرنٹس مسٹر اور مسز بروک اس سے مل کر زیادہ خوش نہیں ہوتے تھے۔ ان کے رویے میں ایک لاتعلقی بلکہ سرد مہری سی ہوتی تھی۔ بلکہ جیسے جیسے اس کی دوستی لینٹ سے بڑھ رہی تھی ان کے رویے میں اپنے لیے ناپسندیدگی کا احساس بڑھتا محسوس ہو رہا تھا۔ ایسا کیوں تھا۔ اس سوال کا جواب اسے اس وقت ملا تھا جب لینٹ نے اسے اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے متعلق بتایا تھا۔

اس کا تعلق بڑی اسٹرونگ کرسچن فیملی سے تھا۔ اس کے باپ مسٹر براؤن کا خاندان بائبل بیلٹ ایریا سے تعلق رکھتا تھا۔ مسٹر بروک تعلیم کے سلسلے میں یہاں آئے تھے اور پھر یہیں رہ گئے تھے۔ وہ نہ صرف پریسٹ (پادری) تھے بلکہ انہوں نے اپنے خاندان کے ساتھ مل کر کئی چرچ بھی بنوائے تھے۔ ان کے خاندان میں بچوں کو بہت جلد Beptized (بپتسمہ) کر دیا جاتا تھا اور اسی طرح دیگر مذہبی امور بھی بڑے اہتمام سے پڑھائے اور سکھائے جاتے تھے مسٹر بروک نہ صرف سپورٹنگ چرچ ورک اور چرچ سکول پروگرامز میں انتہائی سرگرم تھے بلکہ mimisten بھی تھے۔ جس کا کام لوگوں کے مسائل کو مذہب اور بائبل کی رو سے حل کرنا ہوتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ ان کے حلقہ احباب میں بہت سے انجیل کے مبلغ بھی شامل تھے۔ یہ سب نہ صرف کرسچنٹی کی تعلیمات پھیلاتے تھے بلکہ اسلام دشمن جمی سواگرٹ، جان ہیگی، جیری فال ویل، فنی بیکر اور سب سے بڑے اور بدترین اسلام دشمن شخص پیٹ رابرٹسن کے زبردست حامیوں میں سے تھے اور جب کبھی بھی یہ سب مل کر بیٹھتے تھے اور مذاہب پر بات ہوتی تھی تو ہمیشہ اسلام کے خلاف ہی بات ہوتی تھی۔ مسلمان ان کی نظر میں ہمیشہ ہائی جیکرز، بومبرز، دہشت گرد اور اغواکار ہی تھے۔

تینوں بہنوں میں سے لینٹ کو ہی مذہب سے زیادہ لگاؤ تھا۔ وہ کئی بار مسٹر بروک کے ساتھ Pilgrimage (زیارت) پر بھی جا چکی تھی۔ اس نے چھوٹی عمر میں ہی کئی قسم کی بائبل پڑھ لی تھیں۔ مگر جوں جوں وہ یہ کتابیں پڑھتی تھی اس کے اندر دوسرے مذاہب کو جاننے کا تجسس بڑھتا تھا اور اسی لیے اس نے بہت سے مذاہب کو پڑھا تھا۔ ہندوازم، جداازم، بدھ ازم، میٹافزکس اور مقامی امریکن عقائد سب اس کی اسٹڈی کا حصہ رہے تھے۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ مختلف مذاہب کے بارے میں جتنا زیادہ پڑھتی تھی اس کی تشنگی میں اتنا ہی اضافہ ہوتا تھا۔ ہر قسم کی بائبل پڑھنے کے باوجود وہ اطمینان حاصل نہیں ہو پاتا تھا جس کی وہ متمنی تھی۔ مذہبی کتابیں پڑھنے کے بعد دل و دماغ میں کئی قسم کے سوالات پیدا ہوتے تھے اور اس کے اندر عجیب سی بے چینی و بے قراری رہتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی بے حد مشکل سوال کا جواب نہ مل رہا ہو۔ کسی الجھی ڈور کا سرا ہاتھ نہ آ رہا ہو۔ مگر وہ تلاش میں سرگرداں تھی۔ شاید کبھی یہ الجھی ڈور سلجھ ہی جائے۔

"تم نے اتنے مذاہب پر ریسرچ کی ہے کبھی اسلام کے بارے میں کچھ پڑھا ہے؟" اس روز وہ علی مراد کے ساتھ میکڈونلڈ میں کافی پی رہی تھی جب اس نے پوچھا تھا۔

"نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔" اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

"مگر کیوں...؟" وہ حیران ہوا۔

"کیونکہ مجھے اس مذہب سے کبھی انٹرسٹ ہی نہیں رہا۔"

"انٹرسٹ تو پڑھنے سے پیدا ہوتا ہے۔"

"مجھے کبھی اسلام نے انسپائر (متاثر) ہی نہیں کیا۔ پھر پڑھتی کیسے اور سچ پوچھو تو میں نے بچپن سے اسلام کے بارے میں ایسی باتیں سنی ہیں کہ کبھی دل ہی نہیں چاہا ان لوگوں کے بارے میں مزید جاننے کو۔ اب دیکھو ناں جن کے بارے میں سب کو پتا ہے وہ ہائی جیکرز، اغواکار اور دہشت گرد ہیں ان کے بارے میں کچھ اور پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے صاف گوئی سے تفصیل جواب دیا تھا۔

"اگر ہم مسلمان اتنے خراب ہیں تو تم نے مجھ سے دوستی کیوں کی؟" اسے واقعی حیرت تھی۔

"اس لیے کہ میں شروع میں نہیں جانتی تھی کہ تم مسلم ہو اور جب مجھے پتا چلا تب تمہارے ساتھ دوستی ہو چکی تھی۔ اور تب تک میں یہ بھی جان چکی تھی کہ تم اتنے برے نہیں جتنا میں سمجھتی تھی۔ تم ان مسلمانوں سے مختلف ہو۔" اس نے وضاحت کی۔

"ایسی بات نہیں ہے لینٹ... دراصل تم نے مسلمانوں کو قریب سے جانے بغیر ہی امیج قائم کر لیا ہے۔ تم نے صرف سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیا ہے۔ جانتی ہو ہمارا مذہب تو بڑا پیارا مذہب ہے۔ یہ تو اپنے سے پہلے آنے والے تمام مذاہب کا احترام کرتا ہے۔ تمہیں تو اسے اسٹڈی کرنا چاہیے تاکہ تم خود اس کے بارے میں کچھ جان سکو۔ اپنی رائے قائم کر سکو۔" علی مراد نے بڑی متانت سے سمجھایا تو اس نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا تھا۔



اگلے چند روز بعد پھر وہی موضوع چھڑ گیا۔

"تم لوگ ابراہیم اور اس کی سیکریفائس (قربانیوں) کو مانتے ہو؟"

"ہاں۔ بالکل مانتے ہیں۔ بلکہ ہر سال ان کی یاد میں قربانی بھی کرتے ہیں۔" علی مراد نے جواب دیا۔

"Adam eve (آدم اور حوا) کو بھی مانتے ہو؟"

"ہاں بالکل ہم ان ہی کی نسل سے ہیں۔"

"Moses (حضرت موسیٰ) David (حضرت داؤد) Soloman (حضرت سلیمان) اور Jesus (حضرت عیسیٰ)" وہ بہت سوچ سوچ کر پوچھ رہی تھی۔

"ہاں ہم ان سب پیغمبروں کو مانتے ہیں۔ ان پر اتری ہوئی کتابوں پر یقین رکھتے ہیں۔"

"تم لوگ بائبل کو نہیں مانتے؟" اس نے اس کی بات کاٹ کر بے چینی سے پوچھا۔

"ہم اس کتاب کو مانتے ہیں جو حضرت عیسیٰ پر نازل ہوئی تھی جس کا نام انجیل ہے۔ لیکن اس کتاب کو نہیں مانتے جس کا نام بائبل ہے اور جو تم لوگوں نے خود لکھی ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" اس نے ناگواری سے پوچھا۔

"دیکھو، تمہارے ہاں کئی قسم کی بائبل ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ بائبل سب سے اچھی ہے کوئی کہتا ہے یہ بائبل بیسٹ ہے۔"

"تو کیا تمہاری مقدس کتابوں کے بارے میں ایسا نہیں کہا جاتا؟" اس نے بات کاٹی۔

"ہماری کتابوں...؟" علی مراد نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں۔ تمہارے جتنے بھی قرآن ہیں۔" اس نے وضاحت کی۔

"ہمارا صرف ایک قرآن ہے۔ وہی جو چودہ صدیاں پہلے آخری پیغمبر پر اترا تھا۔ اس کا حرف حرف آج بھی وہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"مگر وہ اب تک سیم (وہی) کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ بے یقینی سے بولی۔

"وہ سیم ہی ہے، وہ دنیا بھر کے لاکھوں مسلمانوں کے سینے میں موجود ہے۔ اس کا حرف حرف انہیں زبانی یاد ہے۔ اس کی زیر زبر پیش تک وہی ہے جو پہلے دن سے

تھی اور رہتی دنیا تک ویسے ہی رہے گی۔ کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس میں رتی برابر ترمیم کرسکے۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔" وہ بالکل یقین نہیں کرپا رہی تھی اور جب اس نے بتایا کہ حافظ قرآن کس طرح قرآن کو حفظ کرتے ہیں تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ یہ بات ماننے کو قطعی تیار نہ تھی کہ چودہ سو سال پہلے اترنے والا قرآن آج بھی حرف بہ حرف وہی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پوری دنیا میں ایک ہی قرآن پاک پڑھا جاتا ہے۔

"میں تو تمہارے مذہب کو بہت ہی Ridiculous (مضحکہ خیز) سمجھتی تھی۔ میں نے سنا ہے کہ مسلمان دن میں فائیو ٹائم ارتھ کو کس (زمین پر سجدہ) کرتے ہیں اور ڈیزرٹ (صحرا) میں کوئی بلیک باکس (خانہ کعبہ) ہے اس کی ورشپ کرتے ہیں۔"

"دیکھو جس مذہب کے بارے میں تمہیں ایسی باتیں معلوم ہوں اس کے بارے میں جاننے کی تمہیں بہت دلچسپی ہونی چاہیے۔" وہ چاہتا تھا وہ اس کے بارے میں خود پڑھے۔

"یو آر رائٹ۔ یہ واقعی انٹرسٹنگ چیزیں ہیں۔ مجھے اس کے بارے میں اسٹڈی کرنی چاہیے تھی۔" وہ اس کی بات سے متفق تھی۔ دراصل جمی سوآگرٹ اور اس جیسے دوسرے لوگوں نے اسلام کے بارے میں زبردست پراپیگنڈہ کر رکھا تھا۔ ان کا کام ہی اسلام کے بارے میں ڈس انفارمیشن اور نفرت پھیلانا تھا تاکہ لوگ اس کے بارے میں جاننے کی آرزو ہی نہ کریں۔ شاید اس لیے کہ یہ روحانی پیشوا جانتے تھے کہ یہی سچا دین ہے۔ اگر لوگوں نے اس پر ریسرچ شروع کردی اس کو پڑھنا اور غور و فکر کرنا شروع کردیا تو وہ اس کی سچائی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے اور یہ دین بڑی تیزی سے پھیلنا شروع ہو جائے گا۔

☆ ☆ ☆

علی مراد کی باتوں نے اس کے دل میں اسلام کو جاننے کی خواہش پیدا کردی تھی۔ اس کے بارے میں اس کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ وہ ان کے بارے میں سوچنے لگ گئی تھی۔ یہ مذہب ان تمام پیغمبروں اور ان پر اتری ہوئی کتابوں کو مانتا تھا جنہیں وہ مانتے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے اور زندہ اور پھر دنیا میں دوبارہ آنے کو بھی مانتا تھا۔ جو کہ ان کے اپنے مذہب کے قریب ترین تھا تو پھر فرق کیا تھا۔ اختلاف کیا، کب اور کیوں پیدا ہوا تھا یہ سب جاننے کے لیے اسلام کے بارے میں جاننا بہت ضروری تھا۔ جیسے جیسے اس کے اندر سوال اٹھتے تھے وہ اسلام کے بارے میں پڑھنا شروع ہو گئی تھی اور جوں جوں پڑھتی جا رہی تھی اس کا تجسس مزید جاننے کے بارے میں بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو۔" وقفے میں کچھ دیر کے لیے وہ دونوں اکٹھے بیٹھے تو علی مراد نے اسے کچھ الجھا ہوا پایا تھا۔

"اورائین مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔" اس نے ایپل سڈر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"اورائین کون ہے۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا شاید، میرا بوائے فرینڈ ہے۔"

"ہاں شاید تم نے ذکر کیا تھا ایک دفعہ مگر ناراض کیوں ہو گیا ہے۔"

"بس آج کل میں اسے زیادہ وقت نہیں دے پا رہی۔"

"کیوں؟" اس نے یونہی پوچھا تھا۔

"یہاں سے جا کر سو جاتی ہوں اور جب اٹھتی ہوں تو کچھ کتابیں وغیرہ پڑھنے بیٹھ جاتی ہوں۔ بس پھر دل ہی نہیں چاہتا باہر نکلنے کو" اس نے مفصل جواب دیا۔

"کس قسم کی کتابیں پڑھ رہی ہو آج کل......!"

"تمہارے مذہب سے متعلق کچھ کتابیں ہیں۔"

"اوہ ریئلی! یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تمہیں کچھ نہ کچھ جان کر ہی ہمارے بارے میں رائے قائم کرنا چاہیے۔" وہ خوش ہوا۔

"میں چاہتی ہوں تم مجھے اسلام کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ میرے سوالوں کے جواب دے کر مجھے مطمئن کرو۔"

علی مراد کو ندامت نے گھیر لیا۔ وہ اس کے سوالوں کے ٹھیک سے جواب نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا علم محدود تھا۔ ایک غیر مسلم اس کے مذہب سے متعلق سوال کر رہی تھی اور اسے جواب نہیں آ رہا تھا۔ ایک امام مسجد کے بیٹے کا یہ حال تھا تو دوسرے لوگوں کا کیا ہوگا۔ آج اسلام کو ہر طرح سے بدنام کیا جا رہا تھا اور اسلام کے نام لیوا اس کا دفاع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ٹھیک ہے، وہ کوئی اسکالر نہیں تھا۔ عالم فاضل نہیں تھا۔ لیکن اتنا علم تو ہر مسلمان کو ہونا چاہیے کہ وہ غیر مسلم کو اس کے سوالوں کے جواب دے سکے۔

"میں نے بہت سارے مذاہب کو پڑھا ہے۔ صرف اسلام کو ہی اگنور کیا تھا۔ لیکن جب سے میں نے سنا ہے کہ تمہاری مقدس کتاب صدیوں سے ایک ہی ہے اور اس کا ایک لفظ بھی نہیں بدلا، مجھے اس کتاب کے بارے میں جاننے کا تجسس پیدا ہو گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں میں اسے پڑھوں۔ کیا تم مجھے قرآن کے بارے میں کچھ بتاؤ گے۔ تم نے تو اسے پڑھا ہوگا۔ مجھے بتاؤ اس میں کیا لکھا ہے۔ یہ کیا کہتا ہے؟"

اس نے ایک اور سوال کر دیا تھا اور علی مراد پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ ندامت سے نظریں جھک گئی تھیں۔

اس نے قرآن کو عربی میں پڑھا تھا اور ایک بار نہیں سینکڑوں بار پڑھا تھا۔ لیکن وہ قرآن سننا نہیں چاہتی تھی۔ اسے حرف بہ حرف سمجھنا چاہتی تھی کہ اس میں کیا لکھا ہے اور یہ تو علی مراد کو بھی نہیں پتا تھا۔ وہ اسے لمبی لمبی سورتیں زبانی سنا سکتا تھا لیکن ان کا ترجمہ کیا تھا، وہ نہیں بتا سکتا تھا۔ اس کی پیشانی ندامت کے قطروں سے عرق آلود ہو گئی تھی۔ جو کتاب وہ بچپن سے پڑھ رہا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں تھا اس کا مفہوم کیا ہے۔

میاں جی امام مسجد تھے۔ وہ تہجد گزار تھے۔ منہ اندھیرے جاگتے۔ مسجد میں اذان دیتے، امامت کرتے۔ فجر کے بعد اشراق پڑھتے پھر بڑی دیر تک وہیں رک کر لوگوں کے مسائل سنتے۔ زیادہ تر لوگ ان پڑھ تھے۔ وہ بڑی فہم و فراست اور اپنے تجربات کی روشنی میں ان کے مسائل حل کرتے۔ لوگ ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ سفید داڑھی، سفید براق تہبند و کرتا اور سر پر سفید پگڑی اونچا لمبا قد اور سرخ و سفید رنگت انہیں دیکھ کر خود بخود احترام کرنے کو جی چاہتا تھا۔

وہ اسلام کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ لیکن وہ سب کچھ جو ان کے بزرگوں نے ان کو بتایا تھا۔ جو ان کے مولوی صاحب نے انہیں سکھایا تھا۔ وہ بھی ان پڑھ تھے۔ ترجمہ سے قرآن پاک وہ بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ نہ ساری زندگی کوئی دینی کتاب پڑھی تھی۔ تمام علم یہاں وہاں سے حاصل کیا ہوا تھا۔ یہاں وہاں سے سنا ہوا تھا نہ کوئی تحقیق تھی نہ کہیں کوئی جستجو۔

حسن دین، علی مراد اور کنیز فاطمہ کو بہت چھوٹی عمر میں قرآن پاک پڑھا دیا گیا تھا۔ حسن دین نے قرآن حفظ کر کے میاں جی کی عزت میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔

یہاں آکر بھی اس کی ہر صبح کا آغاز قرآن پاک کی تلاوت سے ہی ہوتا تھا۔ لیکن آج جب لینیٹ نے پوچھا تھا کہ قرآن میں کیا لکھا ہے تو وہ پسینے پسینے ہو گیا تھا۔ وہ کئی صورتیں زبانی تو سنا سکتا تھا لیکن ان کا مفہوم کیا تھا یہ نہیں بتا سکتا تھا۔

دیار غیر میں رہ کر ہندوؤں، سکھوں، یہودیوں، عیسائیوں اور دیگر طرح طرح کے مذاہب کے لوگوں سے مل کر اتنا تو احساس ہو جاتا ہے کہ اللہ نے جو کتاب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری ہے، وہ صرف ریشم و حریر کے جزدان میں لپیٹ کر رکھنے والی، یا چوم کر سینے سے لگانے والی نہیں ہے۔ وہ تو پڑھنے والی اور سمجھ

کر عمل کرنے والی ہے۔ اس کا ایک ایک حرف غور طلب ہے۔ ایک ایک آیت اپنے اندر علم کے خزانے سنبھالے ہوئے ہے۔ کائنات کے تمام اسرار اس میں مخفی ہیں۔ تب ہی تو کہا گیا ہے "اس میں نشانیاں ہیں غور کرنے والوں کے لیے۔" جب تک اس کو سمجھیں گے نہیں، جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتے رہیں گے۔ یہود و انصار ہمارے علم سے مستفید ہو کر عروج کی انتہا پر پہنچ رہے ہیں اور ہم گھریلو مسائل میں بھی اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ کتنے بد قسمت ہیں ہم گھر میں ہیرے جواہرات پڑے ہیں اور ہم باہر خاک چھانتے پھرتے ہیں۔

"بہتر ہو گا لینٹ کہ تم اسلامک سینٹر جوائن کر لو تاکہ تمہیں تمہارے سوالوں کا صحیح جواب مل سکے۔" اگلے روز علی مراد نے اسے قرآن کا انگلش نسخہ تحفتاً پیش کرتے ہوئے مشورہ دیا۔

"ہاں میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔" وہ فوراً ہی مان گئی۔ اب وہ واقعی اسلام کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

قرآن کا مطالعہ کر کے جہاں اس کا تجسس بڑھ گیا تھا وہاں اسے کوئی سوالوں کے جواب بھی مل گئے تھے۔

"قرآن واقعی ایک معجزہ ہے۔" وہ حیران تھی۔ اور بے حد متاثر ہو کر اسے بتا رہی تھی۔

"ہمارے ہاں کئی قسم کی بائبل ہیں۔ خود ہمارے گھر میں سب کی مختلف بائبل ہیں۔ ہر سنڈے نائٹ کو ہم لوگ کچن کے ڈائننگ ٹیبل پر یا لونگ روم کے کافی ٹیبل پر اپنی اپنی بائبل لے کر بیٹھ جاتے ہیں سب ڈسکس کرتے ہیں کہ کون سی والی بائبل زیادہ (Authantic) (صحیح) ہے۔ بائبل کی اصل لینگویج ڈیڈ ہو چکی ہے اور اس کے ڈاکومینٹس بھی ہزاروں سال پہلے گم ہو چکے ہیں۔ لیکن پرافٹ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اترنے والی کتاب ایک ہے اور اب تک سیم ہے۔ یقیناً "یہ معجزہ ہے۔ یہی اس کی سچائی کا ثبوت ہے۔" وہ بے حد متاثر تھی۔

علی مراد کو خوشی تھی کہ وہ پکی عیسائی ہونے کے باوجود قرآن کی سچائی کا اعتراف کر رہی تھی۔

اب تو وہ اکثر اس سے پاکستان اور اس کے کلچر کے بارے میں بھی پوچھتی رہتی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ مسلم ممالک کی ڈاکومنٹریز دیکھتی رہتی ہے اور اسلام نے عورت کو جو مقام دیا ہے اس پر حیران بلکہ خوش بھی ہے۔

"تمہارے بوائے فرینڈ کا کیا حال ہے۔" آج بہت عرصہ بعد اسے خیال آیا تو وہ اس کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"وہ مجھے چھوڑ چکا ہے۔ اب اس کی کوئی اور گرل فرینڈ ہے۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گیا تھا۔"

"کیوں؟"

"میں اس کی برتھ ڈے پارٹی میں اس کے ساتھ کلب نہیں گئی تھی۔ ویسے بھی وہ چاہتا ہے، اب ہم ایک Love child پیدا کر لیں۔" اس نے پاپ کورن کھاتے ہوئے لاپروائی سے بتایا۔ مرد ہونے کے باوجود علی مراد کو اس کی بات سن کر نظریں چرانا پڑ گئی تھیں۔

"لیکن مجھے یہ سب ٹھیک نہیں لگتا۔" اس کی جانب سے کوئی سوال نہ پا کر اس نے خود ہی وجہ بھی بتا دی۔ جو کہ علی مراد کے لیے باعث حیرت تھی۔ ان کی سوسائٹی میں یہ چیز عام تھی۔ خود اس کی بہن کے تین بچے بغیر شادی کے پیدا ہوئے تھے اور وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہتی تھی۔ پھر اسے کیوں یہ ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ سوچنے کی بات تھی۔

☼ ☼ ☼

اسلامک سینٹر جا کر اس پر بہت سے راز آشکار ہوئے تھے۔ بہت سی حقیقتیں اجاگر ہوئی تھیں۔ بہت سی آدھی ادھوری باتیں واضح ہوئی تھیں۔

اس کے گھر والے اس کے بدلے بدلے انداز و اطوار دیکھ رہے تھے اور اب کچھ دنوں سے اس کی حرکات و سکنات کا سنجیدگی سے نوٹس لے رہے تھے۔ وہ چھپ کر اسلامی کتابیں پڑھتی تھی اور ایک روز مسز بروک نے اسے پکڑ لیا تھا۔ گو کہ وہ دوسرے مذاہب کو بھی اسٹڈی کر چکی تھی لہٰذا یہ کوئی اچھنبے والی بات نہیں تھی لیکن جب سے اس نے اسلام کی حمایت میں بولنا شروع کیا تھا جب بھی بائبل پر ڈسکس ہوتی وہ کسی نہ کسی بات میں قرآن کا حوالہ دے دیتی اور اس کے نزدیک وہ ہی صحیح بھی ہوتا۔ اس کی بڑھتی ہوئی دلچسپی اور بڑھتے ہوئے یقین نے انہیں خبردار کر دیا تھا۔ مسٹر اور مسز بروک نے اسے واضح الفاظ میں سمجھا دیا تھا کہ وہ اسلامک لٹریچر پڑھنا چھوڑ دے۔

"اس میں سب جھوٹ لکھا ہوا ہے۔ دکھاوا ہے۔ حقیقت بالکل مختلف ہے۔" اور اس تنبیہہ کے ساتھ وہ اس پر پوری طرح نظر بھی رکھنے لگے تھے لیکن انہیں خبر نہ ہوئی تھی کہ ان کے احساس ہونے تک وہ اس معاملے میں کافی دور نکل چکی ہے۔

اس اتوار کی رات وہ اپنی اپنی بائبل لائے تو وہ قرآن لے آئی تھی۔ مسٹر بروک نے اسے پیار سے سمجھانا چاہا مگر وہ بحث پر اتر آئی تھی۔ وہ حیران رہ گئے تھے۔ وہ اسلام کے بارے میں بہت زیادہ جان چکی تھی۔ اس کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی آخری پروفٹ تھے اور Jesus نے اس کی خوشخبری بائبل میں بھی دی تھی۔

"تمہیں یہ سب باتیں کس نے بتائی ہیں۔" مسز بروک نے برہمی سے پوچھا تھا۔

"اسلامک لٹریچر نے.....۔"

"یہ بھی تو مسلمانوں کا خود سے لکھا ہوا ہے۔ پھر اس پر یقین کیوں کرتی ہو۔"

"کیونکہ اس کی تصدیق قرآن نے کی ہے اور قرآن میں کچھ بھی اضافی نہیں ہے۔ یہ ویسا ہی ہے، جیسا نازل ہوا تھا۔"

مسٹر اور مسز بروک اس کے پختہ یقین پر حیران ہو کر رہ گئے تھے اور تب اس نے ان پر مزید انکشاف کر دیا تھا کہ وہ اسلام قبول کرنے والی ہے۔

اب کے وہ دونوں ششدر رہ گئے تھے۔ حیرت اور صدمے سے ان کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ اس کا مسلمان ہونا شاید اتنی بڑی بات نہ ہوتا اگر وہ کوئی معمولی خاندان ہوتا، مگر وہ تو پریسٹ (پادری) تھے۔ چرچ تعمیر کرنے والوں میں سے تھے۔ وہ تو ان آرگنائزیشنز کا حصہ تھے جو عیسائیت پھیلاتی تھیں اور ان کی اپنی بیٹی مذہب چھوڑ رہی ہے۔ اس سے زیادہ شرم ناک بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ غم و غصے نے گھر کا ماحول بدل کر رکھ دیا تھا، سب کا رویہ ایک دم سے ہی بدل گیا تھا۔

"تم جانتی ہو، یہ مسلم ہندوؤں سے بھی بدتر ہیں۔ آپس میں بہن بھائی شادیاں کر لیتے ہیں۔" مسٹر بروک نے ناشتے کی ٹیبل پر پھر وہی موضوع چھیڑ کر اسے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"کزن میرج کو بہن بھائی کی شادی کا نام نہ دیں ڈیڈی! اس دین نے لوگوں کے لیے بڑی آسانیاں پیدا کی ہیں۔ ہاں مختلف مردوں سے بچے پیدا کرنا، شادی کے بغیر اکٹھے رہنا، میرے نزدیک یہ قابل اعتراض چیزیں ہیں۔ جس کی اسلام میں کہیں گنجائش نہیں ہے۔" اس کے پاس ہر سوال کا جواب تھا۔

"اسلام میں چار شادیاں جائز ہیں۔ کتنا Ridiculous (مضحکہ خیز) ہے۔" مسز بروک نے تمسخر سے کہا۔

"ہاں جائز ہیں مگر فرض نہیں ہیں۔ اس کی ڈیٹیل (گہرائی) میں جائیں تو آپ کو پتا چلے کہ اجازت کے باوجود نائنٹی نائن پرسینٹ مسلم چار شادیاں نہیں کرتے۔ اسلام مکمل کوڈ آف لائف (ضابطہ حیات) ہے۔ اس میں ہر مسئلے کا حل مسئلہ پیدا ہونے سے پہلے بتا دیا گیا ہے۔ آج کے دور میں عورتوں کی پرسینٹ ایج (شرح فیصد) دیکھ لیں چار چار عورتوں کے حصے میں ایک مرد آ رہا ہے لیکن قرآن نے اس کا حل چودہ صدیاں پہلے بتا دیا تھا وہ بھی صرف اس کنڈیشن پر کہ اگر

تم انصاف کرسکو۔ پھر قرآن اور اسلام کو دوسری کتابوں اور مذاہب پر فوقیت کیسے نہ ہو؟" وہ بڑی روانی سے وضاحت کررہی تھی۔

مسٹر بروک ششدر رہ گئے تھے۔ کیسے لاجواب کیا تھا' اس نے کتنی دلیل سے جواب دیا تھا۔

"میں آپ کو بھی مشورہ دیتی ہوں کہ آپ اس کے بارے میں ریسرچ کریں۔ آپ کو پتا چل جائے گا کہ عیسائیت میں ـــــ"

"میں لوگوں کو بائبل کے بارے میں بتاتا ہوں اور تم مجھے سکھارہی ہو' مذہب کیا ہے۔ یہ مسلم لڑکا تمہیں مس گائیڈ کررہا ہے۔" وہ علی مراد کو ہی اس کا سبب سمجھ رہے تھے۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ ان خوش نصیبوں میں سے تھی جسے اللہ نے خود ہدایت کے لیے چن لیا تھا۔ پھر وہ کیسے پیچھے ہٹ سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ ایک عام سا دن تھا۔ لیکن اس کے لیے اس روئے زمین پر اس سے زیادہ خاص دن کوئی نہیں اترا تھا' جب اس نے اسلامک سینٹر جاکر گواہوں کی موجودگی میں کلمہ پڑھا تھا۔

وہ بے حد مطمئن اور پرسکون تھی۔ اس کے اندر روشنیاں سی پھوٹ رہی تھی۔ اسے اپنے اندر بہت بڑی تبدیلی محسوس ہورہی تھی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا' سجدے میں سر رکھے اور رو رو کر اپنی پچھلی زندگی کی تمام غلطیوں کو ملامت کے آنسوؤں سے دھو ڈالے۔ وہ بڑی مسرور و شاداں سی گھر لوٹی تھی۔

"میں کنورٹ ہوگئی ہوں۔ میرا نام آج سے عائشہ ہے۔"

مسٹر اینڈ مسز بروک شام کی چائے پی رہے تھے جب اس نے انکشاف کیا تھا۔

"تم مسلمان ہوگئی ہو؟ ایک پریسٹ کی بیٹی ایک Evangelist (مبلغ) کی بیٹی۔ ہم تبلیغ کرتے ہیں' لوگوں کو سمجھاتے ہیں اور ہمارے ہی گھر میں ہماری ہی بیٹی کنورٹ ہوگئی ہے۔" مسٹر بروک انتہائی شاکڈ تھے۔

"تم ایسا نہیں کروگی لینٹ! یہ پاسبل نہیں ہے۔" مسز بروک ان سے بھی زیادہ شاکڈ تھیں۔

"میں ایسا کرچکی ہوں۔ میں اسلامک سینٹر سے ہی آرہی ہوں۔"

"تمہیں اپنا فیصلہ بدلنا ہوگا۔"

"اب تو یہ ناممکن ہے۔" اس کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ وہ بالغ تھی اور مکمل طور پر خود مختار تھی۔ قانون کے مطابق وہ اس پر کسی قسم کی سختی نہیں کرسکتے تھے اور اس وقت وہ اس کے سامنے بالکل بے بس تھے۔

"ٹھیک ہے اگر تم نے اپنا فیصلہ نہ بدلا تو تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنی فیملی چھوڑنا پڑے گی۔ تمہاری بہنوں کا بھی یہی فیصلہ ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی تم سے کبھی بھی نہیں ملے گا۔" انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"ڈیڈی۔" اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے مذہب کو چھوڑا تھا مگر رشتے کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ ان کی فیملی' ان فیملیز میں سے ایک تھی جہاں رشتے ناتوں کی قدر اور پرواہ تھی۔

گھر چھوڑنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ ان کے معاشرے میں۔ وہ بھی کہیں بھی رہ سکتی تھی لیکن وہ تو اس سے ہر طرح کا تعلق توڑ رہے تھے۔ مکمل طور پر قطع تعلق کررہے تھے اور وہ جانتی تھی وہ سچ مچ ایسا ہی کریں گے۔ کیونکہ وہ کبھی برداشت نہیں کرسکتے کہ ان کی بیٹی مسلمان ہو لیکن کیا وہ ان سب کے بغیر ساری زندگی گزار سکے گی۔ وہ بچپن سے "ڈیڈ گرل" تھی۔ ہر وقت ان کے ساتھ رہتی تھی۔ یہاں تک کہ کافی عرصہ سوتی بھی ان ہی کے ساتھ رہی تھی۔

"ڈیڈی پلیز اتنی بڑی آزمائش میں نہ ڈالیں۔" وہ سچ مچ بوکھلا گئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ان کا ردعمل اس قدر شدید ہوگا اس کا خیال تھا وہ برا مانیں گے ناراض ہوں گے فیصلہ بدلنے پہ مجبور کریں گے۔ مگر یہ سب زیادہ دیر تک نہیں ہوگا۔ کچھ عرصے میں سب کچھ نارمل ہوجائے گا۔ یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ کئی لوگ مذہب تبدیل کرتے تھے اور ان کی فیملیز ملتی رہتی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کے اپنے تو ایک پل میں بیگانے ہوگئے تھے۔ وہ ڈیڈی کی نیچر کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ اپنے موقف کے پکے تھے اور بالخصوص مذہب کے معاملے میں۔ انہوں نے اگر ایک دفعہ تعلق توڑ دیا تو اس کا مطلب ہے ہمیشہ کے لیے تعلق ختم۔

"تو پھر تم اپنی ممی کی بات مان لو۔ دونوں میں سے کسی ایک کو چن لو۔" انہوں نے ایک بار پھر آپشن دی تھی۔ لیکن آپشن کی تو بات ہی کوئی نہ تھی۔ اس کے پاس ایک راستہ تھا جو اس نے چن لیا تھا۔ سچا' روشن اور واضح راستہ۔

"ٹھیک ہے۔ میں جارہی ہوں!" اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

"سوچ لو لینٹ! تم سب کچھ لوز کررہی ہو۔ ماں باپ بہن بھائی زندگی کی تمام آسائشیں۔ یہ مسلم بڑے بے اعتبار لوگ ہیں۔ غریب ملکوں سے آتے ہیں۔ یہاں آکر ان کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے یہاں کی لڑکیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ گرین کارڈ اور سٹیزن شپ لینے کے بعد انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ اپنی بیوی' اپنے بچے سب بھول جاتے ہیں۔ دیکھنا' یہ علی مراد بھی ایسا ہی کرے گا۔" مسز بروک نے سمجھاتے ہوئے اپنا خدشہ بھی ظاہر کردیا۔

"آپ لوگ بالکل غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں کسی کے بہکاوے میں نہیں آئی۔ میں نے کسی شخص کے لیے اسلام قبول نہیں کیا۔ علی مراد تو اس معاملے میں کہیں بھی نہیں ہے۔ وہ میرا ایک عام سا دوست ہے۔ کولیگ ہے اور بس۔ میں کسی کی محبت کے لیے مذہب نہیں بدل رہی۔ میں اسے پڑھ کر' اسے سمجھ کر اس پر ایمان لائی ہوں۔ میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوگا جو آپ سمجھ رہی ہیں۔"

اس نے اپنا بیگ اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔ ایک آخری نظر گھر پر اور الوداعی نظر ممی ڈیڈی پر ڈالی اور دھندلائی آنکھوں سے باہر نکل آئی۔

☆ ☆ ☆

سب دروازے اس پر بند ہوچکے تھے۔ واپسی کی کوئی راہ تھی نہ ارادہ۔ وہ تمام کشتیاں جلاکر آئی تھی۔

کھلا آسماں تھا اور وہ تھی۔

بھری دنیا میں اس وقت کوئی بھی اپنا نہ تھا۔ اگر اس کے پاس کچھ تھا تو اللہ پر یقین تھا۔ کامل یقین۔

اوائل دسمبر کی وہ سلونی شام بڑی دھندلی سی تھی۔ ساری رات برف گرتی رہی تھی۔ روئی جیسی سفید برف نے ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ سردی اپنے عروج پر تھی۔ یخ بستہ ہوائیں جسم میں چھید کردینے والی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہوگئی تھی۔ فوری طور پر تو اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کہ وہ کیا کرے۔ کہاں جائے۔ رات کہاں گزارے۔ کسی موٹل میں کمرہ لے لے۔ یا پھر کسی کی مدد لے۔

معاً" اسے کورٹنی کا خیال آیا۔ اس نے سوچا فی الحال تو اس کی مدد لے بعد کی بعد میں سوچی جائے گی۔ فیصلہ کرکے وہ سیدھی اس کے پاس پہنچی۔

ویک اینڈ تھا۔ وہ تیار ہورہی تھی۔

"کہیں جانے کی تیاری ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ٹام کے ساتھ پارٹی پہ جارہی ہوں۔" اس نے جواب میں بتایا۔

"واپس آؤگی یا اس کے اپارٹمنٹ پر جاؤگی؟"

"نہیں۔ وہ میرے ساتھ یہاں آئے گا۔ وہ فائر ہوگیا ہے۔ اپارٹمنٹ افورڈ نہیں کرسکتا۔ آج کل میرے ساتھ رہ رہا ہے۔" اس نے لانگ شوز پہنتے ہوئے بتایا۔

"اوہ اچھا ـــ ایکچوئلی آج میں بھی تمہارے ساتھ رہنا چاہ رہی تھی۔ تمہیں بتایا تھا ناں۔ میں کنورٹ ہورہی ہوں۔ ڈیڈی نے میرے ساتھ کٹ آف کردیا ہے۔ ساری فیملی ان کے ساتھ ہے۔ میں

خواتین ڈائجسٹ 189 اکتوبر 2011

سب کچھ چھوڑ کر آگئی ہوں۔
"سو سیڈ۔" اس نے رد عمل ظاہر کیا۔
"کل سے کوئی ارینج منٹ کروں گی۔"
"ڈزن میٹر۔ جب تک مرضی رہو۔ ہمارے لیے بیڈ روم ہے۔ تم لونگ روم میں سو جانا۔" اس نے بیگ کھول کر کچھ ڈھونڈتے ہوئے کہا۔
"تھینک یو' سو نائس آف یو۔"
"اوکے میں جا رہی ہوں۔ کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ پھر ڈنر کرنا ہے اس کے بعد کلب جائیں گے۔ تم آرام سے سو جانا۔" اس نے اپنا بیگ اور کار کی چابی اٹھائی۔
"ہاں' کچھ کھانا ہو تو فریج دیکھ لینا۔" اس نے جاتے جاتے پلٹ کر کہا اور عجلت میں باہر نکل گئی۔
وہ آج تقریباً" سارا دن ہی گھر سے باہر رہی تھی۔ اب تھکاوٹ کا احساس ہوا تھا۔ نرم گرم کاؤچ پر پاؤں اٹھا کر بیٹھنے سے کچھ سکون آیا تھا۔ اس نے نیم دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔
کورٹنی اس کی اسکول فرینڈ تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بہت وقت گزارا تھا۔ وہ اکثر اس کے ہاں آتی رہتی تھی۔ اس کے موجودہ بوائے فرینڈ ٹام کے ساتھ بھی اس کی اچھی خاصی ہیلو ہائے تھی۔ مگر جس طرح وہ یہاں آج بیٹھی تھی وہ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔
وہ کتنی ہی دیر خالی الذہن بیٹھی رہی۔ باہر بارش زوروں سے برس رہی تھی اور اندر ایک دم سناٹا تھا۔
رات کے آٹھ بجے تھے۔ اس وقت ان کے گھر میں ڈنر ہوتا تھا۔ سارے دن کی باتیں بھی ڈنر پر ہی ہوتی تھیں۔ بعد میں ممی کافی بناتیں اور وہ سب بیٹھ کر کچھ دیر ٹی وی دیکھتے۔ ڈیوس ہوم ورک کر کے فارغ ہو چکا ہوتا تو کوئی نہ کوئی ویڈیو گیم کھیل رہا ہوتا۔ ویک اینڈ پر اس کی دونوں بہنیں میلوڈی اور جینا بھی آجاتی تھیں۔ آج بھی ویک اینڈ تھا' وہ دونوں اپنے بچوں کے ساتھ ضرور آئی ہوں گی اور اس وقت ڈنر کرتے ہوئے وہ سب اس کے متعلق بات کر رہے ہوں گے۔ بہن بھائی' ممی ڈیڈی سب کی محبت ایک دم سے نفرت میں کیسے بدل سکتی ہے۔
گھر' گھر والے' بچپن سے لے کر اب تک ان کے ساتھ گزارا ہوا وقت ایک ایک لمحہ' ایک ایک پل اس کی نظروں سامنے' کسی فلم کی طرح ذہن کی اسکرین پر چلنے لگا۔ اس نے خود کو مکمل طور پر ان یادوں کے سپرد کر دیا۔
نجانے کب تک یونہی بیٹھی رہی۔
اچانک بھوک کے احساس نے ستایا تو اسے یاد آیا کہ اس نے صبح ناشتے میں ڈونٹس کھائے تھے۔ تب سے لے کر اب تک کافی کے ایک کپ کے سوا کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔
اس نے اٹھ کر فریج کھولا۔ اس میں پاؤنڈ کیک رکھا تھا۔ جنجر بریڈ اور پورک سٹیکس پڑے تھے۔ غالباً" کورٹنی اور ٹام نے لنچ اسی کا کیا تھا۔ پورک سٹیکس کبھی اس کے فیورٹ ہوتے تھے اور وہ بڑے شوق سے کھاتی تھی۔ مگر آج وہ اس کے لیے سب سے زیادہ ناپاک چیز تھی۔ بھوک کی شدت اسے ستا رہی تھی مگر فریج میں اسے کچھ بھی مناسب یعنی حلال نہیں مل رہا تھا۔ شاید اتفاق تھا کہ کسی طرح کا فروٹ یا دودھ بھی نہیں موجود تھا۔
وہ مایوس ہو کر واپس صوفے پر بیٹھ گئی۔ باہر ایک بار پھر برف گرنا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے قریب رکھے آٹومین میں سے کمبل نکالا اور سر کے نیچے کشن لے کر لیٹ گئی۔ بھوک کی شدت سے نیند بھی نہیں آرہی تھی۔
"اے اللہ' مجھے ثابت قدم رکھنا اور ہر مشکل سے گزرنے کی ہمت دینا!" اس نے بے آواز دعا کی۔ آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے اور پھر اس نے خود کو رونے دیا۔ پتا نہیں کب تک روتی رہی۔ روتے روتے ہی جانے کب آنکھ لگی تھی۔
رات کے قریباً" تین بجے کورٹنی ٹام کے ساتھ واپس لوٹی تھی۔ دونوں نشے میں تھے۔ بلکہ بری طرح دھت تھے۔ اس کے لیے یہ سب کچھ نیا یا انوکھا نہیں تھا۔ لیکن آج اسے یہ سب برا لگ رہا تھا۔ بہت برا۔

دونوں بیڈ روم میں چلے گئے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے' وہ سو رہی ہے۔ لیکن اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اب اسے نیند نہیں آرہی تھی۔
اسلام قبول کرنے کے بعد وہ ایسے گھر میں ایسے لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔
صبح اٹھ کر وہ کورٹنی کو بتائے بغیر جاب کے لیے نکل آئی۔ گو کہ آج سنڈے تھا لیکن اس کا آف نہیں تھا۔
رات کو جاگتے رہنے کی وجہ سے سر بھاری ہو رہا تھا۔ بھوک کی وجہ سے نقاہت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ دیر تک روتے رہنے سے آنکھیں بھی دکھ رہی تھیں۔ مگر پھر بھی وہ سارا دن اپنی ڈیوٹی دیتی رہی تھی۔ آف کر کے باہر آئی تو علی مراد گاڑی میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔
"تم تو آج آف تھے۔ کیوں آئے ہو؟"
"تمہیں مبارک نہیں دیتا کیا!" وہ بہت خوش تھا۔ لینٹ نے کل ہی اسے اسلامک سینٹر سے فون کر کے یہ خوش خبری سنا دی تھی۔
"آؤ بیٹھو' کہیں بیٹھتے ہیں۔" اس نے کار کا لاک کھولا۔
"میری گاڑی.....؟"
"واپسی پر لے لیں گے!"
"اوکے۔" وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے گاڑی دیسی ریسٹورنٹ کے سامنے روک دی۔
"یہ کہاں.....؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"ارے بھئی۔ میں تمہیں ڈنر کرواؤں گا۔ تم مسلمان ہوئی ہو۔ کیا میں تمہاری دعوت بھی نہ کروں؟" اس نے وضاحت کی تو وہ چپ چاپ اس کے پیچھے آ گئی۔
"فی الحال تو اسی طرح ٹریٹ دے سکتا ہوں۔ کچھ دنوں بعد پارٹی ارینج کریں گے۔ جس میں کپلز کو انوائٹ کروں گا تاکہ تمہاری جان پہچان مسلم فیملیز کے ساتھ ہو سکے۔" وہ کھانا کھاتے ہوئے پلان کر رہا تھا اور وہ خاموشی سے سن رہی تھی۔
"کیا بات ہے۔ تم ٹھیک سے کھانا نہیں کھا رہی ہو۔" وہ خاموش رہی۔
"اگر طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو چلو' میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔"
"کون سے گھر.....؟"
"تمہارے گھر.....!"
"اب وہ میرا گھر نہیں ہے۔"
"کیا مطلب.....؟" وہ چونکا۔
"ممی' ڈیڈی سب نے مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اب میں وہاں کبھی نہیں جا سکتی۔"
"اوہ..... تو کل سے کہاں تھیں۔ ہوٹل میں؟"
"نہیں' کورٹنی کے پاس۔ میری اسکول فرینڈ ہے۔ لیکن اب مجھے مزید وہاں نہیں رہنا۔ اس کا بوائے فرینڈ اس کے ساتھ رہتا ہے۔" اس نے جواب دے کر وجہ بھی بتا دی۔
"پھر.....؟"
"اب یہ کہ اپارٹمنٹ ڈھونڈنا ہو گا۔ کسی کے ساتھ شیئر بھی کر سکتی ہوں۔ لیکن اس میں دو چار دن لگ سکتے ہیں۔ سوچ رہی ہوں ایمرجنسی شیلٹر کو کال کروں اور اگر نہ ہو تو پھر کسی ہوٹل میں کمرہ لے لوں۔" وہ جیسے خود سے بات کر رہی تھی۔
علی مراد شرمندہ ہو گیا۔ کتنی اکیلی ہو گئی تھی وہ۔ جب کوئی اپنا مذہب بدل کر عیسائیت میں جاتا ہے تو اسے بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ گھر' جاب ہر طرح کی مراعات دی جاتی ہیں۔ ہر طرح سے مدد کی جاتی ہے۔" مگر مسلمانوں نے نو مسلم کے لیے کچھ بھی پلان نہیں کیا تھا۔ نہ کوئی ادارہ تھا نہ کوئی تنظیم۔
باہر جھاجوں بارش برس رہی تھی اور موسم کی رپورٹ کے مطابق رات کے کسی پہر برف کا طوفان آنے والا تھا۔
"بہت پریشان ہو؟" وہ خود پریشان ہو گیا تھا۔
"نہیں۔ اللہ کے ہوتے ہوئے مجھے پریشان ہونے

کی کیا ضرورت ہے۔"

"تم بہت اچھی ہو عائشہ! گھبرانا نہیں۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آرام سے کھانا کھاؤ۔"

اس نے مزید حوصلہ دیا۔ وہ چپ چاپ کھانا کھانے لگی۔ پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے علی مراد کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ٹکرا گیا تھا۔

"تمہیں تو اچھا خاصا ٹمپریچر ہے۔" وہ حیران ہوا۔ وہ اس حالت میں صبح سے کام کر رہی تھی۔

"ہاں۔ صبح سے ہی محسوس ہو رہا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ علی مراد سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے لیے پہلا دن ہی بڑا صبر آزما اور تکلیف دہ تھا۔

رات کی بڑھتی ہوئی تاریکی، بے رحم موسم، اور ایک بے آسرا و تنہا جوان مسلمان لڑکی۔ جو صرف اللہ اور اس کے رسول کے لیے سارے رشتے اور ہر طرح کی آسائشیں چھوڑ آئی تھی۔ کیا یہ سب جان کر بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔

اس سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ لیکن اس کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ اسے راہ میں اتار کر وہ گھر جائے اور سکون سے سو جائے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کا مناسب انتظام کر کے ہی گھر جائے گا۔

"تم اپنی گاڑی لو اور میرے پیچھے آؤ۔" پارکنگ میں گاڑی روک کر اس نے کہا۔

"لیکن کہاں!"

"مسجد چلتے ہیں۔ شاید کوئی حل نکل آئے۔"

"ٹھیک ہے!" وہ اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں مسجد کے احاطے میں تھے۔ عشاء کے نماز پڑھ کر لوگ کب کے واپس جا چکے تھے۔ مسجد خالی پڑی تھی۔ وہ چپ چاپ عورتوں والے کمرے میں بیٹھی دیواروں پہ آویزاں فریم میں لگی خطاطی کو دیکھ رہی تھی۔ علی مراد نے اس کے تمام حالات امام صاحب کو بتا دیے تھے۔ وہ اس کے جذبے اور ہمت سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

"یقیناً" تم جیسے لوگ قابل عزت اور قابل فخر ہوتے ہیں۔ تم نے اللہ کو راضی کیا ہے، وہ تمہیں بھی مایوس نہیں کرے گا۔ یہ دنیاوی تکلیفیں تو نیک لوگوں کی آزمائش ہوتی ہیں۔ اصل اجر تو آخرت میں ملتا ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔" انہوں نے بڑی شفقت سے کہا تھا۔

"جی!" اسے بڑی ڈھارس ملی تھی۔

"جب تک کہیں انتظام نہیں ہو جاتا۔ میرے گھر کے دروازے تم پر کھلے ہیں۔ گھر میں میری بیوی اور دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی دو بیٹوں کی شادی ہو چکی ہے۔ تم بھی میری بیٹی جیسی ہو۔ آؤ میں تمہیں ان سے ملواؤں!" ان کا گھر مسجد سے ملحقہ تھا۔

علی مراد کو ان کے گھر کا ماحول اچھا لگا تھا۔ ان کی بیوی اور بیٹیاں بڑی خوش اخلاق اور ملنسار تھیں۔ بڑی بیٹی خدیجہ جاب کرتی تھی اور چھوٹی اقرا کالج جاتی تھی۔ امام صاحب کی بیوی بڑی نیک اور سادہ مزاج خاتون تھیں۔

"تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی بیٹی! اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔" انہوں نے بڑی شفقت سے کہا۔

"ہاں اگر تکلف کرو گی تو ہمیں تکلیف ضرور ہو گی۔" اقرا نے کہا۔ تو سب کے ساتھ وہ بھی ہنس دی۔

☆ ☆ ☆

وہ یہاں مطمئن تھی۔ بلکہ خوش تھی۔ امام صاحب کی بیوی اور بیٹیاں اسے اسلام کے متعلق بہت کچھ سکھا رہی تھیں۔

علی مراد سے اس کی جاب پر روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ وہ اس کی بھی شکر گزار تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ مناسب کرائے پر گھر ڈھونڈ رہی ہے۔ گو کہ امام صاحب اور ان کی فیملی نہیں چاہتی تھی کہ وہ وہاں سے جائے۔ لیکن اسے مناسب نہیں لگتا تھا کہ وہ کسی کے گھر میں پڑی رہے۔ وہ لوگ بہت اچھے بہت خیال رکھنے والے تھے۔ لیکن وہ ان کے اخلاق کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔

اور اس روز اس نے بتایا تھا کہ اسے ایک اچھا اسٹوڈیو مل گیا ہے۔ پہلی کے بعد وہ شفٹ ہو جائے گی۔

علی مراد امام صاحب کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ اس کڑے وقت میں انہوں نے اس کا ساتھ دیا تھا اور عائشہ کو اپنے گھر میں بیٹیوں کی طرح رکھا تھا۔

امام صاحب علی مراد کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا۔ اسی مسجد میں آتا تھا۔ امام صاحب اکثر اس کی تعریف کرتے تھے بلکہ دوسرے نوجوانوں کو اس کی مثال دیا کرتے تھے کہ مصروفیت کے باوجود وہ اکثر باجماعت نماز ادا کرنے آتا ہے۔ اسی لیے تو اس کے کہنے پر انہوں نے عائشہ کو اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔

"ارے بھئی شکریہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی مدد کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔" اس کے شکریہ کرنے پر انہوں نے جواب دیا۔

"وہ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔ تمہاری طرح مجھے بھی خوشی ہے کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ لیکن ذرا سوچو۔ کیا ہمارا اتنا ہی فرض ہے؟"

"جی کیا مطلب.....؟"

"دیکھو، اس کے اپنوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اس وقت ہم ہی اس کے اپنے ہیں۔ کیا ہمیں زیب دیتا ہے کہ ایک مسلمان بچی کو تنہا رہنے کے لیے چھوڑ دیں۔ کیا ہم اپنی بہو بیٹی کو اس طرح تنہا رہنے دے سکتے ہیں۔ یقیناً "نہیں۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" اس نے ان کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے سوال کیا۔

"اس کے لیے کچھ اور انتظام کرنا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کل ہی کسی مسلم فیملی سے بات کرتا ہوں۔ شاید کسی نے اپنا اپارٹمنٹ شیئر کرنا ہو۔ مسجد میں بھی لکھ کر لگا دیتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی اسٹوڈنٹ تو ضرور مل جائے گی جس کے ساتھ یہ رہ سکے۔" اس نے مسئلے کا حل تلاش کیا۔

"نہیں برخوردار! یہ وقتی سہارے ہیں۔ میں اس کے بارے میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

"جی کہیے۔"

"ان چند دنوں میں وہ مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز ہو گئی ہے اور اس نے بھی مجھے اپنے باپ کی سی عزت دی ہے۔ ماشاء اللہ بہت اچھی بچی ہے۔ اسلام کے بارے میں اتنی تحقیق کر چکی ہے، اتنا کچھ جانتی ہے کہ ہم جیسے ہزاروں مسلمانوں سے اچھی مسلمان ہے۔ اس کی عمر چوبیس سال ہے۔ اس عمر میں بیٹیوں کی شادی ہو جانی چاہیے۔ میری اپنی دونوں بیٹیاں اس عمر میں اپنے گھر کی ہو گئی تھیں۔ میں نے اسے بھی شادی کا مشورہ دیا ہے۔

میں چاہتا ہوں، وہ مسلمانوں کے ساتھ عارضی نہیں مضبوط رشتوں میں بندھے۔ مسلمان گھرانے کی بہو اور مسلمان کی بیوی بنے۔ مسلمان بچوں کی ماں کہلائے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ زیادہ دن تک خود کو تنہا محسوس کرے۔ اس کے بھی اپنے ہونے چاہئیں۔ وہ رشتوں کی بہت بڑی قربانی دے کر آئی ہے۔ اسے اچھا خاندان اور چاہنے والے رشتے ملنے چاہئیں۔" انہوں نے بڑا مفصل جواب دیا۔

وہ مبہوت بیٹھا پوری طرح ہمہ تن گوش تھا۔ مولوی صاحب کی باتیں اس کے دل کو لگی تھیں۔ یقیناً" وہ بہت دانش مند تھے۔ اس نے تو اس پوائنٹ پر سوچا ہی نہیں تھا۔

"آپ نے بہت اچھا سوچا ہے۔ میں آپ کے خیال سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن آپ نے عائشہ سے پوچھا ہے کہ وہ کیا سوچتی ہے؟"

"میں نے کہا ناں۔ اس نے مجھے اپنے باپ کی سی عزت دی ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ اس کی عمر شادی کرنے کی ہے۔ میری بیوی نے بھی اس سے بات کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ آپ لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ اب ہمیں ہی اس کے لیے اچھا لڑکا ڈھونڈنا ہو گا۔ وہ تو زیادہ لوگوں کو جانتی نہیں ہے۔"

"بھئی۔ میں تو ڈھونڈ چکا ہوں۔ اب تمہاری رائے

لینی ہے۔"

"جی.... کون؟" اس کا ماتھا ٹھنکا۔

"تم....!" وہ بلا توقف بولے۔

"میں....!" وہ حیران رہ گیا۔ اس نے کبھی اس کے بارے میں ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔

"آپ شاید غلط سمجھ رہے ہیں امام صاحب۔ میرا اس میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے اور نہ ہی اس نے میرے لیے مذہب بدلا ہے۔"

"میں پوری طرح آگاہ ہوں کہ وہ تمہارے لیے یا کسی کے بھی عشق، محبت میں پڑ کر مسلمان نہیں ہوئی۔ اسے تو اللہ نے ہدایت دی ہے۔ مگر بیٹا؟"

"اوہ!" اس نے طویل سانس خارج کی۔ وہ سمجھ رہا تھا انہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔

"میں اس کے لیے کوئی اچھا لڑکا ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔ اتنا اچھا کہ جس کے ساتھ اس کی آئندہ زندگی آرام سے گزرے جو نیک اور سمجھ دار ہو۔ اسلام کی خاطر اس نے جو قربانی دی ہے اس کی قدر کر سکے۔ وہ میری سگی بیٹی تو نہیں ہے لیکن ایسا لگتا ہے اللہ نے اسے میرے پاس ایک ذمہ داری بنا کر بھیجا ہے۔ وہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کے لیے اسی طرح وسیلے بنا دیتا ہے!" مولوی صاحب کے لہجے میں اس کے لیے بڑی شفقت تھی۔

"آپ نے مجھے چن لیا ہے۔ جانے وہ مجھے پسند کرے یا ناں۔"

"تم رضامندی ظاہر کرو گے تو میں اس سے بات کروں گا۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں ناپسند نہیں کرے گی۔ اسے ایک مخلص ساتھی چاہیے۔ جو پورے خلوص کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ سکے۔ ڈھونڈو گے تو اور بھی بہت مل جائیں گے۔ بلکہ خود خواہش مند ہوں گے۔ مگر مجھے اندیشہ ہے کچھ غلط نہ ہو جائے۔ یہاں پر آئے ہوئے اکثر لڑکوں کو گرین کارڈ کی فکر ہوتی ہے۔ اسی لیے انہیں سٹیزن لڑکی کی تلاش ہوتی ہے اور ایسی شادیاں اکثر مقصد پورا ہونے کے بعد ٹوٹ جاتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا عائشہ سے کوئی اس طرح کا فائدہ اٹھائے۔ تم اپنے گھر والوں سے بات کرو۔ اپنے والدین کو اس کے متعلق بتاؤ۔ اگر وہ اعتراض کریں تو انہیں قائل کرنے کی کوشش کرو۔ تم بالغ ہو، تمہیں پسند کی شادی کرنے کا اسلام نے پورا حق دیا ہے۔ بس اپنے والدین سے بات کرو میں عائشہ سے بات کرتا ہوں اور جلد از جلد یہ نیک فریضہ انجام دے دیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے امام صاحب! میں گھر میں بات کرتا ہوں۔" وہ آمادہ ہو گیا۔ مولوی صاحب کی باتیں اس کے دل کو لگی تھیں اور ویسے بھی عائشہ بے حد خوب صورت تھی، بہت اچھی مسلمان تھی۔ پھر انکار کا تو کوئی جواز ہی نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ اتنی پریشان کیوں ہیں بی بی جان۔" علی مراد نے ان سے بات کرنے کے لیے پاکستان فون کیا تھا۔ پورے گاؤں میں چوہدری علم دین کے گھر میں ٹیلیفون تھا۔ کسی کا بھی ضروری فون آتا ہوتا اسی کے گھر آتا تھا۔

"کنیز فاطمہ کے گھر جڑواں بیٹیاں ہوئی ہیں۔ تین بیٹیاں ہو گئی ہیں۔" انہوں نے آزردگی سے بتایا۔

"اوہ....!" وہ ان کی پریشانی سمجھ گیا۔

کنیز فاطمہ کی شادی پھپھی صغریٰ کے بیٹے انور سے ہوئی تھی۔ انور تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور ساری زمین جائیداد کا اکلوتا وارث بھی۔ پھوپھا رب نواز کی طبیعت بڑی سخت تھی۔ ساری عمر انہوں نے پھپھی صغریٰ کو اونچی سانس نہیں لینے دی تھی۔ رشتہ ایسا تھا کہ میاں جی بھی ان سے دبتے تھے اور اب بیٹی دے کر تو اور بھی انکساری آ گئی تھی۔

"تین بیٹیاں ہو گئیں تو پریشانی کی کیا بات ہے؟ یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔ کنیز فاطمہ کا اس میں کیا قصور!" وہ جواب میں بولا۔

"تو رب نواز کو نہیں جانتا پتر! وہ بڑا سخت مزاج ہے۔ زمین جائیداد والے لوگ ہیں۔ اوپر سے اکلوتا

بیٹا۔ انہیں تو ہر صورت وارث چاہیے ہو گا۔ کل کلاں کو بیٹے کی دوسری شادی کا سوچ لے تو اسے کون روک سکتا ہے!" وہ وہموں میں گھری ہوئی تھیں۔

"بی بی جان! اللہ پر بھروسا رکھیں۔ کیوں وہم پال رہی ہیں۔ بس دعا کیا کریں۔ جس نے بیٹیاں دی ہیں وہ بیٹا بھی دے گا۔ پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔" اس نے حوصلہ دینے کو کہا۔

"کیا کروں پتر! ماں ہوں ناں۔ مجھے نہیں فکر ہو گی تو اور کسے ہو گی۔" ان کی آواز رندھ گئی۔

"میاں جی کیسے ہیں؟"

"ظاہر ہے، وہ بھی پریشان ہیں۔ بیٹی کا معاملہ ہے۔"

"ٹیلی فون کا کیا بنا؟" اس نے موضوع بدلا۔

"درخواست دے رکھی ہے۔ ابھی تک منظور نہیں ہوئی۔ حسن دین کوشش کر رہا ہے۔ کہتا ہے سال کے اندر اندر لگ جائے گا اور ہاں تو بھی کنیز فاطمہ کو دو حرف لکھ دے۔ بہن کا دل بڑھ جائے گا۔ بڑا مان ہوتا ہے بھائیوں پر۔" وہ پھر اسی موضوع پر آ گئیں۔

"ٹھیک ہے بی بی! میں خط لکھ دوں گا اسے۔ بھائی حسن دین اور میاں جی کو سلام کہیے گا۔ میں خط بھی لکھوں گا۔"

اس نے اللہ حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ وہ ان سے عائشہ کی بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ اپنے ہی بکھیڑوں میں پڑی تھیں۔ ایسے میں لوگ وہ اس مسئلے کو کبھی بھی نہ سمجھ پاتے۔ ویسے بھی وہ ساری صورت حال سے واقف نہیں تھے اور فون پر اتنی تفصیل سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔ سو اس نے ذکر کرنا ہی فضول سمجھا۔

"مناسب وقت آئے گا تو انہیں بتا دوں گا۔ پھر ان کے پاس اعتراض کرنے کا کوئی جواز نہیں ہو گا۔"

جانے یہ صحیح تھا یا غلط۔ مگر اس نے یہی سب سوچ کر فیصلہ کیا تھا۔ امام صاحب اس کی رضامندی سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے عائشہ کے سامنے علی مراد کا نام رکھا تو اس نے بھی بخوشی رضامندی دے دی۔ وہ اسے کافی عرصہ سے جانتی تھی۔ وہ اچھا شخص تھا۔ محنتی تھا، نمازی پرہیزگار تھا اور پھر سب سے بڑھ کر اسلام کے بارے میں متجسس ہونے کا سبب وہی تو بنا تھا۔ اسی سے مل کر تو اس نے اسلام کو اسٹڈی کرنے کا سوچا تھا اور اس وقت وہ نیک نیتی سے اس کا ہاتھ تھام رہا تھا یقیناً" وہ اچھا انسان تھا اور اچھا جیون ساتھی ثابت ہو سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

امام صاحب نے آئندہ جمعتہ المبارک کو نکاح کی تاریخ مقرر دی تھی۔ اس نے کہا تھا ایسی جلدی کی کیا بات ہے۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر چپ کروا دیا تھا کہ نیکی کرنے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ جب تم اور تمہارے گھر والے راضی ہیں۔ عائشہ راضی ہے تو بلاوجہ تاخیر کیوں کی جائے۔ عائشہ کی فرمائش پر نکاح بڑی سادگی سے ہوا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ نکاح اسی طرح کروانا چاہتی ہے جیسے بی بی فاطمۃ الزہرہ کا ہوا تھا۔

البتہ علی مراد نے ولیمہ کی چھوٹی سی دعوت کی تھی۔

علی مراد نے ایک بیڈ روم کا اپارٹمنٹ لے لیا تھا۔ جسے دونوں نے بڑی محنت سے سجایا تھا۔ تنکا تنکا اٹھا کر کے پیارا سا آشیانہ بنایا تھا اور یوں زندگی بڑی سبک رفتاری سے گزرنے لگی تھی۔

نکاح سے پہلے مولوی صاحب نے اسے کچھ باتیں سمجھانے کی کوشش کی تھی جو اسے آج بھی یاد تھیں۔ انہوں نے کہا تھا۔

"اندھیروں میں رہنے والے روشنی میں جائیں تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور اگر روشنی میں رہنے والے اندھیروں میں داخل ہوں تو ٹھوکریں لگا کرتی ہیں۔ ماحول سے مانوس ہونے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ میاں بیوی کا تعلق بھی ایسا ہی ہوتا ہے اور بالخصوص ایسی صورت میں تم دونوں بالکل مختلف بلکہ متضاد ماحول سے تعلق رکھتے ہو۔ تمہیں بہت سی جگہوں پر چشم پوشی سے کام لینا پڑے گا۔ وہ جس معاشرے میں پلی بڑھی ہے اور جس ماحول میں جس گھر میں اس کی پرورش ہوئی ہے، وہ ہمارے

ماحول سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ اس نے ماضی میں ہر وہ کام کیا ہے جو ہمارے معاشرے میں ناجائز اور حرام ہے۔ مگر یاد رکھنا' وہ سب اس کے مسلمان ہونے سے پہلے تھا۔ اسے اس کے ماضی کا کبھی کوئی طعنہ نہیں دینا۔

اسے بڑی محبت اور نرمی سے اپنے رسم و رواج اپنے ماحول میں ڈھالنا کبھی کچھ گراں گزرے تو صبر اور برداشت سے کام لینا۔ یاد رکھو' اسلام قبول کرنے کے بعد اس نے پہلا رشتہ تم سے جوڑا ہے۔ تم تمام مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہو۔ تم اچھا سلوک کرو گے تو اسلام کا امیج اچھا ہو گا تم برا کرو گے تو اس کی نظر میں اسلام کا امیج خراب ہو گا۔" وہ بڑی رسانیت اور سنجیدگی سے سمجھا رہے تھے۔

"جی میں سمجھ گیا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔ اسے مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

"خوش رہو بیٹا۔ اللہ تم لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا کرے۔" اللہ تم دونوں کے دلوں میں فاطمۃ الزہرہ اور علی کی سی محبت پیدا کرئے۔" انہوں نے دل سے دعا کی تھی۔

اور پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ گزرتے وقت نے دونوں کو بے حد قریب کر دیا تھا۔ وہ نہ صرف آئیڈیل بیوی ثابت ہوئی تھی بلکہ بے حد اچھی اور مثالی مسلمان بھی تھی۔ علی مراد کی جانب سے اس پر کوئی پابندی نہیں تھی لیکن وہ حجاب پہنتی تھی۔ نماز پنج گانہ ادا کرتی تھی۔ قرآن پاک کو ترجمہ کے ساتھ پڑھتی تھی۔ گھر سنبھالتی۔ خدیجہ اور اقرا سے ترکیبیں پوچھ پوچھ کر اس کی پسند کے کھانے بناتی اور ہر طرح سے اس کی خدمت کرتی۔

کبھی کبھی تو علی مراد کو ایسا لگتا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین ہی نہ آتا۔ کیا کوئی عورت اتنی اچھی ہو سکتی ہے۔ وہ اس سے بے حد محبت کرتی تھی اور اس سے وابستہ تمام رشتوں سے بھی بے حد پیار اور عزت کرتی تھی جنہیں اس نے ابھی تک دیکھا بھی نہیں تھا۔ کبھی خط کا جواب دینے میں وہ سستی کرتا تو وہ اسے مجبور کر کے انہیں خط لکھواتی۔ انہیں پیسے بھجواتی۔ علی مراد کو اس کے حقوق و فرائض بتاتی۔ تو وہ اپنی قسمت پر رشک کرتا۔

اس نے اللہ کی خاطر سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور اس کا اسے کسی قسم کا کوئی ملال نہیں تھا۔ اس نے کبھی بھولے سے بھی اپنے ماضی کو یاد نہیں کیا تھا۔ کبھی اس نے ماں باپ یا بہن بھائی کا نام نہیں لیا تھا۔ کبھی ان سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کبھی اللہ سے کوئی شکوہ گلہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ ہمیشہ مطمئن اور خوش رہتی۔ ہر وقت اپنے رب کی شکر گزار رہتی۔ کتنا بڑا دل تھا اس کا۔ شادی کے ایک سال بعد ہی اللہ نے انہیں پیاری سی بیٹی دی تھی۔ جس کا نام دونوں نے بڑی محبت سے مریم رکھا تھا۔

علی مراد نے خود مریم کے کان میں اذان دی تھی اور پھر اسے عائشہ کی گود میں ڈالا تھا۔

اس نے اس کے روئی جیسے سفید سفید گالوں پر پیار کیا تھا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں برسنے لگی تھیں۔ علی مراد نے شادی کے بعد آج پہلی بار اسے روتے ہوئے دیکھا تھا۔

"عائشہ! کیا ہوا؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔ مگر آنسو بول رہے تھے۔ وہ بن بتائے سب جان گیا تھا۔ ماں بن کر ماں کی یاد آگئی تھی۔ بیٹی کو پیار کرتے ہوئے نجانے وہ کتنے پیار یاد آئے تھے جو اس کی ماں نے اس کے گالوں پر کیے تھے۔

"روؤ نہیں عائشہ! ہم ان سے ملنے جائیں گے۔ میں خود تمہیں لے کر جاؤں گا۔ وہ مریم کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے پیار سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے دلاسا دیا۔ مگر وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت سے رونے لگی۔ مدت سے رکے ہوئے آنسو ہمدردی کے دو بول سن کر بے قابو ہو گئے تھے۔

"وہ کبھی نہیں ملیں گے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"ایسے مت سوچو۔ اتنے دنوں بعد تمہیں سامنے دیکھیں گے تو وہ بھی رہ نہ سکیں گے۔ ساری ناراضی بھول جائیں گے۔" وہ اس موقع پر اسے اداس نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے ہر ممکن ڈھارس بندھا رہا تھا۔

"میں نے دیکھا تھا انہیں۔

Thanks giving day پر ممی اور میری دونوں سسٹرز سیف وے سے ٹرکی لے رہی تھیں۔ اس بار ممی نے فیملی ڈنر ارینج کرنا تھا۔ لاسٹ ایر ہی ہم نے مل کر پلاننگ کرلی تھی۔ بہت بڑی پارٹی تھی ہمارے گھر۔ میں بہت بے اختیار ہو کر ان کی جانب بڑھی تھی۔ مگر انہوں نے بڑی ناگواری سے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ ابھی تک ناراض ہیں۔ شدید ناراض۔" اس نے آنسوؤں کے درمیان بتایا۔

"اوہ مجھے افسوس ہے عائشہ!" اسے سچ مچ دکھ ہوا تھا۔

"لیکن مجھے تو افسوس نہیں ہے!" اس نے آنسو پونچھے۔ خود پر قابو پانا آسان نہیں ہوتا لیکن اسے اس میں کمال حاصل تھا۔

"میں نے غلط اور صحیح میں سے صحیح کا اور سچ اور جھوٹ میں سے سچ کا انتخاب کیا ہے۔ ایسا بڑا قدم اٹھانے پر مشکلیں تو آنی ہی تھیں۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کیسی کیسی مشکلیں آئی تھیں۔ آپ نے بھی تو برداشت کی تھیں ناں۔ ان کے بھی اپنے سگے پرائے ہو گئے تھے۔ وہ کمزور نہیں پڑتے تھے تو میں کیوں گھبراؤں۔" کتنی عظیم تھی وہ۔

"تم بہت اچھی ہو عائشہ! اللہ تم سے بہت خوش ہو گا۔"

"اگر اچھی بیوی اور اچھی ماں بن گئی تو ضرور ہو گا۔" وہ جتنی پیاری تھی باتیں بھی اتنی ہی پیاری کرتی تھی۔



علی مراد نے اب تک اس بات کا ذکر گھر میں نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ مریم تین سال کی ہو گئی تھی۔ مگر اس نے ابھی بھی کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ کبھی وہ سوچتا کہ جب جائے گا تو مریم اور عائشہ کو ساتھ لے جائے گا۔ مریم کو دیکھ کر اور عائشہ سے مل کر وہ اس کے فیصلے کو سراہیں گے۔ فون پر زیادہ لمبی بات نہیں کر سکتا تھا۔ للذا انہیں مطمئن بھی نہ کر پاتا۔

عائشہ نے اس معاملے میں اسے کبھی بھی کچھ نہ کہا تھا۔ سب کچھ اسی پر چھوڑ رکھا تھا۔ جو مناسب سمجھے کرے۔

پاکستان سے آئے ہوئے اسے تقریباً" آٹھ سال ہو چکے تھے۔ بی بی جان اور میاں جی اسے کئی بار کہہ چکے تھے' پاکستان کا چکر لگاؤ۔ عائشہ سے شادی کر کے اس کی مشکلیں آسان ہو گئی تھیں۔ اسے گرین کارڈ حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی تھی۔ اب وہ جب چاہے پاکستان جا سکتا تھا اور حقیقت تو یہ تھی کہ اب اس کا بھی دل چاہتا تھا۔ مدت ہو گئی تھی اپنوں کی شکلیں دیکھے ہوئے۔ نہ کسی خوشی میں شریک ہو سکا تھا نہ غم میں۔

بھائی حسن دین اور کنیز فاطمہ کی شادیاں اس کی غیر موجودگی میں ہوئی تھیں۔ اب تو ان دونوں کے بچے بھی بڑے ہو گئے تھے۔ وقتاً" فوقتاً" وہ تصویریں بھیجتے تو وہ دیکھ لیتا۔ بی بی جان ہر خط میں لکھواتی تھیں کہ بس اب آجاؤ اور اس بار تو میاں جی نے بھی لکھوا بھیجا تھا کہ وہ بہت اداس ہو گئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی شکل دیکھے بغیر ہی دنیا سے چلے جائیں۔

اس بار خط آیا تو بی بی جان کافی پریشان تھیں۔ کنیز فاطمہ کے گھر چوتھی بیٹی ہوئی تھی اور یقیناً" اسے سسرال کی طرف سے پریشانی تھی اور اب تو وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔ کنیز فاطمہ اس کی چھوٹی اور اکلوتی بہن تھی۔ مگر اتنی دور بیٹھ کر محض خط کے ذریعے حوصلہ دینے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ خود جائے۔ اور ابھی وہ جانے کے لیے حتمی فیصلہ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس رات پاکستان سے فون آ گیا۔

میاں جی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور وہ ہاسپٹل میں تھے۔

اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ آٹھ سال ہو گئے تھے ان سے بچھڑے ہوئے۔

"کہیں ایسا نہ ہو، تمہاری شکل دیکھے بغیر ہی دنیا سے چلا جاؤں۔ اب آ جاؤ پتر علی مراد۔" ان کا چہرہ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا اور باوجود ضبط کے آنکھیں گیلی ہوئی جا رہی تھیں۔

"اللہ پر بھروسہ رکھیں علی! وہ بڑا رحیم ہے۔ ان شاء اللہ میاں جی بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔" عائشہ نے اسے بڑے پیار سے دلاسا دیا تھا۔

"مجھے جانا چاہیے عائشہ! مجھے اس وقت ان کے پاس ہونا چاہیے۔ وہ میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ بہت اداس ہو گئے ہیں میاں جی میرے لیے۔"

"ہاں آپ کو اس وقت وہاں ہونا چاہیے۔ انہیں آپ کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں جانے کی تیاری کرنی چاہیے۔" اس نے رسانیت سے کہا۔

"ہم دونوں کو اکٹھے نکلنے میں کچھ دن لگ جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگلی فلائٹ سے ہی نکل جاؤں۔ تم ایسا کرو بعد میں آ جانا۔ مریم کے اسکول اور اپنی جاب سے چھٹی وغیرہ بھی لے لینا۔ باقی تمام ضروری کام، بلز وغیرہ نپٹا کر، جانے کے لیے ضروری شاپنگ وغیرہ بھی کر لینا۔ تب تک میں انہیں اپنی شادی کے بارے میں بھی بتا دوں گا۔ میاں جی ہسپتال میں ہیں اس لیے اب تو بہت سوچ سمجھ کر بتانا پڑے گا۔" اس نے اپنی رائے دی۔

"ٹھیک ہے۔ جیسے آپ مناسب سمجھیں!" اس کی حکم عدولی تو اسے آتی ہی نہ تھی۔ وہ جو کہہ دیتا اس کے لیے وہی حرف آخر ہوتا۔

☼ ☼ ☼

نیویارک کے جان ایف کینیڈی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر روانگی کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔

"او کے چلتا ہوں۔" علی مراد نے مریم کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ نے آپ کو موقع دیا ہے۔ میاں جی کی خوب خدمت کیجیے گا۔" اس نے پہلے سے کہی ہوئی بات ایک بار پھر دہرائی۔

"ہاں ہاں۔ اسی لیے تو جا رہا ہوں۔ بس تم اپنا خیال رکھنا۔ مجھے تمہاری بہت فکر ہو گی۔ اکیلے چھوڑ کر جا رہا ہوں ناں۔ بس تمہارا ہی خیال رہے گا....."

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین ....." ایئرہوسٹس کی اناؤنسمنٹ ایک بار پھر گونجی تھی۔

"میری طرف سے آپ بالکل بے فکر رہیں۔ میرے لیے کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ آرام سے رہ لوں گی ہاں مریم بہت مس کرے گی۔"

"اور تم....؟" اس نے پیار سے اسے دیکھا۔

"ظاہر ہے میری تو دنیا ہی آپ ہیں۔ میرا یہاں اور ہے کون؟" اس کی آواز کپکپا گئی۔ نیلی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ شاید کسی وہم، کسی وسوسے نے دل پر دستک دی تھی۔

"ارے ارے تم تو رونے لگیں۔ بس چند دنوں کی بات ہے۔ پھر تم بھی میرے ساتھ میرے پاس ہو گی۔" اس نے اس کا دودھیا ہاتھ تھاما۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین فلائٹ نمبر....."

"اپنا بہت خیال رکھیے گا....."

"ہاں رکھوں گا۔ لیکن یاد رکھنا۔ تم میری بہت قیمتی چیز ہو۔ تم پریشان ہوئیں تو مجھے بھی دکھ ہو گا۔ مجھے خوشی سے رخصت کرو۔ کسی وہم، کسی اندیشے کو دل میں جگہ مت دو۔ بس دعا کرو، میاں جی صحت یاب ہو جائیں۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین....." بچھڑنے والوں کے لیے یہ اناؤنسمنٹ بڑی گراں ہوتی ہے۔

"جاتے ہی فون کر دیجیے گا۔ مجھے شکرانے کے نوافل پڑھنے ہیں۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں تاکید کی۔

"او کے۔ لاہور ایئرپورٹ سے ہی کر دوں گا۔" اس نے مریم کو ایک بار پھر چوما۔

"اللہ حافظ!" اس کا ہاتھ اس نے بڑی محبت سے دبایا تھا۔

"اللہ حافظ۔" وہ ڈیپارچر کی طرف بڑھ گیا، تو آنسو موتیوں کی صورت ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگے۔ شام اس قدر اداس تھی کہ نیویارک کی جلتی ہوئی تمام روشنیاں مدھم لگنے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

علی مراد ایئرپورٹ سے سیدھا ہسپتال ہی پہنچا تھا۔ حسن دین اسے کاریڈور میں ہی مل گیا تھا اور حیران رہ گیا تھا اور میاں جی تو اسے اچانک سامنے دیکھ کر جیسے جی اٹھے تھے۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے اور ایک دو دن میں انہیں ڈسچارج کر دیا جائے گا۔

حسن دین کے ساتھ ہی وہ گھر آیا تھا۔ اس کی اطلاع کنیز فاطمہ پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور گھر میں جیسے عید ہو گئی تھی۔

اگلے روز میاں جی بھی گھر آ گئے تھے۔ پھپھو صغریٰ اور پھوپھا رب نواز کے ساتھ انور بھی آیا ہوا تھا۔ ایک تو میاں جی کی خبر گیری اور دوسرے اس سے ملنے کے لیے۔

رات کے کھانے کے بعد ابھی ابھی وہ رخصت ہوئے تھے۔

"اب بتا کیا کہتے ہیں تیرے سسرال والے۔ ابھی تو بڑے ٹھیک ٹھاک تھے۔" سب میاں جی کے بیڈ کے اردگرد بیٹھے تھے جب اس نے کنیز فاطمہ سے پوچھا۔

"تجھے دیکھ کے ٹھیک ٹھاک ہو گئے ہیں، ورنہ جب سے چوتھی بیٹی ہوئی ہے ان کے منہ سیدھے نہیں ہو رہے۔ انور ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ انہیں اب وارث چاہیے۔" بی بی نے جواب دیا۔

"لیکن یہ تو اللہ کی طرف سے ہے۔ کوئی یا ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں....؟"

"ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے پتر۔ اب تو آ گیا ہے، مجھے بے فکری ہو گئی ہے۔" میاں جی آہستہ سے بولے۔

"اچھا۔ میرے آنے سے مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔" اس نے میاں جی کی ٹانگیں دباتے ہوئے پوچھا۔

"شکر ہے پتر! تو آ گیا ہے۔ میرا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ میرے رب نے تیرے وسیلے سے میری عزت رکھ لی ہے۔" وہ آہستگی سے بولے۔

"کیا مطلب میاں جی...؟" وہ ان کی بات سمجھ نہ سکا۔

"ہم نے مسرت سے تیری شادی طے کر دی ہے۔" بی بی جان نے صاف لفظوں میں بتایا۔

"میری شادی....؟" اس کے گرد کوئی دھماکہ ہوا تھا۔

"ہاں تیری شادی۔ اس سے بہتر اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔ وٹے سٹے کی شادی میں بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ صغریٰ آپا نے بھائی رب نواز کے کہنے پر خود کنیز فاطمہ سے بات کی ہے۔ ارادہ تو دونوں گھروں کا شروع سے ہی تھا۔ تجھے بھی پتا ہے اس بات کا لیکن تو باہر چلا گیا تو ہم بھی چپ کر گئے۔ اب تیرے آنے پر انہوں نے اشارتاً یاد دلایا تو ہم نے بھی خوشی سے ہامی بھر لی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بی بی جان.... یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ ہونق بنا سن رہا تھا۔ ایک دم سے ہوش میں آ گیا۔

"لو، جو بات ہو چکی اس کے لیے کہہ رہا ہے کیسے ہو سکتا ہے۔" بی بی جان نے مسکرا کر کہا۔

"مگر مجھ سے پوچھے بغیر آپ کیسے کچھ کر سکتے ہیں۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیسے انہیں بتائے۔

"کیوں تجھ سے پہلے کسی سے کچھ پوچھا تھا ہم نے؟ یہ بیٹھا ہے حسن دین۔ پوچھ اس سے۔ کیا اس سے پوچھ کر رشتہ کیا تھا اس کا۔ ایک لفظ بھی بولا تھا یہ تیری طرح....." میاں جی نے حسن دین کی طرف دیکھا۔

"لیکن میاں جی.....!" وہ سچ مچ بوکھلا گیا تھا۔

"بس علی مراد....." انہوں نے ہاتھ اٹھا کر حتمی انداز میں کہا۔ "چار دن پردیس میں رہ کر اپنے ریت رواج، بڑوں کی عزت احترام کیا سب بھول جاتے ہیں۔"

ان کے لہجے میں سختی آگئی۔

"میاں جی! زیادہ باتیں نہ کریں' ڈاکٹر نے بڑی احتیاط کرنے کو کہا ہے۔" حسن دین نے ان کے ساتھ ساتھ گویا سب کو تنبیہہ کی۔

"چلو کنیز فاطمہ! بچوں کو سلاؤ صفیہ۔ دوائی دے دے اپنے میاں جی کو۔" بی بی جان نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میرے لیے دودھ گرم کردے صفیہ!" حسن دین نے آواز دی۔

اتنی بڑی اور اتنی اہم بات کو کتنا معمولی لیا تھا ان لوگوں نے۔ کیسے معمول کی باتیں شروع کردی تھیں سب نے جیسے ابھی کچھ کہا ہی نہ ہو یا جو کہا ہے اس کی کوئی خاص اہمیت ہی نہ ہو۔ کتنا آسان تھا ان کے لیے یہ سب کرنا۔

"ٹھیک ہے میں بھی اتنی ہی آسانی سے سب کچھ بتا دوں گا۔" اس نے اپنے تئیں سوچا اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔



لیکن یہ اس کی بھول تھی۔ یہ سب اتنا آسان نہیں تھا جتنا اس نے سوچا تھا۔ اگلے روز پھر وہی مسئلہ زیر بحث تھا۔

"تم اس رشتے سے انکار کر رہے ہو جو میں نے رب نواز سے خود پکا کیا ہے۔ تیری دادی کی خواہش تھی کہ میں تیری شادی صغریٰ کے گھر کروں۔ تو مجھے میری مری ہوئی ماں کے سامنے شرمندہ کروانا چاہتا ہے؟"

"میاں جی! آپ کو زندہ بیٹے سے زیادہ مری ہوئی ماں کی فکر ہے۔" وہ متعجب تھا۔

"تو نہیں جانتا کہ ماں باپ کا کیا حق ہوتا ہے۔ میرا نام نافرمانوں میں لکھوانا چاہتا ہے۔"

"جسے ماں باپ دھتکار دیں اُسے اللہ بھی معاف نہیں کرتا۔ کیوں ہمارا ٹھکانا دوزخ میں بنا رہا ہے!" بی بی جان بھی پوری طرح ان کی تائید کررہی تھیں۔ وہ میاں جی کی حالت کے پیش نظر ان سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مسئلہ گمبھیر ہوتا جارہا تھا اور معاملہ ایسا تھا کہ وہ خاموش بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

"میں شادی کرچکا ہوں!" اس نے دھماکا کردیا' اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

"کیا؟ کیا کہا تو نے؟" میاں جی کو اپنی سماعتوں پر دھوکا ہوا۔ بی بی جان تو باقاعدہ دل پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔ کنیز فاطمہ کا رنگ فق ہوگیا تھا۔

حسن دین اور بھابھی صفیہ ہکا بکا اُسے دیکھ رہے تھے۔ اس نے مختصراً ساری روئیداد ان کے گوش گزار کردی۔ کمرے میں کچھ دیر سکوت رہا تھا۔ یوں جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو یا پھر کہنے سننے کے لیے کچھ باقی نہ رہا ہو۔

"مریم' میری بیٹی تین سال کی ہوگئی ہے۔ میں اسے یہاں بلانا چاہتا ہوں۔ آپ سب سے ملوانا چاہتا ہوں۔" ان کی خاموشی پر اس نے مزید کہا۔

"ہم نہیں ملنا چاہتے۔ میں نہیں مانتی کسی کافر کو اپنی بہو۔" بی بی جان سے مزید برداشت نہیں ہوسکا۔

"لیکن اس نے اسلام قبول کیا ہے۔"

"رہنے دو۔ ایسی عورتوں کا کیا اعتبار۔ آج اسلام قبول کیا ہے' کل چھوڑ دے۔ وہ تو وہاں ہمارے بچوں کو پھانسنے کے لیے بیٹھی ہیں۔"

"چوہدری سلطان کے بیٹے نے بھی یہی کیا۔ جو بھی چار پیسے کمانے جاتا ہے اسے پھانس لیتی ہیں۔"

"ایسا نہیں ہوتا بی بی۔"

"ہمارے ساتھ تو ایسا ہی ہوا ہے۔"

"وہ بہت اچھی مسلمان ہے بی بی! باقاعدگی سے نماز قرآن پڑھتی ہے۔ روزے رکھتی ہے۔ بڑا مطالعہ کیا ہے اس نے اسلام کا۔" وہ انہیں قائل کرنے کی کوشش میں تھا۔

"ہاں نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی۔ بس ہم نے تیری بات پکی کردی ہے۔ تجھے شادی کرنا ہی ہوگی۔" وہ تو جیسے کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھیں۔

"میں ایسا نہیں کرسکتا۔ کبھی بھی نہیں!" اس نے بھی صاف کہہ دیا۔

"ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا' تو اس طرح ہمارے سامنے کھڑا ہوجائے گا۔ کتنے جتن سے تجھے پڑھایا لکھایا' پال پوس کر بڑا کیا۔ محض تیرا شوق پورا کرنے کے لیے تیرے باپ کی ہزاروں منتیں کرکے تجھے امریکہ بھجوایا اور آج تیری نظر میں ہماری کوئی اہمیت ہی نہیں۔ زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ اکیلے ہی کرلیا۔ تیرے لیے وہ سب کچھ ہوگئی۔ اور ہم بالکل غیر۔"

ان کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہنے لگے۔

"حسن دین کے بعد تین بیٹے یکے بعد مرگئے تھے۔ میں نے کیا کیا نہیں منتیں مانیں۔ کتنے وظائف کیے۔ کتنی دعائیں کیں۔ تیرے میاں جی راتوں کو جاگ جاگ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ پھر رب نے ہماری دعا سنی اور حسن دین کے ساتھ جوڑی ملائی۔ بڑی مشکل سے مراد پوری ہوئی تھی تب ہی تو تیرا نام علی مراد رکھا تھا۔ تو دس سال کا ہوگیا تھا جب تک تیری منتیں اتار رہے تھے۔ ایک ایک دن گن کے تجھے بڑا کیا ہے اور تو ہمارے ارمانوں پہ پانی پھیر رہا ہے۔" وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگیں۔

"نہ جانے کہاں چوک ہوگئی تمہاری تربیت میں! کیوں ہماری نیک نامی ڈبونا چاہتا ہے۔" میاں جی تکیے کے سہارے اونچے ہوکر بیٹھے۔ بڑا ملال تھا ان کے لہجے میں۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا میاں جی! جس سے آپ کی نیک نامی پر حرف آئے۔ میں نے اس سے شادی کی ہے۔" وہ پریشان ہوگیا تھا انہیں کیسے سمجھائے۔

"کیسی شادی ہے یہ۔ نہ ماں کو خبر نہ باپ کو۔ نہ کسی بہن بھائی کو پتا اور ہوگئی شادی!" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر تمسخر اڑایا۔

"وہ میری مجبوری تھی میاں جی۔"

"کیسی مجبوری۔ شادیاں ایسے ہوتی ہیں۔ شادیاں وہ ہوتی ہیں جن میں باراتیں جاتی ہیں۔ ڈولیاں اٹھتی ہیں۔ چار رشتے دار اکٹھے ہوتے ہیں۔ خوشیاں منائی جاتی ہیں۔" بی بی جان کسی دلیل کو ماننے کو تیار نہ تھیں۔

"لیکن بی بی! وہاں ایسے نہیں ہوسکتا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن ہمیں بتایا تو جاسکتا تھا۔ ہم نکاح کے وقت فون کرتے۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے۔ پورے گاؤں میں مٹھائی بانٹتے۔ خوشی سے لوگوں کو بتاتے۔"

"یہ تو آپ اب کہہ رہے ہیں۔ اگر میں اس وقت بتاتا تو آپ کبھی بھی راضی نہ ہوتے۔ اسی لیے مجھے چھپانا پڑا۔" اس نے حقیقت بتائی۔

"چھپ کر شادی نہیں گناہ کیے جاتے ہیں علی مراد۔" میاں جی کو طیش آگیا۔

"میں نے کہا ناں' مجھے مصلحتاً "چھپانا پڑا تھا۔"

"غلط تھا تو چھپایا ناں۔ صحیح ہوتا تو کبھی بھی نہ چھپاتے۔ دس بار خط لکھتے۔ بار بار فون کرتے۔ ہمیں ساری صورت حال بتاتے۔ آج ہمارا منہ بھی بند ہوتا۔ لیکن تم نے تو اکیلے اکیلے سب کچھ کرلیا۔"

حسن دین بھی ان ہی کی جانب سے بولا تھا۔ اس کا ساتھ دینے والا کوئی بھی نہ تھا۔ اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ دلیلیں دے دے کر تھک گیا تھا مگر وہ اسی کو غلط ثابت کررہے تھے' کیونکہ وہ قائل ہونا ہی نہیں چاہتے تھے۔

آٹھ دن ہوگئے تھے اس بحث کو چھڑے ہوئے اور دونوں ہی اپنی جگہ پر قائم تھے اور ابھی یہ سلسلہ نجانے کتنے دن اور اسی طرح چلتا رہتا۔ لیکن اس روز پھپھی صغریٰ' انور کے ساتھ آگئی تھیں اور جاتے جاتے یہ پیغام دے گئی تھیں کہ وہ شادی کی تیاری کرچکی ہیں۔ لہٰذا جلد ہی تاریخ طے کرنے کی رسم کردی جائے۔

"آپ لوگ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ بھائی حسن دین تم ہی کسی طرح سمجھاؤ انہیں۔" وہ سچ مچ اکیلا ہوگیا تھا۔

"کیا دن آگئے' اولاد ماں باپ کو سمجھائے گی۔" میاں جی نے طنزیہ کہا۔

"تو پھر میں کیا کروں میاں جی! آپ ہی مجھے کچھ

سمجھائیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ سچ مچ بوکھلا گیا تھا۔

"دیکھ پتر! تیری بہن کا معاملہ ہے۔ وہ لوگ اٹھتے بیٹھتے کئی بار سنا چکے ہیں کہ وہ وارث کے لیے انور کی دوسری شادی کردیں گے اور ضرورت پڑنے پر طلاق بھی دے سکتے ہیں۔ تو تو جانتا ہے' رب نواز کے دل میں میرے لیے شروع سے ہی خار ہے۔ اس کی اکھڑ مزاجی کی وجہ سے میں نے صغریٰ کی شادی کی مخالفت کی تھی۔ شادی تو بہر حال اس کی ہو گئی لیکن آج تک رب نواز کے دل سے وہ بات نہیں نکلی۔ شاید اس نے کنیز فاطمہ سے رشتہ بھی اسی لیے کیا تھا کہ مجھے دبا سکے اور اب اللہ نے اسے موقع دے دیا ہے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر مسرت سے تیرا رشتہ طے کیا ہے۔ اسی میں سب کا بھلا ہے۔ تیری ماں کی بھی خواہش پوری ہو جائے گی اور تیری بہن کا گھر بھی بچ جائے گا۔ سب کچھ اب تیرے ہی ہاتھ میں ہے!" انہوں نے گویا التجا کی تھی۔

"لیکن میں کیا کروں میاں جی! میں کیسے اپنے ہاتھوں....."

"تیری عقل میں بات کیوں نہیں آتی۔ میں تجھے سمجھا رہا ہوں کہ تیری بہن کے گھر کا معاملہ ہے اور تو کہہ رہا ہے میں کیا کروں۔ کیا باہر رہ کر تیری غیرت عزت سب ختم ہو گئی ہے!" انہیں جلال آگیا تھا۔

"یہ ایک گھر کا نہیں' دو خاندانوں کا معاملہ ہے علی! کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔" حسن دین نے معاملے کی نزاکت کا احساس دلانا چاہا۔

"بہن کو اجڑنے سے بچالے علی مراد! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اپنے ہاتھوں سے تیرا سہرا سجاؤں گی۔ تیرے شگن پورے کروں گی۔ بس تو ہاں کر دے۔" بی بی نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"مان جاؤ میرے بھائی! اگر تم نے شادی نہ کی تو وہ بہن کی منگنی ٹوٹنے کو غیرت کا مسئلہ بنالیں گے۔ تم انور کو نہیں جانتے۔ وہ بہن کا بدلہ لینے کے لیے ایک سیکنڈ میں مجھے چھوڑ دے گا۔ تمہیں میری چھوٹی چھوٹی بچیوں کا واسطہ ہاں کر دو۔ میں تو ماں باپ کے در پر بیٹھ کر کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن پورے کرلوں گی لیکن میری معصوم بیٹیوں کا کیا ہو گا۔ ان کا کیا قصور ہے۔ ان سے باپ نہ چھینو۔ ان سے ان کا گھر بار نہ چھینو۔" کنیز فاطمہ نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ باقاعدہ سسکیوں سے رونے لگی تھی۔

"ٹھیک ہے میاں جی جو آپ کا دل چاہے کریں۔" وہ پوری طرح ڈھے گیا۔

بی بی جان نے پورے خاندان میں مٹھائی بانٹی تھی۔ دو ہفتے بعد کی تاریخ پکی ہوئی تھی۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ ایک تو دل سے یہ کانٹا نکل گیا کہ بیٹے نے نجانے کس کے ساتھ باہر ہی باہر شادی کرلی اور ہمیشہ کے لیے وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اور دوسرا یہ کہ آنے والی بہو من پسند اور سب سے بڑھ کر بیٹی کی نند۔ ایسی بیٹی جس کے سر پر ہر وقت خطرہ تلوار بن کر لٹکتا رہتا تھا کہ جانے کب اگلے مکھن سے بال کی طرح نکال باہر کریں۔

ان کے خیالات کے مطابق اب ان کی بٹی کے قدم صحیح سے جم جائیں گے سسرال میں۔ اب تک بھی وہ اپنی بٹی کے خیال سے خاموش رہے تھے ورنہ اکلوتے بیٹے کی بیوی سے اوپر تلے چار بیٹیاں کہاں برداشت ہوتی ہیں ایسے لوگوں سے۔ اس کا سسر تو دوسرے ہی برس بیٹے کے لیے دوسری بیوی لے آتا اور اب جب تک مسرت دلہن بن کر اس گھر میں نہ آجاتی' بی بی کو یہ پھانس چبھی رہتی کہ جانے کب وہ کاغذ تھما کر میکے بٹھا دیں۔

اس کی ساس تو کئی دفعہ آہیں بھر کر پوتا کھلانے کی خواہش کا اظہار کر چکی تھی۔ اور اب اگر علی مراد ہاں نہ کرتا تو وہ کنیز فاطمہ کو ایک پل بھی وہاں نہ ٹھہرنے دیتی اور اس وقت بی بی کو علی مراد کی بات پکی ہونے کے بجائے بیٹی کا گھر بچ جانے کی زیادہ خوشی تھی۔



ہر کوئی خوش تھا اور اپنے اپنے حساب سے شادی کی

تیاریوں میں مگن بھی۔ بس ایک وہ ہی خاموش تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا' وہ کیا کرے۔ وہ کسی گونگے بہرے کی طرح کھلی آنکھوں سے سب ہوتے دیکھ رہا تھا۔ کرتا بھی تو کیا۔ جو کرنا چاہتا تھا' وہ تو وہ کر نہ سکا تھا۔

اس روز بی بی جان اور میاں جی کو پھوپھا رب نواز نے بلوایا تھا۔ بھابھی صفیہ نے بتایا تھا کہ شادی کا کوئی صلاح مشورہ کرنا ہے۔ صبح کے گئے شام ڈھلے لوٹے تھے دونوں' اور اس نے دیکھا تھا کہ کچھ چپ چپ سے تھے۔ بی بی جان تو صاف کسی الجھن کا شکار لگ رہی تھیں۔ رات کو جب وہ میاں جی کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھ کر واپس آیا تو بی بی جان کی وہ الجھن بھی سامنے آگئی۔

"بس ایک ہفتہ رہ گیا ہے شادی میں۔ علی مراد پتر! کیا کیا ہے تو نے اپنی پہلی بیوی کا؟" بی بی جان نے میاں جی سے بات کرتے کرتے اچانک اسے مخاطب کیا۔

"جی کیا مطلب؟" وہ سمجھ نہ سکا۔

"دیکھو پتر' تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ اس نکاح سے پہلے تو اس کو فارغ کردے۔ وہ لوگ بھی یہی چاہتے ہیں کہ پہلے اسے طلاق دے دے تو پھر مسرت سے نکاح ہو!" انہوں نے کپڑوں کی ترتیب درست کرتے ہوئے کہا۔

"طلاق دے دوں۔ مگر کیوں؟" اس پر جیسے پہاڑ ٹوٹا تھا۔

"ارے تو کیا وہ سوتن پر بیٹی دیں گے۔ ایسی گئی گزری ہے ان کی لڑکی؟" بی بی جان نے ہاتھ اٹھا کر حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"مگر انہیں سارے معاملے کا پتا تو ہے۔ پھر یہ نیا شوشا کیوں چھوڑ رہے ہیں۔" اسے غصہ آگیا۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔ ان کی یہی شرط ہے اور بات بھی صحیح ہے۔ سوتن پر بیٹی کون دیتا ہے۔" وہ اپنی بات پر قائم تھیں۔

"تو نہ دیں۔ ہم کون سا انہیں مجبور کر رہے ہیں۔ صاف بتا دیں انہیں۔ میں عائشہ کو طلاق نہیں دوں گا۔" اس نے دوٹوک الفاظ میں منع کردیا۔

"لیکن تجھے معلوم ہے ناں......"

"اچھا چھوڑیں......!" بی بی جان نے ہاتھ اٹھا کر میاں جی کو آنکھوں کی جنبش سے بات بڑھانے کو منع کیا۔

"ہم بات کریں گے ان سے۔ کوئی حل نکالتے ہیں اس کا بھی!" بی بی جان کے اشارے پر میاں جی خاموش ہو گئے اور علی مراد نے اطمینان کی سانس لی۔

شادی کے دن تک کسی نے اس مسئلے پر دوبارہ بات نہ کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس معاملے پر اسی طرح راضی ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ اس کی غلط فہمی تھی۔

مہندی کی رات کنیز فاطمہ مسرت کی رسم پوری کر کے ادھر آگئی تھی۔ اس کی خواہش تھی' بارات میں بھائی کی طرف سے شریک ہو۔ انور اسے چھوڑ گیا اور جاتے جاتے یہ پیغام بھی دے گیا تھا کہ مسرت سے نکاح سے پہلے علی مراد پہلی بیوی کو طلاق دے دے۔ ورنہ بارات نہ لے کر آئیں۔

لڑکی والے شادی سے ایک رات پہلے جبکہ لڑکی کے ہاتھوں میں مہندی بھی لگ چکی ہو' کبھی اتنی بہادری سے بارات نہ لانے کی بات نہیں کرتے۔ اس جرأت مندی کے پیچھے بڑا واضح اشارہ تھا کہ اس کے بعد کنیز فاطمہ بھی کبھی واپس اپنے گھر نہیں جاسکے گی۔

"لیکن میں کیوں طلاق دے دوں۔ اس کا قصور کیا ہے؟" وہ حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

"ان کی یہی شرط ہے۔ تو طلاق نہیں دے گا تو وہ بھی اپنی بیٹی کی شادی نہیں کریں گے۔"

"لیکن وہ ایسا کیوں چاہتے ہیں۔ وہ بے چاری تو اتنی دور بیٹھی ہے۔"

"اگر تو نے اسے نہ چھوڑا تو ظاہر ہے تیرا وہاں آنا جانا بھی لگے رہے گا۔ ہو سکتا ہے' کل کو وہ خود یہاں آجائے۔ یا تو وہاں جا کر بال بچوں میں گھر کر اسے بھول جائے۔ ایسا خطرہ تو کوئی مول نہیں لیتا۔"

بی بی جان نے اسے بڑے آرام سے سمجھانے کی کوشش کی۔ ساری رات اسی مسئلے پر بحث کرتے

ہوئے گزر گئی تھی۔ علی مراد کسی طور اس شرط کو ماننے پر تیار نہیں ہوا تھا۔

اس وقت صبح کے گیارہ بج گئے تھے۔ گھر کے سب افراد رنج و غم کی تصویر بنے بڑے کمرے میں جمع ہو کر اسے منانے کی حتمی کوشش کر رہے تھے۔

"دیکھو علی! اگر تم نے اس وقت یہ بات نہ مانی تو انور بہن کی شادی نہ ہونے کو غیرت کا مسئلہ بنالے گا اور ہماری بہن کا گھر اجڑ جائے گا۔" حسن دین نے اسے احساس دلانا چاہا کہ معاملہ کتنا نازک ہو چکا ہے۔

"تو میں کیا کروں۔ یہ تو بلیک میلنگ ہے۔"

"تو اتنا بے غیرت کب سے ہو گیا علی مراد؟ بہن کا گھر اجڑنے کی بات ہو رہی ہے اور تو کہہ رہا ہے میں کیا کروں۔" میاں جی غصے سے بولے۔

"تو اس کا گھر بچانے کے لیے اپنا گھر اجاڑ لوں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہارا گھر بسانے کی ہی تو بات کر رہے ہیں علی۔ یہ ایک گھر کا نہیں پورے خاندان کی عزت کا معاملہ ہے۔ تم کوئی پہلے مرد تو نہیں ہو دنیا میں جو طلاق دو گے۔" حسن دین نے پھر سے کہا۔

"لیکن ایک نیک' پارسا اور وفادار بیوی کو طلاق......"

"ارے بچے! یہ حرام نہیں ہے۔ حلال چیزوں میں سے ہے۔" بی بی کو ایک اور نقطہ یاد آیا تھا۔

"ہاں وہ حلال چیز جو اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ ہے۔"

"مردوں کے لیے طلاق دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے گھر کی عزت رکھنے کے لیے......"

"معاف کیجیے گا بھائی حسن دین! پھر اپنی بہن اور بیٹی کی طلاق پر اتنی تکلیف کیوں؟" اس نے تاک کر نشانہ لگایا تھا۔

"میں یہاں کی نہیں' وہاں کی بات کر رہا ہوں جہاں سے تم آئے ہو۔ اس معاشرے میں روز طلاقیں ہوتی ہیں۔" انہوں نے تاویل پیش کی۔

"مگر وہ میری بیوی ہے' مسلمان ہے اس کے لیے یہ اتنی ہی تکلیف دہ بات ہوگی جتنی کنیز فاطمہ کے لیے۔" اس کے پاس بھی وزنی دلیل تھی۔

"اسے میری بیٹی سے نہ ملا۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔" چھپ چھپا کر شادی کرلی۔ بچی پیدا کرلی اور ماں باپ کو خبر تک نہ ہونے دی۔ یہی ہے اس کی اور تمہاری اچھائی اور فرماں برداری؟" بی بی کو بھی غصہ آگیا۔

"یہ بہت نافرمان ہو گیا ہے حسن دین کی ماں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا جس کے لیے میں منتیں مان رہا ہوں۔ وہ بڑا ہو کر میری عزت تک کی پرواہ نہیں کرے گا۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔ اس سے کہہ دو یہ چلا جائے یہاں سے۔ لیکن میرا مرا ہوا منہ نہ دیکھے ہمارا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔" وہ بت بنا بیٹھا تھا۔ کیسے جکڑ گیا تھا وہ رشتوں کے جال میں!

"یہ ظلم نہ کریں میاں جی! اگر میں نے غلطی کی ہے تو مجھے معاف کردیں۔ غلطی تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے۔" اس کا دل مٹھی میں آگیا تھا۔

"وہ رب العالمین ہے۔ ہمارا موازنہ اس سے نہ کرو۔ ہم تو عام انسان ہیں۔ رشتوں' رواجوں اور مجبوریوں میں جکڑے ہوئے انسان!" بی بی جان نے جواب دیا۔ کیسے دوہرے معیار تھے۔ انسانوں کے فیصلے کرنے میں خدا بن جاتے ہیں اور معاف کرنے میں انسان۔ ہر طرف اپنا ہی نفع دیکھنے والے۔

"لڑکی والے بارات کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ میاں جی کی نیک نامی کا خیال کر۔ تو یہاں سے چلا جائے گا مگر ہمیں تو اسی گاؤں' اسی برادری میں رہنا ہے۔" حسن دین کی پریشانی دیدنی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ سب کے دل بیٹھتے جا رہے تھے۔

رو رو کے کنیز فاطمہ کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اسے اپنا اور بچوں کا مستقبل بالکل تاریک نظر آرہا تھا۔

"مان جا علی مراد! اپنے ہاتھوں سے اپنی چھوٹی بہن کا گھر نہ اجاڑ۔ بھائی تو بہنوں کے رکھوالے ہوتے ہیں۔ مان ہوتے ہیں۔ تو کیسا بھائی ہے۔ ہمارے ہوتے ہوئے اسے بے آسرا' بے سہارا کر رہا ہے تو ہمارے

بعد اسے کون دیکھے گا۔" بی بی جان نے اس کے آگے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"میری بچی کا گھر بچا لے پتر! مجھ سے اس کا دکھ دیکھا نہیں جائے گا۔" وہ سسکیوں سے رونے لگیں۔

"کیوں میری نیک نامی ڈبونا چاہتا ہے۔ دین محمد امام مسجد اپنی بات سے پھرے گا تو لوگ اس کی کیا عزت کریں گے۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے میں کس کس کو وضاحتیں پیش کروں گا۔ میرا داماد' میرا بہنوئی تیرے فیصلے کے منتظر ہیں۔ میں کس کس سے معافیاں مانگوں گا۔ بیٹے تو باپ کا مان ہوتے ہیں۔ عزتوں کے وارث ہوتے ہیں۔ آج تو اپنے باپ کی عزت رکھ لے۔ تجھے رب کا واسطہ۔ میری زبان کا پاس رکھ لے۔ ورنہ پوری برادری میں امام مسجد دین محمد دو کوڑی کا نہ رہے گا۔ مجھے بھرے میلے میں رسوا نہ کر۔ میری عزت بچالے بیٹا!" انہوں نے اپنی پگڑی اتار کر اس کے قدموں میں رکھ دی۔ اسے جیسے بجلی کے ننگے تاروں نے چھو لیا تھا۔

"میاں جی! یہ کیا کر رہے ہیں آپ ...!" اس نے جھک کر پاؤں پیچھے ہٹائے تھے۔ "کیوں مجھے گناہ گار کر رہے ہیں۔" وہ ندامت سے شرابور ہو گیا۔

"مجھے تماشا بننے سے بچالے۔ میرے باپ دادا کی عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔ مان جا۔ ورنہ میں اس رسوائی کے ساتھ جی نہ سکوں گا۔" انہوں نے دل پہ ہاتھ رکھ کر بمشکل کہا تھا۔ پورا جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔

"میاں جی! آپ ٹھیک تو ہیں؟" حسن دین نے گھبرا کر پوچھا تھا۔ کنیز فاطمہ دوڑ کر پانی لے آئی تھی۔

"ٹھیک ہے میاں جی۔ جو آپ کا حکم ... وہ انسان تھا بالآخر ہتھیار ڈال دیے۔ آخر کوئی اکیلا کہاں تک لڑ سکتا ہے۔

"آپ ٹھیک ہیں میاں جی۔ میں ڈاکٹر کو بلاؤں؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے!" انہوں نے دو گھونٹ پانی کے پیے۔

"کال بک کرواؤ۔ بارات نکلنے سے پہلے وعدے کے مطابق طلاق ہو جانی چاہیے۔"

حسن دین نے امریکہ کے لیے کال بک کروائی تھی۔ اور شومئی قسمت خلاف معمول پانچ منٹ بعد ہی کال مل گئی تھی۔ فون پکڑتے ہوئے علی مراد کے ہاتھ کپکپا گئے تھے۔

ابھی ہفتہ پہلے ہی اس کی بات عائشہ سے ہوئی تھی۔ اس نے تمام صورت حال اسے بتا دی تھی۔ وہ جیسے سکتے کی کیفیت میں تھی۔ پتھر کا بت بنی سب کچھ سنتی رہی تھی۔ سب کچھ کتنا خلاف توقع تھا اس کے لیے۔ وہ تو بڑی خوشی اور بڑے چاؤ سے پاکستان آنے کی تیاری کر رہی تھی۔

"مجھے غلط نہ سمجھنا عائشہ! لیکن میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں کیا کروں۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو اس گورکھ دھندے میں اسی طرح الجھ جاتا۔ میں میاں جی کے سامنے اونچی آواز میں بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن میں پھر بھی بولا ہوں۔ مگر وہ میری بات سننے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ ان کے پیش نظر صرف کنیز فاطمہ کا مفاد ہے۔" اس نے سب کچھ سچائی سے بتا دیا تھا۔

"رشتے بہت پیارے ہوتے ہیں علی! ان سے کٹ کر جینا آسان نہیں ہوتا۔" وہ سب کچھ سن کر بولی تھی۔

"لیکن وہ میری بات ماننے پر راضی نہیں ہیں۔ میں کیا کروں!" وہ بالکل ہی بے اختیار ہو گیا تھا۔

"آپ شادی کرلیں علی! میں آپ کو نہیں روکوں گی۔ لیکن بس مجھے طلاق نہیں دینا۔" اس کی آواز میں کپکپاہٹ بڑی واضح تھی۔

"مگر تم جانتی ہو' امریکہ کے قانون کے مطابق میں دو شادیاں نہیں کر سکتا۔"

"ہاں لیکن آپ پاکستان میں شادی کر رہے ہیں۔ یہاں کسی کو خبر بھی نہ ہو گی۔"

وہ حیران رہ گیا۔ کوئی بیوی اتنا تعاون کر سکتی تھی؟

"لیکن تم ...؟" وہ کس کرب سے گزر رہی تھی' وہ بخوبی جانتا تھا۔

"میں کبھی پاکستان نہیں آؤں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ مجھ سے شادی کرنے کی وجہ سے آپ اپنے خونی رشتوں سے بچھڑ جائیں۔ میں آپ سے آپ کے والدین چھڑانے کی گناہ گار نہیں ہو سکتی۔ آپ ان کی نافرمانی نہ کریں۔ ان کی بات مان لیں۔ لیکن ان سے صرف ایک بات منوا لیجیے کہ ..."

آنسوؤں نے گلے میں پھندا لگا دیا تھا۔

"کہ ... مریم سے اس کا باپ نہ چھینیں!" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی تھی۔

"ایسا ہی ہو گا عائشہ۔" اس نے عزم سے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

آپریٹر نے دوسری جانب رابطہ کر دیا تھا۔

اس وقت نیویارک میں رات کے تین بجے تھے۔

ہیلو۔" فون کی پہلی بیل پر ہی اس کا نیند میں ڈوبا مگر بے قرار لہجہ اس بات کا غمازی تھا کہ وہ واہموں اندیشوں میں لپٹ کر سوتی تھی۔ اور ہر آہٹ پر فون کی ہر گھنٹی پر چونک کر اٹھتی تھی نجانے دور دیس بیٹھے لوگ' کلمہ حق پڑھنے والے لوگ اس کی قسمت کا کیا فیصلہ کرنے والے ہوں۔ علی مراد نے ایک نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔

میاں جی کا پھیکا پڑتا رنگ۔

بی بی جان کی متفکر مگر التجائیہ نظریں۔

کنیز فاطمہ کی شدت گریہ سے سوجی ہوئی آنکھیں۔

اور میاں جی کی براق سفید پگڑی۔ جو تب تک فرش پر دھری تھی۔ انہوں نے کہا تھا' وہ تب تک نہ اٹھائیں گے جب تک بات پوری نہ ہو جائے۔

"ہیلو عائشہ۔"

"السلام علیکم ... کیسے ہیں آپ ...؟"

"میں ٹھیک ہوں ... بس۔"

"میاں جی اور بی بی جان ٹھیک ہیں؟"

"ہاں سب ٹھیک ہیں وہ۔"

"جلدی کرو بچے ... ٹیلی فون کٹ جائے گا۔ تین منٹ کی کال ہے۔" بی بی جان کو بڑی فکر تھی۔

"عائشہ! میں علی مراد ولد چوہدری دین محمد بقائمی ہوش و حواس تمہیں طلاق دیتا ہوں۔

طلاق دیتا ہوں۔

طلاق دیتا ہوں۔"

"علی ...!" حیرت و صدمے میں ڈوبی ہوئی اک مظلوم اور بے بس سی آواز آئی تھی۔ اور سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ مگر نہیں سلسلہ نہیں ... رشتے منقطع ہو گئے تھے۔ وہ کبھی واپس نہ جا سکے گا اپنی بیٹی سے ملنے بھی نہیں۔

☼ ☼ ☼

وضاحت دینے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ اس کے والدین بہت نیک تھے۔ اتنے کہ اپنی نیک نامی کے لیے وہ کسی کی زندگی برباد کر سکتے تھے۔

☼ ☼ ☼

اللہ اکبر ... اللہ اکبر۔

فجر کی اذان گہری نیند سوتے ہوئے لوگوں کو جگا رہی تھی۔

حی علی الفلاح حی علی الفلاح۔

امام مسجد دین محمد کی آواز مسجد کے گنبد سے ٹکرا کر گاؤں کے لوگوں کو بھلائی کی طرف بلا رہی تھی۔

بی بی جان نے معمول کے مطابق وضو کر کے صبح کا آغاز کیا تھا۔

"صفیہ پتر! مسرت کو بھی جگا دے۔ اذان ہو گئی ہے۔"

"میں اٹھ چکی ہوں پھوپھو جی۔" مسرت نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"علی مراد کو بھی جگا دے۔ اسے کہہ نماز میں تاخیر نہ کیا کرے۔ تیرے میاں جی کو اچھا نہیں لگتا!" انہوں نے مصلے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی اٹھ چکے ہیں پھوپھو!" اس نے جواب دیا۔ نماز اور قرآن پڑھ کر وہ صفیہ بھابھی کے ساتھ ناشتے کا

انتظام کرنے لگی۔ پو پھٹ چکی تھی۔ بی بی نے روٹی کے ٹکڑے اور مٹی کا پیالہ پانی سے بھر کر منڈیر پر رکھا۔ جامن کے پیڑ پر چوں چوں کرتی چڑیاں اپنے حصے کا رزق چننے اتر آئیں۔ اس کے بعد انہوں نے مرغیوں کا ڈربہ کھولا۔ کٹ کٹ کرتی مرغیاں سرخ اینٹوں کے بنے کچے پکے آنگن میں دوڑتے بھاگتے دانہ چننے لگیں۔

سورج نکلا تو میاں جی اشراق پڑھ کر گھر لوٹ آئے۔ کچھ دیر میں گاؤں کی بچیاں قرآن پڑھنے آ گئیں۔ یہ تھی پنجاب کے ایک قصبے نما گاؤں خیر پور کی ایک صبح۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ کچھ بھی نہ بدلا تھا۔

بقول بی بی جان سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ مسرت ان کی بہو بن کر آ گئی تھی۔ کنیز فاطمہ کے قدم پوری طرح سسرال میں جم گئے تھے۔ اب بیٹا نہ ہونے کے باوجود اسے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ لہٰذا چہار سو سکون ہی سکون تھا۔ اور زندگی بڑی سبک رفتاری سے آگے کی جانب رواں دواں تھی۔

☼ ☼ ☼

چند روز میں اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے صدیوں کی بیمار ہو۔ دکھ ہی اتنا شدید تھا۔ اتنی بڑی دنیا میں ایک وہی تو اپنا تھا۔ سارے انمول رشتے گنوا کر ایک شخص سے رشتہ جوڑا تھا' وہ بھی اتنی جلدی چھن گیا۔ اسے حیرت تھی اور دکھ اپنا نہیں' مریم کا تھا۔ خود اس نے تو بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک ماں باپ بہن بھائی اور گھر کی رونقیں سب دیکھا تھا۔ لیکن مریم کو کیا ملا؟

اس کی معصوم بیٹی شروع سے ہی اکیلی تنہا۔ نہ بہن نہ بھائی اور ___ نہ باپ ___ وہ سوچ سوچ کر صدمے سے نڈھال ہو رہی تھی۔

"مجھے معاف کر دو بیٹی! میں نے اپنے طور پر تمہارے لیے بہترین شخص کا انتخاب کیا تھا۔ مگر افسوس میں پہچان نہ سکا۔ وہ تو بہت کم ظرف نکلا۔" مولوی صاحب کو اس کا دکھ کھائے جا رہا تھا۔

"میں تمہارا مجرم ہوں لیکن اللہ گواہ ہے۔ میں نے تمہارے لیے اپنی بیٹیوں کی طرح سوچا تھا۔ میرا خیال تھا وہ اچھے خاندان سے ہے۔ اللہ رسول کو ماننے والے دین دار لوگ ہیں۔ تمہاری قدر کریں گے۔ لیکن کبھی کبھی سب کچھ ہماری سوچ کے برعکس نکلتا ہے۔ شاید اسی کو تقدیر کہتے ہیں۔ لیکن میں تمہارے سامنے بڑا شرمسار ہوں۔ میری طرف سے دل میں کوئی بدگمانی نہ لانا۔ اللہ جانتا ہے' میری نیت اچھی تھی۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ مجھے آپ نے بیٹی کہا ہے۔ کبھی باپ بھی بیٹیوں کا غلط سوچتے ہیں۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" وہ واقعی بڑے نادم تھے۔ وہ سمجھتی تھی۔ لیکن ان کا کیا قصور تھا۔

"لیکن بیٹا! مجھے یہ سوچ کر ندامت ہوتی ہے کہ تم نو مسلم ہو۔ تمہارے دل میں اس مذہب کا امیج کتنا ___"

"ایسا کیسے سوچ لیا آپ نے۔ ٹھیک ہے میں نو مسلم ہوں لیکن ہوں تو مسلمان۔ شادی تو پیدائشی مسلمان لڑکی کی بھی ٹوٹتی ہے۔ کیا وہ اسلام کو مورد الزام ٹھہراتی ہے۔ یا مذہب سے بدگمان ہو جاتی ہے۔ میں نے اسلام کو پڑھ کر قبول کیا ہے۔ پھر میرا ایمان اتنا کچا کیسے ہو سکتا ہے۔

میں جانتی ہوں اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔ شادی ٹوٹنے سے میرے ایمان پر کوئی منفی اثر نہیں پڑا ___ صرف دل ٹوٹا ہے ___ اعتبار ٹوٹا ہے۔" آواز کہیں گم ہو گئی۔

آنسو لڑیوں کی صورت ٹوٹ ٹوٹ کر رخساروں پر گرنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

"علی مراد ___ میرے چچا ہیں مریم! تم میری کزن ہو۔" حیرت' دکھ اور فرط جذبات سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ مگر حقیقت تو تصویروں کی صورت میرے سامنے رکھی تھی۔

علی مراد چچا کی ایک نہیں کئی تصویریں تھیں۔ اپنی شادی کے موقع پر عائشہ چچی کے ساتھ مختلف مقامات پر۔ مریم کی پیدائش کے وقت اور پھر مریم کو گود میں اٹھائے ہوئے۔ مریم کی برتھ ڈے پر اور دیگر مواقع پر اور آخر میں دادا' دادی اور اماں ابا وغیرہ کے ساتھ پرانی تصویریں جو وہ یہاں آتے ہوئے لے کر آئے ہوں گے سب کچھ کھلی کتاب کی مانند سامنے تھا۔ تصدیق یا تردید کا سوال ہی نہیں تھا۔ شک و شبے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

"تم میری چچا زاد ___ میرا اپنا خون ہو ___!"

"میں جانتی ہوں۔"

"کیسے؟ تم کیسے جانتی ہو ___؟"

"آپ کی شکل ___ آپ کا بیک گراؤنڈ اور سب سے بڑھ کر آپ کی فیملی البم جو اس روز آپ نے دکھائی تھی۔ سب کی تصویریں ہیں اس میں۔"

"تم نے بالکل بھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ مجھے بتایا ہی نہیں۔"

"کیا ضرورت تھی۔"

"کیوں مجھ پر اعتبار نہیں تھا؟"

"اعتبار کا رشتہ ماں باپ سے شروع ہوتا ہے۔ جب وہیں سے دغا ہو جائے تو ___ پھر کوئی بھی قابل اعتبار نہیں رہتا۔" اس کے لہجے میں ٹوٹا ہوا کانچ بھر گیا تھا۔

"تم بہت بدظن بہت بدگمان ہو مریم ___!" میرا دل جیسے موم بن کر آنکھوں میں پگھلنے لگا تھا۔

کتنی مظلوم تھی وہ معصوم سی لڑکی۔

☼ ☼ ☼

"میں کون ہوں میں نہیں جانتی۔ میں وہ بدنصیب ہوں جو خود اپنی تلاش میں بھٹک رہی ہوں۔ میری ماں نے مذہب چھوڑا اور میرا باپ مجھے چھوڑ گیا۔ ماں کے رشتے دار چھوٹ گئے۔ اور باپ کے رشتے داروں نے اپنایا ہی نہیں۔

میرے نانا فادر تھے۔ ان کے لیے یہ بڑی شرم کی بات تھی کہ ان کی اپنی بیٹی عیسائیت چھوڑ دے۔ سو انہوں نے اور پوری فیملی نے ان سے قطع تعلق کر لیا اور اب جب ان کی بیٹی مر چکی ہے تو انہیں اس کی چھوڑی ہوئی کسی بھی چیز سے کوئی انسیت نہیں ہے۔ حتی کہ اس کی اولاد سے بھی نہیں۔

میرے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ وجہ کوئی بھی ہو۔ لیکن اس کی زندگی میں میری کوئی جگہ ہے اور نہ کوئی کمی۔

میں ایک فالتو چیز ہوں۔ آپ نے کبھی کوئی ایسا شخص دیکھا ہے۔ جس کا کوئی بھی نہ ہو۔

یا پھر جس کے سب ہوں مگر پھر بھی کوئی نہ ہو۔ کتنا تہی دامن ہوتا ہے وہ انسان' یہ کوئی دوسرا کبھی بھی نہیں سمجھ سکتا۔

جس کا کوئی نہیں ہوتا ___ وہ تنہا ہوتا ہے۔ جس کے سب ہوتے ہوئے کوئی نہیں ہوتا وہ بدنصیب ہوتا ہے۔" آنکھوں سے آنسو نہیں ___ دل پانی کی صورت برساتھا۔

میں گنگ رہ گیا۔ کتنی حساس تھی وہ لاپرواہ سی لڑکی۔

شرم سے میری نظریں ہی نہیں' سر بھی ایسے جھکا تھا کہ اٹھنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں جس قدر اس کے متعلق سوچتا تھا' اتنا ہی ندامت کے گڑھوں میں گرتا جا رہا تھا۔

کتنے فخر سے میں نے اسے بتایا تھا کہ ہمارے ہاں رشتے ناتوں کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔

کتنے مان سے میں نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں یہاں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر طلاقیں نہیں ہوتیں۔ بلکہ ہم شادی کو بڑا مقدس بندھن سمجھتے ہیں۔

کس منہ سے میں نے کہا تھا کہ ہمارے مذہب میں بیٹیوں کو رحمت سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے خاندان میں بیٹیاں بڑی لاڈلی' بڑی پیاری ہوتی ہیں۔

پروفیسر صاحب کی باتیں سن کر میں نے کتنے غرور سے سوچا تھا کہ ہمارا خاندان آج کی ان تمام غلاظتوں سے پاک ہے۔ کس زعم سے میں نے اسے اسلام کی دعوت دی تھی۔

کیسے پاش پاش ہوا تھا میرے غرور کا بت

میری غیرت کا عالیشان مجسمہ دھڑام سے منہ کے بل گرا تھا۔

میرا فخر، میرا مان سب ریت کے بودے قلعے ثابت ہوئے تھے۔

''ہمارے مذہب میں بیٹی کو رحمت سمجھتے ہیں۔'' امریکہ کے بار کلب میں نائٹ شفٹ کرتے ہوئے کتنی بار یہ جملہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا ہوگا۔

''ہمارے ہاں بیٹیاں بڑی لاڈلی، بڑی پیاری ہوتی ہیں۔'' لانڈری میں mop اٹھاتے ہوئے، ریسٹورنٹ میں جھوٹے برتن اٹھاتے ہوئے کتنی بار اس نے اس کے بارے میں سوچا ہوگا۔

امام مسجد دین محمد کی پوتی امریکہ کی سڑکوں پر اکیلی، بے آسرا خزاں کی رسیدہ پتوں کی طرح حالات کے رحم و کرم پر زندگی گزار رہی تھی۔

میرا سر ندامت سے جھک گیا۔

کیسا بے غیرت ہوتا ہے وہ باپ جو بیٹی پیدا کر کے چھوڑ دیتا ہے۔

میرے نزدیک وہ شخص گلی کے کتے سے بھی زیادہ گھٹیا تھا جو زندہ ہوتے ہوئے بھی اپنے بیٹی کو بے آسرا کردے، دوسروں کے رحم و کرم پہ چھوڑ دے۔

یہاں کے ٹاک شوز دیکھ کر میں اکثر ایسے ہی سوچا کرتا تھا۔

تب تک میں خود کو بڑے معزز اور معتبر خاندان کا فرد سمجھتا تھا۔ مگر آج پتا چلا تھا کہ ایسے لوگ میرے خاندان میں بھی موجود ہیں۔ حالات کو وجہ بتا کر وہ اس گالی سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔

اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ مجھ میں سو میں اس سے دوبارہ نہیں ملا تھا۔

ہاں مگر اس کی غیر موجودگی میں اس کی آنٹی سے ملا تھا۔ اور تب مجھے پتا چلا تھا کہ آنٹی خدیجہ امام صاحب کی بیٹی تھیں۔ انہوں نے مجھے مریم اور عائشہ چچی کے متعلق سب کچھ بتایا تھا۔

''عائشہ بہت اچھی، بہت عظیم عورت تھی۔ ہم جیسے مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ اچھی مسلمان۔ علی مراد کے طلاق دینے کے بعد وہ دس سال تک زندہ رہی تھی لیکن ان دس سالوں میں اس نے کبھی شکایت نہ کی تھی۔ ہمیشہ اللہ کی رضا سمجھ کر اپنی قسمت پر شاکر رہی تھی۔ صرف ایک بار اس نے اپنے والدین سے ملنے کی کوشش کی تھی لیکن انہوں نے اسے دھتکار دیا تھا۔''

اصل مسلمان تو وہ تھی جس نے اللہ کی خوشنودی کے لیے حق سچ کا ساتھ دینے کے لیے کسی طرح کے سود و زیاں کو مد نظر نہ رکھا تھا۔ بریسٹ کینسر ڈائیگنوز ہونے کے بعد اس نے آنٹی خدیجہ سے ریکویسٹ کی تھی کہ اس کے بعد وہ مریم کا خیال رکھیں گی۔ اسے کبھی بدظن اور بدگمان نہیں ہونے دیں گی۔ نہ باپ کی جانب سے، نہ مذہب کی جانب سے۔ تب ہی تو وہ اپنے ہزبینڈ کی وفات کے بعد سان فرانسسکو لے آئی ہیں۔ اور شاید اللہ نے انہیں اسی لیے اولاد نہیں دی تھی کہ عائشہ کی وفات کے بعد انہوں نے مریم کو اپنی بیٹیوں کی طرح ہی رکھا تھا۔

''مریم بہت اچھی، بڑی خوددار بچی ہے۔ کسی پر بوجھ بننا اسے قطعی گوارا نہیں ہے۔ جب سے بڑی ہوئی ہے، جاب کر رہی ہے۔ میں جانتی ہوں میری محبت کے باوجود وہ اپنی ذمہ داری خود اٹھانا چاہتی ہے۔ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔''

آنٹی خدیجہ کے لہجے میں اس کے لیے بڑی ممتا تھی۔

''آنٹی! میں مریم کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اس زیادتی بلکہ ظلم کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو میرے خاندان نے اس کے اور عائشہ چچی کے ساتھ کیا ہے۔ اس نقصان کا خسارہ تو شاید کبھی پورا نہ ہو سکے۔ لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ تو ہو سکتا ہے۔ میرے بڑوں نے اس

سے رشتے چھینے تھے۔ میں اسے سگے رشتے لوٹانا چاہتا ہوں۔ میں اس کا ٹوٹا بکھرا اعتبار لوٹانا چاہتا ہوں۔"

میں نے بڑی ہمت کرکے ان سے یہ بات کہی تھی۔

"تمہارے گھر والے نہیں مانیں گے خضر! کیوں اس کہانی کو پھر سے دہرانا چاہتے ہو۔" ان کے لہجے سے بالکل واضح تھا کہ انہیں علی مراد کے بھتیجے پر کوئی اعتبار نہ تھا۔

"آپ مریم سے بات تو کریں آنٹی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ..."

"مریم اپنے فیصلوں میں خود مختار ہے۔ لیکن اسے مشورہ دینا میرا فرض ہے میں اسے ایسا کوئی رسک لینے کی رائے نہیں دوں گی۔"

انہوں نے صاف انکار کردیا تھا۔ وجہ میں بخوبی سمجھتا تھا۔

"تمہارے چچا نے میرے بابا کو عائشہ کے سامنے بڑا شرمسار کیا تھا۔ وہ آخری دم تک اس بات پر پچھتاتے تھے کہ عائشہ کے لیے ان کا انتخاب غلط نکلا۔ اس کو دکھی دیکھ کر وہ ہمیشہ خود کو مورد الزام ٹھہراتے تھے۔ میں نہیں چاہتی کہ اس غلطی کو میں پھر سے دہرا کر کوئی پچھتاوا مول لوں۔" اسے سر جھکائے خاموش بیٹھے دیکھ کر انہوں نے اپنے خدشوں کی وضاحت بھی کردی تھی۔

"خدیجہ آنٹی! رسک تو تب ہوگا جب میں شادی پہلے کروں گا اور گھر والوں کو بعد میں مناؤں گا۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں مریم کو پوری عزت اور خوشی سے بیاہ کرلے جاؤں گا۔ اس شادی میں بارات بھی آئے گی اور ڈولی بھی اٹھے گی۔ میرے گھر والے خود آئیں گے اسے لینے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

میرے لہجے کا عزم اور آنکھوں کی سچائی دیکھ کر وہ چپ کرگئی تھیں اور میں جانتا تھا یہ وعدہ ان سے نہیں درحقیقت میں اپنے آپ سے کررہا ہوں۔

☼ ☼ ☼

میں نے کہیں پڑھا تھا۔

"لوگ مذہب کے نام پر لڑیں گے، جھگڑیں گے حتیٰ کہ اس کے لیے جان دے دیں گے مگر اس پر عمل نہیں کریں گے۔"

اور آج وہی سب ہورہا تھا۔

کیا قرآن یہ کہتا ہے کہ جو کفر کی تاریکیوں سے نکل آئے اسے دھتکار دو۔

جو اللہ اور اس کے رسول کی خاطر اپنے پیاروں کو چھوڑ آئے اسے بے آسرا، بے سہارا چھوڑ دو۔

اسلام کا نام لے کر اپنے مفاد کے لیے دوسرے کا کبھی نہ پورا ہونے والا نقصان کردو۔

کیا یہ انعام ہے اسلام قبول کرنے والوں کا۔ یہ صلہ ہے ان کی قربانی کا۔

کیا اسلام یہ کہتا ہے کہ صبح اٹھ کر نماز پڑھو۔

قرآن پڑھو۔

اور بیٹیاں پیدا کرکے چھوڑ دو۔

ہمارا دین تو رشتے بنانے پر زور دیتا ہے۔ پھر یہ کیسے مسلمان ہیں جو رشتے توڑ کر نیک اور پرہیزگار کہلاتے ہیں۔

"بڑی زیادتی ہوئی ہے مریم تمہارے ساتھ۔ مگر اب، اب مزید نہیں ہونے دوں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔" میرے ارادے اور عزم چٹان کی مانند پختہ تھے۔

"مجھ پر اعتبار کرو مریم! گو کہ میں تم سے بہت شرمسار ہوں۔ تمہارے سامنے نظریں اٹھانا بہت مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی ایک بار، صرف ایک بار مجھ پر اعتبار کرلو۔ میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں زندگی کی وہ تمام خوشیاں دوں گا جو تمہارا حق ہیں۔ پلیز مریم... انکار نہیں کرنا..."

میں نے پوری نیک نیتی اور خلوص دل سے اپنا دامن پھیلایا تھا۔ نہ تو میں اس کی محبت میں دیوانہ ہوا تھا، نہ کوئی لالچ یا غرض تھی۔ صرف دل کی ایک ہی خواہش تھی کہ اس معصوم لڑکی کو اس کا حق ملنا چاہیے۔ اسے اپنوں کے ہوتے ہوئے اس دنیا میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔

"مجھے کوئی خواب نہیں دیکھنا خضر! میں ایسی خوش نصیب کہاں... جنہوں نے میری ماں کو ٹھکرایا، وہ بھلا مجھے کیوں اپنائیں گے۔ آپ کی فیملی بڑی دین دار ہے۔ انہیں تو کوئی اپنے جیسی نیک لڑکی چاہیے ہوگی۔"

اس کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی یہی سوچتی۔

"میرے بزرگوں کے کیے کے طعنے مجھے مت دو مریم۔ اللہ جانتا ہے ان کے عمل پر میں بہت نادم ہوں گناہ گار وہ ہیں لیکن ازالہ میں کرنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم بہت اچھی ہو۔"

"لیکن میں بہت اچھی مسلمان نہیں ہوں... عام سی مسلمان لڑکی ہوں... میں حجاب نہیں لیتی... میں باقاعدگی سے نماز نہیں پڑھتی، دو ٹائم قرآن نہیں پڑھتی بلاوجہ اسلام کا پرچار نہیں کرتی... ہاں لیکن میں ... میں دل نہیں توڑتی... اعتبار نہیں توڑتی... اور رشتے نہیں توڑتی۔"

دکھ پانی بن کر اس کی نیلگوں آنکھوں میں تیرنے لگا تھا۔ کتنی ٹوٹی بکھری اور محبتوں کو ترسی ہوئی تھی وہ موی مجسمے جیسی خوب صورت سی لڑکی۔

"میں پاکستان جارہا ہوں مریم...! صرف تمہارے لیے۔ میرے گھر والے خود تم سے بات کریں گے... بلکہ اپنی زیادتی پر نادم ہوں گے... میرا تم سے وعدہ ہے تمہارے حصے کی خوشیاں تمہیں ضرور ملیں گی۔ میں تمہیں دل کی تمام تر صداقتوں سے اپنانا چاہتا ہوں۔ تم صرف اتنا اعتبار بخش دو کہ انکار نہیں کروگی۔"

میں ہر صورت اسے راضی کرنا چاہتا تھا۔ میں اسے ان خوابوں کی تعبیر دینا چاہتا تھا جو اس کی ماں نے دیکھے تھے۔

"بولو! انکار نہیں کروگی ناں۔"

"نہیں... شاید میں چاہوں بھی تو نہ کرسکوں... کیونکہ وہاں وہ شخص بھی تو ہے، جس کی گود میں سر رکھ کر میں سویا کرتی تھی۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش اس طرح گھل گئی تھی کہ الفاظ آنسو بن گئے تھے۔

خدیجہ آنٹی نے صحیح کہا تھا، عائشہ چچی بہت عظیم تھیں انہوں نے مریم کو کبھی ان رشتوں سے متنفر نہیں کیا تھا۔ سارا کرب اپنی ذات پر اکیلے ہی جھیل کر چلی گئی تھیں۔ میرے دل میں ان کی عظمت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

"تم نے میرا مان بڑھایا ہے مریم... تم سے وعدہ ہے، ساری زندگی تمہارا مان رکھوں گا۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر خود اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا۔ وہ ہولے سے مسکرادی تھی۔ شاید اسے کچھ یقین آگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

میرے اچانک پاکستان آنے پر سب حیران مگر بہت خوش تھے۔ اماں کا خیال تھا کہ میں بہت صحیح وقت پر آیا ہوں۔ ملیحہ کالج کی پڑھائی سے فارغ ہوچکی تھی۔ آج کل ترجمہ سے قرآن پاک پڑھ رہی تھی اور اماں ہماری شادی کے متعلق ہی سوچ رہی تھیں۔ اچھا ہوا کہ میں خود ہی پہنچ گیا تھا۔

میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ سب سے پہلے ملیحہ کو اعتماد میں لیا تھا۔ ساری کہانی اس کے سامنے کھول کے رکھ دی تھی۔ ایک ایک بات اسے من وعن بتائی تھی۔

عائشہ چچی کا اسلام قبول کرنا، علی چچا کی شادی۔ دادا، دادی اور سب کی جذباتی بلیک میلنگ اور پُرزور اصرار پر طلاق، مریم سے قطع تعلق...!

"کیا یہ ظلم نہیں ہے۔ کیا یہ انصاف ہے اور اگر اب بھی مریم کو اس خاندان سے کوئی خوشی نہ ملے، اسے اس کا کھویا ہوا حق نہ ملے تو کیا یہ اس کی حق تلفی نہیں ہوگی؟"

وہ خاموشی اور بڑی توجہ سے میری بات سن رہی تھی۔ میں جانتا تھا وہ بڑی نرم دل اور ہمدرد لڑکی تھی۔

عائشہ چچی اور مریم کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو وہ اپنے دل پر محسوس کررہی تھی۔ وہ بچپن سے ہی ایسی تھی۔ سب کی خیر خواہ۔ دوسروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھنے والی۔ دوسروں کے درد کو محسوس کرنے

والی حساس سی لڑکی۔

اب بھی ان کا دکھ اسے دکھی کر رہا تھا۔ لیکن اب کی بار معاملہ بہت مختلف تھا۔

وہ جس کشمکش میں تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کا دل جس کرب سے دوچار تھا۔ وہ میری نظروں سے اوجھل نہ تھا۔ میں نے اسے بڑے پیچیدہ اور کٹھن دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا۔

"کتنے عظیم ہوتے ہیں وہ لوگ جو اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنے سود و زیاں سے بالاتر ہو کر سوچتے ہیں۔ عائشہ چچی بھی تو ایسی ہی تھیں۔"

میں اسے قائل کرنے کے لیے مثال دے رہا تھا۔

"تم نے قرآن ترجمہ سے پڑھا ہے ناں۔ مجھے بتاؤ ملیحہ یہ اس بارے میں کیا کہتا ہے۔

بتاؤ ملیحہ اللہ کیا کہتا ہے۔ قرآن کیا کہتا ہے؟"

"یہ کہتا ہے اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

اور۔۔۔

اور یہ کہ انصاف قائم کرو۔

اور۔۔۔

اور یہ کہ کسی کا حق تلفی نہ کرو۔

اور یہ کہ جس کام کا ارادہ کرو اسے پورا کیا کرو۔۔۔

اور اللہ پر توکل رکھو بے شک۔۔۔ وہ توکل رکھنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔"

آخری جملہ جیسے اس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔ وہ خود اپنی ہمت بندھا رہی تھی۔ اس کی آواز پوری طرح آنسوؤں میں ڈوب گئی تھی۔

یہ آنسو کیا کہہ رہے تھے میں جانتا تھا۔

وہ سادہ دل معصوم سی لڑکی بچپن سے جس نام کی مالا جپتی رہی تھی اس سے قطع تعلق کرنا آسان تو نہیں ہو گا۔

کسی دوسرے کی خاطر اپنے خوابوں سے دستبردار ہونا کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔

مگر وہ واقعی بہت بڑے دل کی مالک تھی اور بہت اعلا ظرف بھی۔

میں نے اسے سمجھایا تھا کہ جن حالات میں مریم اس وقت ہے، اسے کسی مضبوط سہارے کی ازحد ضرورت ہے۔ اگر اسے یہ سہارا نہ ملا تو وہ کسی بھی لمحے کمزور پڑ کر متنفر ہو سکتی ہے۔

اور وہ میری بات سمجھ گئی تھی۔ اس نے اپنے دین کو سربلند کرنے کے لیے خود کو قربانی کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔

"آپ قدم اٹھائیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔" اس نے بڑی نرمی سے کہا تھا۔

"تم بہت اچھی ہو ملیحہ۔۔۔۔ تم نے آنے والی نسلوں کو گمراہی اور کفر سے بچایا ہے۔ اللہ کے نزدیک اس کا بڑا اجر ہے۔ میری نظروں میں تمہارا مقام بہت بلند ہے۔ ملیحہ! مجھے فخر ہے کہ تم میری کزن ہو۔"

میرے ان الفاظ پر اس کی آنکھیں ساون کی بارش کی طرح برسی تھیں۔

کچھ بھی ہو، دل کی کال کوٹھڑی کو خالی کرنا بڑے حوصلے کی بات تھی، بڑی ہمت درکار تھی۔

اور اس حوصلے اور ہمت کو مجتمع کرنے میں یقیناً" اس نازک سی لڑکی کو بڑی دقت کا سامنا تھا۔ بڑے کرب سے گزرنا تھا۔



اور پھر امام مسجد دین محمد کے کچے پکے آنگن میں سالوں بعد پھر وہی کہانی دہرائی گئی۔ مگر اس بار اس کا مرکزی کردار علی مراد نہیں تھا، جو جذباتی دباؤ میں آ کے سب سے انمول دولت گنوا بیٹھتا۔ اور پھر راتوں کو جاگ جاگ کر اللہ سے معافی کا طلب گار ہوتا۔ بلکہ مضبوط ارادوں کا مالک خضر حسین تھا۔ جس کے پیش نظر سات سمندر پار وہ تنہا اور اکیلی لڑکی تھی جس کی نیلگوں آنکھوں میں وہ آس کا دیپ جلا کر آیا تھا۔

اور جو یقیناً" نیندوں سے جاگ جاگ کر اس کی منتظر ہو گی۔

ایک بار پھر وہی سب کچھ۔۔۔ وہی قسمیں، یاد دہانی، بچپن کی منگ کے واسطے، خاندان کی عزت، جذباتی بلیک میلنگ، اماں کے آنسو، ابا کی دھمکیاں اور لوگوں

میں رسوائی کا خوف۔

"ملیحہ سے رشتہ چھوٹا تو میں اپنے بھائی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی خضر۔۔۔!"

"بس اماں! بہت ہو چکی۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔ "آپ تو بہت نیک خاتون ہیں لوگوں کے بچوں کو قرآن پڑھاتی ہیں۔ ہر وقت اللہ اور اس کے رسول کو راضی کرنے کی بات کرتی ہیں۔"

"اور آپ۔۔۔!" میں نے ابا حسن دین کی جانب دیکھا جو ابھی ابھی نماز کی امامت کروا کے لوٹے تھے۔

"آپ دن میں پانچ بار حی علی الفلاح کہہ کر لوگوں کو بھلائی کی طرف بلاتے ہیں۔۔۔ کبھی آپ نے سوچا ہے کہ آپ نے خود کتنی بھلائی کی ہے۔

اللہ کو صرف عبادت کی ضرورت ہوتی تو اس کے لیے فرشتے ہی کافی تھے۔ قرآن حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد پر بھی زور دیتا ہے۔ بلکہ حقوق العباد کی حقوق اللہ سے زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ حدیث میں ہے کہ یوم حساب سب سے زیادہ مفلس وہ ہو گا جس نے کسی کی حق تلفی کی ہو گی۔ یاد کیجیے چچی عائشہ کے ساتھ کی جانے والی حق تلفی میں آپ لوگ بھی شریک تھے۔ لیکن ابھی بھی وقت ہے، تلافی کر لیجیے۔"

وہ خاموشی سے میری بات سن رہے تھے۔

"میں کوئی عالم نہیں ہوں نہ ہی دین کے بارے میں بہت زیادہ جانتا ہوں لیکن ایک چھوٹی سی بات آپ کو سنانا چاہتا ہوں شاید آپ سمجھ جائیں۔

"ایک شخص حج پر اس طرح روانہ ہوا کہ ہر قدم پر دو رکعت نفل ادا کرتا تھا۔ اس کے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ راستے کے کانٹے بھی اسے پھول معلوم ہوتے تھے۔ ہر تکلیف اسے راحت پہنچاتی تھی۔ وہ اسی جذبے و شوق کے ساتھ سفر کر رہا تھا کہ ایک مقام پر اس کے دل میں خیال آیا کہ جس انداز سے میں سفر کر رہا ہوں آج تک کسی نے نہ کیا ہو گا۔

یہ خیال اس کے دل میں شیطان نے ڈالا تھا۔ اگر وہ فوراً" استغفار نہ کرتا تو یقیناً" بہت برا ہوتا۔ لیکن اللہ نے اس پر فضل کیا۔ اس کے کانوں میں غیب سے آواز آئی "کہ اے نیک بندے! بے شک تُو نے ہماری عبادت کا حق ادا کیا لیکن یہ خیال نہ کر کہ تُو ہماری بارگاہ میں کوئی خاص تحفہ لے کر آ رہا ہے۔ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ کسی "دکھی دل" کو خوش کرنا ہر منزل پر ایک ہزار رکعتیں ادا کرنے سے افضل ہے۔"

کبھی کبھی کوئی چھوٹی سی بات فیصلے بدل کر رکھ دیتی ہے۔ اماں ابا نے بڑی توجہ سے بات سنی تھی اور گویا ان کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

کہانی تو ویسی ہی تھی گھر بھی وہی تھا۔ مکین بھی وہی تھے۔ لیکن اس بار انجام مختلف تھا۔ کیونکہ ملیحہ نے خود شادی سے انکار کر دیا تھا۔ ہر طرح کے سود و زیاں سے بالاتر ہو کر میرا ساتھ دیا تھا اور مجھے کامل یقین تھا کہ یوم حساب اس کا دامن خالی نہیں رہے گا۔

سمیرا حمید

بھید



کہتے ہیں عورت کی ازلی فطرت ہے ناشکری کرنا جو کچھ حاصل ہے اس کی قدر نہ کرنا لیکن حامد تو مرد تھا پھر بھی اسے اپنی بیوی میں کوئی خوبی نظر ہی نہ آئی تھی۔ موقع ملنے کی دیر ہوتی اور وہ شروع ہو جاتا۔

شادی' مرگ' عید' ہر تہوار ہر جگہ ملنے والوں کو وہ بہت طریقے سلیقے سے بتاتا تھا کہ اس کی بیوی کتنی بڑی جاہل ہے' جسے نہ کھانے کی تمیز ہے نہ بات کرنے کی' نہ شوہر کی پرواہ نہ خیال وہ اس کے ساتھ کتنی مشکل سے گزارا کر رہا ہے۔

"یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے' ڈھنگ سے کپڑے تو پہنا کرو۔" کوئی نہ کوئی رشتہ دار خاتون اسے دیکھ کر ٹوک دیتی۔

ویسے تو وہ کم ہی کسی کے یہاں جاتی تھی' گھر کی کوئی نہ کوئی الجھن' کسی بچے کی بیماری' امتحان' اسکول' پھر حامد اسے لے کر بھی نہیں جاتا تھا اور اگر وہ چلی ہی جاتی تو سب جیسے انتظار میں ہی بیٹھے ہوتے اس کے' حامد تو بنا ٹھنا' کبھی اس سے مذاق تو کبھی اس سے تکرار' یہاں کیا ہو رہا ہے وہاں کیا ہونے والا ہے وہ تو چھڑے چھانٹوں کی طرح ادھر ادھر لہراتا پھرتا' ہنس ہنس کر اس کی خوبیاں بیان کرتا۔

"ٹھیک کہتا ہے حامد' فقیرنی لگتی ہے حلیے سے۔۔۔ دو دن ہو گئے یہاں آئے۔ شوہر کا ذرا خیال نہیں۔"

وہ بچوں کو لے کر ہلکان تھی اور حامد دور نزدیک کی اپنی رشتے دار خواتین کے ٹولے کے تبصرے سن رہا تھا۔

"بیٹا! شوہر کا خیال رکھا کرو۔" ساتھ بیٹھی خالہ ساس کب سے حامد کو دیکھ رہی تھیں۔

"رکھتی ہوں خالہ! سب کچھ ان ہی کی مرضی کا کرتی ہوں۔"

خالہ گڑبڑا گئیں۔ اب اسے کیسے سمجھائیں "بنی سنوری رہا کرو' آس پاس بھی نظر رکھا کرو۔"

"کیا بننا سنورنا خالہ! مہینہ ہو گیا قاسم کا بخار ہی نہیں جا رہا' دیکھے کتنا تنگ کر رہا ہے' انتارش ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس صبح جاتی ہوں اسے لے کر شام کو ہی آتی ہوں' پھر گھر کے کام' یہ کچھ ٹھیک ہوا تو آ گئی عذرا کی شادی میں۔"

"حامد سے کہا کرو' لے کر جائے قاسم کو۔" خالہ ساتھ ساتھ تسبیح بھی پڑھ رہی تھیں۔ اس کی خالہ ساس اور ساس میں بہر حال زمین آسمان کا فرق تھا۔

"کہتے ہیں' اسٹور دیکھوں یا اسے' ٹھیک ہی تو کہتے ہیں' قاسم تو جب سے پیدا ہوا ہے بیمار ہی ہے۔"

"سو جھمیلے ہیں عورت کی جان کو۔" خالہ افسوس کرنے لگیں۔ "پھر بھی بیٹا ذرا اپنے شوہر کا خیال رکھا کرو' آؤ بھگت کیا کرو' گھر تو اس کا بھی ہے' بس مرد کو بہانہ ہی چاہیے ہوتا ہے۔" خالہ کی آنکھیں بھر آئیں' دو سال پہلے خالو نے مسقط میں شادی کر لی تھی۔

آسیہ' عورتوں کے ٹولے میں بیٹھے حامد کو دیکھنے لگی۔

"بہت ہمدردیاں ہیں خاندان بھر کی حامد کے ساتھ۔

ہر چھوٹی بڑی ، بوڑھی جوان ہمدرد ہے اس کی۔"

☼ ☼ ☼

خاندان میں ، محلے میں حامد کی دوسری شادی کی خبریں گرم تھیں۔

محلے والیاں آ کر اسے نت نئی خبریں سناتیں۔

"میرے میاں سے کہہ رہا تھا حامد کہ اوپر ایک اور منزل بنانے لگا ہے ، ہو سکتا ہے اسے اوپر رکھے۔"

"ایسی بات نہیں ہے ، کافی عرصے سے پیسے جوڑ رہے ہیں۔"

"لو تم یہی سب سوچتی رہنا ، اور وہ جو ہر روز اسٹور پر آتی ہے ، ساری دنیا جانتی ہے اسے ، ایک تم ہی آنکھیں بند کر کے بیٹھی رہو ، پوچھتی کیوں نہیں اس سے۔"

"کیسے پوچھوں؟" وہ رونے لگی۔ "میری تو ایک نہیں سنتے ، لڑنے لگتے ہیں۔"

"تو اپنے ساس ، سسر سے کہو نا ، پوچھیں اپنے لاڈلے سے۔"

اس نے گہرا سانس لیا ماں تو وہ حامد ہی کی تھی ، کتنے مہینے ہو گئے تھے اسے یہ سب سنتے کہ حامد دوسری شادی کر رہا ہے ، ہر روز نئی بات ہر روز نیا قصہ ، بہنیں اسے ہی الزام دیتیں کہ وہ حامد کو قابو میں نہیں رکھ سکتی۔

نندیں ، جٹھانی طعنے دیتیں کہ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے نہ وہ شکایت کا موقع دیتی نہ شوہر ادھر ادھر ہوتا۔

"تن من نچھاور کرنا پڑتا ہے شوہر کے لیے۔ کیا مجال شوہر کی جو ادھر ادھر دیکھے۔" بڑی نند طنز کرتی۔

"پتا نہیں ، یہ شوہر قابو کیسے کیے جاتے ہیں۔" ساتھ والی حاجرہ کہتی ، جو ہفتے میں دو تین بار مرتے مرتے بچتی تھی ... "اور ایک وہ میرے والا ہے ، ہنس کے بھی بات کرو ، تو بھی تھوبڑا سوجا ہی رہتا ہے۔ پتا نہیں وہ کون خوش قسمت عورتیں ہوتی ہیں ، جو شوہر قابو کر لیتی ہیں۔"

اس کی بہنیں اسے سمجھاتیں کہ وہ پوچھے حامد سے ، لیکن وہ کیا پوچھے ، اس کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی ، وہ کلف لگے کپڑوں کی طرح اکڑا ہی رہتا ضرورت پڑی تو نرم ورنہ وہی حال۔

☼ ☼ ☼

"وہ شادی کر رہا ہے ، تمہارے بھائی بتا رہے تھے۔ اگلے مہینے نکاح کر رہا ہے ، زیور بھی بنوا رہا ہے۔" ساتھ والی پڑوسن خبر سنتے ہی اسے بتانے بھاگی آئی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ جسم میں سے جان نکلنے لگی۔

"تم بات کیوں نہیں کرتیں اپنے سسرال والوں سے ، اپنی نندوں سے؟ بلاؤ ، بٹھاؤ سب کو اور پوچھو ایسا کیوں کر رہا ہے۔"

وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

ساس نندیں اپنی جگہ لاپروا ، جیسے کہتی ہوں۔ ہمیں کیا بھگتو خود ہی۔

"تم سے اجازت تو ضرور لے گا۔" کوئی کہتا۔

"تمہاری ساس ، نندوں کو پتا ہے سب ، بن رہی ہیں۔"

ساس اس سے چڑی رہتی بلاوجہ ، حامد کا دل چاہتا تو بول لیتا ورنہ وہی اپنی مرضی۔

وہ یہ باتیں سنتی ، روتی ، پریشان ہوتی پھر وہی بچوں کے چکر ، گھر کے کام۔

"تمہاری کوئی کمیٹی ہے؟" پچھلے کئی دنوں سے حامد اس کے ساتھ بہت پیار سے بات کر رہا تھا۔

"ہاں ہے۔"

"کتنے کی ہے؟"

"پچیس ہزار کی۔"

"کب ملے گی؟"

"اگست میں۔"

"ابھی تو چھ مہینے ہیں۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے تو ابھی ضرورت تھی۔"

"یہ کمیٹی جوہی کی بالیوں کے لیے ہے۔"

"بنا دوں گا اسے بالیاں بھی ... تم یہ مجھے دے دو۔"

"آپ نے کیا کرنا ہے؟" اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"اسٹور پر کچھ کام کروانا ہے۔"

"اسٹور پر کام کروانا ہے یا زیور بنوانا ہے؟"

آدھے گھنٹے سے وہ آئینہ کے سامنے کھڑا خود کو مختلف زاویوں سے دیکھ رہا تھا ، ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا ، اس نے پہلی بار اتنی ہمت کی تھی۔

"ہاں ، زیور بھی بنوانا ہے۔" اس نے کہا اور بال بنانے لگا۔

"کون ہے وہ؟"

"جب آئے گی تو دیکھ لینا۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

بہت دیر تک وہ سوچتی رہی کہ اب کیا پوچھے ، رہ کیا گیا ہے ، حامد نے تو بات ہی ختم کر دی تھی۔

"میں اجازت نہیں دوں گی۔" ہمت جمع کر کے وہ یہی کہہ سکی۔

"تم سے اجازت مانگ کون رہا ہے۔"

آسیہ کا دل جلنے لگا۔ "آپ ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ رونے لگی۔ "میرا کیا قصور ہے ، گھر کا ہر کام کیا ، بچوں کو سنبھالا ، ساس سسر کی خدمت کی ، اور کیا چاہیے آپ کو۔"

"رونے کی ضرورت نہیں ہے ، تمہارے خرچے پورے ہوتے رہیں گے ، تم نیچے رہنا ، وہ اوپر رہ لے گی ، مل جل کر رہ لینا۔"

جس کہانی کا آغاز لوگ اسے بتاتے رہے تھے اس کا انجام حامد اسے بتا رہا تھا "مل جل کر۔" یہ بات اسے جلتے انگارے کی طرح لگی۔

اس کا گھر ، اس کا شوہر ، اس کے بچے ، وہ کیسے بانٹ لیتی۔

"حلیہ دیکھا ہے اپنا ، فقیرنی لگتی ہو۔" اسے لگا کسی اجنبی نے اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا ہو۔

"کیا خرابی ہے حلیے میں ، صاف ستھرے کپڑے پہنے ہیں ، بال بنائے ہیں اسی حلیے میں نماز پڑھتی ہوں۔"

"نمازیں ہی پڑھتی رہنا۔" اس نے طنز کیا۔

"جب بیاہ کر آئی تھی تب میرا حلیہ یہ نہیں تھا صبح سے شام تک کاموں میں لگی رہتی ہوں ، جوہی کو اسکول لے کر جاتی ہوں لے کر آتی ہوں قاسم کے لیے سارا سارا دن ٹوکن لیے اسپتال میں اپنی باری کا انتظار کرتی ہوں ، کون سا کام ہے جو میں نہیں کرتی ، خرچے سے ایک ایک پیسہ بچا کر رکھتی ہوں۔"

"کرتی ہو تو کیا احسان کرتی ہو ، میں بھی رات دن کام ہی کرتا ہوں۔"

"آپ کام کرتے ہیں اور شکایت بھی ، میں شکایت نہیں کرتی۔"

"تمہیں کیا شکایت ہو گی ، سب کچھ تو ہے اس گھر میں ، سب کچھ لا کر دیتا ہوں ، ہر ضرورت پوری کرتا ہوں۔"

"ہر ضرورت پوری کرتے ہیں ، لیکن کبھی دو لفظ محبت سے نہیں بولے۔"

وہ مڑ کر اس کی شکل دیکھنے لگا ... دنگا فساد تو اس نے کیا کرنا تھا پر وہ اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا ...

"ادھر بیٹھو میرے پاس آ کر ، میں تمہاری حق تلفی نہیں کر رہا ، تمہیں سب پتا چل ہی چکا ہے تو ٹھیک ہے مل جل کر خوش رہنا۔"

اس کے دو بچوں کا باپ کتنے مزے سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے وہ اچھی لگی ، میں حرام راستے کی طرف جانا نہیں چاہتا ، اسی لیے تو اللہ رسول نے اجازت دی ہے۔"

"بیوی کے ہوتے ہوئے کسی اور عورت کی طرف دیکھتے ہیں ، اللہ رسول نے اجازت ہی دی ہے نا فرض تو نہیں کر دیا۔" اس کا کلیجہ کٹ رہا تھا۔

"محبت ہے مجھے اس سے اور میں اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں ..."

"بیوی سے محبت نہیں جو پانچ سال سے ساتھ ہے تمہارے دو بچوں کی ماں ہے۔" غصے سے اس کی رگیں

تن گئیں۔

"شادی تو مجھے کرنا ہی ہے، تمہیں رونا ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"شادی کے لیے ہی بہانے ڈھونڈ رہے تھے، سو کیڑے نکالے مجھ میں، کیسی کیسی باتیں کیں میرے بارے میں خاندان بھر میں۔"

"کیڑے تھے تو نکالے۔"

"اپنے کیڑے نظر نہیں آتے۔"

"اپنی بکواس بند کرو، آرام سے رہنا ہے تو رہ لو ورنہ اپنے گھر دفع ہو جاؤ، بچے میں پال لوں گا، عزت راس نہیں ہے۔"

یہ بات پہلی سے زیادہ شدت سے لگی اسے۔۔۔۔

"بچے پال لو گے، بچوں کی ماں لا رہے ہو یا اپنے لیے بیوی۔" غصے سے وہ بھڑک اٹھی۔

پانچ سال جیسے وہ ایک مہاجر کیمپ میں گزارتی رہی تھی چلو جی، ہجرت کروا ب آگئے۔ ایک کرائے کے گھر میں، جو کبھی اپنا نہیں ہوتا۔

"بچے بھی میں پال لوں گی، تمہیں نئی بیوی مل سکتی ہے تو مجھے بھی نیا شوہر مل سکتا ہے۔" اس کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔

چادر اوڑھ کر قاسم کو اٹھا کر وہ گھر سے جانے کے لیے نکلی، آج پھر اسے ٹوکن کے لیے لمبی قطار میں کھڑا ہونا تھا۔

☆ ☆ ☆

محلے والے، خاندان والے، اس کے اپنے گھر والے اسے تسلی دلاسا۔۔۔ دیتے، باری باری سمجھانے بجھانے آنے لگے۔ کوئی اسے بھڑکاتا کہ وہ گھر چھوڑ کر چلی جائے، کوئی کہتا خاموش رہو، گھر چھوڑ کر کہاں جاؤ گی، ماں باپ کے سر پر بوجھ بنو گی، کوئی کہتا چھوڑو، بچے باپ کے پاس، خود ہی پالے گا تو پتا چلے گا۔

وہ کیسے چھوڑے بچے۔۔۔۔ کون اپنے جسم کے ٹکڑے کاٹ کر پھینک سکتا ہے۔

اس کی ہمسائی کہتی۔ "اس حرافہ کی خبر لو، کیوں پیچھے پڑی ہے حامد کے۔"

اس کے میکے والے کبھی بھڑک اٹھتے اور کبھی اسے ہی خاموش رہنے کو کہتے، اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اسے کرنا کیا ہے لیکن اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ اسے اپنا یہ گھر کسی اور کو نہیں دینا، یہ اس کا گھر ہے۔ بچے اس کے ہیں، شوہر اس کا ہے۔۔۔۔ وہ کیوں چھوڑے، سب۔

آئے دن کوئی نہ کوئی اسے ملتا، کچھ نیا ہی سنا دیتا خاندان بھر کے پاس ایک ہی موضوع تھا۔ اس کی آس پڑوس والی اس کی ساس کی نظر بچا کر اس کے پاس آ جا کرتیں۔۔۔

اس کا نندوئی بھی انہیں تسلی دینے والوں میں سے تھا۔

☆ ☆ ☆

برآمدے میں بیٹھی وہ سبزی بنا رہی تھی۔ ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

"روتی کیوں ہو۔۔۔۔ ہمت سے کام لو، رونے سے کیا ہوگا۔" نندوئی نے موڑھا قریب کھسکا لیا۔

وہ روتی ہی رہی۔۔۔ "کیسی ہمت؟"

"جب حامد کو تمہاری پروا نہیں ہے تو رو رو کر کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہو، اپنا خیال کرو۔۔۔۔ حلیہ دیکھو اپنا جب بیاہ کر آئی تھیں، کتنی پیاری من موہنی سی تھیں اب دیکھو خود کو۔"

وہ پھر بھی روتی ہی رہی۔

"ارے۔۔۔ رے، کتنا روؤ گی؟" موڑھا اور قریب آگیا۔

"مرد ذات ہی ایسی ہے، چھوڑ دیا سو چھوڑ دیا۔ تم کیوں روتی ہو۔" اس نے اس کا کندھا سہلایا۔

آسیہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

جب سے وہ بیاہ کر آئی تھی اپنے اس نندوئی سے فاصلے پر ہی رہتی تھی، وہ کیا خاندان کی اکثر عورتیں اس سے فاصلے پر ہی رہتی تھیں۔

"اتنی اچھی ہو تم۔" اس نے سرگوشی کی۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں، مجھ سے کرو دل کی، باتیں۔"

کچھ بھی تھا۔ آسیہ کو اس کی ہمدردی بہت اچھی لگی۔ ساس کے آتے ہی اس نے اپنا موڑھا دور کھسکا لیا۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری بڑی نند کا میاں ہے وہ، کیوں باتیں کرتی ہو اس کے ساتھ؟" ساس اچھی طرح جانتی تھی اسے۔

"کچھ شرم لحاظ ہے یا نہیں، اسے منع کرو نہ آیا کرے روز یہاں۔"

"آپ منع کردیں۔"

"تم جانتی ہو کہ میں اسے منع نہیں کر سکتی، کمرے میں، کچن میں، ہر جگہ گھستا چلا جاتا ہے، غضب خدا کا، میری آنکھوں کے سامنے تم نے یہ کیا ڈرامہ لگا رکھا ہے۔"

"میں کیوں منع کروں؟ مجھ سے ہمدردی کرنے آتے ہیں وہ۔" ساس کے تیور بدل گئے۔

"اپنا دل بہلانے کے لیے وہی ملا تھا۔"

"آپ کے بیٹے سے تو بہلا نہیں سکی۔ کسی سے بہلانا ہی تھا۔"

"توبہ توبہ، یہ دیکھو کیسے دیدے پھاڑے بے شرمی سے کہہ رہی ہے۔ شرم کر ذلیل!" ساس آپے سے باہر ہو گئی۔

"شرم بھی ہے اور لحاظ بھی اور خدا کا خوف بھی۔"

"بلاتی ہوں میں خدیجہ کو۔ آکر دیکھے یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

☆ ☆ ☆

آگے پیچھے ساری نندیں چلی آئیں۔۔۔۔ ماں نے لمبی بیٹھک لگائی ان کے ساتھ۔

تینوں ایک ساتھ شروع ہو گئیں۔

"تمہارے دیدوں کی شرم کہاں گئی، میرا میاں ہے وہ، دو بچوں کی ماں ہو تم۔"

وہ ڈھیٹ بنی کھڑی رہی، دنوں میں ہی اس کے خلاف کہانی تیار تھی۔

"دو بچوں کے باپ آپ کے بھائی بھی ہیں۔ ان سے تو کبھی آپ سب نے نہیں کہا کہ وہ بھی شرم کریں۔ شرم ہے میری آنکھوں میں، میں ان سے نہیں کہتی کہ یہاں آئیں۔۔۔۔ آپ انہیں منع کریں، وہ یہاں نہ آئیں۔"

"میری کہاں سنتا ہے وہ۔" خدیجہ رونے لگی۔

"کیوں نہیں سنتا تمہاری، اس سے کہو، میری بھابھی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے بھائی کو نہیں پسند۔" اماں بھی بول پڑیں۔

"کہا تھا اماں! دوبار آپ کے بتانے پر کہا تھا۔ وہ وہ ذات کی گالی دی مجھے، کہتے ہیں اپنے بھائی جیسا سمجھ رکھا ہے۔" خدیجہ نے آنسو پونچھے۔

"کیوں میرا گھر برباد کرنے پر تلی ہو، پانچ سال تو فقیرنیوں کی طرح گزار دیے اب یہ کون سی روح آگئی ہے تم میں۔"

"میں کیوں آپ کا گھر برباد کرنے لگی، میں انہیں یہاں نہیں بلاتی۔"

"عورت گھاس نہ ڈالے تو مرد کی کیا مجال کہ دوبارہ پاس آئے۔"

"عورت مرد کو قابو میں رکھنا چاہتی ہو تو مرد کی کیا مجال کہ کسی دوسری کے پاس جائے۔" اس نے ان ہی کی بات منہ پر دے ماری۔

کان پک گئے تھے اس کے یہ طنز سن سن کر۔۔۔۔ قابو، قابو جو اپنے نفس کے قابو میں نہیں وہ کسی کے قابو میں کیا آئے گا۔

"اماں! اس کے تیور دیکھے۔۔۔۔ حامد کو بتائیں، زبان تو اس کی پہلے بھی چلتی تھی۔ اب تو اور بکواس کرنے لگی ہے۔"

"چوڑی لگتی ہو حلیے سے اور حرکتیں دیکھو جیسے مہارانی ہو، میاں کو قابو نہ کر سکیں تو ادھر ادھر منہ مارنے لگیں۔"

"میں نہیں کر سکی تو آپ کر لیں، میرے پاس کیوں آئی ہیں۔" آسیہ سرد لہجے میں بولی۔

"پچھلے کئی سالوں سے آپ اپنے بیٹے کے قصے سن رہی ہیں اُسے تو آپ نے کبھی کچھ نہیں کہا' نہ بچوں کی شرم نہ بیوی کا لحاظ۔"

"وہ مرد ہے۔ تمہارا کام ہے اُسے سنبھالنا۔" چھوٹی نند بھی بولی "تمہیں کچھ شرم حیا ہے یا نہیں؟"

"اب ہی تو شرم آئی ہے مجھے' پانچ سال ایک مرد کے لیے اس کے گھر کے لیے بچوں کے لیے جان مارتے ہوئے گزارے۔۔۔ تب بھی شوہر کہتا ہے گھر سے نکال دے گا' تو بہت شرم آئی مجھے۔۔۔ اس گھر کا کوئی فرد میرا نہیں' ایک اینٹ بھی میری نہیں۔ میرے بچے میرے نہیں' ان بچوں کا باپ میرا نہیں' ہر نقص مجھ میں ہے۔"

"دیکھو ذرا زبان' ایسے ہی حامد متنفر نہیں تم سے' بہت اچھا کر رہا ہے شادی کر رہا ہے تو' جان عذاب کر رکھی ہے اس کی۔" چھوٹی نند پھر بولی۔

"آپ کا میاں بھی کر سکتا ہے دوسری۔"

"بیوی تم جیسی ہو.... بدکردار تو اسے کرنا ہی چاہیے۔"

غصے اور نفرت سے اس کا خون کھولنے لگا۔

"گھر کی صفائی کرتی ہوں' برتن کپڑے دھوتی ہوں' بچوں کے ہزار کام کرتی ہوں' رات دن اس گھر میں گزارتی ہوں' میں بدکردار ہوں اور جو کئی سالوں سے حامد کر رہا ہے۔"

"وہ تو چلو نکاح کر رہا ہے اور تم۔"

"نکاح سے پہلے کیا کرتا رہا ہے' رات رات بھر گھر سے باہر رہنا' بن ٹھن کر نکل جانا نہ بیوی کی پرواہ نہ بچوں کی خبر۔"

"تو اپنے میاں سے کیوں نہیں پوچھتیں' ہم سے کس بات کا بدلہ لے رہی ہو' آنے دو حامد کو۔ ایسا ٹھیک کرے گا کہ دوبارہ یہ زبان نہیں چلے گی۔" اس نے نفرت سے انہیں دیکھا۔

"میرے لیے دو دن میں پنچایت اکٹھی کر لی' بیٹا سالوں سے کیا کر رہا ہے اس پر کسی کی انگلی نہیں اٹھی' میں نے کچھ کیا نہیں اور مجھ پر الزام لگا دیا اور جس کی گواہی ساری دنیا دے رہی ہے وہ نیک پارسا ہے۔"

ساس چیخنے چلانے لگی۔

یہ وہی تھی جو ہر بار اپنے بیٹے کے عشق کے قصوں پر کان بند کر لیتی تھی وہ بنا کسی وجہ کے ہی آسیہ سے نفرت کرتی تھی' وہ ان ساسوں میں سے تھی کہ جب بیٹا پٹائی کرتا ہے تو خوش ہوتی ہیں اور بعد میں رو رو کر سب کو بتاتی ہیں کہ ان کی بہو کے لچھن ہی ایسے ہیں مار کھانے والے۔

☼ ☼ ☼

"بھائی جان یہاں روز کیوں آتے ہیں۔" دس پندرہ دن کے بعد ہی حامد کو بتایا جا سکا ورنہ وہ رات دو تین بجے سے پہلے نہیں آتا تھا۔

"ان ہی سے پوچھ لیں۔" وہ بدستور ٹی وی دیکھتی رہی۔

"بچی مت بنو' اماں نے مجھے سب بتا دیا ہے۔"

"پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں' جب اماں نے سب بتا دیا ہے۔"

"اتنی بے غیرتی پر اتر آئی ہو گھٹیا عورت! شرم نہیں آئی بہنوئی ہیں وہ میرے۔"

"بے غیرتی کیسی' وہ آتے ہیں' میرا حال چال پوچھتے ہیں' اس میں شرم کی کیا بات ہے؟ گھر سے باہر نہیں جاتی' غیر مردوں کے ساتھ بات نہیں کرتی۔"

"اور مر گئے ہیں تمہارا حال پوچھنے کے لیے۔"

"تم نے تو کبھی پوچھا نہیں۔"

"انہیں منع کر دینا۔ دوبارہ یہاں نہ آئیں' خاص کر میری غیر موجودگی میں۔"

"تم خود منع کر دینا۔"

"اپنے آپے میں رہو' اتنا ذلیل کر کے نکالوں گا کہ منہ چھپاتی پھرو گی۔"

آسیہ کو جیسے کسی نے آگ میں جھونک دیا ہو۔

"میں کیوں منہ چھپاؤں گی۔ منہ تو تمہیں چھپانا چاہیے۔"

"دو بچوں کی ماں ہو اور اپنے کرتوت دیکھو۔"

"دو بچے تمہارے بھی ہیں' تم بھی شرم کرو' نہ میں نے کچھ برا کیا اور نہ میں بے شرم ہوں۔"

"کیوں ہر وقت کھی کھی کرتی ہو اس کے ساتھ؟"

حامد اپنی ماں کی زبان ہی بولنے لگا۔

"تو تم کر لیا کرو نا میرے ساتھ۔" وہ طنزیہ مسکرائی۔

"کسی گمان میں نہ رہنا' ایڑیاں رگڑو گی تو بھی طلاق نہیں دوں گا میرے گھر میں یہ بے غیرتی نہیں ہوگی۔"

"اگر تم دوسری شادی کر سکتے ہو تو میں بھی خلع لے سکتی ہوں۔ تم بھی کسی گمان میں نہ رہنا۔"

"آپا کا گھر برباد کرو گی؟" وہ اس کی طرف بڑھا۔

"دوسری شادی کرنا گھر برباد کرنا ہوتا ہے' تو تم کیوں کر رہے ہو؟"

"میری بہن کا گھر برباد کرو گی؟" وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

"کیوں آپا اپنی سوکن کے ساتھ مل جل کر نہیں رہ سکتیں۔"

"سارا خاندان تھو تھو کرے گا۔ بے غیرت عورت۔"

"خاندان اب بھی تھو تھو ہی کر رہا ہے' میرے لیے تو پہلے بھی کرتا تھا جو قصے تم نے خاندان بھر میں میرے لیے پھیلا رکھے ہیں وہ کافی ہیں خاندان کا ہر شخص مجھے ہی نصیحتیں کرنے چلا آتا ہے۔ مرد کی خدمت کرو' بچے پالو' گھر سنبھالو پھر بھی نقص' سجے بنے رہو' گھومو پھرو وہ بھی نقص' چپ رہو نقص' زبان چلاؤ وہ بھی نقص' اس عورت میں تمہیں نقص نظر نہیں آتے جس کے ساتھ سارا سارا دن گھومتے ہو' جسے آدھا اسٹور کھلا چکے ہو' بیوی ایک ایک روپیہ بچا رہی ہے' اس کی قدر نہیں۔ ایسی عورتوں کے ساتھ خوش رہتے ہو جو تمہیں دن رات اپنے پیچھے لگائے رکھتی ہیں۔

بیوی میں ہزار نقص نظر آ رہے ہیں' کسی کی تھوڑی سی ہمدردی مل گئی تو بیوی بے غیرت ہو گئی اور تم کیا ہو۔"

"ایک بار گھر سے نکالا تو یاد رکھنا بچوں کی شکل نہیں دیکھنے دوں گا۔"

وہی صدیوں پرانی بات۔

"تین بچے آپا کے بھی ہیں۔"

اس کے گال پر اس زور کا اس کا ہاتھ پڑا کہ وہ دور جا گری' بہنوں کا لاڈلا بھائی تھا۔۔۔ اس تھپڑ نے اس کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا۔ اب یہاں رکنا بے معنی تھا۔ اس نے صرف بیمار قاسم کو اپنے ساتھ لیا اور چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"اماں! آسیہ کو جا کر لے آئیں' حامد سے کہیں کہ جا کر لائے اسے' روز جاتے ہیں وہاں' وہاں تو کوئی روک ٹوک بھی نہیں ہوگی۔" خدیجہ آپا رو رہی تھیں۔

"تم نے ہی تو کہا تھا نکال باہر کرو' عقل ٹھکانے آ جائے گی' اب مر گئی ہے' ایسے نہیں آئے گی۔"

"مجھے کیا پتا تھا' وہ وہاں جا گھسیں گے' سنتے ہی نہیں میری۔ روز کی لڑائی ہے میرے گھر۔" ان کے رونے میں شدت آ گئی۔

"چلیے میں اور آپ جا کر لے آتے ہیں۔ خدا کے لیے میرا گھر تو برباد نہیں کریں' آسیہ کے سر پر تو بھوت سوار ہے' میرا گھر برباد کر دے گی۔"

"اس کے گھر والوں نے صاف کہا ہے حامد نے شادی کی تو پہلے اسے طلاق دے۔"

"طلاق دلوا کر میری سوکن بنائیں گی۔ حامد سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں یہ' یہ میں ہی ہوں جو سنبھال رکھا ہے اب تک۔"

"کون ہے وہ حرافہ جس سے حامد نکاح پڑھوا رہا ہے' دو نمبر عورتیں دو دن ہی اچھی لگتی ہیں' نکال باہر کرے گی سب کو' سب کچھ ہتھیا کر۔"

خدیجہ آپا کو اب یاد آیا تھا یہ سب۔

"سمجھائیے حامد کو' اپنا گھر برباد نہ کرے' اپنے بچوں کا خیال کرے۔"

اماں سوچ میں پڑ گئیں۔

"تم نے ہی شہہ دی تھی حامد کو' تمہیں ہی زہر لگتی تھی وہ۔"

"ہاں لگتی تھی' اب بھی لگتی ہے' فقیرنی' چوڑی' مجھے کیا پتا کہ اس چڑیل کی اتنی ہمت ہو جائے گی۔ میں جاتی ہوں سلمیٰ کو لے کر بازار۔ پتا کرتی ہوں اس چڑیل کا۔ کون ہے وہ حرافہ..... پتا نہیں کس خاندان کی ہے۔ آپ جائیں ابا کو لے کر آسیہ کے گھر..... لے کر آئیں اسے۔"

آپا ادھر گئیں' اماں' ابا' سب آسیہ کو لینے گئے باری باری' لیکن آسیہ نہیں آئی کیوں آتی وہ.....

یا حامد اس عورت کو چھوڑ تا یا اسے۔

☼ ☼ ☼

کئی ماہ ہو گئے تھے اسے گئے ہوئے' کبھی ادھر سے دو لوگ آتے۔ کبھی ادھر دو لوگ جاتے' آئے دن خاندان کے لوگ جمع کیے جاتے' بات کی جاتی..... اور بنتے بنتے بگڑ جاتی۔

بڑی آپا ہر صورت اسے گھر لانا چاہتی تھیں۔ لیکن اس کی ضد تھی کہ حامد آئے اور آکر لے جائے..... اور دوسری شادی کو بھول جائے اور حامد جا کر لے تو آئے۔ نکاح کو کیسے بھولے.....

اماں نے منت کی' آپا نے ہاتھ جوڑے' روئیں' سمجھایا..... خاندان کو روز نت نئی خبریں ملتیں۔ گرما گرم۔ ان ہی دنوں دو خبریں ملیں۔ دو واقعات ہوئے آگے پیچھے۔

آپا نے ڈھونڈ ڈھانڈ بھرے بازار میں اس عورت کو جا لیا۔

اور پھر۔

"دکان داروں نے اپنی دکانوں سے نکل نکل کر اس لڑائی کو دیکھا..... ماں کی' بہن کی' باپ کی ہر ذات کی گالی سنی گئی وہاں' ہاتھا پائی..... لاتیں گھونسے..... یہ سب ڈرامہ اسٹور کے اندر ہوتا رہا۔

اب عورت اپنا گھر بچائے یا دوسری کا بسائے۔

اور اسی کے پیچھے پیچھے دوسرا واقعہ ہوا۔ اسی عورت کے یار بیلیوں نے "حامد اسٹور" اور اس کے مالک کی اچھی طرح توڑ پھوڑ کی۔

بازار والے تو خیر ہفتوں سنتے رہے مگر خاندان والے سالوں ہنس سکتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"بچی آسیہ!" وہ تیسرے گھر والی زینت تھی۔ وہ اس وقت بازار میں تھی بتا رہی تھی کہ تیری نند اور وہ عورت یوں گتھم گتھا ہوئیں جیسے تمباکو کو بل دیے ہوں۔" زینت اس کی ساس کے ڈر سے آہستہ آہستہ اسے بتا رہی تھی دور بیٹھی اس کی ساس خونخوار نظروں سے دونوں کو دیکھ رہی تھی اسے لگتا تھا وہ اس بار بہو نہیں خونخوار شیرنی اٹھا لائی ہے۔

"حامد ٹھیک ہے اب؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا

"ٹھیک ہے' چلنے میں ہی تھوڑا مسئلہ ہے۔" آسیہ نے کریلے چھیل کر دھوپ میں رکھے۔

"سنا ہے' وہ عورت آپا کا گھر ڈھونڈتی پھر رہی ہے' اسے سکون نہیں ملا ابھی۔"

وہ ہنسی۔

"عورت ہو تو آپا جیسی' نہ بھرے بازار کا خیال کیا نہ عورت ذات کا..... آپا کے تو کپڑوں کی وہ حالت ہوئی کہ پوچھو مت۔"

"کریلے چھیلو' پھر دھوپ میں رکھو' نمک لگاؤ' ان کی کڑواہٹ ختم..... مگر انسان..... اس کی کڑواہٹ کیسے ختم کی جاتی ہے..... کون سی دھوپ انسان کو چندن بناتی ہے.....؟"

کڑاہی گرم کر کے وہ کریلے فرائی کرنے لگی' حامد نے ہی فرمائش کر کے پکوائے تھے..... کبھی کبھی اس کے کراہنے کی آواز کچن میں اسے سنائی دے جاتی تو وہ جا کر اسے دیکھ لیتی۔ اس کا رخ بدلتی اور پھر سے کچن میں آکر کام کرنے لگتی۔

☼

نمرہ احمد

ناولٹ

وہ میرا ہے



دونوں ہاتھ ریلنگ پہ جمائے' وہ جھک کر ٹیرس سے نیچے دیکھ رہی تھی۔ دور دور تک کالونی میں خاموشی اور اداسی کا راج تھا۔ شام کی نیلاہٹ ہر سو اترنے لگی تھی۔ پرندے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ اونچے' خوبصورت بنگلے قطار میں خاموشی سے کھڑے تھے۔ فضا میں ایک نامحسوس سا بوجھل پن تھا۔

غیر دلچسپ' پھیکا' اور بے رنگ سا منظر!

اس کی نگاہیں مایوس سی پلٹ آئیں۔ بے حد بوریت بھری جگہ تھی وہ' اگر اسے پہلے علم ہوتا تو کبھی خالہ کے گھر چھٹیاں گزارنے نہ آتی۔

پچھتاوے بھرے تاسف سے اس نے سر جھٹکا' پھر گردن موڑی۔ نگین شیڈ تلے کرسی پہ بیٹھی ناول میں گم تھی۔

"کیا پڑھ رہی ہو اتنی دیر سے؟" اسے پھر سے غصہ آنے لگا۔ ایک تو جگہ بور ترین تھی' اوپر سے نگین کی شخصیت۔

"ہوں؟" صفحے سے نگاہیں اٹھائے بنا مبہم سا استفسار۔

"میں نے پوچھا ہے' کیا پڑھ رہی ہو؟" وہ اس کے کان کے قریب آکر چیخی۔





"شش! زرنیلا چائے بنانے گئی ہے۔ کمیل آیا ہوا ہے۔" شرمیلی مسکان لبوں پہ سجائے، نگین نے تجسس بھری بے چینی سے صفحہ پلٹا۔

وہ کلس کر رہ گئی۔

اماں نے کہا تھا' چھٹیاں اچھی گزریں گی' خالہ کے پاس رمضان میں اسلام آباد چلی جاؤ اور اس نے فوراً" خوشی خوشی حامی بھرلی۔ خالہ لوگوں سے ملے بھی تو پانچ چھ برس ہو چکے تھے۔ وہ لوگ کراچی شفٹ ہوئے تو آنا جانا ختم ہی ہو گیا تھا۔ اب اسی سال اسلام آباد واپس آئے تھے۔ وہ ان کے آنے پہ بے حد خوش تھی۔ فون کا ہی سہی مگر رابطہ تو تھا نا۔ اور یونہی باتوں باتوں میں اس نے نگین کو کہہ ڈالا کہ۔

"میرا گمان ہے تم آج بھی چھ سال پہلے والی نگین ہو گی۔ عینک والی' تیل لگائے' ٹی وی' اخبار یا کتاب میں گھسی ہوئی؟"

"تمہارا گمان غلط بھی تو ہو سکتا ہے' ہانی! میں بہت بدل گئی ہوں!" نگین نے اپنے ازلی سادہ انداز میں اسے یقین دلایا تھا مگر جب ہانی نے یہاں آکر اسے دیکھا' تو اسے یقین ہو گیا کہ اس کے گمان واقعی سچ نکلتے ہیں۔

چھ سال بعد بھی نگین ویسی ہی تھی۔

آنکھوں پہ موٹے عدسے والا بڑا سا چشمہ' تیل میں گندھی چوٹی اور چہرے پہ چھایا ہونق پن۔ وہ ایک ٹائم ٹیبل کے تحت چلتی تھی۔ اپنا نہیں' ٹی وی چینلز کا ٹائم ٹیبل۔ مارننگ شو شروع ہونے سے ایک منٹ قبل وہ جاگتی' پھر چشمہ اٹھایا اور بھاگ کر ٹی وی چلایا' پھر پہلا وقفہ آنے تک وہ بنا پلک جھپکے اسکرین پہ نگاہیں گاڑے بیٹھی ہوتی۔ وقفے میں منہ دھونے اٹھتی۔ ٹی وی کی دلدادہ ڈراموں کے نشر مکرر بھی دیکھا کرتی۔

جو وقت ڈراموں سے بچتا' ان میں وہ ناولز لے کر بیٹھ جاتی۔ کرسی پہ ٹانگیں چڑھائے' تیل میں گندھی چوٹی کندھے پہ ڈالے' وہی تاریخی چشمہ پہنے کتاب میں گھس کر پڑھتی نگین اسے بہت بور کر رہی تھی۔

"کہاں یہ ہونق لڑکی' اور کہاں وہ لاہور کی پرنسس! خوبصورت' پر اعتماد' اور پرجوش' ٹپ ٹاپ سے رہنے والی جس کے سلکی لمبے بال شانوں پہ لہرا رہے ہوتے' فیشن اور اسٹائل جس پہ ختم تھے' جو ہر دم' ہر چیز میں شغل تلاشتی تھی اور جواب ادھر آدم بے زار' بور قسم کے اسلام آبادیوں میں پھنسی بیٹھی تھی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ لاہور میں ہی رہتی۔ جہاں ہر دم رونق' اور شغل ہوتا تھا۔

"ہائے اللہ۔"

"کیا ہوا؟" نگین کی کراہ پہ وہ گھبرا کر پلٹی۔

"شاہ نیل نے زرنیلا کے اوپر چائے گرادی۔" وہ پریشانی سے سینے پہ ہاتھ رکھے پڑھتی جا رہی تھی۔

"دفع ہو جاؤ نگین!" وہ پیر پٹخ کر دوبارہ ریلنگ کے پاس چلی آئی۔

کالونی ویسی ہی ویران پڑی تھی۔ اس کی بوریت انتہا کو پہنچ چکی تھی اور قریب تھا کہ وہ واپس جانے کا فیصلہ کر لیتی' جب اس نے سامنے والوں کے گیٹ میں زن سے داخل ہوتی گاڑی دیکھی۔

ریلنگ پہ ہاتھ رکھے' ہانی نے گردن اونچی کر کے دیکھا۔

کوئی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے موبائل کان پہ لگائے' دوسرے سے لاک میں چابی گھماتا' وہ جو بھی تھا' بہت ہینڈسم تھا۔ نیلی جینز پہ سیاہ شرٹ' لمبا قد اور صاف رنگت۔ وہ اب گیٹ بند کرنے واپس پیچھے کو جا رہا تھا۔ فون بدستور کان سے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کے پچھلے دروازے سے ایک گورا نکلا تھا۔

"بلیک واٹر!" ہانی کے ذہن میں بے اختیار یہ خیال ابھرا۔

گیٹ بند کر کے اب وہ اندر جا رہا تھا۔ پھر جب اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا تو ہانی نے رکی ہوئی سانس باہر نکالی۔ اف' کتنا ہینڈسم تھا' لیکن ملک دشمن۔

"نگین۔۔۔ نگین۔۔۔" وہ دوڑ کر اس کے پاس آئی۔

اپس جانے کے سارے پروگرام بھول گئے تھے۔ "تم نے اسے دیکھا ہے؟"

"کسے؟"

"وہ جو سی فائیو میں رہتا ہے۔"

"ہاں' دیکھا ہے۔" نگین کا چہرہ ہنوز کتاب پہ جھکا تھا۔

"اچھا' کون ہے؟" وہ خوشی بھرے تجسس سے اس کے قریب ہوئی۔

"کیسا ہے؟" نگین نے لمحے بھر کو ناول سے سر اٹھایا پھر ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگی۔ "بڑا پیارا ہے' سفید رنگت' سلکی بال' بھوری آنکھیں' اونچا قد' مضبوط جسامت' اور یہ لمبی سی دم!"

"دم؟" وہ آنکھیں موندے جو کسی حسین تصور میں کھوئی تھی' جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔ "اس کی دم بھی ہے؟"

"ہر کتے کی دم ہوتی ہے ہانی!"

"کتا؟ کون سا کتا؟"

"وہ جو سامنے والوں کا ہے!"

"اُبے! میں کتے کی نہیں' اس کے مالک کی بات کر رہی ہوں!"

"اوہ اچھا' وہ۔۔۔" نگین جواب دیتے ہوئے پھر سے پڑھنے لگی تھی۔ "وہ کوئی نیا کرائے دار ہے۔ ابھی ہفتہ بھر پہلے شفٹ ہوا ہے۔ وہ سفید جرمن شیفرڈ اسی کا ہے نا۔۔۔ سنا ہے انگلینڈ سے آیا ہے۔ کتا بھی ساتھ ہی لایا ہے۔"

"ہوں۔ چلو پھر اس کے گھر چلتے ہیں۔" وہ کچھ سوچ کر اٹھی۔ نگین نے پہلی دفعہ ناول سے چہرہ اٹھا کر حیرانی سے اسے دیکھا۔

"مگر کیوں؟"

"یہ تم بتاؤ۔ تمہارے ناول کی ہیروئن ہیرو سے کیسے ملی تھی؟"

"وہ۔۔۔ زرنیلا کمیل کے گھر بریانی دینے گئی تھی تو۔۔۔"

"بس ہم بھی اس کے گھر بریانی دے کر آتے ہیں۔ چلو۔"

"مگر ہانی! جب زرنیلا گئی تو آگے سے۔۔۔"

"بھاڑ میں گئی تمہاری زرنیلا۔" اس نے غصے سے ناول کھینچا اور بنا دیکھے پیچھے پھینکا۔

سیڑھیوں سے چھوٹو کپڑوں کی گٹھڑیاں اٹھائے آرہا تھا۔ ناول اس کے سر پہ لگا۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ گٹھڑیوں سمیت پیچھے گرا۔

"تمہارا ناول تو چیختا بھی ہے۔" ہانی حیرت سے مڑی۔ سامنے کوئی نہیں تھا مگر نگین دیکھ چکی تھی۔

"میرا ناول۔" وہ سیڑھیوں کی جانب دوڑی۔

"رکو تو!" وہ پیچھے لپکی۔

سیڑھیوں پہ تینوں گٹھڑیاں اوپر نیچے پڑی تھیں۔ نگین ان کے درمیان ہاتھ مار رہی تھی۔

"مر گیا یا بچ گیا؟"

"بچ گیا۔" اس نے خوشی خوشی کہیں سے کتاب کھینچ نکالی۔

"وہ مار دیتا اے باجی!" چھوٹو کہیں اندر کراہ رہا تھا۔ بارہ سالہ کام والا لڑکا' اس کی ڈرامہ بازیوں سے وہ اچھی طرح واقف تھیں' سو نگین نے جھک کر اس کی نبض چیک کی۔

"زندہ ہے یہ۔" اور ہانی اسے ہاتھ سے کھینچ کر نیچے لے آئی۔

لاؤنج کے اس طرف کچن تھا۔ کھلے دروازے سے خالہ چولہے کے پاس کام کرتی دکھائی دے رہی تھیں۔

"خالہ!" وہ بہت خوشگوار موڈ میں انہیں پکارتی ہوئی اندر آئی۔ "بڑی خوشبو آرہی ہے۔ کیا پکا رہی ہیں؟"

"کریلے!"

"کریلے؟" اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ حلق تک کڑوا ہوگیا۔ پھر فریج پہ نظر پڑی تو ذرا امید بندھی۔

"خالہ! کل کا کون سا سالن رکھا ہوگا؟"

"ٹینڈے بینگن۔" وہ مصروف سی ہانڈی میں چمچ ہلا رہی تھیں۔

اب بھلا ٹینڈوں میں بینگن ڈال کر کون کھاتا تھا' سوائے خالہ کے۔

"ٹینڈے رکھے تھے تو آج کریلے نہ بناتیں ہم وہی کھالیتے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی فریج کا جائزہ لینے لگی' مگر خالہ کے کان بہت تیز تھے۔

"اللہ بخشے میرے سسر مرحوم کو' وہ کہا کرتے تھے' جس گھر میں روز چولہا جلے' وہی گھر بستا ہے۔"

"سوئی گیس کے محکمے میں تو نہیں تھے آپ کے سسر؟"

"کیا کہا؟"

"کچھ نہیں امی! آپ یہ بتائیں۔ کوئی سوئٹ ڈش رکھی ہے؟"

نگین کی پہلی سمجھ داری کی بات پہ ہانی نے حیرت سے اسے دیکھا تو وہ ذرا سی شرما گئی۔

"وہ زونیلا بریانی کے ساتھ کھیر بھی لے کر گئی تھی نا۔" سرگوشی میں بتایا۔ ادھر خالہ شروع ہوچکی تھیں۔

"سوئٹ ڈش کہاں سے آتی؟ صبح سے چینی ختم ہے۔ اللہ بخشے میرے سسر مرحوم کو' وہ کہا کرتے تھے' جس گھر میں چینی نہ ہو' وہ گھر۔۔۔"

اور وہ نگین کو ہاتھ سے پکڑ کر باہر کھینچ لائی۔

"چینی ختم ہے نا' بس ہم اس سے چینی مانگنے جاتے ہیں۔"

"ہائے اللہ ہم کوئی مانگنے والیاں ہیں۔"

"اوہو' چینی مانگنے سے کیا ہوتا ہے؟" وہ اسے زبردستی لاؤنج تک اپنے ساتھ لائی' پھر پلٹ کر دیکھا۔

وہاں ایک کونے میں صوفے کے اوپر نیچے' دائیں بائیں ہر طرف کتابوں کے ڈھیر لگے تھے۔ ایک چوڑی سی انسائیکلوپیڈیا ٹائپ کی کتاب کھلی کھڑی تھی' دو ہاتھوں نے اسے تھام رکھا تھا۔ تھامنے والے کا چہرہ کتاب کے پیچھے چھپا تھا۔

"سنی! اگر خالہ ہمارا پوچھیں تو کہنا کہ ہانی اور نگین کتے والے سے۔۔۔ سوری' سامنے والوں سے چینی مانگنے گئی ہیں۔"

اس نے کھلی کتاب کو آواز لگائی۔ کتاب ذرا نیچے ہوئی اور پیچھے چھپا اوپر نکلا۔

تیرہ سالہ سنی' جس کی ہیری پوٹر والی گول عینک ناک پہ پھسل رہی تھی۔

"چینی؟" اس نے انگلی سے ناک پہ گرتی عینک پیچھے کی۔ "کیا آپ جانتی ہیں کہ چینی گنے کے رس سے بنتی ہے اور اس کی کمی سے دماغ کے سیل مرنے لگتے ہیں۔"

"اوہو!" وہ تنک کر واپس پلٹی۔

ایک سے ایک نمونہ پڑا تھا خالہ کے گھر۔ لاہور سے ادھر آرہی تھی تو سہیلیاں کہہ رہی تھیں کہ خالہ کے کسی ہینڈسم بیٹے سے منگنی کروا کر آنا۔ اب ان کو کیا بتاؤں گی کہ خالہ کے بچے' وہی اچھے' اور اتنے اچھے کہ اپنے کسی کام کے نہیں رہے۔ خالو بھی خالہ کے سسر کی طرح مرحوم ہوچکے تھے اور پیچھے عجب تکون چھوڑ گئے تھے۔

اس نے "کتے والے" کی بیل بجائی' پھر ایک ہاتھ سے کھلے بال سنوارے۔ دوسرے ہاتھ نے ابھی تک نگین کا ہاتھ دبوچا ہوا تھا' جو بے حد ڈری سہمی گھبرائی گھبرائی سی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"تم کیوں پریشان ہو؟"

"ہانی۔۔۔ اگر اس نے ہمیں ڈانٹ دیا تو؟"

"تو ہم فوراً" سے گر کر فوت ہوجائیں گے' ٹھیک ہے؟ ڈوب مرو نگین! بندہ ہی ہے' کتا تو نہیں کہ کھا جائے گا اور۔۔۔"

اسی پل کتے کے زور سے بھونکنے کی آواز آئی۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹی۔

"شش! رومیو! بی کوائٹ۔" کوئی برآمدے کے دروازے سے نکلتے ہوئے کتے کو نرمی سے ڈانٹ رہا تھا۔

بھونکنے کی آواز فوراً" رک گئی۔

"واہ۔۔۔ کتا تو بڑا رومانٹک رکھا ہے جناب نے۔ رومیو۔" اس نے بے ساختہ سراہا۔

قدموں کی آواز قریب آئی اور گیٹ کا ہک ہٹا۔ پھر دروازہ اندر کو کھلا۔

"فرمایئے۔" وہ اکھڑے اکھڑے تیور لیے سامنے ہوا۔

نگین اس کی کہنی پکڑے بالکل اس کے پیچھے جا چھپی۔

"السلام علیکم۔ ہم سامنے والے گھر میں رہتے ہیں۔"

"پھر؟"

"وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔ آپ شاید نئے آئے ہیں۔۔۔ آپ۔۔۔؟" ہانی نے رک کر سوالیہ ابرو اٹھائی۔

"میں فرہاد ہوں!"

"اور میں شیریں۔" بے ساختہ لبوں سے پھسلا۔

"جی؟"

"وہ۔۔۔ شیرہ بنانا ہے' چینی چاہیے تھی۔" وہ ہڑبڑا کر سنبھلی۔

"شیرہ چینی سے بنتا ہے یا گڑ سے؟" نگین نے پیچھے سے سرگوشی کی۔ اس نے چہرے پہ مسکراہٹ سجائے زور سے اپنا جوتا نگین کے پاؤں پہ رکھا۔ جواباً" وہ دبی سی سسکی۔

"سوری' میرے پاس چینی نہیں ہے۔" خشک لہجے میں کہتا گیٹ بند کرنے لگا۔

"مگر کیوں؟ لگتے تو آپ خاصے ویل آف ہیں۔"

"محترمہ! میں میٹھا نہیں کھاتا۔"

"تو چائے میں کیا ڈالتے ہیں؟"

"کینڈرل!" وہ دانت پیس کر ضبط سے بولا "سامنے کونے پہ اسٹور ہے' وہاں سے چینی مل جائے گی۔ اور ساتھ میں اخلاقیات کی کوئی کتاب بھی۔" اور کھٹ سے دروازہ بند کردیا۔ پھر زور سے کنڈی چڑھائی۔

کتا پھر سے بھونکنے لگا۔

"واہ۔۔۔ خود فرہاد ہیں' کتا رومیو ہے' مگر رومانس ذرا چھو کر نہیں گزرا۔ جہنم میں جائیں میری طرف سے" وہ خفت چھپانے کو زور زور سے بڑبڑاتی واپس پلٹی۔

"میں تمہیں بتانے ہی لگی تھی ہانی! مگر تم نے نہیں سنا۔"

"کیا؟" نگین کی شرمندہ آواز۔ وہ چونکی۔

"یہی کہ جب زرنیلا بریانی لے کر گئی تھی تو کمیل نے بھی یہی کہا تھا۔" نگین نے بے بسی سے سر جھکا دیا۔

وہ پیر پٹخ کر آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

اس نے الماری کا پٹ کھولا۔ سامنے ہی ایک استری شدہ نیا ریڈی میڈ جوڑا لٹکا ہوا تھا۔ جدید تراش خراش کا خوبصورت جوڑا۔

ہانی نے حیرت سے پلٹ کر نگین کو دیکھا جو چہرے کے سامنے کتاب کیے آرام دہ کرسی پہ جھول رہی تھی۔ اس وقت اس نے سستی سی لان کا پینڈو سا جوڑا زیب تن کر رکھا تھا۔

"یہ جوڑا کس کا ہے؟"

"میرا۔" بنا سر اٹھائے جواب ملا۔

"کون لایا تھا؟" اسے یقین نہ تھا کہ نگین کی پسند اتنی زبردست ہوسکتی ہے۔

"امی نے"

"تو پہنتی کیوں نہیں ہو؟"

"خالہ رشیدہ نے بتایا تھا کہ اس پہ سایہ ہے۔"

"کیا؟" اس نے گھبرا کر الماری بند کی اور دونوں ہاتھ جھاڑے 'پھر ایک دم ٹھٹک کر پلٹی "یہ خالہ رشیدہ کون ہیں؟"

"پتا نہیں!" کتاب پہ سر جھکائے نگین نے شانے اچکائے۔

"تو تمہیں کہاں ملیں؟"

"خواب میں۔ میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھی خاتون میرے پاس آئیں اور انہوں نے بتایا کہ ان کا نام خالہ رشیدہ ہے اور یہ کہ ان سارے کپڑوں پہ سایہ ہے۔ سو ان کو میں نہ پہنا کروں۔ اس لیے میں نہیں پہنتی۔"

"بالکل بدھو ہو تم!" وہ جارحانہ انداز میں الماری کی طرف بڑھی 'پھر رک گئی "کیا پتا واقعی ان پہ سایہ ہو! ورنہ خالہ رشیدہ کو کیا شوق تھا نگین کے خواب میں آنے کا؟"

وہ آہستہ سے الماری سے پرے کھسک آئی۔

"سنو نگین!" چند لمحے بعد اس نے اسے پکارا۔ "تمہارے پڑوسی کے پاس چلتے ہیں۔"

"پھر... اب کیا بہانہ کریں گے؟"

"تمہاری اس رنگیلا نے اگلا بہانہ کیا کیا تھا؟"

"زرنیلا۔" نگین نے برا مان کر اسے دیکھا۔

"جو بھی ہے۔ ابھی تو مجھے بس فرہاد کا نام یاد ہے۔"

وہ چت بیڈ پہ گر گئی۔ "بڑا شاندار بندہ ہے۔ اس کے ساتھ یہ چھٹیاں بہت اچھی گزریں گی۔" "سنو!" وہ پر جوش سی ہو کر اٹھی۔ "تمہیں اس کے ساتھ سیٹ نہ کرادوں۔"

"توبہ کرو ہانی! کیسی باتیں کرتی ہو۔ وہ اکیلا بندہ 'پتا نہیں کون ہے۔ اور تم!" سرخ پڑتے چہرے کے آگے اس نے کتاب کرلی۔

"اکیلا!" ہانی نے جیسے کچھ سمجھ کر سرہلایا۔ "وہ اکیلا کیوں رہتا ہے۔"

لپک کر کھڑکی کی طرف آئی۔ پردہ ہٹایا تو سامنے اس کا ٹیرس دکھائی دے رہا تھا۔ اس کو اپنے شکوک صحیح ہوتے نظر آرہے تھے۔

"ایک اکیلے بندے کو اتنا بڑا گھر کرائے پہ لینے کی کیا ضرورت تھی؟ صرف ایک پورشن کیوں نہیں لیا اس نے؟" وہ آنکھیں سکیڑے اس کے ٹیرس کو دیکھ رہی تھی۔ "مجھے کیوں گمان ہو رہا ہے نگین! کہ ضرور کوئی بات ہے 'ورنہ اتنا بڑا گھر لے کر کیوں رہتا؟ اس نے اس دن ہمیں چینی بھی نہیں دی کہ کہیں ہم اس کے گھر کے اندر نہ آجائیں۔ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ تم سن رہی ہو یا نہیں؟"

"ہاں ہاں!" نگین نے گھبرا کر کتاب سے سر اٹھایا۔

"تم کہہ رہی ہو کہ اس کی چینی میں گڑبڑ ہے۔"

"نہیں گڑبڑ تمہارے دماغ میں ہے۔ اچھا چلو 'آج سنی کے پاس ہونے کی خوشی میں جو خالہ نے کھیر بنائی ہے 'وہ اسے دے کر آتے ہیں۔"

"مگر اماں نے تو اس لیے بنائی ہے کہ دودھ بچا پڑا تھا اور....."

"اسے کیا پتا کس لیے بنائی ہے 'بس چلو۔" وہ تیزی سے بالوں میں برش کر رہی تھی۔ سنگھار میز کے آئینے میں اس کا عکس نمایاں تھا۔ کھلتے ہوئے گلابی رنگ کی چوڑی دار آستینوں والا لمبا فراک 'اور پاجامہ پہنے 'سلکی بال 'آنکھوں میں کاجل لگائے 'وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اپنی تیاری سے مطمئن ہو کر پلٹی تو نگین ادھر نہیں تھی۔

"یہ کدھر گئی۔" وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو لاؤنج میں وہ عین ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی۔ بنا نگاہیں جھپکے 'وہ اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ ہانی نے گھڑی دیکھی۔ آٹھ بج گئے تھے۔ اب نگین سے کچھ کہنا بے کار تھا۔

کونے میں کتابوں کے ڈھیر میں سنی کا سر دکھائی دے رہا تھا۔ اسے یکدم ایک خیال آیا۔

"سنی! تم کتنے اچھے ہو!" وہ خوش دلی سے کہتی اس کے ساتھ آکر بیٹھ گئی۔

سنی نے سر اونچا کیا 'پھر مشکوک نظروں سے اسے

دیکھتے ہوئے انگلی سے ناک پہ پھسلتی عینک پیچھے کی۔

"سنی! مجھے لگ رہا ہے آج بارش ہوگی 'ہے نا؟"

"ہوں۔ مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے!" اس نے بغور ہانی کی بے تکلف مسکراہٹ کو دیکھا۔ عموماً" وہ ہر وقت جلی بھنی رہتی تھی۔

"مجھے بارشیں بہت پسند ہیں۔" اس نے مزید بے تکلفی بڑھانا چاہی۔

"کیا آپ جانتی ہیں کہ ہر سیکنڈ پورے کرہ ارض پہ جتنی مقدار میں بارش ہوتی ہے 'اتنا ہی پانی ہر سیکنڈ میں زمین پر سے بخارات بن کر اڑ جاتا ہے؟"

وہ پیر پٹخ کر کھڑی ہوئی۔ سارا دوستانہ پن ہوا ہو گیا تھا۔ سوچا تھا کہ اسے فرہاد کے گھر اپنے ساتھ لے جائے گی۔ مگر اس گھر میں کوئی نارمل نہیں تھا۔

"خالہ پوچھیں تو بتا دینا کہ میں ذرا پڑوس میں جا رہی ہوں۔"

سنی نے شانے اچکائے اور پھر سے کتاب چہرے کے سامنے کرلی۔

وہ کچن میں آئی 'فریج سے کھیر نکالی۔ پھر ٹرے میں چھوٹے ڈونگے میں ڈال کر سیٹ کی۔ اوپر پلیٹ رکھی۔ جالی دار کپڑے سے ڈھکا۔ ایک نظر خود کو سلیب کے چمکتے ماربل میں دیکھ کر او کے کیا اور باہر چلی آئی۔

بجلی گئی ہوئی تھی اور گیٹ کھلا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ٹرے تھی۔ سو گیٹ کیسے بجاتی؟ یا پھر متجس فطرت غالب آگئی۔ وہ بنا دستک دیے اندر گھس آئی۔

کتا ٹانگیں پسارے سو رہا تھا۔ اس نے شکر کیا۔ برآمدے سے اندر کھلنے والا کھڑکی کا دروازہ نیم وا تھا۔ وہ آہستہ سے دبے پاؤں برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی جب اندر سے آتی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

"جی جی سر! آپ فکر نہ کریں۔" اور پھر ایک جاندار سا قہقہہ۔ وہ فرہاد ہی تھا۔

ہانی ذرا سی دیوار کی اوٹ میں ہوگئی۔

"مجھ پہ بھروسا رکھیں۔ میں نے کہا نا 'میں بلاسٹ چاند رات کو ہی کروں گا۔ اچھا ہے 'عید والے دن لوگوں کے گھر صف ماتم بچھی ہو تو کتنا مزا آئے۔"

ٹرے اس کے ہاتھوں میں لرز گئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

"جی 'جب تک آپ کا کام نہ ہو جائے میں ادھر پاکستان میں ہی رہوں گا 'جیسے ہی کام ہوگا.... میں واپس آجاؤں گا۔"

آواز خاموش ہوگئی۔ شاید اس نے فون بند کر دیا تھا۔

وہ الٹے قدموں باہر کو بھاگی۔ گیٹ کھلا ہی رہ گیا بند کرنے کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ بس ایک خیال حواسوں پہ چھا گیا تھا۔

دہشت گرد! یقین ہو گیا تھا۔ وہ شخص دہشت گرد تھا۔ تب ہی وہ کہے کہ اکیلا کیوں رہ رہا ہے۔ نہ اس نے اسے آفس وغیرہ جاتے دیکھا اور نہ کسی کو اس کے پاس آتے دیکھا۔ آخر بات وہی نکلی 'اسے بم بلاسٹ کرنا تھا۔

کیوں؟ آخر کیوں اس کے گمان سچ نکلتے تھے؟

اس نے ٹرے سلیب پہ پٹخی اور حواس باختہ سی لاؤنج میں آئی۔

نگین اسی طرح ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

"نگین.... نگین! وہ دہشت گرد ہے 'وہ غیر ملکی ایجنٹ ہے 'وہ پاکستان میں دھماکا کرنے آیا ہے 'اس نے چاند رات پہ بلاسٹ کرنا ہے!"

نگین نے حیرت سے گردن اس کی جانب موڑی۔

"کون؟"

"وہی سی فائیو والا۔"

"وہ کتا؟" اس کا منہ کھل گیا۔

"کتا نہیں 'اس کا مالک۔"

"کیا کہہ رہی ہو ہانی؟" نگین کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"سچ کہہ رہی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو!"

"نہیں میں نے اپنے ان گناہگار کانوں سے خود سنا ہے۔ وہ غیر ملکی دہشت گرد ہے' فون پہ اپنے باس سے پلان ڈسکس کر رہا تھا' میں نے سن لیا۔ بس اب جلدی سے پولیس کو فون ملاؤ۔" اس نے تپائی پہ دھرا فون سیٹ اٹھا کر گود میں رکھا۔

"مگر ہانی! اگر پولیس نے تم سے ثبوت مانگا تو؟"

وہ جو زور و شور سے نمبر ڈائل کرنے لگی تھی' ڈھیلی پڑ گئی۔ واقعی' ثبوت تو اس کے پاس نہیں تھا۔

"لیکن۔۔۔ لیکن ہمیں اطلاع تو کرنا چاہیے۔"

"مگر کس بنیاد پہ؟ اگر وہ واقعی ٹیررسٹ ہے تو اس کے سورسز پولیس میں بھی ہوں گے اور پولیس کے پاس ہمارا نمبر آجائے گا۔ پھر۔۔۔"

"پھر کیا کریں' ثبوت کیسے اکٹھے کریں؟" اس نے فون پرے کر دیا۔

"یہ تو مجھے نہیں پتا۔ ایک تو دہشت گردوں والا کوئی ڈرامہ بھی آج کل نہیں آرہا۔" نگین نے مایوسی سے گردن جھکائی' پھر ایک جھٹکے سے اٹھائی "ڈرامہ! اوہ میرا ڈرامہ۔ میں تو بھول ہی گئی۔" اس نے تڑپ کر ٹی وی کو دیکھا۔

مگر اب اسکرین پہ اشتہارات چل رہے تھے۔

"اسے چھوڑو' یہ سوچو کہ اب کیا کرنا ہے۔"

"کیا کریں؟"

دونوں نے چند لمحے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا' پھر اپنے سر' ہاتھوں میں گرا دیے۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

پھر ایک جھٹکے سے دونوں نے سر اٹھایا۔

"سنی!" دونوں ایک ساتھ چیخیں۔

کتابوں کے ڈھیر میں بیٹھے سنی نے فوراً" کتاب چہرے کے اور آگے کر دی۔

"سنی!" آگے پیچھے جست لگا کر دونوں اس کے اطراف میں آبیٹھیں۔

وہ کارپٹ پہ صوفے کے کنارے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کتاب ہنوز' چہرے کے سامنے تھی۔ ان کے پکارنے پہ کتاب ہٹائی۔

"جی؟"

"تم کتنے اچھے ہو سنی!"

"کام بتائیں۔"

"تم۔۔۔ تم۔۔۔ اگر تمہارے پاس کسی مجرم کو گرفتار کروانے کے لیے ثبوت نہ ہوں تو تم کیا کرو گے؟"

"میں اپنے کام سے کام رکھوں گا۔" اس نے پھر سے کتاب چہرے کے سامنے کر لی۔

"سنی! اچھے بھائی نہیں ہو؟ دیکھو اگر وہ مجرم کسی کی جان کے درپے ہو تو بھی تم کچھ نہیں کرو گے؟"

سنی نے کتاب بند کر کے میز پہ رکھی' پھر انگلی ٹھوڑی پہ رکھے اوپر دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔

"ہاں' تب میں اسے گرفتار کرواؤں گا۔"

"مگر کیسے؟ یاد رکھو تمہارے پاس اس کے خلاف ثبوت نہیں ہیں!"

"میں اس کی جاسوسی کر کے ثبوت اکٹھے کروں گا۔"

ہانی اور نگین نے ایک لمحے کو ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر سنی کو۔

"اور۔۔۔ اور یہ جاسوسی کیا ہوتی ہے؟"

"جاسوسی؟" اس نے ناک پہ پھسلتی عینک پیچھے کی۔ "کیا آپ جانتی ہیں کہ جاسوسی اعصاب کا کھیل ہے۔ یہ صرف مضبوط اعصاب سے ہی کھیلا جا سکتا ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے طارق اسماعیل ساگر کی کتب ملاحظہ فرمائیں۔"

"کوئی کتاب پڑھ کر جاسوس نہیں بن سکتا سنی! ہمیں ایک ٹیچر چاہیے۔" سنی نے مسکرا کر پھر عینک پیچھے کی۔

"مجھ سے اچھا ٹیچر آپ کو نہیں مل سکتا!" اب وہ ڈھیر میں ہاتھ ڈالے کوئی کتاب نکال رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"جاسوسی کا پہلا اسٹیپ۔۔۔ ٹارگٹ کی روٹین کا جائزہ!"

سنی کاؤچ پہ بیٹھا' پاؤں میز پہ رکھے' کتاب سے پڑھ

پڑھ کربول رہاتھا۔

وہ دونوں کھڑکی کے سامنے جڑی بیٹھی تھیں۔ سنی نے کہیں سے ایک دوربین نکال کران کو دے دی تھی اوراب اسے آنکھوں سے لگائے ہانی "ٹارگٹ" کی ہر حرکت بتارہی تھی جو کہ ساتھ بیٹھی نگین تیزی سے نوٹ بک پہ لکھے جارہی تھی۔

"لکھو' صبح سات بجے وہ کتے کو لے کرواک پہ نکلا۔ آٹھ بجے واپس آیا۔ پھراس نے لان میں بیٹھ کرچائے پی۔"

"اس کا کتا چائے بھی پیتا ہے؟" نگین نے بے یقینی سے سراٹھایا' جواباً ہانی نے زور سے اسے کہنی ماری۔

"لکھو' ٹارگٹ نے چائے پی۔ اب وہ اخبار پڑھ رہاہے۔"

نگین تیزی سے لکھ رہی تھی۔

"اب وہ کسی کو فون ملا رہاہے۔ ایک تواس دوربین سے آواز کیوں نہیں آتی۔"

"یہ بھی لکھوں؟" نگین نے رک کرپوچھا۔

ہانی نے اسے مارنے کے لیے کشن اٹھایا اور وہ دونوں ہاتھ سرپہ رکھے نیچے ہوئی۔

پہلے تین دنوں میں انہوں نے اس کی روٹین اچھی طرح سمجھ لی۔

وہ صبح واک کے لیے گھر سے نکلتا' یا پھر رات کو سات آٹھ بجے کے قریب۔ پھر رمضان شروع ہوگئے مگر اس کی روٹین برقرار رہی اوراب بھی وہ رات آٹھ بجے خوب تیار ہوکر گاڑی پہ نکل جاتا۔ پھررات گیارہ کے قریب ٹیرس پہ موبائل کان سے لگائے ہنس ہنس کر باتیں کرتا دکھائی دیتا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک وہ سونے چلاجاتا اور وہ دوربین رکھ دیتیں۔

☼ ☼ ☼

"جاسوسی کا دوسرا اسٹیپ۔۔۔ ٹارگٹ کے جاننے والوں سے اس کے متعلق معلومات اکٹھی کرنا۔"

سنی کے پڑھائے گئے اسباق ان کے ذہنوں میں مسلسل گھوم رہے تھے۔

وہ جمائیاں روکتی' بے زار سی کالونی کے سرے پہ بینچ پہ بیٹھی تھی۔ نگین قلم اورنوٹ بک تھامے مستعدی سے کھڑی تھی۔

"کب آئے گا آخر اس کا اخبار والا؟" ہانی نے کوفت سے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ اسے گھڑی باندھنے کی قطعاً" عادت نہیں تھی مگر جیمز بانڈ کو فلموں میں اور پوئرا اور ہومز کو کتابوں میں گھڑی پہنے ہمیشہ دیکھا تھا اور فی الحال وہ خود کو ان سے کم نہیں سمجھ رہی تھی۔

"اخبار والا آئے گا تو ہم کیا کریں گے ہانی؟"

"بدھو! یاد نہیں ہے سنی نے کیا کہا تھا؟ پہلے اس کی تعریف کرکے اسے متاثر کریں گے۔ پھراس سے ٹارگٹ کے متعلق پوچھیں گے۔"

"کیا پوچھیں گے؟"

"شش۔۔۔ وہ آرہاہے!" اس نے جلدی سے نگین کا ہاتھ دبایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اخبار والا سائیکل دوڑاتا سامنے سے آرہاتھا۔ فرہاد کے گھر کے باہر اس نے سائیکل روکی' رول کیا ہوا اخبار اندر اچھالا اور پھر اسی مگن انداز میں سائیکل آگے بڑھا دی۔

وہ دونوں چل کر اس کے سامنے آگئیں۔

اخبار والے نے سائیکل آہستہ کردی۔

"بات سننا بھائی۔"

"جی؟" اس نے سائیکل ان کے قریب روکی۔

"السلام علیکم!" ہانی نے تمیز سے سلام کیا' تب ہی نگین نے کہنی ماری۔ اس نے پلٹ کر نگین کو دیکھا۔ "کیا ہے۔"

"تعریف کرونا اس کی۔" پرجوش سی سرگوشی کی۔

"اب اس زکوٹا جن کی میں کیا تعریف کروں؟" اس نے نگین کو گھورا' پھر چہرہ اخبار والے کی جانب موڑا۔

"بھائی! آپ کے پاس ڈیلی ٹائمز ہوگا؟"

نگین نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ایک آخری تھا' وہ ابھی سی فائیو میں پھینک دیا ہے۔"

"آپ کے پاس اور نہیں ہوگا؟"

"ہانی۔۔۔!" نگین نے پریشانی سے الجھ کر اس کا بازو تھامنا چاہا' مگراس نے اسے "شش" کہہ کر روکا۔

"نہیں۔۔۔ اور نہیں ہے۔" نفی میں سرہلاتے اخبار والے نے اخباروں کے بنڈل میں ہاتھ مارا تھا۔

"اوہو۔۔۔ مجھے تو بہت ضروری چاہیے تھا۔ میرا بی اے کا رزلٹ آؤٹ ہوا ہے کل۔ آپ مجھے سی فائیو والے سے اخبار صرف دو منٹ کے لیے لادیں نا۔"

نگین ہونقوں کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

"مگر بی بی۔۔۔"

"پلیز بھائی لادیں' دیکھیں میں اتنی دیر سے آپ کو یہ ہی کہنے کھڑی تھی ادھر" اب نگین سے ضبط نہ ہوسکا۔ "نہیں نہیں ہانی! تم یہ کہنے تو نہیں آئی تھیں۔ تم بھول گئی ہو؟ تمہارا بی اے تو پچھلے سال ہی کلیئر ہوگیا تھا۔ ہم تو اس لیے یہاں کھڑے تھے کیونکہ ہم نے اخبار والے سے اس بندے کے متعلق انفارمیشن لینا تھی۔"

اس نے بوکھلا کر نگین کے منہ پہ ہاتھ رکھا' مگر اخبار والا مشکوک نگاہوں سے انہیں گھور رہاتھا۔

"کس کی جاسوسی کررہی ہو آپ بی بی!"

"جاسوسی؟" نگین کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑی۔ "اسے کیسے پتا چلا؟"

"کک۔۔۔ کچھ نہیں۔ تم تم جاؤ۔" اور وہ کہنے کے ساتھ ہی نگین کا ہاتھ کھینچتی واپس لے آئی۔

☼ ☼ ☼

"جاسوسی کا تیسرا اسٹیپ۔۔۔ ٹارگٹ کے نہ جاننے والوں سے اس کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنا۔"

سنی کمرے میں ٹہلتا' کتاب پہ نگاہیں جمائے ہاتھ ہلا ہلا کر کہہ رہاتھا۔

"اب یہ نہ جاننے والے کون ہوتے ہیں؟"

سی فور کے گیٹ کے سامنے کھڑے ہوئے ہانی نے جھلا کر پوچھا تھا۔ جواباً" نگین نے فوراً" نوٹ بک کے صفحے پیچھے پلٹے۔

"ہاں' سنو' سنی نے کہا تھا' یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو آپ جانتے ہوں اور جو ٹارگٹ کو بھی جانتے ہوں مگر ٹارگٹ ان کو نہ جانتا ہو۔"

"دیکھتے ہیں۔" ہانی نے گہری سانس لیتے ہوئے بیل پہ ہاتھ رکھا۔ یہ سی فور تھا۔ فرہاد کے ہمسایوں کا گھر۔

چند ہی لمحے بعد گیٹ کھلا۔ ایک خاتون نے سر باہر نکالا۔ سر سے پیر تک ان کو دیکھا' ناک چڑھائی۔

"کیا ہے؟" انداز روکھا تھا۔

"ہم سامنے والے گھر سے آئے ہیں' کچھ کام تھا آپ سے۔" ہانی نے مسکرا کر خوش دلی سے تعارف کروایا۔

"بولو!"

"وہ آنٹی! بات یہ ہے کہ۔۔۔ ویسے ادب میں آنٹی کہہ رہی ہوں۔۔۔ ورنہ کہنا تو نہیں چاہیے' کیونکہ آپ ماشاء اللہ اتنی ینگ ہیں۔"

"واقعی ہانی! آنٹی تو نہ کہو۔ چھوٹی نانی جتنی تو ہوں گی۔" نگین نے آہستہ سے کہا تھا مگر آنٹی کے تاثرات بگڑے۔

"جی بالکل' ہماری چھوٹی نانی ٹوئنٹی ایرز کی ہیں۔ نانا ابا کی دوسری وائف ہیں نا' سو اس لیے نانی کہتے ہیں ورنہ ماشاء اللہ آپ کی طرح ہی ینگ اور اسمارٹ ہیں۔"

اس نے نگین کو گھور کر' مسکراتے ہوئے بات سنبھالی۔

آنٹی کے تاثرات ذرا نرم پڑے۔ ذرا تفاخر سے انہوں نے شانے اچکائے۔ "ظاہر ہے' اصلی عمر ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔ خیر بتاؤ' کیا کام تھا؟"

"وہ آنٹی' بلکہ باجی کہنا مناسب ہوگا۔" اب کے وہ سنی کی نصیحتوں پہ پوری طرح عمل کررہی تھی "بات یہ ہے کہ ہر طرف لان کی سیل لگی ہوئی ہیں' رمضان بھی شروع ہوچکا ہے' اب میری کزن تو ذرا پھوہڑ ہے اوراس کا ٹیسٹ بھی اتنا اچھا نہیں مگر اتنے دن سے میں آپ کو دیکھ رہی ہوں۔ آپ کے کپڑوں کے کلرز اور پرنٹس اتنے زبردست ہوتے ہیں کہ میں متاثر ہوئے

بنا نہیں رہ سکی۔"

نگین کا منہ آدھا کھل گیا۔

"اب آپ خود ہی دیکھ لیں باجی کہ میرا اور میری کزن کا جوڑا کتنا عام اور پھیکا سا ہے، دوسری طرف آپ کا یہ جوڑا تین ہزار سے کم کا نہیں لگ رہا۔"

نگین کے ماتھے پہ تیوریاں پڑ رہی تھیں مگر وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔

"تو باجی! میں آپ سے یہی کہنے آئی تھی کہ اگر ڈریس سلیکشن میں آپ میری مدد کریں اور میرے ساتھ شاپنگ پہ چلیں تو۔۔۔"

"کون سی شاپنگ؟ کہاں کی شاپنگ؟" نگین کمر پہ ہاتھ رکھے چلائی تھی "تم نے مجھے تو کہا تھا کہ سی فور کی بڈھی گھوڑی لال لگام کی جھوٹی تعریفیں کریں گے تو خوش ہو کر ساتھ والے کے بارے میں ہمیں ساری معلومات دے دے گی، مگر تم نے اکیلے اکیلے شاپنگ بھی پلان کر لی اور مجھے بتایا تک نہیں!"

"نن۔۔ نگین!" اس نے بوکھلا کر آنٹی کو دیکھا جواب قہر برساتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"میں نے شاپنگ کا تمہیں بتایا تو۔"

مگر بات سنبھالنے سے قبل ہی آنٹی نے کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔

"تم واقعی میرے بغیر شاپنگ پہ چلی جاتیں کیونکہ میں پھوہڑ ہوں؟" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"ٹھہرو! میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تم کیا ہو۔ آج تم میرے ہاتھوں نہیں بچو گی۔" وہ جارحانہ انداز میں آگے بڑھی اور نگین ڈر کر گھر کی طرف بھاگی۔

☼ ☼ ☼

"جاسوسی کا چوتھا اسٹیپ۔ ٹارگٹ کے بارے میں ڈاکومنٹ انفارمیشن اکٹھی کرنا۔"

افطاری کے بعد وہ تینوں نگین کے کمرے میں موجود تھے۔

سنی ہاتھ میں چپس کا کھلا پیکٹ پکڑے، چپس نکال نکال کر کھا رہا تھا۔ گود میں بڑی سی کتاب کھلی رکھی تھی۔ نگین ساتھ بیٹھی اپنے دوپٹے کے پلو سے چشمہ صاف کر رہی تھی جبکہ وہ دوربین لگائے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ سنی کی بات پہ مایوسی سے اس نے دوربین رکھی۔

"ڈاکومنٹ انفارمیشن کہاں سے اکٹھی کریں؟ میرے باپ دادا کا کبھی نادرا سے تعلق نہیں رہا۔"

"توبہ، ان کا کیوں کسی نادرا وادرا سے تعلق ہوتا؟" نگین برا مان گئی۔

"تم تو چپ ہی رہو۔" وہ صبح سے اس پہ جلی بھنی بیٹھی تھی۔ ہر دفعہ نگین کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور کرتی تھی۔

"میں تو بتانے لگی تھی کہ عظمیٰ نے مکار ڈاکو کے بارے میں کیسے انفارمیشن اکٹھی کی تھی، مگر ٹھیک ہے، نہیں بولتی۔"

"کون عظمیٰ، اور کیا کیا اس نے؟" وہ الرٹ ہوئی۔

"دھواں ڈرامے والی عظمیٰ۔ جب اظہر نے اسے مسکار کی بیوی کو فون کرنے کو کہا تھا اور پھر انہوں نے باآسانی مسکار کو ٹریس کر لیا تھا۔"

"ارے ہاں، یاد آگیا۔ فون لاؤ۔"

"مگر نمبر آجائے گا۔"

"ارے میری سم سے کرو، اس سے کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے جھٹ اپنا موبائل تکیے سے اٹھایا اور نمبر ڈائل کیا۔

"ریکارڈ بھی کرونا۔"

"کرتی ہوں۔" اس نے ریکارڈنگ آن کر کے فون کان سے لگایا۔ گھنٹی جا رہی تھی۔ نگین اور سنی آگے ہو کر اس کو دیکھ رہے تھے۔

"ہیلو!" چھٹی گھنٹی پہ فون اٹھا لیا گیا۔

"السلام علیکم۔ میں سرف بنانے والی کمپنی سے بات کر رہی ہوں۔ ہم اپنے پروڈکٹ کے بارے میں عوام کا فیڈ بیک جاننا چاہ رہے تھے۔ آپ بتایئے۔ آپ نے ہمارے سرف کو کیسا پایا۔"

"میں دھوبی نہیں ہوں۔ کپڑے لانڈری سے دھلواتا ہوں۔" وہ بےزاری سے بولا تھا۔

"تو آپ ہمیں اس لانڈری کا نام ہی بتا۔۔۔"

دوسری طرف سے کھٹ سے فون رکھ دیا گیا۔

"پتا نہیں کس شیریں کا فرہاد ہے یہ!" وہ فون کو گھور کر رہ گئی۔ "خیر، اس کی آواز ہمارے پاس آگئی ہے۔ اب آگے کیا کرنا ہے؟"

"کیا کرنا ہے؟" سنی کے پیکٹ سے چپس نکالتی نگین نے غائب دماغی سے دہرایا۔

"بھئی عظمیٰ نے آگے کیا کیا تھا؟"

"وہ۔۔ اظہر نے ریکارڈنگ ایس ایچ او کو سنوائی تھی اور ایس ایچ او مسکار کی بیوی کی آواز پہچان گیا تھا۔"

"مگر ہماری کہانی میں نہ اظہر ہے، نہ ایس ایچ او۔"

"یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں!"

"کاش تم کبھی سوچتے بھی لگو نگین!" اس نے بےزاری سے فون واپس پھینکا۔ "اتنا وقت برباد کر دیا اور حاصل کچھ بھی نہیں۔"

"ویسے اس کے مالک مکان کے پاس اس کے ڈاکومنٹس تو ہوں گے۔" چند لمحوں بعد وہ سوچ کر بولی۔

"لیکن مالک مکان کا نمبر تو ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"مگر اس شیریں کے میاں کے پاس تو ہوگا نا! میرے پاس ایک آئیڈیا ہے، چھوٹو! چھوٹو!" وہ اونچا اونچا چھوٹو کو پکارتی اپنا موبائل تلاش کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

دوربین آنکھوں سے لگائے، وہ موبائل کان پہ رکھے بیٹھی تھی۔ نگین نے اپنا کان اس کے کان سے لگے موبائل سے جوڑ رکھا تھا۔

"اب چھوٹو اس کے سامنے کھڑا ہے۔" وہ دوربین سے دیکھتی مدھم آواز میں کہہ رہی تھی۔

سامنے والے لان میں وہ کرسی پر ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ چھوٹو اس کے سامنے تھر تھر کانپتا کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟"

ہانی کے کان سے لگے موبائل سے فرہاد کی آواز بخوبی سنائی دے رہی تھی۔ اس کی کال نگین کے موبائل سے ملی ہوئی تھی، جو چھوٹو کی جیب میں چھپا تھا۔

"وہ جی، مجھے میرے صاحب نے بھیجا ہے۔ ہم آپ سے پہلے اس گھر میں رہتے تھے۔ ہمارا کچھ سامان ادھر رہ گیا تھا، جس کے لیے ہمیں مالک مکان سے رابطہ کرنا ہے۔ صاب سے ان کا نمبر کھو گیا ہے۔ اگر آپ کے پاس ہے تو دے دیں۔"

چھوٹو نے رٹو توتے کی طرح ہانی کا یاد کرایا بیان دہرا دیا۔

ہانی نے فاتحانہ مسکراہٹ سے نگین کو دیکھا، اور پھر سامنے نظر آتے منظر کو۔

"اچھا!" فرہاد نے آنکھیں سکوڑ کر چھوٹو کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"نام؟" چھوٹو کے رہے سہے اوسان جانے لگے۔ نام کا بتانا تو اسکرپٹ کا حصہ ہی نہیں تھا۔

"کیوں؟ تمہیں اپنا نام نہیں آتا؟"

"وہ جی، باجی نے کہا تھا کہ کتے والا جو بھی فضول سوال پوچھے، جواب نہیں دینا۔" ہانی نے بےاختیار سر پہ ہاتھ مارا۔

فرہاد کے لبوں کو ایک جاندار مسکراہٹ چھو گئی۔

"تمہاری باجی نے اور کیا کیا کہا تھا؟"

"وہ جی۔۔۔" چھوٹو ذرا شرما گیا۔ "انہوں نے کہا تھا کہ اگر میں یہ کام کر دوں تو جس کڑی سے چاہوں، وہ اس سے میرا ویاہ کرا دیں گی۔"

"تمہاری باجی نے کوئی میرج بیورو تو نہیں کھولا ہوا؟"

"نہ جی، وہ کیوں میرج کھولیں گی؟ بہت پڑھی لکھی ہیں وہ، لاہور سے آئی ہیں۔"

"چغد، ذلیل۔۔۔ اب نام ہی نہ بتا دے۔" وہ دوربین آنکھوں سے لگائے غصے میں کھول رہی تھی۔

"تو جا کر اپنی پڑھی لکھی باجی سے کہو کہ کتے والا پوچھ رہا ہے، میرے شفٹ ہونے سے ہفتہ پہلے تو اس گھر کی تعمیر مکمل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے تو یہاں خالی

پلاٹ تھا۔ آپ کیا اس میں جھگی لگا کر رہتی تھیں؟"
"ج۔۔۔ جی" اس کے سخت ہوتے تیوروں پہ چھوٹو الٹے قدموں واپس بھاگا۔ رومیو زور زور سے بھونکنے لگا۔
گرتا پڑتا چھوٹو باہر آیا تھا۔
"آئے ذرا اسے۔ میں ویاہ کراتی ہوں اس کا۔" ہانی نے دوربین ایک طرف رکھی اور آستینیں موڑلیں۔ اب اس کا سارا غصہ چھوٹو پہ نکلنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"جاسوسی کا پانچواں اسٹیپ۔۔۔"
وہ دونوں اداسی سے کھڑکی سے لگی نیچے فرہاد کے گیٹ کو دیکھ رہی تھیں جہاں وہ واک کے لیے نکل رہا تھا' جب سنی پیچھے سے آکر بولا۔
"کیا؟" ان دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔
"ٹارگٹ کا تعاقب! ٹارگٹ جہاں بھی جائے اس کا پیچھا کیا جائے گا۔"
ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا' اور پھر اگلے ہی پل باہر کو بھاگیں۔
"مگر۔" کچھ کہتا سنی ہڑبڑا کر سائیڈ پہ ہوا۔ وہ دونوں دوڑ کر باہر نکلیں اور اب تیزی سے آگے پیچھے سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔
"مگر۔۔۔ مگر خاصے فاصلے سے آپا!" سنی نے تاسف سے بات مکمل کی' لیکن وہ عجلت میں سنے بغیر ہی جاچکی تھیں۔
فرہاد ابھی اپنے گیٹ سے چند قدم آگے ہی بڑھا تھا۔ ہاتھ میں کتے کی زنجیر تھی جو کہ دم ہلاتا مزے سے اس کے پیچھے جارہا تھا۔
ہانی گیٹ پہ ایک لمحے کو رکی' پھر دوپٹہ سر پہ لے کر خاصا آگے تک کرلیا۔ نگین نے فوراً" تقلید کی۔
وہ دونوں اب سر جھکائے تیز تیز قدموں سے اس کے بالکل پیچھے چلنے لگی تھیں۔
وہ زنجیر پکڑے اپنے خوبصورت برطانوی لب و لہجے میں انگریزی میں کتے سے باتیں کرتا ان سے چند قدم ہی آگے تھا۔
تھوڑی دور جاکر وہ ایک دم رکا۔ ان دونوں کو بھی بریک لگے۔ لمحے بھر کو ٹھہر کر وہ پیچھے مڑا۔ وہ بھی ہڑبڑا کر پیچھے کو پلٹیں۔
چند ثانیے وہ ان دونوں لڑکیوں کی پشت کو دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر واپس پلٹا۔
وہ پھر سے دوپٹوں کے گھونگھٹ نکالے اس کے پیچھے ہولیں۔
چند قدم آگے فرہاد ایک دم رکا' اور کتے کی زنجیر کھینچتا ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ وہ جو اس کے پیچھے ناک کی سیدھ میں چلی آرہی تھیں' بوکھلا گئیں مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اب چلتی ہی رہتیں۔ سو سر جھکائے آگے بڑھ گئیں یہ وہیں سڑک کے کنارے کھڑا رہ گیا۔
"یہ رک کیوں گیا ہے؟"
"پتا نہیں۔"
"ذرا دیکھو تو کیا کررہا ہے؟"
نگین نے گردن ذرا سی موڑ کر دیکھا' پھر منہ بناتے ہوئے واپس سامنے کو ہوئی۔
"دونوں کتے کھڑے ہم پہ ہنس رہے ہیں۔"
"پھر اب کیا کریں؟ چلتے ہی رہیں؟"
نگین نے شانے اچکادیے۔ ہانی جھنجلا کر تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

☼ ☼ ☼

"سارے اسٹیپ فیل ہوگئے ہیں تمہارے۔ کوئی کام کی بات بتائی ہے تم نے ابھی تک؟"
وہ نیم جان سی کاؤچ پہ گری سنی پہ برس رہی تھی' جو اطمینان سے کتاب چہرے کے سامنے کیے بیٹھا تھا۔
ایک تو صبح کی گرمی' اوپر سے روزے میں واک۔ اب اس آدھے انگریز کا تو پتا نہیں روزہ تھا یا نہیں کہ روز ہی واک پہ نکل کھڑا ہوتا تھا مگر وہ تو بے حال ہورہی تھی۔
"آپا! میں نے کہا بھی تھا کہ فاصلے سے تعاقب کیجیے گا۔"
"خواب میں کہا ہوگا' ہم نے تو نہیں سنا۔ اور کیا فائدہ ہوا تعاقب کرنے کا؟ کون سی معلومات ملیں؟"
"کیا آپ جانتی ہیں کہ تعاقب کے دوران ٹارگٹ جس سے بھی ملے یا جو گفتگو کرے اس شخص سے بھی معلوم مل سکتی ہیں۔"
"آہو' مگر وہ بات کررہا تھا اپنے پیارے کتے سے' اب کیا میں کتے سے اس کی زبان میں بھو بھو شروع کردیتی؟"
"بے شک کتے سے گفتگو میں بھی کلیو مل سکتا تھا۔" سنی بات ماننے کو تیار نہ تھا۔
"جانے بھی دو۔ وہ بول رہا تھا انگریزوں والی پھوں پھاں انگریزی جبکہ مجھے تو انگریزی فلموں کی انگریزی بھی بغیر پڑھے سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کی خاک آنا تھی؟"
وہ تیز پنکھے تلے بے حال سی لیٹی کراہے جارہی تھی۔ صرف اس لیے کہ اس گھنے میسنے کو شک نہ ہو' وہ کالونی کے پورے تین چکر کاٹ کر آئی تھیں۔
"مگر ہانی! شام کو بھی تو وہ کہیں جاتا ہے۔ تب بھی تو اس کا پیچھا کیا جاسکتا ہے۔"
"میں نہیں کررہی کوئی پیچھا وچھا مجھے معاف رکھو!"
اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ نگین گھٹنوں پہ سر رکھے کچھ سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

یہ الگ بات تھی کہ افطاری کے بعد ذرا معدے کو قرار آیا تو وہ سارے دعوے بھول بھال کر پھر سے اس کے تعاقب کے لیے تیار ہوگئی۔
کار انہوں نے کالونی کے سرے پہ روکی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ فرہاد' یہیں سے گزر کر نکلے گا اور واقعی چند ہی منٹ بعد اس کی گاڑی زن سے ان کے برابر سے گزری۔
"چلو!" اس نے فوراً" ایکسیلیٹر پہ دباؤ بڑھادیا۔
آج وہ بہت احتیاط سے اس کا پیچھا کررہی تھیں۔ مگر نگین بہت ڈری ہوئی تھی۔
"ہانی! اگر کسی نے ہمیں پکڑلیا تو؟"
"ڈراؤ تو مت!"
اسے خود بھی ڈر لگ رہا تھا۔ کہاں وہ پورا ایک عادی مجرم' اور کہاں وہ صرف دو عدد تنہا معصوم جوان لڑکیاں۔۔۔ "ہائے اللہ۔۔۔" اسے خود پہ ترس آنے لگا۔ مگر ملک و قوم کے لیے۔
"ہاں نگین! ملک و قوم کے لیے ہمیں یہ کرنا ہوگا۔" اس نے جوش سے اسٹیئرنگ وہیل پہ ہاتھ مارا۔ "یہ بازی عشق کی بازی ہے' یہ بازی۔۔۔"
"تمہیں اس سے عشق ہوگیا ہے؟" نگین کو شاک لگا۔
"ارے اس سے نہیں' ملک و قوم سے ہے۔" اس نے جھنجلا کر موڑ کاٹا۔ فرہاد کی گاڑی سامنے ہی تھی۔
"ارے' یہ ہسپتال کیوں آیا ہے؟" ہسپتال کی پارکنگ میں اسے گاڑی بڑھاتے دیکھ کر وہ دونوں حیران ہوئی تھیں۔
"کیا پتا اس کا وہ باس بیمار ہو۔ یقیناً" کسی غریب کی بددعا لگی ہوگی۔" وہ اب گاڑی سے نکل کر اس کے پیچھے آئی تھیں۔
ریسپشن کے قریب فرہاد جیب سے موبائل نکالتے ہوئے رکا' اور چمکتی اسکرین کو دیکھا۔ پھر چند بٹن دبائے۔ شاید کسی میسج کا جواب دے رہا تھا۔
موقع اچھا تھا' وہ اس سے پہلے ہی اندر آگئیں۔
"اگر اپنے باس سے ملنے آیا ہے تو ریسپشن سے پتہ کرنے ضرور آئے گا۔ آؤ۔" ہانی اس کا ہاتھ تھامے فرنٹ ڈیسک پہ لے آئی۔
اب وہ ریسپشن ڈیسک پہ کہنی رکھے' فرہاد کی سمت پشت کیے منتظر تھی کہ کب وہ آئے۔
نگین سامنے ستون کی اوٹ میں نوٹ بک اور پین لیے تیار کھڑی ہوگئی۔
شیشے کا دروازہ کھول کر وہ اندر آتا دکھائی دیا۔
بے حد پراعتماد اور مغرور انداز میں چلتا وہ سیدھا

ریسپشن ڈیسک کی طرف آیا جہاں ہانی نے اسے آتے دیکھ کر پوری طرح اس کی طرف پشت کرلی تھی۔

ایک تو کمبخت بلا کا ہینڈسم تھا' اوپر سے تھا بھی "دشمن"

"ایکسکیوز می سسٹر!" قریب آکر اس نے اپنے خوبصورت لب ولہجے میں پکارا۔ ایک اتنا ڈیشنگ بندہ آپ کو "سسٹر" کہہ کر بلائے تو آپ کا دل اپنا نہیں تو اس کا سر دیوار میں دے مارنے کو ضرور چاہے گا۔

"جی سر!" ریسپشنسٹ نے خوش دلی سے جواب دیا۔ شکر ہے اسی کو سسٹر کہا تھا۔ وہ بے اختیار اس کی مشکور ہوئی۔

"ڈاکٹر نعمان کہاں ہوں گے؟" وہ اس کے بالکل ساتھ کھڑا پوچھ رہا تھا۔ قیمتی' مسحور کن پرفیوم کی مہک اس کے ہوش اڑائے جارہی تھی۔

"وہ رہے ڈاکٹر نعمان۔"

وہ شکریہ کہہ کر کاریڈور کی طرف مڑ گیا۔ نگین ستون کے پیچھے سے نکلی اور وہ ڈیسک سے ہٹی' دونوں ساتھ ملیں اور پھر ایک ساتھ ہی اس کے پیچھے چل پڑیں۔

دفعتاً" وہ رکا۔ آہٹ محسوس کرکے پلٹا۔

وہ بھی بوکھلا کر واپس مڑیں۔

اس نے آنکھیں سکیڑ کر چند لمحے ان کو دیکھا' پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ تب ہی سامنے سفید اوور آل بازو پہ ڈالے ایک ڈاکٹر آتا نظر آیا۔ فرہاد کو دیکھ کر اس کے لبوں پر ایک جان دار مسکراہٹ ابھری۔

"ارے' یہ عید کا چاند ہوئے فرہاد حسن کب طلوع ہوئے؟؟"

ڈاکٹر نعمان نے گرم جوشی سے سے گلے سے لگایا۔

"پہلی کام کی بات پتا چلی' اس کا پورا نام فرہاد حسن ہے!" نگین ہانی کے ساتھ ان دونوں کی طرف پشت کیے کھڑی جلدی جلدی نوٹ بک پہ قلم گھسیٹنے لگی۔

"بکومت' اور سوری یار! میں پہلے نہیں آسکا' انکل کی طبیعت اب کیسی ہے؟؟"

"لکھو ٹارگٹ نے باس کے لیے "انکل" کا کوڈ ورڈ رکھا ہوا ہے۔" اس نے نگین کے کان میں سرگوشی کی۔

"اب بہتر ہیں آؤ' تمہیں ملواتا ہوں۔ اور تم سناؤ تمہاری پرنسس کیسی ہے؟ ابھی تمہاری قید میں آئی یا نہیں؟"

"قید!" وہ چونکی' نگین کے بھی کام کھڑے ہوئے۔

"قید میں تو بس سمجھو' وہ آہی گئی ہے۔" وہ مبہم سا مسکرایا۔

ہانی کا رواں رواں کانپ اٹھا۔

"سوچ لو' کہیں اس زبردستی پہ زنجیریں تڑوا کر بھاگ نہ جائے۔"

"تو اس نے کسی لڑکی کو زنجیروں سے قید کر رکھا ہے؟" وہ شدید صدمے میں گھری ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"تمہاری زنجیریں بڑی مضبوط ہیں' نہیں بھاگے گی' بے فکر رہو!"

وہ دونوں اب باتیں کرتے دور جارہے تھے۔

ہانی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پلٹ کر ان دونوں کو دیکھا اور پھر نگین کو۔

"یہ لڑکیاں بھی اغوا کرتا ہے۔"

"ہاں' اور ہم بھی لڑکیاں ہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے' اگر اس نے ہمیں دیکھ لیا تو؟"

"بھاگو!" وہ نگین کا ہاتھ کھینچ کر' دھڑکتے دل کے ساتھ اسے باہر لائی۔

✡ ✡ ✡

"بس کچھ دن کے تعاقب کی بات ہے' پھر اسے گرفتار کرواہی لیں گے۔"

ہانی جوش سے کہتی نگین کے ہمراہ گھر میں داخل ہوئی تھی۔ کل "قیدی لڑکی" کا سن کر آج انہوں نے فرہاد کا واک پہ پورا پورا پیچھا کیا تھا۔ گو کوئی کامیابی تو نصیب نہ ہوئی مگر ان کا جوش دیدنی تھا۔

"میرا گمان ہے کہ یہ آج کل میں اس جگہ ضرور جائے گا جہاں اس نے اس معصوم لڑکی کو چھپا رکھا ہے

اور تب ہم۔۔۔"

سامنے کڑے تیور لیے بیٹھی خالہ کو دیکھ کر ہانی کی زبان کو بریک لگے۔

"خخ۔ خالہ!" وہ بمشکل مسکرائی۔

"کہاں سے آئی ہو؟"

"لاہور سے۔ آپ بھول گئیں پیاری خالہ؟" اس نے مسکرا کر آنکھیں جھپکیں مگر خالہ کے تیور اچھے نہ تھے۔

"اللہ بخشے میرے سسر مرحوم کو' وہ کہتے تھے لڑکیوں کو دو سونے کا نوالہ مگر دیکھو عقاب کی نظر سے!"

"ان کے دور میں "شیر" ناپید تھے کیا؟" اسے محاورے کی ٹانگ توڑنے پہ سخت غصہ آیا۔

"بکومت! وہ فرماتے تھے' لڑکیاں اگر یوں لور لور پھریں تو مانو کوئی گڑبڑ ضرور ہے!"

"بالکل درست فرما گئے تھے۔ اور نہیں تو کیا۔" وہ تائیدی انداز میں سر ہلاتی ان کے ساتھ بیٹھنے لگی۔

"خبردار جو مجھے مکھن لگایا۔ وہیں سامنے ہو جاؤ۔"

"خالہ! وہ روہانسی ہوگئی۔ پھر نگین نے ہاتھ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا کہ دم کٹی لومڑی اکیلی کیوں ہو؟

"اب میری بات کان کھول کر سنو۔ صبح میرے پاس فرہاد آیا تھا۔"

"کون فرہاد؟" اس نے معصومیت سے نگین کو دیکھا۔

"ہاں ہاں' اب تمہاری یادداشت جواب دے گئی ہے نا۔" خالہ طنزیہ بولیں۔ "وہ کہہ رہا تھا کہ اس کالونی کی لڑکیاں اخلاق و تہذیب سے بالکل عاری ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہا تھا۔ واقعی اس کالونی کی لڑکیاں بڑی بدتہذیب ہیں۔"

"بجا فرمایا آپ نے' آگے سنیے' وہ یہ بھی بتا رہا تھا کہ اس کالونی کی دو لڑکیاں روز اس کا پیچھا کرتی ہیں۔"

"ہاں تو ہوں گی کوئی دو فضول سی لڑکیاں' ہمیں کیا۔"

"ہمیں یہ ہے ہانی بیٹا کہ حیرت انگیز طور پہ ان دو لڑکیوں کا حلیہ بھی۔ تم دونوں سے بہت ملتا ہے۔"

"دیکھا' میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ آپ کی کالونی کی لڑکیاں میرے سارے اسٹائل اور فیشن کاپی کرتی ہیں۔" وہ ان کے طنز پر اترا کر گردن اکڑاتے ہوئے مسکرائی۔

"جی بیٹا! مگر اتفاق سے ان کے نام بھی ہانی اور نگین ہیں۔"

"واؤ' کتنے اتفاق ہوتے ہیں نا دنیا میں!"

"بکومت!" خالہ کو جلال آہی گیا' اور جب ان کو جلال آتا تھا تو سننے میں آیا تھا کہ قبر میں ان کے سسر مرحوم کی روح بھی کانپ اٹھتی تھی۔

"تم دونوں کیا حرکتیں کرتی پھر رہی ہو؟ جب جی چاہا منہ اٹھا کر پرائے بندے کے پیچھے چل دیں؟ محلے میں ہماری کوئی عزت ہے۔ اگر بات پھیل گئی تو جانتی ہو' کتنی بدنامی ہوگی۔"

"کتنی؟" بے اختیار لبوں سے پھسلا' پھر گڑبڑا کر زبان روکی۔

"کان کھول کر سن لو' اگر آئندہ مجھے تم دونوں کی طرف سے کوئی شکایت ملی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

وہ غصے میں کہہ کر کچن کی طرف چلی گئیں۔

نگین منہ لٹکائے صوفے پہ گر گئی' جبکہ وہ وہیں ٹہلنے لگی۔

"اس ڈاکو چور' دہشت گرد کی اتنی ہمت کہ ہماری شکایت لگائے' اب تو اس کو اندر کرانا ہی پڑے گا۔"

وہ ادھر ادھر چکر لگاتی بولے جارہی تھی۔

"مگر اب اماں سے نظر بچا کر ہم اس کا پیچھا کرنے نہیں جاسکتے۔"

"جاسکتے ہیں۔" وہ ٹہلتے ٹہلتے رکی۔ اس کی آنکھیں کسی خیال سے چمک اٹھی تھیں۔

"میرے پاس ایک آئیڈیا ہے!" وہ پرجوش سی اس کے قریب آئی۔

✡ ✡ ✡

ریسٹورنٹ کے خوابناک ماحول میں لذیذ کھانوں کی

اشتہا انگیز خوشبو پھیلی تھی۔ پیچھے دھیما دھیما سا آرکسٹرا، چمچوں اور گلاسوں کے ٹکرانے کی آواز اور اے سی کی خنکی۔

وہ مدھم روشنی میں ڈوبی کونے والی میز پہ موجود تھیں۔ آج فرہاد کا تعاقب ان کو اس ریسٹورنٹ میں لے آیا تھا۔

"اب ہم حلیہ بدل کر جائیں گے تاکہ وہ ہمیں پہچان نہ سکے۔" نگین اس کے آئیڈیے پہ حیران رہ گئی تھی۔ مگر ڈارک میک اپ، بڑے سیاہ گلاسز اور مختلف ہیر اسٹائل میں اپنا بدلا بدلا سا روپ اس نے نگین کو دکھایا تو وہ زیادہ متاثر نہیں ہوئی۔

"تم پہچانی جا رہی ہو ہانی!"

"تب ہی اچھی لگ رہی ہوں۔ مگر کوئی بات نہیں۔ وہ کون سا ہمیں بہت دیکھتا ہے۔" اس نے اپنے بال مسکارا ڈائی سے ریڈ ڈائی کر لیے تھے۔

اب وہ اس پہ نظر رکھے ادھر بیٹھی تھیں۔ وہ سامنے والی ایک ٹیبل پہ بیٹھا، موبائل کے بٹن کافی دیر سے دبائے جا رہا تھا۔ اس وقت رش کم تھا۔

تب ہی ویٹر اس کا آرڈر لے آیا۔ پینا کولا کے لبالب بھرے دو گلاس۔

"دو گلاس؟" ہانی نے گہرے گلاسز کے پار سے دیکھا۔ "اس کا مطلب ہے یہ کسی سے ملنے آیا ہے۔ یا پھر شاید اس لڑکی کے تاوان کی رقم وصول کرنے۔"

نگین نوٹ بک میں سر گھسائے، قلم چلائے جا رہی تھی۔

"ویٹر نے فرہاد کے سامنے میز پر دونوں گلاس سیٹ کیے۔ وہ ابھی تک موبائل پہ مصروف تھا۔ بس سر کے خم سے شکریہ ادا کیا۔ سیاہ ڈنر جیکٹ اور سفید شرٹ میں وہ بہت شان دار لگ رہا تھا۔

"ہانی! آٹھ بج گئے؟" دفعتاً نگین نے پریشانی سے سر اٹھایا۔ ہانی نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ آٹھ بجے گئے تھے۔

"نہیں بجے۔ ابھی آدھا گھنٹہ ہے۔" اس نے اطمینان سے نگین کو تسلی دی۔ وہ جانتی تھی سچ بتانے کی صورت میں نگین بدحواس سی ہو کر باہر بھاگے گی۔

دفعتاً وہ چونکی۔ ایک سوٹڈ بوٹڈ ادھیڑ عمر شخص فرہاد کی ٹیبل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"یہ کون ہو سکتا ہے؟"

آہٹ پہ فرہاد نے سر اٹھایا، پھر مسکراتا ہوا اٹھا۔

"یقیناً اس مغویہ لڑکی کا وارث ہے۔ شکل تو دیکھو، کتنی مسکینوں والی ہے بے چارے کی!"

اب فرہاد گرمجوشی سے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔ شاید بیٹھنے پہ اصرار۔ مگر اس شخص نے نفی میں سہلاتے کوٹ کی جیب سے ایک پیکٹ نکالا۔

ہانی کے سارے حواس بیدار ہو گئے۔ وہ بے اختیار گردن اونچی کر کے دیکھنے لگی۔

اب وہ شخص پھولا ہوا خاکی لفافہ فرہاد کو تھما کر کچھ کہہ رہا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث وہ ان کی آوازیں نہیں سن سکتی تھیں۔

پھر وہ شخص چلا گیا اور فرہاد نے لفافے کو احتیاط سے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالا۔ تب ہی اس کی نگاہ ان دونوں پہ پڑی۔

سر جھکائے نوٹ بک پہ کچھ لکھتی نگین اور گردن اونچی کر کے اس کو دیکھتی ہانی، جس نے اس کے متوجہ ہونے پہ گڑبڑا کر رخ پھیرا تھا۔

فرہاد کے ماتھے پہ ناگواری بھری شکن ابھری۔ لب بھینچ کر وہ اٹھا اور تیز لمبے ڈگ بھرتا ان کی ٹیبل تک آیا۔

اب بھاگنا بے سود تھا۔ وہ جان کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"آپ دونوں ادھر کیا کر رہی ہیں؟" عین ان کے سر پہ پہنچ کر وہ درشتی سے بولا۔

نگین کے ہاتھ سے قلم پھسلا۔ گڑبڑا کر اس نے سر اٹھایا۔ مگر ہانی نے پرسکون انداز میں گردن اس کی جانب موڑی۔

"ہم سے کچھ کہا؟"

"کیا میں آپ کو دیواروں سے باتیں کرنے والا لگتا

ہوں؟"

"لگنے کو تو آپ بہت کچھ لگتے ہیں۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔ پھر سر جھٹکا۔ "خیر! آپ کی تعریف؟"

"آپ کیوں میرے پیچھے ہر جگہ پہنچ جاتی ہیں؟ مسئلہ کیا ہے آپ لوگوں کو؟" وہ خاصا برہم تھا۔

ہانی نے جواباً حیرت سے نگین کو دیکھا۔

"تم ان کو پہچانتی ہو شائستہ؟"

"کون شائستہ؟" نگین الجھی۔

اس نے میز کے نیچے سے اپنا پاؤں نگین کے پاؤں پہ مارا۔

"تم... تم شائستہ... تم سے پوچھ رہی ہوں۔ یہ صاحب کون ہیں اور کیوں ہمیں تنگ کر رہے ہیں۔"

"اپنی اداکاری کے جوہر آپ کہیں اور دکھائیے گا۔ میری بات کان کھول کر سنو تم دونوں۔" وہ آپ سے تم پر اتر آیا۔ "آئندہ اگر مجھے اپنے پیچھے تمہاری صورت نظر آئی تو اپنے پاؤں پہ گھر نہیں جاؤ گی۔"

"تو یہ کیا ہمیں ٹیکسی کروا کے دے گا؟" نگین نے حیرت سے اسے دیکھا جو سختی سے دو ٹوک بات کر کے واپس پلٹ چکا تھا۔

"آیا بڑا نہیں کا نواب! سارے ڈرامے کا بیڑا غرق کر دیا۔ اور تم بھی تو کچھ نہیں سمجھتی ہو۔" وہ غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نگین منہ لٹکائے اس کے پیچھے تھی۔

☆ ☆ ☆

"کل ٹارگٹ نے یقیناً" دھاکے کی یا اس مغویہ لڑکی کے تاوان کی رقم وصول کی ہے۔ مجال ہے جو اسے ذرا شرم آئی ہو۔"

وہ مسلسل کمرے میں ٹہل ٹہل کر بولتی اپنا غصہ نکال رہی تھی۔

نگین بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ناول میں غرق تھی۔

"اور پتا نہیں کس معصوم لڑکی کو قید کر رکھا ہے۔ جانے کیا حال ہوا ہو گا اس کا۔"

نگین نے بہت دھیان سے پڑھتے ہوئے صفحہ پلٹا۔

"زنجیروں سے باندھ رکھا ہے اس ظالم انسان نے اسے۔ بس ایک دفعہ میرے ہاتھ لگ جائے، ساری زندگی کے لیے جیل نہ بجھوا دیا تو میرا نام بھی ہانی نہیں ہے۔ تم نے سنا جو میں نے کہا؟"

"ہاں ہاں۔" نگین نے بوکھلا کر سر اٹھایا۔ "تم نے کہا، پانی نہیں ہے۔"

تب ہی خالہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ بس آخری فقرہ کانوں میں پڑا۔ پریشان ہو گئیں۔ "کیا؟ پانی نہیں ہے؟ اللہ بخشے میرے سسر مرحوم کو، وہ کہا کرتے تھے جس گھر میں پانی بار بار ختم ہو، اس کے گھر والوں کے رزق سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ ٹھہرو میں موٹر چلواتی ہوں۔"

ہانی نے سر پکڑ لیا۔ یہاں کوئی ٹھیک سے بات سننے کو تیار نہ تھا۔

"اور تم کیوں سر پکڑے بیٹھی ہو؟ اللہ بخشے میرے سسر مرحوم کو، وہ کہا کرتے تھے اگر سر کا درد ایک دفعہ شروع ہو جائے تو جاتا نہیں ہے۔"

"درد نہیں ہے خالہ۔"

"پھر اٹھو، تمہاری اماں کا فون آیا ہے پی ٹی سی ایل پر۔"

وہ گہری سانس لیتی اٹھی۔ اماں موبائل نہیں رکھتی تھیں۔

"یہ کیا کہ ذرا سی بات کی اور کریڈٹ ختم... ایسی غربت میں ہم سے تو گزارا نہیں ہوتا۔" اور پھر انہوں نے کبھی موبائل نہیں رکھا۔ اپنا پی ٹی سی ایل انہیں بہت پیارا تھا۔ لمبی سی تار، جہاں چاہے کھینچ کر لے جاؤ۔

"اللہ بخشے میرے سسر مرحوم کو، وہ کہا کرتے تھے، لڑکیاں جلد ہی اپنے گھروں کی ہو جائیں تو اچھا ہے۔" کمرے سے نکلتے ہوئے اس کے کان میں خالہ کا فقرہ پڑا۔ وہ ذرا سی ٹھٹک گئی پھر بھاگ کر نیچے آئی۔

"ہیلو اماں!"

اماں سے سلام دعا کے بعد اس نے تین منٹ تک

گھر کا پورا احوال سنا۔ ماسی کی چوریوں اور کام چوریوں کی داستان، پھپھو کا کسی محفل میں ٹوک دینا اور خالہ کے جرمنی سے بھجوائے گئے تحفوں کی تفصیل سن کر اس نے سرسری انداز میں "اور سب خیریت ہے؟" پوچھا تو اماں چند لمحے کو رکیں۔

"تمہاری خالہ نے کوئی رشتہ وشتہ تو نہیں دیکھا تمہارے لیے؟"

"معلوم نہیں۔" وہ خود بھی الجھ گئی۔

"مگر انہوں نے تو۔ خیر" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔ "اچھا وہ عفان کے لیے تمہاری پھپھو اصرار کر رہی ہیں۔"

"اچھی بات ہے، ورنہ کہیں اس دفعہ بھی فیل نہ ہو جائے۔ اصرار کر کے پڑھوانا چاہیے۔"

"اوہو، بات تو پوری سنو! انہوں نے عفان کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔"

"وہ ایک دم چپ سی ہو گئی۔

"جو تم بہتر سمجھو، مجھے آگاہ کر دینا۔ سوچ لو۔ اچھا ہے۔"

اس نے آہستگی سے فون کریڈل پہ رکھا۔ ایک دم دل ڈوب کر ابھرا تھا۔ لاؤنج میں کونے پہ کتابوں کے ڈھیر سے سنی نے سر نکالا۔

"کیا انہوں نے آپ کا رشتہ پکا کر دیا؟"

وہ چونکی۔ "تمہیں کس نے بتایا ہے؟"

"اماں کچھ کہہ رہی تھیں۔" اس نے لاپرواہی سے شانے اچکاتے ہوئے کتاب کا صفحہ پلٹا۔

"پتا نہیں۔" وہ سر جھٹک کر سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

"ہاں، کر دیں آپا!"

"وہ ٹھٹک کر پلٹی۔ سنی کتاب پہ نگاہیں جھکائے مسکرا رہا تھا۔

اس کے دیکھنے پہ سر اٹھایا، پھر ناک پہ پھسلتی عینک پیچھے کی۔

"ہاں کر ہی دیں آپا کیونکہ ساتھ والا تو دہشت گرد نکلا۔"

اس نے مسکرا کر پھر سے کتاب چہرے کے سامنے کر لی۔

وہ متحیر سی، ساکت رہ گئی۔

کتنی عجیب بات کی تھی سنی نے!

سر جھٹک کر وہ تیز تیز سیڑھیاں چڑھتی اوپر آئی۔

دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔

نگین اسی طرح بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ناول میں غرق تھی۔ وہ کھڑکی کے سامنے آئی اور پردہ ہٹایا۔ پھر دوربین اٹھا کر آنکھوں سے لگائی۔

"تب ہی فرہاد کی گاڑی اس کے پورچ میں رکی۔

"کیونکہ ساتھ والا تو دہشت گرد نکلا۔"

"عفان کا رشتہ۔"

"ساتھ والا۔"

"چپ کرو!" اس نے اندر اٹھتی آوازوں کو گھرکا۔

وہ ڈرائیونگ ڈور کھول کر نکلا، پھر پچھلی سیٹ سے چند شاپنگ بیگز نکالے۔

"وردہ، ڈی نائن، جنریشنز۔" یہ خالص زنانہ شاپنگ کیوں کر کے لایا ہے؟"

"وہ اب شاپنگ بیگز تھامے چابی سے دروازے کا لاک کھول رہا تھا۔

"کہیں یہ اس مغویہ لڑکی کے لیے تو نہیں لایا، یعنی وہ لڑکی اس کے گھر میں ہے؟" اگلے گمان نے اسے دہلا دیا۔

"ہاں جیسے ناولز میں ہوتا ہے۔" نگین بھی ناول چھوڑ کر دوڑی چلی آئی۔ "اس کو اس لڑکی سے پیار ہو گیا ہو گا۔ تب ہی زبردستی نکاح کرنے کے لیے قید کر رکھا ہو گا۔"

"اب پیار ہو گا تو اتنی مہنگی شاپنگ کر کے لایا ہے ورنہ یاد ہے، ڈی نائن کے پرنس تو ہم دور سے دیکھ کر گزر جاتے تھے۔"

"پیار؟" اسے عجیب سا لگا۔ دل کی حالت غیر ہونے لگی۔

"وہ کیا کسی اور سے پیار کر سکتا ہے؟ کیا ایسا ممکن ہے؟"

"وہ ساتھ والا تو دہشت گرد نکلا۔"

ایک دم اس نے دوربین بیڈ پہ رکھ دی اور خود تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"جاسوسی کا چھٹا اسٹیپ۔" سنی میز پہ پاؤں رکھے صوفے پہ بیٹھا بول رہا تھا۔ "ٹارگٹ کے گھر اور سامان کی تلاشی۔"

"اس نے مجھے اپنی نوکرانی تو نہیں رکھا، ورنہ میں یہ ضرور کر لیتی۔" اس نے تلخی سے سر جھٹکا۔

آج کل وہ بات بے بات تلخ ہو جاتی تھی۔ رہ رہ کر زنجیروں میں جکڑی ایک خوبصورت لڑکی تصور ذہن میں ابھرتا جسے منت کر کے وہ ظالم (مگر ہینڈسم) بندہ کچھ کھلا رہا ہو گا۔

"دفع دور!"

وہ چڑ کر کھڑی ہوئی۔ اب وہ عاجز آ گئی تھی اس کی جاسوسی سے۔

اوپر کمرے میں آئی تو نگین آنکھوں سے دوربین لگائے کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی۔

"ہانی!" اسے آتے دیکھ کر وہ خوشی سے اس کی طرف گھومی۔

"کیا ہے؟"

"فرہاد ابھی ابھی گھر سے نکلا ہے۔"

"میری بلا سے دنیا سے بھی نکل جائے۔"

(مگر دل نے پوچھا۔ "کیا واقعی" تو وہ دل سے نگاہیں چرا کر رہ گئی)

"ہانی سنو تو۔ میں نے خود دیکھا ہے، وہ دروازہ لاک کرنا بھول گیا ہے۔

وہ مغویہ یقیناً اس کے گھر میں قید ہو گی۔ چلو چل کر اسے آزاد کراتے ہیں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

اسے اس لڑکی سے اب رتی برابر بھی ہمدردی نہ تھی۔ "گھنی، میسنی، ادائیں دکھا کر پھنسا رکھا ہو گا بے چارے کو۔ اچھا ہے، وہیں سڑتی رہے۔"

مگر وہ بے چارہ کب سے ہو گیا ہانی؟" کوئی اس کے اندر ہنسا تھا۔

"مجھے نہیں پتا۔" وہ جھنجلا گئی۔

"کس سے لڑ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔ تم بتاؤ کیا کہہ رہی تھیں؟"

"اس کا گھر کھلا ہے۔ چلو اس لڑکی کو آزاد کروا آئیں۔"

"مگر اس سے کیا ہو گا؟" وہ بے دلی سے بیٹھی رہی۔

"بھئی، وہ لڑکی اس کے خلاف پولیس کے سامنے گواہی دے گی۔"

ہانی نے چونک کر اسے دیکھا۔

"اگر اس نے گواہی دی تو کیا فرہاد اس سے نفرت کرنے لگے گا۔"

"اور نہیں تو کیا۔ جو ہمارے خلاف گواہی دے، اس سے ہمیں نفرت تو ہو ہی جاتی ہے۔"

"سچی!" وہ خوشی سے اٹھ کر بیٹھی، پھر سنبھل گئی اور چہرے پہ سنجیدگی طاری کر لی۔ "چلو۔"

☼ ☼ ☼

وہ دونوں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتیں، آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ لائٹ کا سوئچ ہاتھ ہی نہیں آ رہا تھا۔

"اس نے ضرور لڑکی کو تہہ خانے میں چھپا کر رکھا ہو گا۔"

"مگر اس کالونی کے تو سارے گھروں کے ڈیزائن ایک سے ہیں ہانی... اور یہ تو کرایہ دار ہے، تہہ خانہ کیسے بنوا سکتا ہے اتنی جلدی۔"

"ایک تو تم اتنی عقل مندی کی باتیں نہ کیا کرو۔ چلو پھر کمروں میں دیکھ لیتے ہیں۔"

وہ سہج سہج کر آگے بڑھ رہی تھیں۔ لاؤنج میں گھپ اندھیرا تھا۔ وہ دیواروں کا سہارا لیے ذرا آگے آئیں تو ایک دروازے سے ہاتھ ٹکرایا۔

ہانی نے دروازہ دھکیلا۔

چرر کی آواز کے ساتھ وہ کھلتا چلا گیا۔

"ہانی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"تو مجھے تو نہ ڈراؤ!"

"ہائے ہانی اگر اس کے گھر میں جن بھوت ہوا تو؟"

"نگین میری جان تو مت نکالو۔" اس کا اپنا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بمشکل خود پہ قابو رکھے اس نے کمرے میں قدم رکھے۔

اے سی کی خنکی ابھی تک باقی تھی۔ کسی قیمتی پرفیوم کی مہک کمرے میں پھیلی تھی۔ وہ اندھوں کی طرح ٹٹولتی آگے بڑھ رہی تھی جب گھٹنا کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔

"اف!" وہ کراہ کر رہ گئی' پھر ہاتھ سے ٹٹولا۔ لکڑی کا سرا تھا۔ شاید بیڈ کی پائنتی۔

"یہ تو اس کا بیڈ روم ہے۔ آؤ کسی اور کمرے میں....."

تب ہی پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

"اوہ گاڈ! وہ واپس آگیا۔"

ان کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔

"اب کیا کریں.....؟"

"چلو کہیں چھپتے ہیں۔"

کھڑکی کے پردے ذرا سا سرکائے۔ باہر سے چھن کر آتی چاندنی میں اسے کونے میں رکھے کشن نظر آئے۔

"آؤ۔" وہ نگین کا ہاتھ تھامے اس طرف بڑھی۔

لاؤنج کے داخلی دروازے کا ہینڈل ایک کلک کے ساتھ کھلا۔ اور بھاری بوٹ داخل ہونے کی آواز آئی۔

وہ دونوں کشن کے پیچھے بیٹھ گئیں۔ ایک بڑا کشن اپنے اوپر رکھ لیا اور پیچھے جھولتا پردہ اس پر ڈال دیا۔

لاؤنج کے فرش پہ جوتوں کے چلنے کی آواز آرہی تھی۔

ہانی کا سانس رکنے لگا۔ "اگر پکڑی گئی تو؟"

اسے چشم تصور میں اپنا آپ زنجیروں میں جکڑا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اب بیڈ روم کی طرف آرہا تھا۔ قدموں کی چاپ نزدیک آگئی تھی۔ تب ہی نگین نے ہولے سے سرگوشی کی۔

"ٹائم کیا ہوا ہے؟"

فرہاد کا ہیولا سا اسے دروازے میں کھڑا دکھائی دیا۔ وہ جیسے متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

ہانی نے چاندنی میں چمکتی وال کلاک دیکھی' اور پھر چہرہ نگین کے کان میں تقریباً" گھسا کر بہت دھیرے سے بولی۔

"آٹھ بج گئے ہیں۔"

"کیا؟" نگین حلق کے بل چلاتی ہوئی کھڑی ہوئی۔

کشن نیچے گرا۔

پردہ ہٹ گیا۔

ساتھ ہی فرہاد نے لائٹ آن کردی۔

سارا کمرا روشنی میں نہا گیا۔

بکھرے کشن' پیچھے ہکا بکا بیٹھی ہانی اور کھڑی ہوئی نگین۔

"آٹھ بج گئے اور تم نے بتایا نہیں۔" وہ پریشانی سے چلائی تھی۔ "آج فرائیڈے ہے۔ "میرا نصیب" آرہا ہوگا۔ ہائے پتا نہیں بے چاری نازیہ کا کیا بنا۔"

وہ اسی پریشانی کے عالم میں دروازے کی طرف بھاگی۔

فرہاد راستے میں کھڑا تھا' مگر نگین کو جیسے ہوش نہ تھا۔

"ہٹیں جی۔" وہ اسے ایک طرف کرکے باہر نکل گئی۔

ہانی شاکڈ سی بیٹھی رہ گئی۔

وہ اس کے سامنے ہی کھڑا تھا۔ سینے پہ بازو باندھے' دیوار سے ٹیک لگائے' وہ کڑے تیوروں سے اسے گھور رہا تھا۔ "میرا نصیب" کے چکر میں نگین اس کا نصیب غارت کرگئی تھی۔

"آپ نیچے کیوں بیٹھی ہیں مس ام ہانی؟ اوپر آکر بیٹھیے۔" طنز میں ڈوبی آواز پہ وہ ہوش میں آئی۔

"ہاں..... وہ..... وہ ڈرامہ..... لگ گیا ہوگا۔" وہ اٹھی اور نگین کی طرح سر جھکائے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی مگر فرہاد نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کیا اور سامنے آکھڑا ہوا۔

"وہ..... وہ..... ڈرامہ....." وہ منمنائی۔

"ڈرامہ تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کیا ہوتا ہے۔" وہ

کہتے ہوئے دو قدم آگے بڑھا اور وہ الٹے پاؤں پیچھے ہٹی۔

"تو آپ ادھر کیا کرنے آئی تھیں؟"

"وہ ہمارا کیبل نہیں آرہا تھا... تو ڈرامہ دیکھنے....."

"میرے بیڈ روم میں آپ کو ٹی وی دکھائی دے رہا ہے؟"

ہانی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں۔"

"تو اس کا کیا مطلب ہے؟"

"یہی کہ آپ ٹی وی افورڈ نہیں کرسکتے۔"

وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا' وہ ویسے ہی الٹے قدموں پیچھے ہو رہی تھی۔

"شکل سے تو آپ بہت معصوم لگتی ہیں۔"

"شکریہ۔ سب یہی کہتے ہیں۔" وہ معصومیت سے مسکراتی پیچھے ہٹتی دیوار سے جا لگی۔ اوہ... پیچھے دیوار... سامنے وہ... اب کیا کرے؟

"مگر سب کو کیا معلوم کہ اتنی معصوم شکل بھی چوری کرنے کے لیے کسی کے گھر میں داخل ہوسکتی ہے۔"

"چوری؟" وہ جو شرمندہ سی سر جھکائے کھڑی تھی۔ تڑپ کر سر اٹھایا۔ "چور ہوں گے آپ... آپ کے نانکے دادکے' میں آپ کو چور لگتی ہوں۔"

"تو میرے گھر میں یوں کیوں داخل ہوئیں؟"

"ارے بھاڑ میں گیا آپ کا گھر۔ میں تو بس اس بے چاری کو چھڑانے آئی تھی جسے آپ نے اغوا کرکے قید کر رکھا ہے۔"

وہ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

"آپ کو کس نے بتایا اس کے بارے میں؟"

وہ پل بھر کو ساکت رہ گئی۔

"تو آپ نے واقعی؟"

ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید اس کے گمان جھوٹے ہوں۔ وہ اچھا بندہ ہو۔ وہ سب اس نے خود سے فرض کرکے غلط سمجھا ہو' مگر اس کے اعتراف نے اسے گنگ کردیا تھا۔

"جی' میں نے اپنی منگیتر کو اغوا کرکے اوپر والے کمرے میں قید کر رکھا ہے اور شاید اب مجھے آپ کو بھی ادھر باندھنا پڑے۔ اور کیا کیا جانتی ہیں آپ میرے بارے میں؟"

"نن..... نہیں... وہ... وہ بس چاند رات والا بلاسٹ....." بے اختیار زبان دانتوں تلے دبائی۔

"اچھا؟ یہ خبر بھی آپ کو ہے؟ اب تو مجھے آپ کو لازمی ادھر باندھنا پڑے گا۔"

"نہیں نہیں۔ پلیز مجھے جانے دیں۔"

"تاکہ آپ میرے خلاف پولیس میں رپورٹ کردیں۔"

"نہیں' میں نہیں کروں گی' پلیز مجھے جانے دیں۔" اس کا گلا رندھ گیا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"اور میں کیسے یقین کروں کہ آپ اپنا منہ بند رکھیں گی؟"

"میں..." وہ ہکلائی۔ یہ تو پکا ارادہ تھا کہ کسی طرح یہاں سے نکلے' پھر فوراً" پولیس کو فون کرے گی۔

"آپ یہی سوچ رہی ہیں ناکہ مجھے بہلا پھسلا کر آپ یہاں سے نکلیں اور گھر جاکر چھوٹتے ہی پولیس کو کال کریں؟"

"نن..... نہیں۔" وہ پھر ہکلائی۔ کمبخت تو ٹیلی پیتھی بھی جانتا تھا۔

"مجھے پتا ہے' تم یہی کرو گی' سو میری بات غور سے سنو۔ تمہارے گھر کے ہر موبائل اور لینڈ لائن فون اور انٹرنیٹ پہ میں نے آبزرویشن لگا رکھی ہے اور اگر تم نے پی سی او کے لیے گھر سے قدم باہر نکالا بھی تو میرے بندے تمہیں واچ کر رہے ہیں۔ جس لمحے تم نے گڑبڑ کی' میں اس لڑکی کو مار دوں گا۔"

"نہیں! پلیز اس کو کچھ نہ کہیے گا۔ میں کچھ نہیں کروں گی۔"

"اور اگر چاند رات تک تم گھر سے بھی نکلیں تو....."

"پلیز میں کچھ نہیں کروں گی۔ مجھے جانے دیں۔" اس کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

"کوئی گڑبڑ کی تو یاد رکھنا۔!" دھمکی آمیز ادھوری بات کر کے وہ سامنے سے ہٹا تو وہ بری طرح روتی ہوئی باہر بھاگی۔

پھر اپنے گھر کے باہر اس نے آنسو پونچھے۔

"ہانی آ!" افسردہ بیٹھی نگین اسے لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھ کر بے اختیار اٹھی۔

"تم ٹھیک تو ہو؟ آئی ایم سوری میں۔۔۔"

"چپ!" وہ غرائی۔

"مگر میں۔۔۔"

"بالکل چپ!" وہ سختی سے کہہ کر کاؤچ پہ آگری۔

تب ہی کتابوں کے ڈھیر سے سنی نے کچھوے کی طرح گردن اوپر نکالی۔

"کیا آپ جانتی ہیں کہ اگر جاسوسی کے سارے اسٹیپ فیل ہو جائیں تو کیا کرتے ہیں؟"

ہانی اور نگین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تو اگلا اسٹیپ استعمال کرتے ہیں۔" محظوظ انداز میں کہتا وہ پہلے کی طرح شروع ہو گیا۔

"جاسوسی کا ساتواں اسٹیپ ٹارگٹ کی۔۔۔"

ہانی نے پیر سے جوتا اتارا' اور نگین نے کشن اٹھایا۔

اگلے ہی لمحے دونوں چیزیں سنی کی طرف اڑ رہی تھیں۔

وہ غڑاپ سے اپنے ڈھیر میں گم ہو گیا۔

"سارا اسی کا قصور ہے۔ اسے اتنا مارو کہ آئندہ یہ گدھا ہمیں فضول مشورے نہ دے۔"

ہانی دوسرا جوتا اتار کر اس کی طرف آئی مگر "گدھا" کتابوں کے بیچ سے بچتا بچاتا سیڑھیوں کی طرف نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مذاق مذاق میں شروع ہونے والا کھیل اتنی سنجیدگی اختیار کر لے گا' اس نے تو سوچا بھی نہ تھا۔

کتنی ہی دفعہ گھر سے باہر نکلنے کا سوچا' یا نگین کو کچھ بتانے کا' مگر ہر بار اس کی دھمکی یاد آجاتی تو وہ سہم جاتی۔

دل تو ویسے ہی آج کل روٹھا ہوا تھا۔ ہر شے سے بے زار' ناراض اور تنہا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کرے تو کیا کرے۔

آج سعودیہ میں عید ہوئی تھی' یعنی اب متوقع طور پہ ادھر چاند نظر آجاتا تھا' اور اگر آج کی رات چاند رات ہوئی تو وہ دھماکہ کر دے گا۔ پھر کیا ہو گا؟

وہ کتنی ہی دیر بے چین سی لاؤنج میں ٹی وی کے آگے بیٹھی رہی۔ رویت ہلال کمیٹی کا اجلاس شروع ہو چکا تھا مگر ممبرز کے شجرے ہی مکمل نہیں ہو رہے تھے کہ بات آگے بڑھتی۔

"میرا ناول کدھر ہے؟ یہیں رکھا تھا۔"

"مجھے کیا پتا۔"

"تم نے ہی اٹھایا ہو گا۔" نگین اور سنی پیچھے لڑ رہے تھے۔ اس نے پوری لڑائی تو نہ سنی' بس آخر میں سنی کو غصے سے چہرے کے آگے کتاب کرتے اور نگین کو پیر پٹخ کر باہر جاتے دیکھا تھا۔

چاند نظر آنے کی خبر آہی گئی۔ اس کا دل ڈوب گیا۔ کتنے لوگ اس کی بزدلی کی وجہ سے آج موت۔۔۔ آگے وہ سوچ نہ سکی اور کمرے میں چلی آئی۔

کتنی ہی دیر وہ بستر پہ چت لیٹی چھت کو دیکھتی رہی۔

دفعتاً" دروازے پہ مدھم سی دستک ہوئی۔

وہ کسلمندی سے اٹھی۔

دستک دوبارہ ہوئی اور پھر مسلسل ہونے لگی۔

وہ جھنجلا کر آگے بڑھی اور دروازہ کھولا۔

"کون ہے؟ کیا مسئلہ ہے' کیوں مجھے۔۔۔" وہ جو غصے میں بڑبڑ کر رہی تھی' ایک دم شل رہ گئی۔

سامنے کھڑی لڑکی نے اس کے حواس سلب کر لیے تھے۔

وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ دراز قد' لمبے سیدھے بال کمر پہ گرتے ہوئے' نفاست سے کیا میک اپ' بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں' اور پاؤں تک آتا اسٹائلش سا پنک فراک۔

وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔ ہانی کو لگا ں نے اسے پہلے دیکھ رکھا ہے۔ مگر نہیں۔ اوہ نہیں۔ لز نہیں۔

"نگ۔۔۔ نگ۔۔۔ نگین!" وہ متحیر سی دو قدم پیچھے ۔

"ہاں میں!" نگین اپنا دلفریب سراپا لیے مسکراتی ئی دروازے میں کھڑی تھی۔

وہ منہ کھولے گنگ سی رہ گئی۔ یہ سب کیا تھا؟

"تم نے کہا تھا ہانی کہ نگین تمہارے گمان کے ائق ہو گی' مگر وہ کیا ہے کہ گمان دنیا کی سب سے وئی بات کو کہتے ہیں۔"

وہ پراعتماد' مسکراتے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"ہوتا یہ ہے ہانی کہ بعض دفعہ اپنی عقل مندی کے عم میں ہم لوگوں کو کیٹیگریز میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ جھے' برے' کم عقل' چالاک۔۔۔ جبکہ ہر انسان سرے سے اتنا ہی مختلف ہوتا ہے جیسے اس کی لیوں کے نشان۔ مگر ہم کثرت گمان سے باز نہیں تے' اور یہ گمان بہت دھوکا دیتے ہیں۔ اور جانتی ہو' ض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ یہ ہمیں تجسس میں ایسا راتے ہیں کہ باہر نکلنا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔"

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ نی پڑھی لکھی باتیں نگین کر رہی تھی؟

"تو ہوا یوں کہ چھ سال ہمارا رابطہ نہ رہنے کے عث تم نے اپنے ذہن سے وہ چھ سال پرانی' عینک والی لم عقل نگین نہ نکلنے دی۔ حالانکہ عینک تو لیزر ٹمنٹ نے ہی اتروادی تھی اور کم عقلی عمر اور شعور لی بڑھتی منازل نے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہر بندہ ڑنا سیکھ لیتا ہے مگر تم نے میری کسی بات سے گمان کیا کہ میں ویسی ہی ہوں' سو میں نے سوچا کہ چلو' اپنی یاری ہانی کو ایک سبق دیتے ہیں تاکہ وہ زندگی میں پھر بھی لوگوں کے بارے میں یوں رائے قائم نہ کرے۔"

اس نے آہستہ سے اپنا ادھ کھلا منہ بند کیا۔ اندر ہی ندر غصے کا ابال اٹھنے لگا تھا' مگر نگین اسی طرح کھے

جارہی تھی۔

"سو میں نے ایک پلان سوچا۔ لائبریری سے ناول پکڑے' اور ڈراموں کا ٹائم ٹیبل یاد کیا۔ پھر زیرو نمبر کی عینک لی اور سنی اور اماں کو خاموش رہنے کی تنبیہہ کی مگر جنہوں نے سب سے زیادہ میری مدد کی' وہ فرہاد تھے۔ آیئے فرہاد' آپ کو اپنی کزن سے ملواؤں۔"

دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوا براؤن کرتے میں ملبوس' وہ مسکراہٹ دبائے نگین کے ساتھ آکھڑا ہوا۔

وہ سینے پہ ہاتھ باندھے' لب بھینچے خاموشی سے دونوں کو دیکھے گئی۔

"یہ فرہاد ہیں' حسن چچا کے بیٹے۔ حال ہی میں ایم بی اے کرکے انگلینڈ سے آئے ہیں۔ چچا اور باقی لوگوں نے بھی عید کے بعد آنا ہے سو بڑی فیملی کے باعث انہوں نے پورا گھر رینٹ پہ لیا' اور یہ میرے پلان کا حصہ بھی نہیں تھے۔ مگر جب تم نے ان کی باتیں سنیں جن میں یہ حسن چچا سے ایک انکشاف کرکے فیملی میں دھماکہ کرنے کی بات کررہے تھے اور دھماکے کے پیچھے "بم" کا لفظ تم نے خود ایڈ کرلیا تو ہم نے سوچا' چلو ایسا ہے تو ایسا سہی۔ جب شک کی عینک فٹ کرکے دیکھا تو ان کا ہر عمل مشکوک نظر آیا۔ چاہے آفس کے کوئی کاغذات لینے ریسٹورنٹ گئے' یا دوست کے والد کی عیادت کے لیے ہسپتال' یا پھر منگنی کی زنجیروں میں محاورتاً" اپنی منگیتر کو جکڑنے کا ذکر کیا تم ان پہ شک ہی کرتی رہیں چاند رات میں انہوں نے اسی لڑکی کے حوالے سے ایک دھماکہ کرنا تھا مگر۔۔۔ خیر' آئی ہوپ کہ اس معصوم شرارت پہ تم ہمیں معاف کردو گی کیونکہ ہم تمہارے اچھے دوست بھی تو ہیں نا۔"

نگین نے شرارت سے چمکتی آنکھوں سے فرہاد کو دیکھا جس نے مسکراہٹ دباتے شانے اچکا دیے۔

"یہ آپ دونوں کا معاملہ ہے' میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

اس نے سلگتی نگاہوں سے فرہاد کو دیکھا۔ (وہ غصے کی اداکاری' خالہ کو لگائی شکایتیں۔ سب ڈرامہ تھا؟ اور خالہ کو تو اللہ کرے ان کے سسر مرحوم قبر سے پوچھنے آئیں۔

"اچھا گفٹ دیا ہے آپ نے مجھے عید کا۔" وہ سپاٹ لہجے میں کہتی بیڈ پہ اپنا موبائل تلاش کرنے لگی۔ ابھی بیپ بجی تھی۔ شاید اس کے موبائل پہ کوئی میسج آیا تھا۔

فرہاد تے نگین کو دیکھا' تو اس نے "سب ٹھیک ہوجائے گا" اشارہ کیا' پھر ہانی کی جانب پلٹی۔

"تو تم نے ہماری شرارت معاف کردی؟"

ہانی نے موبائل بیڈ سے اٹھایا اور چمکتی اسکرین کو دیکھتے ہوئے شانے اچکائے۔

"معافی کا اختیار ہم بے چاروں کو کہاں حاصل؟" تلخ لہجے میں کہتے اس نے میسج کھولا۔

خالہ کے نمبر سے ایس ایم ایس آیا تھا۔

"ہانی آپا! اگر آپ ان دونوں سے بدلہ لینا چاہتی ہیں تو جو میں کہوں' وہی کریں۔۔۔ سنی۔"

اس نے "جلدی بکو" لکھ کر جواب دیا اور سپاٹ چہرہ اوپر اٹھایا۔

آخر سنی بھی تو شریک ہی رہا تھا نا۔

"بات یہ ہے ہانی کہ۔۔۔" فرہاد نے اپنے مدھم انداز میں کہنا شروع کیا مگر وہ تیزی سے بات کاٹ کر بولی۔

"آپ میرے نہیں' نگین کے کزن ہیں' پلیز مجھ سے مخاطب ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہانی' دیکھو ناراض تو نہ ہو۔" نگین پریشان ہوگئی۔

تب ہی میسج کی بیپ دوبارہ بجی۔ اس نے سر جھکا کر ہاتھ میں پکڑا موبائل دیکھا۔

"جاسوسی کا چھٹا اسٹیپ۔ سنی جو کہے اس کی ہاں میں ہاں ملاؤ۔" آگے ایک آنکھ مارتا چہرہ تھا۔

"ہانی آپا!" دفعتاً" سنی نے دروازے سے جھانکا۔

ان تینوں نے پلٹ کر دیکھا۔

"آپ کی فلائٹ کنفرم ہوگئی ہے؟ خالہ کا لاہور سے فون آیا تھا' پوچھ رہی تھیں۔ میں نے بتادیا کہ آپ نے دس بجے کی فلائٹ سے آنا ہے۔ صبح یہی بکنگ کرائی تھی نا آپ نے؟"

نگین نے حیرت سے اسے اور فرہاد نے ذرا پریشانی سے نگین کو دیکھا۔

"تم واپس جارہی ہو؟"

"ہاں' میری دس بجے کی فلائٹ ہے۔" اس نے جاسوسی کے چھٹے اسٹیپ پر عمل کیا۔

"اور خالہ یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ آپ نے منگنی کے فنکشن پر اماں کو انوائٹ کرلیا؟"

"نہیں' میں ابھی کردیتی ہوں۔" وہ سمجھ کر نگین اور فرہاد کی طرف پلٹی جو الجھے الجھے سے کھڑے تھے۔

"کس کی منگنی؟"

"میری منگنی۔" بہت اعتماد سے اس نے بتایا "میری پھپھو کے بیٹے عفان سے میری منگنی عید کے تیسرے روز طے ہے۔ آپ لوگ ضرور آیئے گا اور فرہاد صاحب! آپ بھی انوائٹڈ ہیں۔ اب اگر آپ لوگ مجھے ایکسیوز کریں تو میں اپنی پیکنگ کرلوں۔۔۔"

"مگر ہانی۔"

"پلیز مجھے دیر ہورہی ہے۔" وہ بے رخی سے کہتی الماری کی طرف بڑھ گئی۔

ایک دم فرہاد تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ نگین بھی متاسف سی اس کے پیچھے ہوئی۔ سنی سب سے آخر میں پلٹا۔ وہ دونوں نکل چکے تو سنی نے باہر کے لیے قدم بڑھائے۔

وہ الماری چھوڑ کر تیزی سے لپکی اور کان سے پکڑ کر غڑاپ سے سنی کو اندر کیا۔ اور دروازہ بند کیا۔

"گھنے میسنے' مجھے بے وقوف بنا رہے تھے سب۔۔۔ ایک میں ہی ملی تھی یہ گھٹیا مذاق کرنے کو؟"

"نازیبا زبان کے استعمال پر سنی اپنی امداد واپس بھی لے سکتا ہے۔" اس نے غصے سے اسے گھورا' پھر پکڑ کر بیڈ پہ بٹھایا۔

"یہ میری فلائٹ کس نے بک کرائی ہے۔"

"میں نے صبح کرادی تھی تاکہ آپ کی فیس سیونگ ہوسکے۔"

"اور یہ منگنی کا چکر۔"

"فرہاد بھائی کو جیلس کرنے کے لیے۔"

"کیا مطلب" وہ بری طرح چونکی۔

"سیدھی سی بات ہے جو آپ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ غالباً" چھت پہ بیٹھی آسمان کے نظارے کررہی تھیں' جب فرہاد بھائی نے آپ کو دیکھا اور فوراً" حسن چچا کو فون تھمایا کہ شادی کروں گا تو اسی لڑکی سے۔ وہ لڑکی پسند کرنے ہی ادھر آئے تھے' مگر جب آپ چینی لینے گئیں تو خوامخواہ جان بوجھ کر آپ کو تنگ کرتے رہے۔ نگین آپا نے ان کو جب یہ بتایا کہ آپ ان کے اور ہمارے رشتے کو نہیں جانتیں تو انہوں نے چچا کو کہا کہ وہ تھوڑا ٹائم آپ کو تنگ کریں گے' پھر چاند رات پہ بتادیں گے۔ یہی دھماکہ ابھی وہ کرنے لگے تھے' مگر نگین آپا نے سنی سے ایک ناول کے لیے لڑائی کرکے اس بے چارے کو غداری پر مجبور کردیا۔"

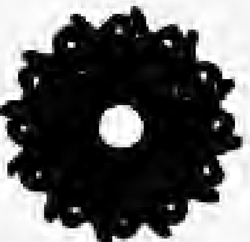
"اور وہ زنجیروں والی لڑکی؟"

"ارے وہ تو اپنے دوست سے شیئر کررہے تھے کہ عنقریب آپ کو رشتے کی بیڑیاں پہنادیں گے' کیونکہ اماں' خالہ سے سرسری بات تو کرچکی ہیں۔ اصل بات تو چچا کے پاکستان آنے پر ہی ہوگی' اور تب تک اگر آپ کا ایک عدد منگیتر نکل آئے تو سوچیں' فرہاد بھائی کتنا جلیں گے۔"

"کہیں تم اب بھی مجھے؟" اس نے مشکوک نگاہوں سے سنی کو گھورا تو اس نے شانے اچکا دیے۔

"سنی ایسا نہیں ہے۔"

"اچھا!" ایک مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ تو وہ اسے پسند کرتا تھا۔ ورنہ ظاہر تو یہ کررہا تھا کہ جیسے نگین سے بہت "انڈراسٹینڈنگ" ہو۔ تیار تو ہو کر دونوں ایسے آئے تھے جیسے ولیمہ کے دلہا دلہن ہوں۔ گھنے میسنے۔۔۔



مصباح خادم

کاملیت پسند

"امی' امی... میری اسٹڈی ٹیبل پہ میگزین رکھا تھا؟" وہ جھنجلاتے ہوئے کمرے سے ہی آوازیں لگاتی ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئی' جہاں امی دوپہر کے کھانے کے لیے سبزی بنا رہی تھیں۔

"تو...؟" انہوں نے ہاتھ روک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"تو یہ کہ اب وہ وہاں نہیں ہے۔" اس نے گہرا سانس لے کر انہیں بتایا۔

"تم تو جانتی ہو کہ میں تمہاری چیزوں کو چھیڑنا تو دور کی بات قریب بھی نہیں جاتی' لہٰذا میں تو اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔" وہ بے فکری سے جواب دے کر دوبارہ سبزی بنانے میں مشغول ہو گئیں تو اس نے زچ ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔

پورے ہفتے کی مصروفیت کے بعد اتوار کا دن اس کے لیے بھرپور فراغت لے کر آیا تھا۔ دیر تک نیند پوری کرنے کے بعد اس نے ڈٹ کر ناشتہ کیا اور اب اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ کی تلاش میں اسٹڈی ٹیبل تک آئی تھی۔

سارہ بی اے فائنل ایئر کی طالبہ تھی۔ کالج میں آخری ماہ ہونے کی وجہ سے نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کی بھرمار تھی' جس کے سبب وہ ڈائجسٹ کو بالکل توجہ نہیں دے سکی تھی اور اب جب اسے فراغت ملی تو ڈائجسٹ غائب۔

ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اسے کہاں تلاش کرے' جب وہ اسے صوفے کی سائیڈ ٹیبل پر پڑا نظر آیا۔

اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اس نے جوں ہی اسے اٹھایا' ماتھا گہری تیوریوں سے بھر گیا۔ کوئی عجلت میں پڑھتے پڑھتے ویسے ہی اوندھا کر کے رکھ گیا تھا' جس کی وجہ سے اس کا درمیانی صفحہ کئی جگہ سے دوہرا ہو کر سلوٹوں کا شکار ہو گیا تھا۔

غصے کی شدت سے اس کے کان تک سرخ ہو گئے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے' تب ہی امی کو مخاطب کیا۔

"ماریہ کہاں ہے امی؟"

"تمہاری بھاوج کپڑے دھو رہی ہے' وہی پھیلانے چھت پر گئی ہے۔"

ان کا جواب سنتے ہی وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

ماریہ ٹوکری میں سے آخری کپڑا نکال کر تار پر پھیلا رہی تھی' جب وہ اس کے سر پر پہنچ گئی۔

"یہ ڈائجسٹ میری اسٹڈی سے تم نے اٹھایا تھا؟" وہ شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی۔ ماریہ کو فوراً" ہی معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

"جی آپی... وہ میں نے..."

"مجھ سے پوچھا تھا؟" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"میں پوچھنا چاہتی تھی مگر آپ سو رہی تھیں تو اس لیے۔" وہ اٹکنے لگی۔

"سو ہی رہی تھی' مر تو نہیں گئی تھی نا' ایک اس کو ڈھونڈنے کی خواری اور اوپر سے دیکھو' تم نے اس کا کیا حشر کیا ہے۔" اس نے ڈائجسٹ کھول کر اسے دکھایا۔

"تم جانتی ہو ناں کہ میں ایسی لاپروائی اور بے ... کسی طور برداشت نہیں کر سکتی۔ ایک ایک ... سے بچاتی ہوں میں انہیں اور تم نے لے کے ... رسالے کا بیڑا غرق کر دیا۔"

"وہ آپی! بڑی بھابھی نے بلا لیا تھا تو میں جلدی ...۔" وہ منمنائی' جس کا سارہ پر مطلق اثر نہ ہوا۔

"بڑی بھابھی نے ہی بلایا تھا ناں' کوئی موت کا فرشتہ ... نہیں آ گیا تھا جو تم یوں حواس باختہ ہو گئیں۔"

وہ کہنا چاہتی تھی کہ موت کا فرشتہ تو اب بھی نہیں آیا لیکن مزید شامت بلوانے سے خاموش رہنا بہتر تھا۔

"ڈونٹ ٹچ... آئندہ خبردار جو میری کسی بھی چیز کو ہاتھ لگایا تو... تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ انسانی چیزیں استعمال کر سکو۔"

وہ اپنی بات کہہ کر تن فن کرتی سیڑھیاں اتر گئی۔

ماریہ نے بے بسی سے اسے جاتے دیکھا اور پھر خود بھی ٹوکری اٹھا کر اس کے پیچھے ہو لی۔

☼ ☼ ☼

وہ بچپن سے ہی ایسی تھی' ایک ایک رتی کا خیال



رکھنے والی' ذرا سی کمی بیشی بھی برداشت نہ کرنے والی ..... اور جوں جوں بڑی ہوتی گئی' بردبار ہونے کے بجائے مزید شدت پسند ہوتی چلی گئی۔

بچپن میں وہ جب بھی امی سے چٹیا بنواتی' جھگڑا ضرور ہوتا۔ کبھی کہتی آپ نے فلاں بل صحیح نہیں ڈالا' کبھی اس بات پر کہ چٹیا بیچ میں نہیں ہے۔ امی کبھی تو اسے تسلی دیتیں اور کبھی زچ ہو کر کہتیں کہ "میرے پاس کوئی پیمانہ نہیں ہے' جس سے ناپ ناپ کر چٹیا بناؤں۔" اس جھنجٹ سے بچنے کے لیے اس نے چٹیا بنانا ہی چھوڑ دی مگر اب کیا کیا چھوڑتی۔

اسے ہاف بوائل انڈا پسند تھا لہٰذا بہت احتیاط سے ابالنا پڑتا۔ ذرا سا سخت ہونے کی صورت میں ابالنے والے کو خود ہی کھانا پڑتا تھا۔

اس کا بستر ہمیشہ شکنوں سے پاک ہوتا۔ چاہے خود بیٹھتی ہو یا کوئی اور' اٹھتے ہی دوبارہ سیٹ ہو جاتا۔ کپڑوں پر ایک بھی سلوٹ نظر آتی تو دوبارہ استری کرنے بیٹھ جاتی۔ اپنی کتابوں اور رسائل کو انتہائی حفاظت سے رکھتی کہ کہیں کوئی صفحہ خراب نہ ہو جائے اور جو یہ جرم کسی اور سے سرزد ہو جاتا تو ادھار رکھنا تو اسے آتا ہی نہیں تھا' جیسے ابھی ماریہ کی درگت بنی تھی۔ امی اسے لاکھ سمجھاتیں۔

"روبوٹ نہیں بستے یہاں پر.... کہ ہر کام جتنا اور جیسا ڈیٹا بھرا ہے' ہوتا رہے۔ یہ انسانوں کی دنیا ہے اور انسان خطا کا پتلا ہوتا ہے' لہٰذا کمی بیشی کی گنجائش رکھا کرو۔"

مگر مجال ہے جو اس کے کان پر جوں بھی رینگ جائے۔ آرام سے کہہ دیتی کہ اس کی نیچر ہی ایسی ہے اور اس کی اسی بے لچک نیچر کے باعث تمام جاننے والے اسے مس پرفیکشنسٹ کہہ کر چھیڑتے تھے جس کا وہ قطعی برا نہیں مانتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا جو چار بج کر بیس منٹ بجا رہی تھی۔ اس کا پارہ یک دم ہائی ہونے لگا۔

دراصل پچھلے دنوں محلے کی ایک خاتون اس کے پاس آئی تھیں۔ ان کے دو بچے میٹرک کے طالب علم تھے اور ایک ماہ بعد ان کے پیپرز تھے لیکن دونوں ہی ریاضی اور انگریزی میں کچھ کمزور تھے تو انہوں نے ساریہ سے کہا کہ ایک ماہ کے لیے انہیں پڑھا دے۔ اس کے اپنے امتحانوں میں بھی زیادہ عرصہ نہیں بچا تھا مگر ان کے اصرار پر اسے راضی ہونا پڑا اور چار بجے کا وقت دے دیا۔ اب مس پرفکشنسٹ کے نزدیک چار بجے کا مطلب چار بجے ہی تھا مگر کیا کیجئے کہ مقابل بھی قوم کے ازلی ڈھیٹ افراد تھے' جن کے لیے وقت کی پابندی سے بہتر' مرجانا تھا اور انہیں چونکہ اپنی زندگی بہت عزیز تھی لہٰذا لیٹ تھے۔

ساریہ نے ایک بار پھر گھڑی کی طرف دیکھا جو اب ساڑھے چار کا وقت بتانے لگی تھی۔ وہ تنگ آکر اٹھنے ہی والی تھی جب سنی اور حنا اسے آتے دکھائی دیے۔ وہ لب بھینچ کر وہیں بیٹھ رہی جب تک کہ وہ دونوں اس کے سامنے نہیں آکھڑے ہوئے۔

"یہ وقت ہے تم لوگوں کے آنے کا؟" اس نے تیکھی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"وہ باجی...!"

"کتنے بجے آنے کا کہا تھا میں نے؟" ان دونوں نے صفائی دینا چاہی جسے سننا اس نے ضروری نہیں سمجھا۔

"چار بجے۔" انہوں نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"اور اب کیا وقت ہوا ہے؟"

"چار بج کر پینتیس منٹ۔"

"اگر ناگوار نہ گزرے تو اتنی لیٹ آنے کی وجہ پوچھ سکتی ہوں میں۔" اس نے بھرپور طنز سے پوچھا۔ وہ دونوں کھسیانے ہو گئے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہیں' کیونکہ کوئی خاص وجہ تو تھی ہی نہیں لیٹ آنے کی۔ بس کمپیوٹر پر گیمز کھیلتے ہوئے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا اور جب خیال آیا تو کتابیں اٹھا کر چلے آئے اور بس یہیں بھول ہو گئی' وہ تو اپنی پرانی ٹیچر کے عادی تھے۔ جہاں بیس تیس منٹ کی تاخیر معمول کی بات تھی اور جس پر زیادہ بازپرس بھی نہیں ہوتی تھی مگر

بس جانتے تھے کہ یہاں ان کا سامنا ساریہ سے تھا جو ب ایک لمحے کا حساب رکھتی تھی۔ وہ شرمندہ ہو کر ھنے لگے کہ اب کہیں کھڑے رہنے پر ڈانٹ نہ پڑ ائے۔

"بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے ڈپٹ کر لہا۔ "کیونکہ میں تم جیسے غیر ذمہ دار لوگوں کو پڑھانے ا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ ٹیوشن کے پہلے دن تم لوگوں ی لاپروائی کا یہ عالم ہے تو آگے بھی کوئی اچھی امید رکھنا عبث ہو گا' لہٰذا روز روز کی چخ چخ اور ٹینشن سے ہتر ہے کہ تم لوگ اپنے لیے کسی اور ٹیچر کا انتظام کر و۔"

اس نے دوٹوک انداز میں انہیں اپنا فیصلہ سنایا اور ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔ امی کو پتا چلا تو سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"یا اللہ! میں کیا کروں اس لڑکی کا.... ارے ایک بار کی غلطی تو خدا بھی معاف کر دیتا ہے۔ برسوں کی محلے داری کا بھی خیال نہیں رکھا اس لڑکی نے۔"

"بات محلے داری یا رشتے داری کی نہیں ہے امی! اصول کی ہے۔ جب چار بجے کا ٹائم دیا تھا تو چار بجے ہی آنا چاہیے تھا' چلیں! کسی مجبوری کے تحت پانچ دس منٹ کی دیر تو برداشت کی جا سکتی ہے لیکن جان بوجھ کر اتنی غفلت' ایسی غیر ذمہ داری...؟ آئی ایم سوری! میری برداشت سے تو باہر ہے اور اگر آپ کو اتنا ہی افسوس ہو رہا ہے محلے داری کا تو آپ خود ڈھونڈ کر دے دیجیے کوئی ٹیوٹر' پر مجھ سے توقع نہ رکھیے۔"

وہ اطمینان سے کہتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور امی کے پاس بے بسی سے اس کی پشت دیکھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ یہ کوئی پہلی بار تو ہوا نہیں تھا لہٰذا گہری سانس لے کر نماز کے لیے اٹھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے کپڑے سل گئے ہیں ساریہ! دیکھ لو۔" بھابھی کے ہاتھ میں اس کا نیا جوڑا تھا' جو انہوں نے پورے دو دن لگا کر اور ایک ایک انچ ناپ کر سیا تھا۔

ساریہ جو امی سے بالوں میں تیل لگوا رہی تھی' جھٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے تیل تو لگوالو۔" اسے اٹھتے دیکھ کر امی نے ٹوکا۔

"ابھی آکے لگواتی ہوں۔" وہ بھابھی کے ہاتھ سے اپنا جوڑا لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

بھابھی خاموشی سے امی کے پاس بیٹھ گئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ کپڑے اٹھائے واپس آئی' چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

"یہ کیسا سوٹ سیا ہے آپ نے؟" اس کے پوچھنے پر بھابھی گھبرا گئیں۔

"پھر کوئی کمی رہ گئی ہے کیا....؟" انہوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ اتنی جان لگا کر سیا اور پھر.... ان کے پریشان چہرے کو دیکھ کر وہ مزید ضبط نہ کر سکی اور ہنستے ہوئے ان کے گلے لگ گئی۔

"یہ ہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ کیسا سوٹ سیا ہے آپ نے' جس میں کوئی کمی ہی نہیں ہے' ایک دم پرفیکٹ۔" اس نے امی کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا تو انہوں نے مطمئن نظروں سے بہو کی طرف دیکھا۔

"شکر ہے تمہیں پسند آیا ورنہ میں تو سوچ رہی تھی کہ کہیں میری دو دن کی محنت اکارت ہی نہ چلی جائے۔" بھابھی نے اس کی پسندیدگی پر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے کہا مگر امی اچانک سنجیدہ ہو گئیں۔

"اپنی اس عادت کو کچھ کنٹرول کرو ساریہ! زندگی میں سب ہی کچھ من چاہا یا پرفیکٹ نہیں ملتا۔ بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ آگے تمہاری شادی بھی ہونی ہے۔ ساس' نند' دیورانی' جٹھانی سب ہی رشتوں کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ کئی سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ اونچ نیچ سہنی پڑتی ہے۔ صبر و برداشت سے ہی گھر کی بنیادوں کو مضبوطی بخشی جاتی ہے اور جیسا تمہارا مزاج ہے ناں! مجھے تو دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔ خدا جانے کیا بنے گا۔"

ان کے لہجے میں تفکر کی لہریں تھیں۔ ساریہ مسکرا دی۔

"تواس کا بہترین حل یہ ہے کہ آپ میری شادی کسی ایسے لڑکے سے کرادیں جو اکلوتا ہو اور جس کے ماں باپ اس دارِ فانی سے کوچ کر چکے ہوں۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔" اس نے امی کی پریشانی کو چٹکیوں میں اڑا دیا۔

"اور جو وہ اکلوتا بھی تمہارے معیار پر پورا نہ اترا تو ــــ؟" انہوں نے اس کا کان کھینچ کر پوچھا۔

"تو کیا ــــ موصوف اپنے گھر خوش اور میں اپنے گھر خوش۔" اس نے تو کندھے اچکائے تھے لیکن امی کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا' آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"نہ میری بچی ــــ آئندہ مذاق میں بھی کبھی ایسی بات منہ سے نہ نکالنا۔ تو نہیں جانتی' بیٹیاں جب رخصت ہوتی ہیں تو ماں باپ کی سانسیں بھی جیسے سہاگ کے جوڑے میں ساتھ باندھ لے جاتی ہیں۔ ان کی خانہ آبادی ہی والدین کی زندگی ہوتی ہے اور جن بدنصیب والدین کی بیٹیاں پھر سے میکے کی دہلیز پر آ بیٹھتی ہیں تو وہ زندہ لاش بن جاتے ہیں۔ جیتے جی مر جاتے ہیں۔ اللہ کسی ماں باپ کو بیٹی کا دکھ نہ دکھائے اور سب کے صدقے میری بیٹی کو بھی آباد کرے اور آئندہ خبردار! جو ایسی بات کی ہو تو ــــ" انہوں نے نم آنکھوں کے ساتھ پیار سے اس کے سر پر چپت لگائی تو اس نے شرمندگی سے ان کی گود میں منہ چھپا لیا۔

☼ ☼ ☼

اس کی تو جیسے دعا قبول ہوئی تھی۔ فیصل بہت اچھا لڑکا تھا۔ شکل و صورت بھی اچھی تھی۔ ماں باپ بچپن میں ہی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ بہن بھائی کوئی تھا نہیں۔ بچپن خالہ کے بچوں کے ساتھ گزرا۔ مائیکرو اکنامکس میں ایم ایس کرنے کے بعد ایک بینک میں جاب مل گئی۔ کچھ عرصہ بعد بینک سے قرضہ لے کر فلیٹ خرید لیا اور اب اسٹیبلش ہونے کے بعد شادی کے لیے تیار تھا۔

امی ابو کو اس رشتے میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی لہٰذا بھائی سے مشورہ کر کے متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا اور بھابھی کو تو جیسے موقع مل گیا' اکثر اسے چھیڑتی رہتیں۔

"بھئی ہماری ساریہ کو تو سمجھو ساری ٹینشنوں سے نجات مل گئی ہے۔ ایک ہی بے چارہ میاں ہو گا جو صبح کا گیا شام کو لوٹے گا لہٰذا نہ کوئی بے ترتیبی نہ گندگی اور نہ ہی کوئی چیزوں کو خراب کرنے والا۔ ہر کام پاکستان کے معیاری وقت کے عین مطابق ہو گا۔ غرض ہماری ساریہ کا گھر تو جنت کا نمونہ ہی سمجھو۔"

وہ ہنس کر چپ ہو جاتی کہ واقعی اس نے ایسا ہی سوچ رکھا تھا۔ امتحان کے فوراً بعد نہایت دھوم دھام سے اس کی شادی ہوئی اور پھر وہ دونوں کہساروں کے راز جاننے شمالی علاقہ جات کی طرف نکل گئے۔ ایک دوسرے کی دلفریب سنگت میں ایک ماہ کا عرصہ کیسے گزرا' پتا ہی نہیں چلا اور یوں ہنی مون کی خوشگوار یادیں لیے وہ لوگ واپس آ گئے۔

☼ ☼ ☼

شادی کے بعد آج فیصل کا آفس میں پہلا دن تھا۔ اسے ناشتہ کروانے کے بعد وہ جما جما کر اپنے کپڑے استری کر رہی تھی۔

اتنے دنوں بعد امی سے ملنے کا احساس اتنا خوش کن تھا کہ وہ سب کچھ بھلائے ہوئے تھی۔ اسے میکے چھوڑ کر فیصل کو آفس جانا تھا اور رات میں کھانا کھا کر واپسی کا ارادہ تھا۔

"جلدی کرو ساریہ ــــ میں آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں۔"

فیصل کی پکار پر اس نے آخری نظر کپڑوں کو دیکھا' بہترین استری ہوئے تھے۔ اس نے مطمئن ہو کر استری اسٹینڈ پر رکھی ہی تھی کہ موبائل بجنے لگا۔

امی کا فون تھا' وہ چھوٹتے ہی بولیں۔

"ساریہ! تمہارے ابو کے دوست تھے ناں احسان صاحب' کل رات ان کا انتقال ہو گیا۔ ہم سب وہیں جا رہے ہیں تمہارے ابو کے ساتھ' تمہیں اس لیے بتا

ہی ہوں کہ تم آؤ اور ہم گھر پر نہ ملیں تو اچھا نہیں لگے نا۔"

"میں تو اتنی خوش تھی کہ اتنے دنوں بعد آپ سے ملوں گی۔" اس کے کہنے پر وہ مسکرا دیں۔

"کیا کریں بیٹا مجبوری ہے نا' چلو تم ایسا کرنا کہ شام میں فیصل کے ساتھ آ جانا ــــ مل کر کھانا بھی کھا لیں گے اور ملاقات بھی ہو جائے گی۔"

ان کی تجویز پر خوش ہوتی وہ فون بند کر کے باہر آئی تو فیصل تیار کھڑا تھا۔

"اوہو یار! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں' میں پہلے ہی لیٹ ہو چکا ہوں۔" اس نے جھنجلا کر کہا تو ساریہ نے اسے امی کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا اور اسے جلد آنے کی تاکید کی۔

فیصل کے جانے کے بعد اس نے چھوٹے موٹے کام سمیٹے۔ گھر پہلے ہی صاف تھا پھر بھی ہلکی ہلکی جھاڑ پونچھ کر لی۔ دوپہر میں شام کے بچے ہوئے چکن کڑاہی کے ساتھ روٹی کھائی اور ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے سو گئی۔ اٹھی تو ابھی صرف چار ہی بجے تھے۔ فیصل کا آفس چھ بجے آف ہوتا تھا' سو انتظار کے سوا فی الحال اسے کوئی کام نہیں تھا۔ وہ شدید بوریت محسوس کرنے لگی۔ تب ہی اسے خیال آیا کہ کیوں نہ فیصل کے آنے تک ایک چکر پڑوس کا لگا لیا جائے۔ آخر اب اسے یہیں رہنا تھا لہٰذا تھوڑی جان پہچان ضروری تھی۔ یہ ہی سوچ کر وہ برابر والی نسیمہ آنٹی کے گھر چلی گئی۔

نسیمہ آنٹی اس کی امی کی عمر کی ایک نفیس خاتون تھیں۔ بڑی بیٹی کی شادی کر چکی تھیں اور اب بیٹے کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

ان کے ساتھ بیٹھے باتیں کرتے' وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور جب گھڑی دیکھی تو ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ وہ عجلت میں انہیں خدا حافظ کہتی اپنے دروازے تک آئی تو لاک کھلا ہوا تھا۔ وہ حیران ہوتی اندر چلی آئی' سامنے ہی صوفے پر فیصل بیٹھا تھا۔ چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ ساریہ ٹھٹک کر رک گئی۔

"آپ کب آئے' آپ کا آف تو چھ بجے ہوتا ہے نا!" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کہاں تھیں تم ــــ؟" اس نے جیسے ساریہ کا سوال سنا ہی نہیں یا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا' وہ کھسیانی سی ہو گئی۔

"وہ دراصل میں بور ہو رہی تھی تو سوچا ہمسایوں کی خیر خیریت پوچھ لی جائے ــــ جان پہچان اچھی ہوتی ہے ناں۔" اس نے فیصل کے سخت لہجے میں پوچھے گئے سوال پر وضاحت دی۔

"کس سے پوچھ کر گئی تھیں؟" اس کا لہجہ ہنوز درشت تھا۔ ساریہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے غصہ آ کس بات پر رہا ہے' پڑوس میں جانے پر یا اس سے پوچھے بغیر جانے پر۔

"اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ برابر میں ہی تو گئی تھی' نسیمہ آنٹی کے ہاں ان سے تو کافی اچھے مراسم ہیں آپ کے ــ بتا رہی تھیں وہ ــــ" اس نے پھر نا سمجھی میں جواب دیا۔

"نسیمہ آنٹی کے ہاں جاؤ یا اپنی ماں کے گھر ــــ مجھ سے پوچھے بغیر یا اکیلے تم کہیں بھی نہیں جاؤ گی۔ مجھے قطعی پسند نہیں ہے عورتوں کا یوں بے لگام ہو کر پھرنا۔" وہ بغیر کسی لچک کے حاکمانہ انداز میں کہتا کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

ہتک کے احساس سے ساریہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ

بھڑک اٹھی۔

"یہ آپ مجھ سے کس انداز میں بات کر رہے ہیں ـــــ بیوی ہوں آپ کی، کوئی ملازمہ نہیں کہ ایسا سلوک برداشت کروں آپ کا۔ اتنا ہی شوق تھا حکم چلانے کا تو گاؤں کی کوئی ڈری سہمی، جاہل گنوار لے آتے ـــــ میں پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہوں۔ اچھے برے کی تمیز ہے مجھے ـــــ میری بھی عزت ہے، حیثیت ہے، مرضی ہے، خوامخواہ میں ـــــ"

وہ ہمیشہ کی طرح بات ناگوار گزرنے پر تیز تیز بولتی کچن کی طرف مڑ گئی تھی مگر یہ اس کا میکا نہیں تھا جس کا صحیح اندازہ اسے تب ہوا جب پیچھے سے فیصل نے اسے بالوں سے جکڑا اور اپنی طرف کھینچ لیا۔ آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ غصے سے اس کا چہرہ شدید سرخ ہو رہا تھا اور کنپٹیوں کی رگیں تن گئی تھیں۔

"مجھے آج کل کے مردوں کی طرح نہ سمجھنا جو عقل و ہوش بیویوں کے پاس گروی رکھ کر ان کی ہاں میں ہاں ملانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ میں مختلف سوچ کا انسان ہوں۔ عورتوں کی خودسری جوتی کی نوک پر رکھتا ہوں۔ سمجھیں؟ بات کرتی ہے اپنی مرضی کی۔ آئندہ خبردار! جو میرے آگے مرضی کی بات کی یا زبان چلائی تو ـــــ زبان کاٹ دوں گا۔"

وہ ساریہ کے ہوش ٹھکانے لگا کر میز پر رکھے ڈائجسٹ کو دولخت کرتا، صوفے کو ٹھوکر مارتا باہر نکل گیا تھا اور ساریہ، وہ تو جیسے کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ ایک ماہ کے مہذب پن کی قلعی پوری طرح کھل چکی تھی۔

اس کے بال الجھ کر گچھے کی شکل اختیار کر چکے تھے اور کپڑے بے ترتیب ہو گئے۔ ٹوٹی ہوئی چیزوں کے ساتھ اس کی عزت نفس اور نفاست پسندی بھی جگہ جگہ بکھری پڑی تھی مگر پھر بھی اس کی زبان گنگ اور آنکھیں ساکت تھیں کہ وہ جو امی کے لاکھ سمجھانے کے باوجود کسی چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی سمجھوتا نہیں کرتی تھی، زندگی کے سب سے بڑے امتحان میں شکست کھا گئی تھی۔ اس کے نصیب میں مردانگی کے غرور میں جکڑا ایک ایسا خودپسند شخص تھا جو پرفیکٹ تو کیا ایک عام آدمی کے معیار پر بھی پورا نہیں اتر تا تھا اور ساریہ کے پاس کوئی ایسا آلہ نہیں تھا کہ جس سے وہ اس کی سوچ بدل کر اسے پرفیکٹ بنا سکتی۔

جانے کتنی دیر گزری تھی جب موبائل بجنے لگا۔ مسلسل بجتی بیل گہری خاموشی میں چنگھاڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے دکھتے بدن اور ٹوٹی ہوئی عزت نفس کو سنبھالتے بے توجہی سے نمبر دیکھا۔ امی کی کال تھی، جسے اس نے کانپتے ہاتھوں سے ریسیو کیا۔

"ہاں تو بیٹا! پھر آ رہی ہو ناں ڈنر پر فیصل کے ساتھ؟"

سلام دعا کے بعد انہوں نے پوچھا تھا۔ اس کا دل چاہا چیخ چیخ کر روئے، انہیں ان کے داماد کی اصلیت بتائے کہ جس نے ذرا سی بات پر اسے وحشیوں کی طرح پیٹ ڈالا تھا مگر زخمی ہونٹ کپکپا کر رہ گئے اور بولی تو صرف اتنا۔

"نہیں امی! آج تو مشکل ہے ـــــ وہ دراصل فیصل کے کچھ دوست آئے ہوئے ہیں۔ شادی کی ٹریٹ مانگ رہے تھے فیصل سے تو ان ہی کے لیے کھانا بنا رہی ہوں۔"

اس نے انہیں مطمئن کر کے فون بند کر دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اسے آج احساس ہو رہا تھا کہ ان چھوٹے چھوٹے معاملات پر کمپرومائز کرنا کتنا آسان تھا مگر ساری زندگی پر سمجھوتا کرنا کہ جہاں پل پل جینا اور پل پل مرنا پڑے کتنا مشکل ہے ـــــ لیکن اسے یہ بھی کرنا تھا کہ اس کے لیے اپنے ماں باپ کی سانسیں اپنی ذات سے بڑھ کر عزیز تھیں اور جنہیں وہ رخصتی کے وقت اپنے سہاگ کے جوڑے میں ساتھ باندھ لائی تھی۔



نہیں ہے سود مگر رنجشِ زباں بھی نہیں
جو عمر گزری ہے، کچھ ایسی رائیگاں بھی نہیں

میں کس سے جا کے کہوں حال دیدۂ نم کا
کہ میرے دکھ سے تو آگاہ میری ماں بھی نہیں

وہ بار بار مجھے آزمائے جاتا ہے
یہ جانتا ہے کوئی اپنے درمیاں بھی نہیں

یہ بارشیں بھی تو کچی چھتوں کی دشمن ہیں
مگر یہاں تو میرے سر پہ سائباں بھی نہیں

تم اس سے روٹھ کے یہ بات بھی عیاں کر دو
ذرا سی بات پہ جھکتی یہ لڑکیاں بھی نہیں

بس اک مقام پہ آ کر ٹھہر گیا وہ تو
مجھے یقین ہے جس کا اسے گماں بھی نہیں

یہ کس کے غم میں سمندر ملول ہے ثروت
بڑا اداس ہے ساحل کہ سیپیاں بھی نہیں

ثروت ظفر



ایک سوچ

جس کی یادوں کے دیپ میری پلکوں
کی چلمن پہ جا بجا روشن ہیں
وہ بادل مزاج کیا جانے؟
اب کس آنگن برس رہا ہو گا

شبانہ یوسف

آگ، پانی، خاکِ باد
زندگانی کی نہاد
دیکھنے میں سخت محکم
اور پرکھیے تو، بہت ناپائیدار
سوچیے تو ذی کمال و ذی وقار
تولیے تو، خام، بودی، کم عیار
پھر بھی
ہر ذی روح کی
تھی نگاہوں میں کبھی
ایک تحفہ، ایک امانت، زندگی
آج لیکن ایک ایسی راہ پر
گامزن ہے زندگی کا قافلہ
ماورائے امتیازِ رنگ و بو
اک محبت، اک عبادت، زندگی
اک اک لحظہ گزرتا ہے گماں
زمین بارود کا انبار ہے
ایٹمی ماچس کی اک تیلی اسے درکار ہے

منظر ایوبی

جب کبھی زندگی کو سوچتا ہوں
ہر گھڑی تشنگی کو سوچتا ہوں

تیرے ہونے سے سب مکمل تھا
آج تیری کمی کو سوچتا ہوں

خواہشیں راکھ ہو گئیں جس سے
میں اسی بے بسی کو سوچتا ہوں

تجھ سے احساس کا ہے ربط عجیب
کب کہاں میں کسی کو سوچتا ہوں

مجھ میں جو ہے ترے خیال کے ساتھ
اب میں اس روشنی کو سوچتا ہوں

جب بھی تنہائی گھیرتی ہے مجھے
پھر میں تیری ہنسی کو سوچتا ہوں

دل کے صحرا میں جب غبار اٹھے
قطرہ قطرہ تجھ ہی کو سوچتا ہوں

عرفان صدیقی

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت جودانؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس نے اپنے بھائی سے (کسی غلطی پر) معذرت کی اور اس نے قبول نہ کی، اس پر (ناجائز) ٹیکس وصول کرنے والے جتنا گناہ ہے۔"

(ابن ماجہ 3718)

سیکھنے کی بات،

ایک قافلہ ایک اندھیری گلی سے گزرا۔ ان کے پاؤں میں کنکریاں چبھیں۔ کچھ لوگوں نے اس خیال سے کہ یہ کسی اور کو بھی چبھ سکتی ہیں، نیکی کی خاطر اٹھا کر جیب میں رکھ لیں۔ کچھ نے زیادہ اور کچھ نے کم۔ جب اندھیرے سے باہر آئے اور دیکھا تو وہ ہیرے تھے۔ جنہوں نے اٹھائے کم وہ پچھتائے کہ کم کیوں اٹھائے۔ جنہوں نے نہیں اٹھائے وہ بھی پچھتائے۔
دنیا کی زندگی کی مثال اس اندھیرے کی ہے۔ نیکیاں کنکریوں کی طرح ہیں۔ اس زندگی میں جو بھی نیکی کرے گا وہ آخرت میں ہیرے جیسی ہوگی اور انسان ترسے گا کہ زیادہ کیوں نہیں کی۔

نمرہ، اقراء۔ کراچی

آپ بھی پوچھیے،

○ کیا تمہیں جانوروں سے محبت ہے؟
○ جی ہاں اور خاص کر بھنے ہوئے مرغ سے۔
○ شرم کرو، مار کھا کر بھی ہنس رہے ہو؟
○ جناب! آپ ہی تو کہتے ہیں کہ مصیبت کے وقت کو ہنس کر ٹال دو۔
○ تم نے ایک کان پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟
○ آپ ہی نے کہا تھا کہ ہم ہر بات ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔
○ کسی بے وقوف کے سوال کا جواب بڑے سے بڑا عقل مند بھی نہیں دے سکتا۔
○ جب ہی تو کل میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکا۔
○ کون سی چیز محنت کے بعد بھی نہیں ملتی؟
○ میری تنخواہ۔
○ بے جان چیزیں نہیں بولتیں؟
○ مگر جناب! ریڈیو تو بے جان ہے۔ وہ کیسے بولتا ہے؟
○ میں تم سے اتنی دیر سے سوال کا جواب پوچھ رہا ہوں، تم جواب کیوں نہیں دیتے؟
○ استاد جی! میری امی کہتی ہیں کہ بڑوں کے سامنے جواب نہیں دینا چاہیے۔
○ انڈے اور ڈنڈے میں کیا فرق ہے؟
○ دونوں کھانے کی چیزیں ہیں۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

قابلیت،

ایک دن شدید فلو میں مبتلا ہو کر میں بستر پر پڑا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ فون پر میری بیٹی جو جانوروں کے علاج کے کالج میں سیکنڈ ایر کی طالبہ تھی۔ میری آواز سے اس نے میری حالت کا اندازہ لگا لیا۔
"ڈیڈ! آپ کی حالت بہت بری محسوس ہو رہی ہے۔ کیا آپ ڈاکٹر کے پاس گئے تھے؟"
میں نے کہا کہ میں ڈاکٹر کے پاس نہیں گیا اور یہ بھی کہ میں جلدی ٹھیک ہو جاؤں گا۔
"لیکن کیا آپ کو اندازہ نہیں کہ آپ کو نمونیا بھی

ہو سکتا ہے اور آپ کے پھیپھڑوں میں زخم بھی لگ سکتے ہیں۔"

اس نے میری توجہ خطرناک بیماریوں کی طرف دلائی تو میں واقعی پریشان ہو گیا۔

"کیا تم واقعی سمجھتی ہو کہ مجھے نمونیا ہے؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"معلوم نہیں ڈیڈ۔ یہ بات تو میں آپ کو تب بتا سکتی جب آپ گھوڑا ہوتے۔"

سدرہ سحر عمران۔ کراچی

سمجھنے کی بات،

- ہم دن میں ہزاروں غلطیاں کرتے ہیں لیکن خود سے کبھی نفرت نہیں کرتے اور ہمارے دوست ایک غلطی بھی کریں تو ایک منٹ میں ان سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔
- ان لوگوں کی قدر کرو جو تمہارے لیے اپنی معروف روٹین میں سے وقت نکالتے ہیں لیکن ان لوگوں سے محبت کرو جو اپنی روٹین کو نہیں دیکھتے۔ جب تمہیں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔

فریحہ شبیر۔ شاہ نکڈر

نقاد،

- نقاد ایک ایسے انسان کی طرح ہوتا ہے جس کی اپنی ٹانگیں نہ ہوں اور وہ بھاگنے کی کوشش کرے۔
- نقاد وہ شخص ہوتا ہے جو ان چیزوں پر لکھتا ہے جنہیں وہ پسند نہیں کرتا۔
- ایک نقاد نے فلم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔ "فلم اتنی بری تھی کہ جو لوگ فری پاس لے کر فلم دیکھنے آئے تھے انہیں بھی یہ فلم پسند نہ آئی۔"
- نقاد نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔ "اگر اس ناول میں کوئی ہیرو ہے تو اسے چاہیے کہ وہ مصنف کو قتل کر دے۔"
- "اس فلم میں دس اداکار ہیں جنہیں کمزور کہانی نے قتل کر کے دفن کر دیا ہے۔"

انیقہ انا۔ چکوال

محبت کہیں جسے،

مشہور امریکی شاعر "پال پاٹس" بہت عمدہ شاعری کرتے تھے۔ ان کی چار دلکش نظموں کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

- ہماری تاریخ دو حصوں پر بٹی ہوئی ہے۔ عیسیٰؑ کے جنم سے پہلے اور عیسیٰؑ کے جنم کے بعد۔ اسی طرح میری زندگی بھی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ تجھے دیکھنے سے پہلے اور تجھے دیکھنے کے بعد۔
- ایک دن میں نے گلی میں موت کو دیکھا۔ وہ بالکل اس زندگی جیسی تھی جیسی زندگی میں تیرے بغیر جی رہا ہوں۔
- کسی ایسے شخص سے پیار کرنا جو تم سے پیار نہ کرتا ہو، کسی ایسے ملک کا نمائندہ بننا ہے جس ملک کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔
- تجھے پلٹ کر دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اندھا ہونے کے بعد پھر سے آنکھیں پالے۔

صائمہ سلیم سندھو۔ گوجرہ

موتی مالا

- دو ایسے پرندے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک اڑ جائے تو دوسرا خود ہی ختم ہو جاتا ہے۔
- کوشش کرو کہ زندگی میں وہ شخص آپ کو ہمیشہ مسکراتا ہوا ملے جسے آپ روز آئینے میں دیکھتے ہیں۔
- اس دل سے پیار نہ کرو جو تمہیں درد دے پر اس دل کو کبھی درد نہ دو جو تم سے پیار کرے کیونکہ تم دنیا کے لیے کوئی ایک ہو پر کسی ایک کے لیے پوری دنیا ہو۔

تحریم، عائشہ۔ فیصل آباد

یادگار لمحے،

- اگر کوئی شخص تمہاری رائے کی مخالفت نہیں کرتا تو بہتر ہے کہ ایک مرتبہ پھر اپنی رائے پر نظر ثانی کر لو۔
- بلنٹنے کی عادت ڈالیے۔ چیزیں بھی، جذبے بھی اور خوشیاں بھی۔
- بعض معاملات میں انسان جب تک خود تجربے سے نہ گزرے ــــ معاملے کی سنگینی اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔

صالحہ، اقصیٰ۔ میرپور آزاد کشمیر

روشن حرف وہ سارے،

- تیری گفتار اگر موتی بھی بکھیرے، خاموشی اس سے بھی بہتر ہے۔
- اگر تو آنکھ رکھتا ہے اور ایک عالم تیرے سامنے جلوہ گر ہے تو تجھے کسی معلم یا کتاب کی کیا ضرورت ہے۔
- ہم عادت کا بیج ڈالتے ہیں اور کردار کا پھل کاٹتے ہیں۔
- انسان شکل سے صرف جانا جاتا ہے، پہچانا کبھی نہیں جاتا۔
- غصہ آندھی ہے جو دماغ کے چراغ کو بجھا دیتی ہے۔
- جسے اس کے اعمال پیچھے ہٹا دیں، اسے اس کا حسب و نسب آگے نہیں بڑھا سکتا۔
- کامیاب معاشرہ وہی ہے، جس میں چپکے سے فرائض ادا ہوتے ہیں اور چپکے ہی سے حقوق ادا ہوتے ہیں۔

صبا سلیم۔ ٹنڈو جان محمد

اقتباس،

فیصلے کا لمحہ بڑا مبارک ہوتا ہے۔ زندگی میں بار بار یہ لمحات نہیں آتے۔ صحیح وقت پر مناسب فیصلہ ہی کامیاب زندگی کی ضمانت ہے۔ اگر غلطی سے کوئی فیصلہ غلط بھی ہو جائے تو اس کی ذمہ داری سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے فیصلے اپنی اولاد کی طرح ہیں۔ جیسے بھی ہیں ان کی حفاظت تو کرنا ہو گی۔ دنیا کی تاریخ کو بغور دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ اکثر تاریخی فیصلے غلط تھے لیکن تاریخی تھے۔ تقدیر اپنا بیشتر کام انسان کے اپنے فیصلے میں ہی مکمل کر لیتی ہے۔ انسان راہ چلتے چلتے دوزخ تک جا پہنچتا ہے یا وہ فیصلے کرتے کرتے بہشت میں داخل ہو جاتا ہے۔ بہشت یا دوزخ انسان کا مقدر ہے لیکن یہ مقدر انسان کے اپنے فیصلے کے اندر ہے۔

(واصف علی واصف)

صبا شفیق۔ جہلم

ترک فوجی،

کوریا کی جنگ کے سلسلے میں اقوام متحدہ کی عالمی تنظیم کی طرف سے جو فوج وہاں بھیجی گئی، ان میں ترک فوجی بھی شامل تھے۔ ترک فوجیوں نے اس جنگ میں جس جرأت اور دلیری کا ثبوت دیا، وہ ہمیشہ یاد رہے گا مگر اپنی جرأت اور دلیری کے ساتھ ساتھ ترک فوجی چند یادگار لطیفوں کے خالق بھی ہیں۔ جن میں سے ایک یوں بیان کیا جاتا ہے۔

ایک محاذ پر حملہ ہونے سے پہلے ترک فوجیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے آپ کو پوشیدہ رکھیں۔ انہوں نے فوراً حکم کی تعمیل شروع کر دی مگر جب کمپنی کمانڈر معائنہ پر آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ترک فوجیوں نے جہاں اپنے آپ کو گھاس پھونس، درختوں کے تنوں، ٹہنیوں اور جھاڑیوں تلے بڑی خوبی سے چھپا رکھا تھا وہاں انہوں نے پاس ہی اپنے وطن کا سرخ پرچم بھی گاڑ رکھا تھا، جو ہوا کی لہروں پر اپنے فدائیوں کی موجودگی کا اعلان کر رہا تھا۔

نمرہ، اقراء۔ کراچی

سرکاری کھانا،

قائداعظمؒ کھانا بہت کم کھاتے تھے۔ دبلے پتلے بوڑھے اور بیمار تھے۔ مرض الموت میں جسمانی کمزوری بڑھ گئی تھی۔ زیارت میں قیام کے دنوں میں ڈاکٹر الٰہی بخش نے تشویش ظاہر کی کہ کم خوراکی کی وجہ سے ان کی حالت تیزی سے خراب ہو رہی ہے۔ ان کی رائے تھی کہ لاہور میں جو باورچی کپور تھلہ برادرز کے نام سے مشہور ہیں، انہیں زیارت بھیجا جائے کیونکہ ان کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا قائداعظم کو مرغوب ہے۔ کپور تھلہ کے باورچی بھائیوں کی تلاش شروع ہوئی۔ وہ لاہور

چھوڑ کر لائل پور چلے گئے تھے۔ لائل پور سے زیارت پہنچے۔ کھانا پکایا۔ اس روز قائداعظم نے شوق سے چند لقمے کھائے۔ کھانے کے بعد اپنے پرائیویٹ سیکریٹری فرخ امین کو بلوایا۔ کھانے میں فرق کی وجہ دریافت کی۔ وجہ بتائی گئی تو وہ ناخوش ہوئے۔

چیک بک منگوائی، باورچیوں کے آنے جانے کے خرچ کا حساب کیا۔ اس رقم کا چیک کاٹا۔ رقم سرکاری خزانے میں جمع کرائی۔ باورچی رخصت کیے اور کہا۔
"یہ حکومت یا ریاست کا کام نہیں کہ وہ گورنر جنرل کو اس کی پسند کا کھانا (سرکاری خرچ) پر فراہم کرے۔"

(مختار مسعود کی لوح ایام)
ثناء کنول معشوق۔ کوٹ غلام محمد

انقلاب

کسی ملک میں انقلاب آیا۔ اس ملک کا باشندہ بیرون ملک سے واپس آیا اور ایئرپورٹ سے نکل کر اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔
"سگریٹ کہاں سے ملے گا؟"
"سگریٹ خریدنے کے لیے آپ کو چرچ جانا پڑے گا۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔
"کیا! چرچ تو وہ جگہ ہے جہاں عبادت کی جاتی ہے۔"
"لوگ عبادت کے لیے یونیورسٹی جاتے ہیں۔"
"لیکن یونیورسٹی میں تو پڑھنے والے لوگ ہیں"
"نہیں پڑھنے والے جیل میں ہیں۔"
"جیل میں تو مجرم ہوتے ہیں۔"
"اوہ نہیں۔ وہ تو برسراقتدار ہیں۔"
عذرا، اُکفتی۔ کراچی

وکیل

یو، ایس کی ایک کورٹ میں وکیل اور ڈاکٹر کے درمیان بحث میں یہ ڈائیلاگ ہوئے۔
وکیل: "تم نے پوسٹ مارٹم سے پہلے نبض چیک کی تھی؟"
ڈاکٹر: "نہیں۔"
وکیل: "اس کا بلڈ پریشر؟"
ڈاکٹر: "نہیں۔"
وکیل: "سانس۔"
ڈاکٹر: "نہیں۔"
وکیل: "تو پھر تم کو کیسے پتا چلا کہ وہ مرچکا ہے؟"
ڈاکٹر: "کیونکہ اس کا دماغ ایک جار میں میری ٹیبل پر رکھا تھا۔"
وکیل: "لیکن ابھی بھی ممکن تو ہے کہ وہ زندہ ہو۔"
ڈاکٹر: "ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ زندہ ہوگا اور کہیں وکالت کررہا ہوگا۔"
عابدہ نثار۔ کراچی

بھرم

چار دوست شراب پی رہے تھے۔ ٹیبل پر رکھے چاروں کے موبائل میں سے ایک بجنے لگا۔ ایک دوست نے اُٹھایا اور بات کرنے لگا۔ "ہیلو۔"
دوسری طرف سے ایک عورت بولی۔ "جان! میں بازار میں ہوں، تمہارا کریڈٹ کارڈ میرے پاس ہے۔ کیا میں ایک لاکھ کا جیولری سیٹ خرید لوں۔"
اس نے جواب دیا۔ "ہاں ہاں بیگم لے لو۔"
بیوی نے پھر کہا۔ "سلک کی ساڑھی بھی، جو بیس ہزار کی ہے۔"
"ایک نہیں، دو چار لے لو بیگم۔" پھر فون رکھ دیا باقی دوستوں نے حیرت سے کہا۔ "تم پاگل ہو یا تمہیں زیادہ چڑھ گئی ہے۔" "یا بھرم دکھا رہے ہو تم؟"
"یہ سب چھوڑو، پہلے یہ بتاؤ، یہ موبائل کس کا تھا؟" اس نے آرام سے پوچھا۔
ندا، فضہ۔ کراچی





ساره انعم کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر امجد اسلام امجد کی یہ نظم
...سل کے ہر نمائندہ ہر طالب علم کے دل کی آواز ہے۔
...ئی نسل کا دکھ ہم نئی نسل کا نوحہ۔

...سوچتا ہوں
...ا ہے جو کچھ پڑھا ہے جو کچھ
...کس لیے تھا وہ کس لیے ہے؟
...ے بتاؤں کہاں سے پوچھوں؟
...ے عقیدوں کے خواب دے کر کہا گیا ان میں روشنی
...ہے
...ی قدروں کی چھب دکھا کر مجھے بتایا یہ زندگی ہے
...ھائے مجھ کو کمال ایسے
...بیں نہ لائیں سکھانے والے اگر ان ہی کو میں جا سناؤں
...ں کہنہ آنکھوں کی دسترس میں نئے مناظر کہاں سے
...ؤں
...ہاں یہ جنس کمال رکھوں؟ خیال تازہ کہاں سجاؤں
...ن پاؤں تلے نہیں ہے تو کیسے تاروں کی سمت
...اؤں؟
...نہیں سنبھالوں؟ یا آنے والے نئے عقیدوں کا
...سید پاؤں؟
...ہ سب عقیدے تمام قدریں، خیال سارے
...مجھ کو سکے بنا کے بخشے گئے میرے حواس خمسہ سے
...معتبر تھے
...ب ان کو رہبر بنا کے نکلا تو میں نے دیکھا
...میرے ہاتھوں میں کچھ نہیں ہے
...ں ایسے بازار میں کھڑا ہوں جہاں کرنسی بدل چکی

ہے۔

طیبہ کریم بخش کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر امید فاضلی کی بہترین غزل سب دوستوں کی نذر۔

وہ خواب ہی سہی پیش نظر تو اب بھی ہے
بچھڑنے والا شریک سفر تو اب بھی ہے

ہزار وقت نے دیوار ہجر اُٹھا دی مگر
خیال یار مرا ہمسفر تو اب بھی ہے

مگر یہ کون بدلتی ہوئی رُتوں سے کہے
شجر میں سایہ نہیں ہے، شجر تو اب بھی ہے

محبتیں ہیں اگر معتبر تو پھر اک شخص
محبتوں کی طرح معتبر تو اب بھی ہے

زباں بریدہ سہی، میں خزاں رسیدہ سہی
ہرا بھرا مرا زخم ہنر تو اب بھی ہے

ہماری در بدری پر نہ جائیے کہ ہمیں
شعور سایۂ دیوار و در تو اب بھی ہے

ثمرین افضل کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ غزل آپ سب

قاریئن بہنوں کی نذر۔
تمہیں بخشی ہے دل پہ حکمرانی اور کیا دیتے
یہی تھی بس ہماری دراج دھانی اور کیا دیتے

ستاروں سے کسی کی مانگ بھرنا اک فسانہ ہے
تمہارے نام کردی زندگانی اور کیا دیتے

وہ ہم سے مانگتا تھا عمر کا اک دل نشین حصّہ
نہ دیتے اگر اُسے اپنی جوانی اور کیا دیتے

بچھڑتے وقت اس کو اک تحفہ تو دینا تھا
ہمارے پاس تھا آنکھوں میں پانی اور کیا دیتے

شبنم شمشاد کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر سلیم کوثر کی یہ غزل تمام پڑھنے والوں کے لیے۔

تارے جو کبھی اشک فشانی سے نکلتے
ہم چاند اُٹھائے ہوئے پانی سے نکلتے

خاموش سہی، مرکزی کردار تو ہم تھے
پھر کیسے بھلا تیری کہانی سے نکلتے

مہلت ہی نہ دی گردشِ افلاک نے ہم کو
کیا سلسلۂ نقل مکانی سے نکلتے

اک عمر لگی تیری کشادہ نظری میں
اس تنگیٔ داماں کو گرانی سے نکلتے

بس ایک ہی موسم کا تسلسل ہے یہ دُنیا
کیا ہجر زدہ خوابِ جوانی سے نکلتے

وہ وقت بھی گزرا ہے کہ دیکھا نہیں ہم نے
صحراؤں کو دریا کی روانی سے نکلتے

شاید کہ سلیم امن کی صورت نظر آتی
ہم لوگ اگر شعلۂ بیانی سے نکلتے

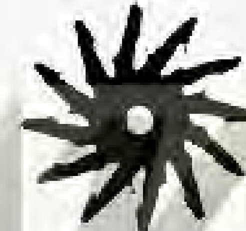
فرزانہ سہیل کی ڈائری سے

بعض سچائیاں بڑی تلخ ہوتی ہیں "محبت بھی! ایک ایسی تلخ سچائی ہے جو زندگی کے سارے موسموں کو خزاں میں بدل دیتی ہے۔ کچھ ایسی ہی حقیقت۔ غلام محمد قاصر کی اس نظم میں ہے۔

تاخیر

پیار کا لمحہ
صورتِ بہار، نمو کی صورت
خود میں چھپا کر مٹھی بھر مہکار تری خاموشی کی
شاخِ گلاب نے اپنے پہلے غنچے سے سرگوشی کی
دل کی صدا پر
خوشبو سے اک پھول چھپا کر
میں جب تیرے پاس آیا تو لوگ وہاں سے جا بھی چکے تھے
مجھ سے بڑھ کر چاہنے والے ہار تجھے پہنا بھی چکے تھے
کتنے ہی پھول ترے دامن تک آ بھی چکے
مرجھا بھی چکے تھے

شاخ بھی ہے افسردہ میری تنہائی بھی
پہلی محبت بن گئی پہلی رسوائی بھی
پیار کا لمحہ
سچائی بھی
ہرجائی بھی



خالدہ جیلانی



شبانہ امین راجپوت ____ کوٹ ادھاکشن
کچی مٹی کے گھروندے اکثر ٹوٹ جاتے ہیں
جن پہ گماں ہو اپنے ہیں وہ روٹھ جاتے ہیں
وقت کو کس طرح میں قید کروں یارب
ہر لمحے صدیوں کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں

عفت جبیں ____ فیصل آباد
ہوئی ہے شام تو آنکھوں میں بس گیا تو
کہاں گیا ہے میرے شہر کے مسافر تو
میں جانتا ہوں کہ دُنیا تجھے بدل دے گی
میں مانتا ہوں کہ ایسا نہیں بنا ہے تو

شازیہ رانا ____ دیپال پور
میں خود بھی تیری محبت سے پیشتر یوں تھا
کہ جیسے کوئی اُمت کتاب سے پہلے

فرزانہ فہیم ____ شاہ تکندر
وہ پریشان رہتا ہے اقرار نہیں کرتا
دل لے کے محبت کا اظہار نہیں کرتا
دل تو اس کا بھی ہوا محبت میں زخمی
زخموں کا اندازہ چہرے دیکھ کے نہیں ہوتا

آمنہ اُجالا ____ ڈہرکی
ہمارے بعد بھی رسمِ دوستی چلی کہ نہیں
ہماری یاد پہ کوئی شام بھی ڈھلی کہ نہیں
دیارِ ہجر سے آئے ہو کچھ تو کہو ٹھن
کہ شامِ غم کسی موڑ پہ ڈھلی کہ نہیں

کہکشاں صابر ____ کویت
اس کی آنکھوں میں ہم نے وفا دیکھی تھی
مہکتے پھولوں کی اک ادا دیکھی تھی
یہ نہ سوچا تھا کہ وہ بے وفا ہو گا فراز
اس میں تو ہم نے چاہت کی انتہا دیکھی تھی

رفیعہ بلوچ ____ گھوٹکی
پتھر ہوں تو کیوں خوف شبِ غم سے ہوں لرزاں
انسان ہوں تو جینے کی ادا کیوں نہیں آتی

ماریہ گل ____ عیسیٰ خیل
لوٹا ہے سدا جس نے ہمیں دوست بنا کر
ہم خوش ہیں اُسی شخص سے پھر ہاتھ ملا کر

گل پری مرزا ____ لاہور
یہ عشق و محبت، مہر و وفا، سب رسمی رسمی باتیں ہیں
ہر شخص خودی کے عالم میں بس اپنی خاطر جیتا ہے

شفق طاہر ____ گوجرہ
میری دُعاؤں میں تیرا وجود رہتا ہے
اس سے بڑھ کر میرا اعتراف کیا ہو گا

سائرہ لنگڑیال ____ سیال موڑ
ایسے ہوتے نہیں کچھ لوگ مگر جانے کیوں
دُھوپ میں سایۂ دیوار نظر آتے ہیں

زینب گل ____ گاؤں لاٹھوڑی
نہ جانے کون ہے جس کی تلاش میں
ہر اک سانس میرا اب سفر میں رہتا ہے

سادہ شیخ ____ کراچی
محبت کی نمازوں میں امامت ایک کو سونپو
اِسے تکنے اُسے تکنے سے نیت ٹوٹ جاتی ہے
محبت دل کا سجدہ ہے جو ہے توحید پر قائم
نظر کے شرک والوں سے محبت روٹھ جاتی ہے

شبنم شمشاد ____ یزمان
ہے تعلق تو اک سادہ لفظ
پھر جو بھی ہے وہ نباہ میں ہے
کب سے میں نے پلک نہیں جھپکی
کوئی امجد میری نگاہ میں ہے

رشیدہ بتول ______ سکھر

اک عجیب ٹھنڈک ہے اس کے نرم لہجے میں
لفظ لفظ شبنم ہے، بات بات پیاری ہے

مدیحہ احمد ______ رحیم یار خان

ان کی آنکھیں کہہ رہی ہیں عدم
ہم پہ تصنیف ایک کتاب کرو

فوزیہ ماجد ______ سرگودھا

یہ اور بات کہ ہم چھوڑ چکے کوزہ گری ورنہ
تیرے جیسے تو ہم مٹی کے بنا سکتے ہیں

روز مین ناز ______ کراچی

روپ تو اس کو ایسا دیتے دیکھتی ہی رہ جاتی دُنیا
بُت سازی ہی چھوڑ چکے تھے ہم جب وہ پتھر موم ہوا

شگرف اعجاز ______ کراچی

ایک ہی زخم نہیں، سارا وجود زخمی ہے
درد بھی حیران ہے کہ اُٹھوں تو کہاں سے اُٹھوں

ماہا انعام ______ کراچی

رچ بس گیا ہے ذہن میں نامِ کسی کا روپ
اب کیا کریں گے ہم کوئی شاہکار دیکھ کر

صبا افضل بٹ ______ دیپال پور

چمن ویران ہے اب تک شگوفے کھل نہیں پائے
بڑی تاخیر کر دی ہے کسی نے مسکرانے میں

یاسمین کنول ______ پسرور

ہم نشینی اگر کتاب سے ہو
اس سے بہتر کوئی رفیق نہیں

نمرہ، اقرأ ______ کراچی

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

سیدہ صائمہ سرفراز ______ کراچی

جو مر چکے ہیں تمہیں اُن کی فکر ہے
جو مر رہے ہیں تمہیں اُن کا کچھ ملال نہیں

پارس بلوچ ______ ڈہرکی

یہاں خاموش نظروں کا کنارا کون بنتا ہے
بہت گہرے سمندر کا کنارا کون بنتا ہے
چلو ہم دیکھتے ہیں خود کو اب برباد کر کے بھی
کہ ان بربادیوں میں بھی ہمارا کون بنتا ہے

روشن ہاشم ______ کراچی

راہِ طلب میں پھر اک یہ مقام بھی آیا
کہ دل گرفتہ ہے تو میری زندگی کے لیے
میں دیکھتا ہوں کہ تیری اُداس آنکھوں میں
وفا کے آنچ لیے ہوئے ہیں عقیدتوں کے دیے

شاہانہ بلوچ ______ خان پور

اُس طرف تو تیری یکتائی ہے
اس طرف میں اور میری تنہائی ہے
جس بیاباں میں ہوں آبلہ پا
وہ بیاباں میری سچائی ہے

ناہید نور الٰہی ______ کراچی

کیا کیا نہ خواب ہجر کے موسم میں کھو گئے
ہم جاگتے رہے تھے مگر بخت سو گئے
کیا دُکھ تھے کون جان سکے گا نگارِ شب
جو میرے اور ترے دوپٹے بھگو گئے

سحرش خان بھٹو ______ میرپور بھٹو

گر جائیں زمیں پر تو سنبھالے نہیں جاتے
بازار میں دُکھ درد اُچھالے نہیں جاتے
جنگل کے یہ پودے ہیں انہیں چھوڑ دے نیر
غم آپ جواں ہوتے ہیں، پالے نہیں جاتے

شازیہ رانا ______ دیپال پور

چلو آؤ کائنات بانٹ لیتے ہیں
تم میرے باقی سب تمہارا

ثنا ممتاز ______ لاہور

پلکوں کی حد کو توڑ کر دامن پہ آ گرا
اک آنسو میرے صبر کی توہین کر گیا

فوزیہ ناز ______ کراچی

عجیب حبس کا موسم ہے دل کے آنگن میں
ترس گئے ہیں تیرے ساتھ گفتگو کے لیے

نسیم سحر ______ کراچی

دعویٰ حسن کرے کوئی تو خاموش رہو
بس آہستہ سے آئینہ مقابل رکھ دو
میں محبت ہوں مجھے آتا ہے نفرت کا علاج
تم ہر شخص کے سینے میں میرا دل رکھ دو

★

ہمارے رسالے

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com



آمنہ زریں...... گکھڑ منڈی

یوں تو سارا پاکستان اپنا ہے اور ہم نام ہوتے میں بھی کیا ئقہ ہے "مگر تحریر میری 'نام میرا' اور بھیج دیا کسی نے اڑہ سے ؟! ارے...... سچ بہت دلچسپ لگا!

فرحت اشتیاق کے نام نے دل باغ باغ کر دیا...... اور ت عبد اللہ تو آ ہی چکی ہیں۔ فاخرہ جبیں کی بھی آمد آمد ے "جان کر خوشی ہوئی نا کافی ہے۔" "ٹھنڈ پڑ گئی" زیادہ سب لگ رہا ہے!

آج کا دور جانے کس کس ابتلا اور کس کس جدت رازی کا نام ہے۔ ان میں سے ایک نام الیکٹرانک میڈیا کا ں ہے۔ جس نے بہت کچھ مثبت اور ظاہر ہے کہ کچھ منفی ں کیا ہی ہے...... میں ایک باقاعدہ ناظر نہیں ہوں۔ لیکن م وقت میں کافی تاک جھانک کر لیتی ہوں اور دو چار دن ا کے سامنے بیٹھ کر مجھے ایک خوشگوار ادراک ہوا کہ ہر جھے چینل پر ہر بڑا ڈرامہ ہماری ان ہی لکھاریوں کا ہے۔

اس ادراک کے بعد کہہ سکتی ہوں...... کہ آج سے چند ں پہلے ہمارا ڈرامہ جس زوال کا شکار تھا' آج نہ صرف ں زوال کے اثر سے باہر ہے۔ بلکہ ترقی کی جانب رواں اں ہے۔ کیونکہ اب اسے ایک بہترین کہانی پر سرمایہ رچ کرتے پریشانی نہیں اٹھانا پڑتی۔

ایک کمینہ سا خیال آئے بغیر رہ نہیں پاتا...... کہ وہ لوگ و ہمارے رسالے میں چھپنے والے مواد کو ادب کا درجہ ینے سے انکار کرتے ہیں...... اور بس یوں ہی...... دل لگی کا معاملہ سمجھتے ہیں...... ان کو آج ڈرامے کی سنبھلی ہوئی صورت حال' اس سے وابستہ ہزاروں افراد کے روزگار اور اس سے بڑے منافع کو ایک نظر ضرور دیکھنا چاہیے...... کہ وہ کس کے بل بوتے پر اپنا سفر طے کر رہا ہے؟

تو پھر آج شاباش ہے اس پلیٹ فارم کو...... جس نے آج کے میڈیا کو اتنی بہترین کہانیاں اور کہانی کار فراہم کیے۔

فخر اور شکریہ جب اجتماعیت کا احساس لیے ہوئے ہوں' تو ان سے وابستہ خوشی سوا ہو جاتی ہے' ہمیں اپنے ادارے اپنی لکھاریوں پر ناز ہوتا ہے۔ جب اسکرین پر نام روشن ہوتے ہیں تو بلاشبہ ہمیں اس وابستگی پر فخر کا احساس ہوتا ہے ثمرہ بخاری' رخسانہ نگار عدنان' نگہت عبداللہ' فائزہ افتخار' عمیرہ احمد' ماہا ملک اور اب فرحت اشتیاق کے ہم سفر نے تو کمال کر دیا۔

اور آخر میں جناب اپنی پیاری' ہونہار لکھاریوں سے بس یہ کہنا ہے کہ آپ کے لفظوں کو تصویر بننے کا مرحلہ مبارک ہو...... مجھے یہ بھی کہنے دیجیے کہ آپ کی بہترین کہانی اور کرداروں نے ہمارے فنکاروں کو بھی اپنی صلاحیتیں پوری طرح آزمانے کا موقع فراہم کیا ہے اور وہ بھی اس سے انصاف کر رہے ہیں۔ مگر ہمیں...... فراموش مت کیجیے گا کیونکہ رسالہ آپ کی تحریر کا کچھ اس طرح سے امین بنتا ہے کہ آنے والی نئی نسلوں کو بھی ان سے شناسا ہونے کا موقع ملتا ہے اور پرانے ہوتے ہوئے لوگوں (ہم جیسوں) کو جب چاہے' نکال کر دوبارہ پڑھنے اور محظوظ

ہونے کا..... ہے نا؟ اپنے طور پر یہ بھی منفرد میڈیم ہے نا؟ جی ہاں! اور میں خط لکھوں؟ اور وہ آرٹیکل نہ بنے؟ یہ پتا نہیں کب ہو گا؟ کتنی محبت؟ بہت محبت کے ساتھ۔

پیاری آمنہ! آپ نے لکھا ہے قدر کھو دیتا ہے روز کا آنا جانا ہو سکتا ہے کسی اور معاملے میں درست ہو لیکن محبتوں کا معاملہ جدا ہے محبت جہاں ہو، جتنی ہو کم لگتی ہے اور محبت کا اظہار بہت خوب صورت ــــ یوں تو محبتوں میں دلوں کے رابطے ہوتے ہیں لیکن اگر اظہار نہ ہو تو کہیں کوئی کمی سی رہ جاتی ہے۔ اور خوب صورت دل کو چھو لینے والے الفاظ ہوں تو کیا کہنے 'نشہ دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ ہمارا دل تو یہی چاہتا ہے۔ آپ بہت اچھا لکھیں اور لکھتی رہیں۔ ہمارا ساتھ ہمیشہ قائم رہے اسی طرح۔

فرحت اشتیاق نے کہا ہے 'میری طرف سے قارئین کو یقین دلا دیں کہ فرحت کی وفاداری اپنے قارئین اور خواتین ڈائجسٹ کے ساتھ پکی ہے۔ میں خواتین ڈائجسٹ کو کبھی چھوڑنا نہیں چاہتی۔

رخسانہ نگار نے وعدہ کیا ہے ان شاء اللہ ان کا مکمل ناول آئندہ ماہ شامل ہو گا۔ ثمرہ کی تحریر ستمبر کے شعاع میں شامل تھی۔ وہ جلد خواتین ڈائجسٹ کے لیے بھی ناول لکھیں گی۔ عنیزہ سید کا ناول بھی آپ جلد پڑھیں گی۔ ماہا ملک بھی ناول لکھنا چاہتی ہیں بس وقت کا مسئلہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خواتین ڈائجسٹ کو عزت دی ہے یہ رب کا کرم ہے اور ہماری مصنفین کا تعاون۔ ہم تو صرف کوشش کر سکتے ہیں۔ کامیابی تو اللہ کی دین ہے۔

شاہانہ بلوچ ــــ خان پور

نمرا احمد کے مصحف کی کیا تعریف کروں۔ سورج کے آگے چراغ والی بات ہے۔ بہت دنوں کے بعد ایک جامع اور پر اثر کہانی پڑھی۔ جس میں کچھ بھی غلط نہیں لگا اور جس نے میرے دل اور دماغ کو اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ نمرا احمد کو میری طرف سے بہت بہت مبارکباد۔ اب فرحت اشتیاق کا ناول۔ "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ روم اور اٹلی کا سفرنامہ محسوس ہو رہا ہے۔ پلیز سادہ سادہ الفاظ میں کہانیاں لکھا کریں۔ آسیہ رزاقی کا ناولٹ اچھا لگا۔ اب تو خواتین اور شعاع کے افسانے زیادہ اچھے ہوتے ہیں ناولٹ کے مقابلے میں۔

خاص طور پر "نگی جنی جنج" کو میری طرف سے سال کا بہترین افسانہ ہونے کا اعزاز دیں۔ آمنہ زریں کے خط سے متفق ہوں۔ سب پرانی رائٹرز سے خاص طور پر اقبال بانو، رفعت سراج، فریدہ اشفاق، کہاں غائب ہو۔ لوٹ آؤ سب لوگ آپ کے منتظر ہیں۔ فریدہ اشفاق آپ ہیں کہاں کبھی تو شعاع اور خواتین کو یاد کریں۔

شاہانہ! آپ کو افسانے زیادہ اچھے لگتے ہیں ہم اسی لیے ہم نے افسانوں کی تعداد بڑھا دی ہے۔ فرحت اشتیاق بہت سادہ الفاظ میں لکھتی ہیں۔ ناول کے شروع میں کرداروں کا تعارف، ان کا بیک گراؤنڈ واضح کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے آپ کو ایسا محسوس ہوا، آگے چل کر جب اصل کہانی سامنے آئے گی تو یہ شکایت نہیں ہو گی۔

حرا ــــ اسلام آباد

آپ کی تمام مصنفین زبردست ہیں۔ فرحت اشتیاق کی نینساں توقیر والی کہانی کے بعد سے ساری کہانیاں پڑھنے لگی ہوں اور بشریٰ سعید سے پوچھنا ہے کہ آپ یو ایس اے میں رہ چکی ہیں کیا؟ اتنی متوازن اور خوب صورت تحریر کے لیے تو میں آپ کو نیشنل ایوارڈ کے لیے نامزد کروں گی بھئی۔ کوئی اتنا اچھا کیسے لکھ سکتا ہے۔ میں نے آپ کی صرف "سفال گر" پڑھی ہے اور یقین کریں، میرا خیال ہے کہ کوئی آپ جیسا نہیں لکھ سکتا۔ کہانی میں بنیادی عنصر ہوتا ہے کردار نگاری اور یہ آپ اتنے زبردست انداز میں کرتی ہیں کہ میں تو آپ کی فین ہو گئی ہوں اور پلیز گرانٹ کو مت ماریے گا۔

میں عرصہ دراز سے یوکے میں رہی ہوں اس لیے مکمل طور پر اردو میں نہیں لکھ سکی۔

حرا آپ کی میل سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ خواتین کتنی توجہ سے پڑھتی ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ اتنا عرصہ یوکے میں رہنے کے باوجود آپ نے خواتین ڈائجسٹ کا مطالعہ جاری رکھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اتنا اچھا تبصرہ کیا۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

صدف انور ــــ گڑھی حبیب اللہ (ہزارہ)

طویل انتظار کے بعد جب پندرہ ستمبر کو خواتین آیا تو اپنے پسندیدہ ترین ناول کو نہ پا کر جو مایوسی ہوئی اب کیا بتاؤں۔ گویا میرے دل نے ٹھیک ہی گواہی دی تھی۔ اب رفعت جی کی سزا یہ ہے کہ اگلی بار "چراغ آخر شب" کی دو اقساط اکٹھی شامل اشاعت ہونا چاہئیں۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ بھئی گزشتہ کچھ عرصہ سے میں خواتین منگواتی ہی اس ناول کے لیے ہوں خصوصاً"۔ پلیز اسے زیادہ لمبا مت کیجیے گا اور عبیر کا کپل فاروق کے ساتھ ہی بنائیے گا۔ کیونکہ یہ دونوں میرے پسندیدہ ترین کردار ہیں اور پروفیسر عباس تو ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتے ہیں ہم سب کے لیے۔ خواتین سے ہم بہت کچھ سیکھتے ہیں، بہت اچھا لگتا ہے۔ اگر ہر شمارے میں میری فیورٹ رائٹرز کی تحریریں شامل ہوں تو کیا ہی بات ہے۔ مثلاً" رفعت ناہید سجاد، عمیرہ احمد، فرحت اشتیاق (میں آپ کی سب سے بڑی فین ہوں، عنیزہ سید، ساجدہ حبیب، رفعت سراج، عالیہ بخاری اور نگہت سیما۔ رخسانہ نگار، فائزہ افتخار، ماہا ملک، نگہت عبداللہ، آسیہ رزاقی، آسیہ مرزا، راحت جبیں، فاخرہ جبین، تنزیلہ ریاض، انیسہ سلیم اور عفت سحر، اس کے علاوہ نمرہ احمد، آمنہ ریاض، در ثمین، راشدہ رفعت بھی اچھا لکھتی ہیں۔

ٹائٹل اس بار کچھ خاص نہیں تھا ہاں البتہ شعاع کا ٹائٹل بہت بہت زبردست تھا۔ اب کی بار میری پسندیدہ ترین مصنفہ فرحت اشتیاق کا نام خواتین کی فہرست میں موجود ہے تو ناراضی کے ساتھ ساتھ دل خوشی کے بے پناہ احساس سے لبریز ہے یعنی متضاد کیفیات کا شکار ہے۔ آپ لوگ یہ جو انٹرویو وغیرہ شائع کرتے ہیں، ان کی جگہ باقاعدگی سے قارئین یا مصنفین سے متعلق کوئی سلسلہ دیا کریں۔ اگر انٹرویوز ہی شائع کرنے ہیں تو پھر پلیز وائس آف امریکہ کی اردو سروس کے اینکر پرسن اسد حسن اور ان کی وائف سعدیہ اسد کا انٹرویو بمع تصویر ضرور شائع کیجیے گا۔ پہلی اور آخری فرمائش ہے۔

پیاری صدف! آپ نے تو کوئی سوال ہی نہیں کیا جواب کیا دیں؟ رفعت ناہید سجاد اگر ہمیں لکھ کر دیں تو ہم ان کی چار اقساط بھی ایک ساتھ شامل کر سکتے ہیں۔ پرانی مصنفین کی اہمیت، صلاحیت، مقبولیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا لیکن مسئلہ یہی ہے کہ ان میں سے بیشتر عدیم الفرصتی کے باعث ہر ماہ نہیں لکھ سکتیں۔ ویسے بھی کچھ نئی مصنفین بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ آپ نے شاید ان پر توجہ نہیں دی۔

انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے، جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

سمیرا ــــ ای میل (وہاڑی)

میں نے میٹرک کے بعد خواتین پڑھنا شروع کیا تھا اور اب بی ایس سی (آنرز) کر رہی ہوں۔ ٹائٹل دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ بہت ہی پیارا تھا۔ میری بہن تو ٹائٹل پر فدا ہی ہو گئی حالانکہ وہ ڈائجسٹ نہیں پڑھتی۔ ٹائٹل کو دیکھ کر سیدھی فرحت اشتیاق کے ناول پر چھلانگ لگائی، جس کا میں نے پورا مہینہ بہت بے صبری سے انتظار کیا تھا۔ مگر آخر میں "آئندہ ماہ" دیکھ کر بہت غصہ آیا۔ فرحت صاحبہ سے درخواست ہے کہ اس ناول کا اینڈ "متاع جان" کی طرح ــــ مت کیجیے گا۔

نایاب جیلانی اس بار بھی چھائی رہیں۔ بہت زبردست موضوع چنا تھا۔ میں نے یہ کہانی اپنی امی کو بھی سنائی۔ نایاب جی! یو آر دی بیسٹ۔

"سفال گر" ہمیشہ کی طرح فٹ تھا۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آسیہ رزاقی کا ناول بھی اچھا تھا۔ افسانوں میں انیسہ سلیم کا افسانہ زبردست رہا۔ نگہت عبداللہ کا "میرے خواب لوٹا دو" بھی اچھا ہے۔

پیاری سمیرا! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

سعیدہ صائمہ سرفراز ــــ کراچی

عید نمبر اچھا تھا لیکن اگر عید سے پہلے ملتا تو مزہ آتا۔ ٹائٹل بس ٹھیک تھا "کرن کرن روشنی" کی کرنوں سے مستفید ہوئے۔ آپی خواتین کے مسئلے مسائل بھی شامل کر دیا کریں۔ "میرے خواب لوٹا دو" کی دوسری قسط بھی اچھی رہی آخر کو ہماری پسندیدہ رائٹر ہیں نگہت عبداللہ۔"

"سنہری دھوپ کا موسم" مکمل مگر طویل ناول تھا مگر خاص بات یہ تھی کہ نایاب جی نے کہیں بھی بوریت محسوس نہیں ہونے دی۔ ان کے ناول میں ایک نمایاں

رنگ سسپنس، تجسّس کا ہے جس سے ناول پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" فرحت جی نے حسب توقع اچھا لکھا اگلی قسط کا انتظار ہے۔ فرحت جی کے لکھنے کی خاص بات یہ ہے کہ وہ جس جگہ کے بارے میں بھی لکھتی ہیں پوری معلومات کے ساتھ اس طرح لکھتی ہیں کہ پڑھنے والوں کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود بھی وہیں ہیں ام ثمامہ کا "ساس آس اور نراش" اچھا لگا "چودہ گلاب" میں عرفان کو اتنے گلاب کیسے مل گئے مجھے بتائے کوئی کیونکہ میں گلاب کی عاشق ہوں۔ مجھے آسیہ رزاقی سے یہ پوچھنا ہے کہ ان کی ہیروئن اتنی مظلوم کیوں ہوتی ہے، جیسے پہلی اور آخری قسط میں ہما کا کردار رابعہ افتخار کا "جب چاند نظر آئے" عید کے حساب سے افسانہ تھا۔ آپی میں اس خط کے ذریعے اپنی بہنوں سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ بارشوں کا موسم ہے اور اس موسم میں بیماریاں بھی بہت پھیلتی ہیں۔ اس لیے بہنوں سے گزارش ہے کہ پلیز جس طرح اپنے گھر کو صاف رکھتی ہیں، اسی طرح اپنے محلے کو، علاقے کو پارک کو بھی صاف رکھیں۔ بچوں کو شروع ہی سے عادت ڈالیں۔ کچرا پلاسٹک کی تھیلیوں میں ڈال کر اچھی طرح باندھ کر کچرادان میں ڈالیں۔ اپنے گھر کا کچرا باہر مت پھینکئے کیونکہ یہ پورا وطن ہمارا گھر ہے۔ پارک گھومنے جائیں تو ایک شاپر لازمی اپنے پاس رکھیں تاکہ اگر کچرادان نہ ملیں تو کچرا بسکٹ وغیرہ کے ریپر — شاپر میں ڈال کر کہیں کچرے دان میں ڈال دیں۔ پلیز بڑی مہربانی آپ لوگوں کی۔

صائمہ! آپ نے بہت اچھی باتیں لکھیں۔ اگر ہم ان باتوں پر عمل کریں تو نہ صرف ہمارے گلی کوچے صاف نظر آئیں بلکہ بیماریاں بھی نہ پھیلیں۔ ہمارے مذہب میں تو صفائی کی اتنی اہمیت ہے کہ اسے نصف ایمان کہا گیا ہے۔ لیکن افسوس دوسری بہت سی باتوں کی طرح اسلام کی اس بات پر بھی غیر مسلم زیادہ عمل کرتے ہیں۔

معذرت کہ بیاض اور سروے میں آپ شرکت نہ کر سکیں۔ اب عیدالاضحیٰ کے سروے میں شرکت کر لیجئے گا۔

خدیجہ مسعود ..... لاہور

ہر ماہ ڈائجسٹ لیتے ہی میں فہرست دیکھتی ہوں کہ شاید فرحت اشتیاق، فائزہ افتخار اور عنیزہ سید کو ہم قارئین پر رحم آگیا ہو اور انہوں نے کچھ لکھا ہو ہمارے لیے..... مگر ہر بار مایوسی ہوتی ہے سوائے اس دفعہ کے۔ کیونکہ فرحت اشتیاق کو بالآخر ہم پر رحم آ ہی گیا۔ شکریہ فرحت! ناول کی پہلی قسط پڑھ کر ہی پتا چل گیا کہ کہانی دلچسپ اور شان دار ہو گی۔

انشاء جی کو پڑھ کر میں ہمیشہ فریش ہو جاتی ہوں۔ انٹرویوز پڑھ کر بھی بہت مزا آیا۔ ثروت نذیر بہت اچھا لکھتی ہیں۔ میں انتظار میں ہوں کہ وہ دوبارہ کب نظر آتی ہیں۔

ایک گزارش ہے کہ فائزہ افتخار اور عنیزہ سید کو واپس لے آئیں کیونکہ ان کے بغیر فیملی ادھوری ہے۔ جو مزا کہانی پڑھنے میں ہے وہ ڈرامہ دیکھنے میں نہیں۔

خدیجہ! فائزہ افتخار کا ناول اس ماہ اکتوبر کے شعاع میں شامل ہے۔ عنیزہ سید بھی خواتین کے لیے ناول لکھ رہی ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

روشن ہاشم ..... نامعلوم شہر

ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ اس ماہ سارے افسانے اچھے تھے۔ خاص طور پر انیسہ سلیم کا "یوٹرن" بہت پسند آیا۔ توکل، چودہ گلاب، جب چاند نظر آئے، ساس، آس نراش تینوں افسانے بھی اچھے تھے۔

بشریٰ سعید حسب سابق اپنے پچھلے ہی رنگ میں تھیں۔ بہت اچھا جا رہا ہے "سفال گر" بشریٰ کا تجربہ اتنا وسیع ہے کہ ہمارا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتا ویل ڈن بشریٰ سعید۔ آسیہ رزاقی نے اپنے پچھلے ناول "حساب باقی ہے" میں جو رنگ جمایا تھا۔ ابھی وہ ہی ذہن سے محو نہیں ہوا تھا کہ پہلی اور آخری قسط آگئی۔ اس بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی میری موسٹ فیورٹ رائٹر جب بھی لکھیں گی دل کے تاروں کو چھو لیں گی کبھی "آواز کبھی ترنم سے" آسیہ آپی! میں آپ کے ہر ہر ناول، افسانے کی فین ہوں۔ کالج اور اسکول کے زمانے میں تو گریز تھا۔ ڈائجسٹ ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے آسیہ رزاقی اور ایم سلطانہ فخر کے افسانے ڈھونڈے جاتے۔ اب تو بہت ہی پرانی باتیں ہو گئی ہیں۔ سالہا سال گزر گئے لیکن ان کی تحریر دیکھ کر روح میں تازگی بھر جاتی ہے۔ میری طرف سے ان کو بہت بہت سلام عرض ہے۔ نایاب جیلانی کا "سنہری دھوپ کا موسم" بہت ہی بیسٹ رہا۔ رخشندہ نے بولڈپن کا مظاہرہ کر کے کتنی زندگیاں داؤ پر لگنے سے بچالیں۔ پرانی فرسودہ روایت میں جکڑی لالہ رخسار کو آزادی دے کر زندگی دے دی۔ بہت پسند آیا ناول۔ "جو بچے ہیں سنگ" کی دوسری قسط کا انتظار ہے۔ سلسلے سارے ہی اچھے تھے۔ عید سروے میں ہمیں شامل کرنے کا شکریہ۔ عید کے پکوان بہت پسند آئے۔ نگہت عبداللہ کا "میرے خواب لوٹا دو" بھی اچھا چل رہا ہے۔ انٹرویو اور ملاقات بھی اچھی رہی۔

پیاری روشن! خواتین کی پسندیدگی کا شکریہ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

مائدہ انور ..... ڈڈیال آزاد کشمیر

فرحت اشتیاق کا مکمل ناول دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ہمیشہ کی طرح انہوں نے بہت خوب لکھا۔ یقیناً "یہ ناول بھی یادگار ہو گا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ٹی وی سے جڑ کر بھی وہ اپنے قارئین کو نہیں بھولیں۔ ہاں ایک بات پر حیرت ہوتی ہے۔ یہ مکمل ناولز کو جانے کیا بیماری لاحق ہو گئی ہے روز بروز سوکھتے ہی جا رہے ہیں؟ ابھی تو کہانی شروع ہوئی تھی کہ آگے "باقی آئندہ ماہ" منہ چڑا رہا تھا۔

مائدہ فرحت کا ناول 32 صفحات پر مشتمل تھا۔ لگتا ہے آپ کے پڑھنے کی رفتار تیز ہو گئی ہے یا فرحت کا ناول اتنا دلچسپ اور رواں انداز میں لکھا ہوا تھا کہ آپ کو لگا کہانی ابھی شروع ہوئی، ابھی ختم ہو گئی۔

صائمہ مقدس ..... ہیڈ رسول

ہم چھ کزنز "خواتین، شعاع" اور "کرن" نہایت ذوق و شوق سے پڑھتی ہیں اور ان سب کو بقول بڑوں کے، خراب کرنے کی ذمہ داری میری ہے۔ اور میں کہتی ہوں کہ انڈین موویز، اسٹار پلس کے ڈرامے دیکھنے سے ہزار گنا بہتر ہے کہ بندہ آپ کے ڈائجسٹ پڑھے کہ وہ بات جو مائیں نہیں سمجھا سکتیں۔ وہ یہ آرام سے پرمزاح طریقے سے سمجھا دیتے ہیں۔ باقی سب ڈائجسٹ کو تو زمانے کی ہوا لگ گئی ہے۔ ماڈرن سے ماڈرن کہانیاں اور رومانس آنے لگ گیا ہے۔ لیکن آپ کے ماہنامے بہترین ہیں اور دن بدن ان کا معیار بہتر سے بہتر ہو رہا ہے۔

کرن کرن روشنی کی کئی کرنیں میری ڈائری کو منور کر رہی ہیں اور میری زندگی کو بھی۔ اس سلسلے میں آپ اللہ کے نبی صحابہ تبع تابعین اور بزرگوں کے استعمال کردہ

مسنون دم اور تعویزات بھی بتایا کریں۔

بہت خوشی ہوتی ہے کہ آج اکیسویں صدی کے اس فتنوں اور توہمات اور من گھڑت قصوں کے دور میں آپ توحید سے بھرپور ماہنامہ شائع کرتے ہیں۔ آپ کی بیان کردہ کسی حدیث کے لیے کسی اور حوالے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ پتا ہوتا ہے کہ مستند ہوگی۔ یہ ایک صدقہ جاریہ ہے۔ میں جب بھی نماز کے بعد دعا کرتی ہوں تو محمود خاور، بابر محمود اور ریاض صاحب اور آپ سب کے لیے ضرور دعا کرتی ہوں کہ اور کوئی عمل آپ کا قبول ہو نہ ہو یہ تو ضرور قبول ہوگا۔ (انشاء اللہ)

مصحف پڑھ کر ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ اللہ 70 ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اگر ہم ماں کی ساری باتیں مانیں، تو ماں کبھی ہمیں ڈانٹتی یا مارتی نہیں۔ کبھی ہماری آزمائش نہیں لیتی بھول چوک پر بھی معاف کر دیتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے جتنا قریب جائیں، وہ مارتا کیوں ہے۔ ہماری محبت اور ایمان کی اتنی زیادہ آزمائش کیوں لیتا ہے۔ یہی ڈر مجھے اللہ سے زیادہ قریب ہونے سے روکتا ہے۔

محمل کو ہر طرح کے امتحان سے اس نے گزارا۔ فرشتے سے انسان ہونے کے ناتے ذرا سی بھول ہوئی تو اسے ہمیشہ کے لیے عرش سے فرش پر پھینک دیا کیوں؟ ماں تو کبھی بھی ایسا نہیں کرتی۔

"چراغ آخر شب" نہایت پیارا ناول، ایک فقرہ میں وہ بات پنہاں جس کو لکھنے میں دوسری رائٹرز صفحے کے صفحے بھر دیتی ہیں۔ یہ ایک ہی فقرہ میں وہ تمام بات کہہ جاتی ہیں۔

نہایت جان دار ناول سمجھ میں دیر سے آتا ہے لیکن جب آتا ہے تو دل اور آنکھیں بھر جاتی ہیں۔ اور سفال گر کاش میں حکیم بیگم یا عمر کی طرح ہوتی۔ "رقص جنوں" کے تو سب ڈائیلاگ ابھی تک دل پر نقش ہیں۔

فرحت اشتیاق محبت سے بھرپور رائٹر۔ ان کے سب ناول بہترین ہیں۔ صرف چند مشورے اگر قبول کریں تو ان کے ناول کو چار چاند لگ جائیں۔ نمبر1 یہ کہ وہ جو بات یا فقرہ کہانی میں ایک بار لکھ چکی ہوں اس واقعے کو یا بات کو بار بار مت دہرایا کریں۔ ہمارا حافظہ کمزور نہیں ہے، پلیز! بات کو بار بار دہرانا ان کی تحریر کی خوب صورتی کو ماند کر دیتا ہے۔ نمبر2 وہ (میں ان، ان کا اس، اس کا) طرح کی ضمیروں کا بہت زیادہ استعمال کرتی ہیں۔ جبکہ ہم لوگوں کو تو پرائمری کلاسز میں بتا دیا جاتا ہے کہ ضمیروں کو بار بار دہرانے سے تحریر کا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔

چودہ گلاب، اچھا افسانہ تھا۔

نایاب جی آپ کی کہانیاں بہت پاور فل ہوتی ہیں۔ لیکن آخری صفحے سے شروع ہوتی ہیں۔ کہانی اینڈ سے شروع تک پڑھنی پڑتی ہے۔ جاسوسی ناولز کی طرح۔ بہرحال ویل ڈن۔ تھوڑا سا ایک چیز کا دھیان رکھیں کہ ہر عبادت گزار بندہ اماں جی جیسا نہیں ہوتا آپ کے دو تین

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو

ڈیئر قارئین۔۔۔ السلام علیکم۔

امید ہے آپ سب بخیریت ہوں گے۔

اس ماہ آپ "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" کی قسط نہیں پڑھ سکیں گی جس کے لیے میں آپ سب سے معذرت خواہ ہوں۔ اس غیر حاضری کا سبب میری علالت رہی ہے۔

قسط نہ پا کر آپ سب کو بہت مایوسی ہوگی مگر میں جانتی ہوں، آپ سب مجھ سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے اس ایک ماہ کی غیر حاضری کو معاف کر دیں گے۔

تو ڈیئر قارئین! سینور سکندر اور لیزا سے اب آپ کی ملاقات ان شاء اللہ آئندہ ماہ یعنی نومبر میں ہوگی۔

اس ناول کے بارے میں اپنی آرا سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

ڈھیر سارے پیار کے ساتھ

فرحت اشتیاق

ناولز میں یہ بات میں نے نوٹ کی ہے کہ آپ عبادت گزار بندے کو کرپٹ ظاہر کرتی ہیں۔ مائنڈ مت کیجیے گا۔

صائمہ جی! آپ نے خط لکھا بہت شکریہ! مصنفین تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے قریب ضرور ہوں لیکن دعا کیا کریں کہ وہ آپ کو ہر آزمائش سے محفوظ رکھے۔ اور ایک بات بتائیں کیا جو لوگ اللہ کے قریب نہیں ہوتے ان پر پریشانیاں اور آزمائشیں نہیں آتیں؟ آپ اللہ سے ڈریں ضرور لیکن یہ یاد رکھیں اس کی رحمت زیادہ ہے، اس کے غضب سے۔

یاسمین کنول۔۔۔ پسرور

ستمبر کے شمارے میں "سفال گر" اور پہلی اور آخری قسط اچھی تحریر لگیں۔ اس کے علاوہ جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو نے بے حد متاثر کیا۔ مختصر ترین یونہی نے بہت کچھ کہہ دیا ہمارا بنیادی مسئلہ اس میں موجود تھا مگر حل۔۔۔ وہ کسی کے بھی پاس نہیں ہے سب ہی گزارہ کر رہے ہیں۔

یاسمین اتنا مختصر تبصرہ۔۔۔؟ مزا نہیں آیا۔ فرحت اشتیاق اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

کہکشاں صابر۔۔۔ کویت

میں نے آج تک خط نہیں لکھا۔ میرے اندر ہمت نہیں ہے مجھے ڈر ہے کہ میرا خط شائع نہیں ہوگا تو میرا حوصلہ ٹوٹ جائے گا۔ میں نے 8th کلاس سے خواتین ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا تھا۔ میٹرک کر کے میں کویت آ گئی۔ اب بارہویں جماعت کا امتحان دے رہی ہوں۔ یہاں خواتین ڈائجسٹ نہیں ملتا۔ امی پاکستان جاتی ہیں تو بہت سارے منگواتی ہوں اور پڑھتی ہوں اور ان میں سے ایک میں فرحت اشتیاق کا ناول "متاع جان ہے تو" تھا یقین جانئے میں بہت روئی ہوں اور اسے بار بار پڑھا ہے۔ اب فرحت اشتیاق میری فیورٹ ہیں باقی نمرہ احمد، نمرہ بخاری، ثروت نذیر اور نعیمہ ناز بھی اچھا لکھتی ہیں۔ وجہ وہی۔۔۔ ہاں میں نے اس رسالے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آپ کا شکریہ۔

کہکشاں! اتنی دور سے یاد کیا، بہت خوشی ہوئی۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ آپ اتنا عرصہ شائع نہ ہونے کے ڈر سے خط نہ لکھ سکیں۔

ام طیفور۔۔۔ گوجرانوالہ

میں نے آپ کو افسانہ "اپنی چھت" کے نام سے ارسال کیا تھا اس کی بابت پوچھنا تھا کہ آیا قابل اشاعت ہے یا نہیں؟ مجھے ستمبر کے شمارے میں بھی شدت سے انتظار تھا مگر۔۔۔! 3، 4 ماہ ہو چکے ہیں مجھے اس افسانے کو بھیجے ہوئے۔ پلیز، کم از کم اس افسانے کے قابل قبول ہونے کے بارے میں ہی بتا دیجیے۔

خواتین کے سبھی سلسلے قابل تعریف ہیں اور بڑی خوب صورتی سے جاری ہیں۔

ام طیفور! آپ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ افسانہ نکی جنی جنج بہت اچھا تھا اور آپ میں اتنی صلاحیت ہے کہ اگر تھوڑی توجہ دیں تو بہت اچھا لکھ سکتی ہیں۔ افسانہ "اپنی چھت" ہمیں آپ کے پچھلے افسانے کے مقابلے میں کمزور لگا۔ آپ نے نکنی جنی جنج لکھ کر قارئین کے دلوں میں اپنا ایک امیج بنایا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ یہ برقرار رہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔



روشن حرف وہ سارے

سیما ممتاز عباسی

میری عادت رہی ہے کہ پڑھنے کے دوران جو بھی اچھی لائن پڑھی، دل کو لگی نوٹ کرلی اس دور میں سینٹ میری ہائی اسکول کوئٹہ کی پختہ سرخ اینٹوں کی دیوار پر ایک شعر درج تھا جو میرے دل و دماغ پر چھا گیا اور ہر وقت زبان پر رہنے لگا۔

بچپن کی محبت کو دل سے نہ جدا کرنا
جب یاد مری آئے تو ملنے کی دعا کرنا

اس وقت سے اب تک جو شعر اچھا لگا ہے' وہ یاد ہو گیا ہے اور کئی دنوں تک وہ شعر اپنے تعارف کے ساتھ ساتھ میرا تعارف بھی بن جاتا ہے۔

یوں غم نے ترے کر دیا گریہ مرا روشن
اشکوں کی جگہ آنکھوں سے جگنو نکل آئے

ایک شعر اور بھی ہے۔

مت کر اتنا یقین ہاتھوں کی لکیروں پر
قسمت ان کی بھی ہوتی ہے جن کے ہاتھ نہیں ہوتے

پسند اور ناپسند شاعر یا ان کی شاعری اولیت میں رہتی ہے۔ آج کل نیٹ کا در کھولیے تو "ناہید ورک" کی شاعری کے گلاب کِھلنے لگتے ہیں لیکن پروین شاکر کی شاعری نے تو میری سوچ بدل کر رکھ دی!

پروین شاکر کی موری نظم

بارش نے
جب سے مجھ کو پازیب پہنائی ہے
میں رقص میں ہوں
اور.....
اتنی خوش ہوں
اپنے پاؤں کی بدرنگی کو
دیکھ دیکھ کر بھول رہی ہوں
پر پھیلائے
بھیگے ہوئے جنگل میں
مسلسل ناچ رہی ہوں
ناچ رہی ہوں!

مجھے تو صرف اتنا پتا ہے کہ محبت کے روایتی تحفوں میں ایک کتاب بہترین تحفہ ہوتا ہے اور میں نے جس کو بھی گفٹ ہے اس پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے دل سے اپنائیت سے اور مشترکہ خوشی کے لیے!

محنت کی سندرتا کھیتوں میں پھیلی ہے
نرم ہوا کی دھن پر دھیان کی بالی گائے

میری ڈائری میرے دوستوں کی فیورٹ بک رہتی ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ نوٹ کر کے آپس میں تبادلہ کرتے رہتے ہیں اور بڑی دلچسپی اور اعتماد کے ساتھ ایک بار میری ہی دوست کو یہ معلوم ہوا کہ

حسین کتنا زیادہ ہو گیا ہے
وہ جب سے اور سادہ ہو گیا ہے

سچی بات ہے کہ کسی نے دیکھ کر مجھ پر بھی شاید شعر گوئی کی ہو اگر کی بھی ہو تو میں نے سنا نہیں اگر نہیں تو پھر میری طرف سے۔

ہم کو احساس تک نہیں ہوتا
ہم کسی کی حیات ہوتے ہیں!

ایک ایسی بھی غزل ہے جو اپنی گائیکی کے انداز کا منفرد بیان ہے اور یہ اکثر بیشتر ریڈیو و ٹی وی چلتا ہے تو سن کر ایک ذہنی سکون مل جاتا ہے' یہی کلاسیکی شاعری سے میرا انتخاب ہے کلام جگر مراد آبادی اور عابدہ پروین کی آواز ہے۔

کچھ اس ادا سے آج وہ پہلو نشین رہے
جب تک ہمارے پاس رہے ہم نہیں رہے
یا رب کسی کے راز محبت کی خیر ہو
دست جنوں رہے نہ رہے آستین رہے
درد غم فراق کے یہ سخت مرحلے
حیران ہوں میں پھر بھی تم اتنے حسین رہے
جا اور کوئی ضبط کی دنیا تلاش کر
اے عشق ہم تو اب تیرے قابل نہیں رہے
اللہ رے چشم یار کی معجز بیانیاں
ہر ایک کو ہے گماں کہ ــــ مخاطب ہم ہی رہے

آپ کا باورچی خانہ

سعدیہ شیریں عظیمی

خواتین ڈائجسٹ میں قارئین کی شرکت کے لیے ہم اس ماہ کے کچن کے حوالے سے ایک نیا سلسلہ شروع کررہے ہیں۔ سوالات یہ ہیں۔

کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ "پسند ناپسند غذائیت' گھر والوں کی صحت"۔

گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں' کھانے کا وقت ہے۔ کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کرکے تواضع کر سکیں۔

کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے' آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

صبح کا ناشتہ ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟ ایسی خصوصی چیز کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہیں۔

گھر سے باہر کھانا کھانا فیشن بنتا جارہا ہے' آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟ (1) جب کوئی لے جائے (2) کسی کی سالگرہ پر (3) یا کسی خوشی کے موقع پر۔

کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مدِ نظر رکھتی ہیں؟

اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

کچن کی کوئی ٹپ' جو دینا چاہیں؟

ان سوالات کے جواب بھجوا کر آپ بھی اس سلسلہ میں شرکت کرسکتی ہیں' ساتھ ایک عدد تصویر بھی بھجوائیں تصویر ضروری نہیں ہے۔

میرا شمار بھی ایسی خواتین میں ہوتا ہے جنہیں گھر والوں کی پسند و ناپسند کے ساتھ ساتھ ان کی صحت کا بھی خیال رہتا ہے لہٰذا میری ترجیح یہی ہوتی ہے کہ ایسا کھانا پکے جو سب کی پسند کے ساتھ غذائیت سے بھرپور ہو۔

مہمان تو عموماً" بتا کر ہی آتے ہیں شاذ و نادر ہی اچانک آتے ہیں تو جو اس ٹائم بنا ہو وہی سرو کیا جاتا ہے۔ البتہ جھٹ پٹ بننے والی ڈشز میں سے فوراً" کوئی بنالی جاتی ہیں۔ جیسے کڑاہی افغانی' مٹن کھڑا مسالا' دھواں قیمہ وغیرہ وغیرہ۔ البتہ چکن نوابی ڈش تیاری سے بننے تک 30 سے 45 منٹ لیتی ہے اور چونکہ قورمے سے ملتی جلتی ہے لہٰذا ذائقہ میں تو مزے دار ہے ہی بنتی بھی جلدی سے ہے۔

چکن نوابی

اجزا:

چکن	750 گرام (3 پاؤ)
لہسن ادرک پیسٹ	ایک ٹیبل سپون
سرخ مرچ	ایک ٹیبل سپون
نمک	حسب ذائقہ
پیاز	2 عدد لچھے دار
دہی	1 کپ
تیل	1 کپ
گرم مسالہ پاؤڈر	ایک یا آدھا سپون

اجزا نمبر 2

ثابت سفید زیرہ	ایک ٹی سپون
چہار مغز کے بیج یا سفید تل	ایک ٹی سپون
سبز الائچی	3 عدد
ناریل	ایک ٹیبل سپون
بادام	آٹھ عدد

(سارے مسالے توے پر بھون کر پیس کر ایئر ٹائٹ جار میں رکھیں اور ضرورت پڑنے پر استعمال کریں۔)

ترکیب :

گھی گرم کر کے پیاز کو براؤن کر کے نکال لیں اور ٹھنڈا کریں۔ دہی میں لہسن ادرک نمک مرچ براؤن پیاز ڈال کر پیسٹ بنالیں اور اسی تیل میں اچھی طرح بھننے تک درمیانی آنچ پر پکائیں اور پھر چکن ڈال کر خوب بھونیں اور تھوڑا پانی ڈال کر گلنے دیں جب گل جائے تو بھنا مسالا اور 1 سے ڈیڑھ کپ پانی ڈال کر تھوڑی دیر دم پر رکھ لیں۔ تیل اوپر آنے پر پسا گرم مسالا ڈالیں اگر خوشبو پسند ہے تو — دو قطرے کیوڑہ ایسنس کے ڈال کر گرم گرم پیش کریں۔

(میں وقت کی بچت کے لیے مرغی پہلے فرائی کر لیتی ہوں)

(3) کچن کی صفائی کا خصوصی اہتمام تو یہی ہے کہ اسے ہاتھ کے ہاتھ صاف رکھا جائے۔ برتن ساتھ ساتھ دھلیں اور شیلفس بھی اور ہر چیز استعمال کے بعد ٹھکانے پر رکھی جائے تو خصوصی صفائی کی خاص ضرورت نہیں رہتی۔

(4) صبح کا ناشتہ تو سادہ ہی ہوتا ہے البتہ چھٹی کے دن یا موڈ بننے پر پراٹھے مختلف طرح کے بنائے جاتے ہیں یا بے آب روٹی۔ یہ میں نے اپنے سسرال میں سیکھی ہے اور بہت مزے کی ہوتی ہے اور بنانی بھی خاص مشکل نہیں۔

بے آب روٹی

ترکیب :

حسب منشا آٹے میں حسب منشا گھی، پسی چینی، ایک دو چمچ خشخاش، معمولی سا نمک اور چار پانچ چمچ دہی ملا کر دودھ کے ساتھ خوب گوندھیں (اور ذرا سخت رکھیں) توے پر روٹی بیل کر ذرا احتیاط سے ڈالیں، دونوں اطراف پر گھی یا تیل لگا کر احتیاط سے سینک کر اتارلیں۔ یہ کئی دن خراب نہیں ہوتی۔

(5) یہ تو آپ نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ شادی سے پہلے بہت بار گھر سے باہر کھانا کھایا ہے۔ اب یہاں ایسا ماحول نہیں۔ گاؤں ہے۔ ہاں البتہ جب شہر جائیں، موڈ ہو تو ضرور کچھ نہ کچھ کھا لیتے ہیں۔

(6) کھانا پکاتے ہوئے عموماً" تو موسم کو ہی مد نظر رکھا جاتا ہے۔ جیسے گرمیوں میں ٹھنڈا ٹھار فالسے کا شربت اور سردیوں میں گاجر کا حلوہ۔ مگر بعض چیزیں موسم کے بغیر بھی کبھی کبھی جی خوش کر دیتی ہیں جیسے سردیوں میں کریلے قیمہ اور گرمیوں میں مٹر پلاؤ۔

(7) اچھا پکانے کے لیے محنت کی قائل ہوں مگر زیادہ نہیں کیونکہ تیار مسالوں کی وجہ سے کام آسان ہو گیا ہے میرے خیال میں تو صفائی اور موڈ بھی اچھا پکانے میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ اچھا پکانے کے لیے آپ کا موڈ جتنا خوشگوار ہو گا کھانا اتنا ہی مزے کا بنے گا۔

(8) ٹپس تو بے شمار ہیں۔

(1) بیسن کو بھون کر ٹھنڈا کریں اور اسے تھیلی میں بند کر کے رکھ دیں بیسن کئی مہینوں تک خراب نہیں ہو گا۔

(2) برتن سے انڈے کی بو دور کرنے کے لیے تھوڑا سا آٹا چھڑک کر پانچ منٹ چھوڑ دیں پھر دھولیں، بو دور ہو جائے گی۔

(3) بچوں کی پیدائش کے بعد اکثر خواتین کا پیٹ بڑھ جاتا ہے۔ پیٹ کو اگر بڑھنے سے روکنا ہے تو اس کے لیے چالیس دن تک پانی کے بجائے پانی میں چند دانے گندم کے ڈال کر اس پانی کو ابال کر پھر ٹھنڈا کر کے پیاس لگنے پر یہ پانی پیا جائے تو اس سے پیٹ نہیں بڑھے گا۔ آزمودہ نسخہ ہے۔



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

مغلئی چاول

اجزاء :

چاول	آدھا کلو
چکن	آدھا کلو
پالک	1 کپ کٹی ہوئی
ثابت گرم مسالا	آدھا کھانے کا چمچہ
چکن یخنی	2 کپ
دہی	آدھا کپ
ادرک لہسن پیسٹ	1 چائے کا چمچہ
اجینو موتو	1 چائے کا چمچہ
پیاز	1 عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	آدھا کپ

ترکیب :

تیل گرم کرکے پیاز سرخ کرلیں۔ لہسن، ادرک کا پیسٹ ڈال کر بھونیں۔ چکن ڈال کر تھوڑی دیر تل لیں۔ اب دہی کے ساتھ تمام مسالا جات ڈال دیں۔ تھوڑی دیر بھوننے کے بعد باریک کٹی ہوئی پالک، یخنی اور چاول ڈال دیں۔ ڈھک کر اتنا پکائیں کہ یخنی سوکھ جائے، دم لگادیں۔ رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

کالی مرچ والی ہانڈی

اجزاء :

چکن (چھوٹی بوٹیاں کروالیں)	ایک کلو
ٹماٹر سرخ	آدھا کلو
کالی مرچ (کٹی ہوئی)	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
ادرک (باریک کٹی ہوئی)	1 انچ کا ٹکڑا
تیل	ڈیڑھ پیالی
دہی	1 کپ
پیاز	آدھا پاؤ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	آدھی گڈی
ہری مرچ	4 عدد
لہسن ادرک (پسا ہوا)	1 کھانے کا چمچہ
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب :

ٹماٹر، پیاز، لہسن، ادرک اور ہری مرچ ڈال کرا بالیں اور گرائنڈر میں پیس لیں۔

چکن کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنوالیں اور دھو کر ایک چھلنی میں رکھیں، تاکہ زائد پانی نکل جائے۔ ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں اور چکن کو تل لیں، ساتھ ہی گریوی ڈال کر بھونیں، آدھا چمچہ ہلدی اور دہی بھی شامل کردیں اور چکن گلنے تک خوب بھونیں، آخر میں گرم مسالا، کالی مرچ اور ہری مرچ ڈال کر دم دے دیں۔ ادرک اور ہرا مسالا چھڑک کر پیش کریں۔

زنگر برگر

اجزاء :

چکن چیسٹ پیس	4 عدد
سرکہ	2 کھانے کے چمچے
سویا ساس	2 کھانے کے چمچے
مسٹرڈ پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
بن	حسب ضرورت
کرنکل چپس	1 کپ
میدہ	8 کھانے کے چمچے
کارن فلور	4 کھانے کے چمچے
انڈے	3 عدد
کارن فلیکس	1 کپ
بیکنگ پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
بریڈ کرمز	آدھا کپ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

چکن میں نمک، سویا ساس، مسٹرڈ پاؤڈر اور سرکہ ملا کر رکھ دیں۔ میدے میں کارن فلور، انڈے ڈال کر اچھی طرح پھینٹیں اور پیسٹ بنالیں۔ اب چکن کو میدے والے آمیزے میں ڈبوئیں۔ کارن فلیکس، بریڈ کرمز (ڈبل روٹی کا چورا) اور کرنکل چپس کو چورا کرکے ایک کھلے برتن میں رکھیں۔ اب چکن کے ٹکڑوں کو میدے کے آمیزے سے نکال کر چورے کی تہہ لگائیں اور تل لیں۔

بن کو بیچ میں سے کاٹ کر اس میں مایونیز لگائیں۔ کھیرا، سلاد کا پتا اور چکن رکھیں، پھر دوسرا بن رکھ کر تھوڑا سا دبائیں۔ مزے دار زنگر برگر تیار ہے۔

ڈبل روٹی کے پکوڑے

اجزاء :

ڈبل روٹی	حسب ضرورت
بیسن	ایک پاؤ
پیاز	ایک عدد
انڈہ	ایک عدد
ہری مرچ	4 عدد
سرخ مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

بیسن میں تمام اشیا ملا کر گھول لیں اور تقریباً آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ انڈا بھی ڈال کر پھینٹ لیں۔ ڈبل روٹی کے دو یا چار ٹکڑے کرلیں اور کنارے کاٹ کر الگ کردیں۔ ڈبل روٹی کے ٹکڑے بیسن میں ڈبو کر تل لیں۔ ہلکا سنہرا ہونے پر اتارلیں۔ چائے کے ساتھ مزے دار اور جلد تیار ہونے والی ڈش حاضر ہے۔

خبریں وبریں

تبصیر نشاط



دس بہانے کر کے.....

"دس بہانے کر کے لے گئے دل" پڑوسی ملک کا یہ مشہور گانا تو یقیناً" آپ نے سنا ہی ہو گا۔ غالباً" معروف اداکارہ نائلہ جعفری نے بھی سنا ہوا ہے' جب ہی تو.....

"مدرز ڈے" (ماؤں کا عالمی دن) کے حوالے سے ایک خصوصی ڈرامے کی ریکارڈنگ جاری تھی۔ نائلہ جعفری بھی کاسٹ کا حصہ تھیں۔ وہ دوپہر بارہ بجے سیٹ پر آتیں اور رات کے نو بجتے ہی جانے کا شور مچا دیتیں۔ دو دن تک انہیں رات بارہ بجے تک کام کرنا پڑا تو تیسرے دن وہ دوپہر ایک بجے تک نہ آئیں۔ ان سے رابطہ کیا گیا۔ انہوں نے کہا "طبیعت خراب ہے۔" مگر پھر وہ دو بجے تک آ گئیں تاہم نو بجتے ہی کام ادھورا چھوڑ کر چلی گئیں۔

اگلے دن وہ بارہ بجے آئیں۔ طے شدہ شیڈول کے مطابق وہ ریکارڈنگ کا آخری دن تھا مگر حسب معمول انہوں نے نو بجتے ہی جانے کا شور مچا دیا۔ چونکہ کام اسی دن ختم کرنا تھا' لہٰذا ڈائریکٹر نے انہیں گھر جانے کی اجازت نہ دی۔

بارہ بجے نائلہ نے ڈائریکٹر سے درخواست کی کہ انہیں گھر سے کچھ ضروری دوائیں لینی ہیں' لہٰذا انہیں جانے دیا جائے۔ ان کا گھر قریب ہی تھا۔ ڈائریکٹر نے اجازت دے دی۔ وہ رات کے ایک بجے تک نہ آئیں۔ انہیں فون کیا گیا تو پتا چلا' وہ گھر میں سو رہی تھیں۔ نیند سے بوجھل آواز میں اگلے دن آنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔

ڈائریکٹر صاحب پریشان ہو گئے' کیونکہ نائلہ آخری سین ادھورا چھوڑ گئی تھیں۔

اگلے دن آئیں تو وہ کالی شلوار پہنے ہوئی تھیں' جبکہ اس ادھورے سین میں انہوں نے سفید شلوار پہنی ہوئی تھی۔ انہیں شلوار تبدیل کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے کہا۔

"وہ شلوار تو میں گھر میں بھول آئی ہوں۔"

ڈائریکٹر نے انہیں جانے کی اجازت نہ دی اور کہا۔

"کسی کو بھیج کر منگوالیں۔"

اس پر نائلہ نے کہا۔ "گھر میں کوئی نہیں ہے۔ مجھے ہی جانا ہو گا۔"

ڈائریکٹر انہیں جانے دینے کا رسک نہیں لے سکتا تھا لہٰذا اس نے اسی لباس میں شوٹنگ کی اور اس بات کا خیال رکھا کہ بقیہ سین میں ان کی شلوار اسکرین پر نظر نہ آئے۔

چھپایا نہ جائے گا

اگر آج کے ڈراموں کا موازنہ ماضی کے ڈراموں سے کیا جائے تو اکثر لوگوں کو پرانے ڈراموں کا پلڑا بھاری محسوس ہوتا ہے۔ لوگوں کو اس وقت کے کام کرنے والوں میں ایک لگن اور اپنے فن سے وابستگی محسوس ہوتی ہے۔ اکثر سینئر فنکارائیں آج کی اداکاراؤں پر تنقید کرتی نظر آتی ہیں کہ یہ لوگ "اداکاری" سے زیادہ "خود" پر توجہ دیتی ہیں کہ ان کے لباس' میک اپ اور ہیئر اسٹائل میں کوئی کمی نہ رہ جائے' مگر جناب! اس کا کیا کیا جائے کہ ہماری بعض سینئر اداکارائیں اپنی چال چھوڑ کر اس روش پر چل نکلی ہیں۔



سینئر اداکارہ عائشہ خان فن اداکاری کا ایک مستند نام ہیں۔

ایک نجی چینل کے لیے ڈرامے کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ عائشہ خان بھی کاسٹ میں شامل تھیں۔ شوٹ شروع ہونے سے ایک گھنٹہ قبل میک اپ آرٹسٹ کو ساتھ لے کر بیٹھ جاتیں اور اسے ہدایات جاری کرتے ہوئے اپنا میک اپ کرواتیں اور اگر اس دوران کوئی دوسرا فنکار میک اپ آرٹسٹ سے مخاطب ہونے کی جسارت کر بیٹھتا' اسے عائشہ خان کی ناراضی کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہی نہیں..... میک اپ آرٹسٹ سے میک اپ کروا کے بھی وہ مطمئن نہ ہوتیں۔ اس کے بعد بھی وہ آئینہ سنبھالے اپنا میک اپ درست کرتی نظر آتیں۔ یوں پوری شوٹ کے دوران عائشہ کے ہاتھوں میں ہر وقت آئینہ نظر آتا۔

عائشہ جی! آپ نے اب تک جو بے مثال اداکاری کی ہے' وہ میک اپ کی محتاج کبھی نہیں رہی۔ آج کی بیشتر اداکاراؤں کی ایکٹنگ نے ڈراموں میں جو داغ لگایا ہے تو اس کے لیے ہم یہی کہیں گے۔

"میک اپ سے یہ داغ چھپایا نہ جائے گا۔"

کچھ سیکھو!

گزشتہ دنوں اداکارہ میرا کے گھر میں چوری ہو گئی۔ یہ چوری اس لحاظ سے خاصی انوکھی تھی کہ اس میں صرف کرنسی اور وہ بھی غیر ملکی اڑائی گئی۔ 4 ہزار امریکی ڈالر اور 5 ہزار ریال غائب ہونے پر میرا کو تشویش ہوئی۔ میرا نے گھر کے تمام ملازمین کو جمع کیا اور ان سے پوچھ گچھ کی۔ ملازمین نے قرآن اٹھا لیا کہ انہوں نے چوری نہیں کی۔ اس پر میرا نے انہیں جانے دیا اور چوری کی ایف آئی آر درج نہیں کرائی۔

وطن عزیز کے سیاست دانو! اداکاراؤں سے فن



اداکاری کے علاوہ کچھ اور بھی سیکھ لو۔

سعود کی خود غرضی

کہتے ہیں کہ فنکار معاشرے کا سب سے حساس طبقہ ہوتا ہے' خواہ اس کا تعلق فنون لطیفہ کے کسی بھی شعبے سے ہو۔ کچھ فنکا حساس ضرور ہوتے ہیں لیکن صرف اپنے لیے۔

فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ اداکار سعود اور شفقت چیمہ شوٹ کروا رہے تھے۔ مار دھاڑ سے بھرپور سین تھا۔

دونوں کو کئی فٹ گہرے پانی میں لڑائی کرنی تھی۔ لڑتے ہوئے دونوں اس طرف جا نکلے' جہاں کی زمین کچھ دلدلی تھی اور پانی بھی خاصا گہرا تھا۔ سعود کے ایک زوردار مکے سے شفقت چیمہ پانی میں گر گئے۔ اتفاق سے انہیں تیرنا بھی نہیں آتا تھا۔ وہ ڈوبنے لگے۔

انہوں نے سعود کو پکڑنا چاہا اور مدد کے لیے کہا' کیونکہ سعود ایک ماہر تیراک ہیں' مگر انہوں نے اس وقت خود غرضی کا مظاہرہ کیا اور شفقت چیمہ کو وہیں ڈوبتا چھوڑ کر خود تیرتے ہوئے پانی سے باہر آ گئے۔ بعد میں عملے کے کچھ افراد نے شفقت چیمہ کو بچایا۔

شفقت جی! یہ دنیا ہے۔ یہاں ڈوبتے ہوئے لوگوں کا سہارا کون بنتا ہے بھلا۔



بیان کالمانہ

مشرف نے ملک کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا وہ بھی صرف آٹھ برسوں میں۔ کبھی نہ رکنے والی صوبائی' لسانی' فرقہ وارانہ جنگیں شروع کرائیں۔ ان کو نا کافی سمجھا تو امریکا سے بھی حملے کرائے۔ امریکا کو زیادہ زحمت نہ ہو اس لیے اپنے ایرپورٹ اسے دے دیے۔ آدھی آبادی خط غربت سے نیچے دھکیل دی اور ڈاکوؤں' چوروں' ٹارگٹ کلرز اور بھتہ نوشوں کی ایک پوری کھیپ کھڑی کردی۔

(عبداللہ طارق سہیل' وغیرہ وغیرہ)

آج سیلاب کو ایک ماہ ہو چلا ہے۔ یہ اپنی سول سوسائٹی کی منہ پھاڑتی سیکولر ایلیٹ کو بلائیں اور پوچھیں کہ تم کہاں مر گئے ہو۔ ایک عورت کو شادی سے روکا جائے تو زمین آسمان ایک کر دیتے ہو اور آج لاکھوں عورتیں بے یار و مددگار ہیں۔ کوئی انسانی حقوق حقوق نسواں' سول سوسائٹی کی ہزاروں این جی اوز اپنے ایر کنڈیشنڈ دفاتر میں کہاں خاموش ہیں لیکن کوئی ان کا گریبان نہیں پکڑے گا۔ جب آفت ٹل جائے گی تو یہ لوگ دو قومی نظریہ پر بحث کرنے واپس نظر آئیں گے۔

(اوریا مقبول جان۔ حرف راز)

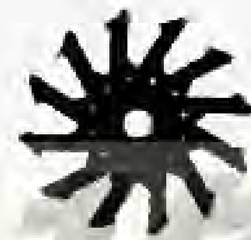
امریکا افغانستان میں خاصے تکلیف دہ دنوں سے گزر رہا ہے جس پر اس سے ہمدردی کی جانی چاہیے لیکن جب وہ اس تکلیف کا منبع شمالی وزیرستان کو قرار دیتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ تکلیف نے دماغ پر بھی کافی اثر کیا ہے۔

میرے نزدیک بے غیرت اور بے عزت سیاست کے درخت کا پھل کبھی میٹھا نہیں ہوتا۔

(ڈاکٹر صفدر محمود۔ صبح بخیر)

گزشتہ سال رمضان میں لندن کے ایک اخبار نے خبر دی تھی کہ پاکستان کے سابق جنرل مشرف رمضان کے مہینے میں ایک ہوٹل میں قیمتی لنچ کرتے پائے گئے۔ وہ گلوکار پر پچاس پچاس پونڈ کے نوٹ برسا رہے تھے۔

(ڈاکٹر صفدر محمود۔ صبح بخیر)





آپ نے دیکھا ہو گا کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں بظاہر کوئی بھی غیر معمولی خوبی یا صلاحیت نہیں ہوتی پھر بھی لوگ انہیں بہت پسند کرتے ہیں۔

جب کہ بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حسن' دولت' ذہانت' معاشرے میں اعلا مقام' ہر خوبی سے نوازا ہوتا ہے لیکن لوگ ان سے کتراتے ہیں' ان سے دوستی کرنا پسند نہیں کرتے۔

آپ نے کبھی غور کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کی بنیادی وجہ خوش مزاجی ہے۔

کیا آپ چھوٹی چھوٹی باتوں کا برا مان جاتے ہیں؟

آپ کو ہر دم یہ احساس رہتا ہے کہ لوگ آپ کو اہمیت نہیں دیتے؟

اگر کوئی آپ پر تنقید کرے تو آپ کو غصہ آ جاتا ہے؟

اگر کوئی آپ سے ناراض ہو جائے تو آپ منانے میں پہل کرنے کو اپنی توہین سمجھتے ہیں؟

اگر آپ سے کوئی مذاق کرے تو آپ سنجیدہ ہو جاتے ہیں؟

اگر ان سب باتوں کا جواب اثبات میں ہے تو آپ تنک مزاجی کا شکار ہیں اور آپ کو اپنی شخصیت میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

جو لوگ ذرا ذرا سی بات پر برا مان جاتے ہیں' لوگ ان سے دور رہنے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ احساس تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

خوش مزاج بننا مشکل نہیں ہے۔

اگر کوئی آپ پر تنقید کرتا ہے تو تو برا نہ مانیں' سوچیں کہ اس کی بات کس حد تک صحیح ہے۔ اگر آپ میں کوئی خامی ہے تو اپنی اصلاح کر لیں۔ اگر اس نے غلط تنقید کی ہے تو یہ سوچ کر بھول جائیں کہ یہ اس کا نقطہ نظر ہے۔

کوئی روٹھ جائے تو اسے خود بڑھ کر منا لیں۔ اس میں آپ کی ہتک نہیں ہے بلکہ بڑائی ہے۔

کوئی آپ کو نظر انداز کرتا ہے تو خود آگے بڑھ کر بات کریں۔

کوئی آپ سے بڑا ہو یا چھوٹا' اس کی عزت کریں۔

لوگ آپ سے محبت کریں گے' آپ کے دوست بن جائیں گے۔

اس لیے کہ ہنستے مسکراتے چہرے' خوش گفتار لوگ سب کو بھلے لگتے ہیں۔

ایسے لوگ جن کی پیشانی پر بل ہوں' لب نفرت سے سکڑے ہوں اور لہجے میں کرختگی ہو' آپ کا ان سے بات کرنے کو جی چاہتا ہے؟

نہیں ناں۔

تو پھر آج سے طے کر لیں کہ آپ ایک خوش مزاج شخصیت ہوں گی۔



دراصل بچپن میں ناک پر پتھر لگنے سے اس کی شکل بگڑ گئی تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ نمایاں ہوتی گئی۔ کیا ایسا کوئی طریقہ ہے۔ جس سے ناک کا یہ نقص دور کیا جا سکے؟

ج : زرین بہن! میک اپ کے ذریعے اس نقص کو کسی حد تک دبایا جا سکتا ہے لیکن اگر یہ زیادہ نمایاں ہے تو پھر ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کی پلاسٹک سرجری کرائی جائے۔ اس کے لیے کئی پرائیویٹ اسپتال ہیں' کراچی میں شہید ملت روڈ پر ہل پارک کے پیچھے ایک بڑا پلاسٹک سرجری کا اسپتال ہے جہاں سرجری کی سہولت موجود ہے۔ آپ وہاں کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کرلیں' وہ آپ کو تمام تفصیلات سے آگاہ کردیں گے۔

اس کے لیے آپ کو چار سے پانچ دن تک اسپتال میں رہنا ہوگا اور دو ہفتے تک ناک پر پلاسٹر چڑھا رہے گا' اسے آپ ایک طرح آپریشن ہی سمجھیں۔

ماریہ علی..... گجرات

س : میری عمر تیس سال ہے لیکن آنکھوں کے نیچے کی جلد پھول گئی ہے۔ جس کی بنا پر میں اپنی عمر سے بہت زیادہ نظر آتی ہوں۔ کوئی ایسا نسخہ بتائیں کہ میں اس سے نجات حاصل کرسکوں؟

ج : اسے آنکھوں کے نیچے تھیلیاں بننا کہتے ہیں۔ عموماً" یہ موروثی ہوتی ہیں۔ ان کے ظاہر ہونے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ گردوں اور پیشاب کے انفکشن کی وجہ سے بھی ایسا ہوتا ہے' آنکھوں کے اردگرد کی جگہ بہت نازک ہوتی ہے' اس میں لچک بھی کم ہوتی ہے اس لیے یہ جلد پھول جاتی ہے۔ آپ ڈاکٹر سے مشورہ ضرور کریں۔

چائے اور کافی کا استعمال کم کردیں۔ پانی زیادہ سے زیادہ پئیں ۔ روزانہ کم از کم سولہ گلاس پئیں۔ صبح سویرے گرم پانی میں لیموں کا رس ملا کر پئیں۔ آنکھوں کے گرد کوئی بھاری کریم نہ لگائیں۔

ایک آلو لے کر اچھی طرح دھوئیں پھر اس کے باریک قتلے کاٹ کر آنکھوں پر رکھیں۔ اس سے کافی فرق پڑے گا۔

کھیرے کا رس لگانے سے بھی یہ تھیلیاں کم ہوجاتی ہیں۔ البتہ اگر یہ موروثی ہیں تو صرف **کاسمیٹک** سرجری سے ہی ختم ہوسکتی ہیں۔

ثمروٹ..... چیچہ وطنی

س : میرے بال اُڑے اُڑے سے نظر آتے ہیں۔ بالوں کے دو منہ بن گئے ہیں۔ بال بدرنگ اور کھردرے بھی ہیں۔ اس لیے گھنے اور لمبے ہونے کے باوجود خوب صورت نظر نہیں آتے۔ پہلے میرے بال گھنگھریالے تھے۔ میں نے انہیں سیدھا کرایا اور اسٹریکنگ بھی کرائی۔ اس کے بعد بالوں کا یہ حشر ہوگیا ہے۔ کیا کوئی ایسی صورت ہے کہ بال چمک دار اور دلکش نظر آئیں؟

ج : کنڈیشنگ بالوں کو غذائیت فراہم کرنے کا ایک انتہائی مفید طریقہ ہے۔ یہ بالوں کو ہموار کرتا ہے اور اس سے بالوں میں چمک بھی پیدا ہوتی ہے۔

1 استعمال شدہ چائے کی پتی پانی میں دوبارہ ابال کر چھان لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر شیمپو کرنے کے بعد اس پانی سے سر دھوئیں۔

2 ایک مگ پانی میں ایک لیموں کا رس ملائیں اور سر دھونے کے بعد آخر میں اسے بالوں پر ڈالیں۔

3 مہندی بھی بہترین کنڈیشنر میں سے ایک ہے۔ اس کے استعمال سے بھی بہت سے فوائد ہوتے ہیں۔

4 مہندی میں ایک لیموں کا رس' ایک انڈا اور چائے کا ایک چمچہ دہی ملا کر لگائیں۔ بالوں میں نہایت دلکش چمک پیدا ہوجائے گی۔

5 مہندی کے پیسٹ میں چائے کا ایک چمچہ خالص ناریل یا زیتون کا تیل ملا کر بالوں میں لگائیں۔ آدھے گھنٹے بعد سر دھولیں۔

6 مہندی لگانے سے نہ صرف بالوں کی ساخت ہموار' ریشمی اور چمک دار ہوجاتی ہے بلکہ بال گھنے بھی نظر آنے لگتے ہیں۔

☼